دل گداز تحریریں، • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ سچی کہانیاں

July 2017

عید مبارک



کاملیت کا نشان

بابرہ شریف



اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

30 سے زائد سچی کہانیاں اس شمارے میں موجود ہیں

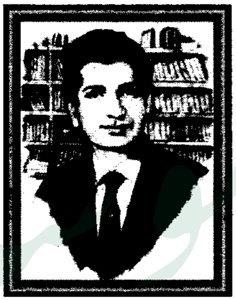
☆...... تصوف کی دنیا کا شاہکار کاوش صدیقی کا سلسلہ وار ناول 'خانقاہ'

☆...... 'مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
021-35893121

منیجر سرکولیشن
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ❋ جلد: 34 - شمارہ: 07 ❋ جولائی 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

07 دیر نہ ہو جائے
منزہ سہام

08 احوال
کاشی چوہان
قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دلچسپ سلسلہ

28 بابرہ شریف
احمد سجاد بابر
کروڑوں دلوں کی دھڑکن، حسن و فن کا مجسمہ، آسمانِ فن کا درخشاں ستارہ، کاملیت کا نشان

35 تجھ بن روئے ساون
ریاض حسین شاہد
اُن لوگوں کی داستان، جو محبت کو احترام دینا جانتے ہیں

60 تریاق نہیں ملتا
اُم مناہل
اُس شخص کی داستانِ عبرت، جس نے ہر رشتہ پامال کیا اور خدا کے قہر سے ڈرنا بھول گیا

70 چوری چوری
منشی محمد عزیز منے
اُن بیٹیوں کے لیے عبرت اثر تحریر، جو شادی کے بعد بھی آنکھیں بند کیے ماؤں کے اشاروں پر چلتی ہیں

75 نیکی گلے پڑ گئی
نصرت سرفراز
اُس رحم دل جوڑے کی کتھا، غریبوں پر مہربانی جنہیں پھانسی گھاٹ تک لے گئی تھی

80 سودا
راشد لطیف
اُس دوشیزہ کی داستان، جس سے اُس کی سہیلی نے خوب فائدہ اٹھایا

86 کس پہ اعتبار کریں
سیمیں غزالہ نبحان
اُس کالی دیوی کے پجاری کا قصہ، جس نے خزانے کے لالچ میں مسلمان ہونے کا ڈرامہ رچایا تھا

91 چاچی بانوری
مومنہ بتول
ایک میمن سیٹھ کی زندگی کی بساط الٹتی ایک کتھائے خاص، جو آپ کو مدتوں یاد رہے گی

96 بابا کی رانی
فراز قیوم
ایک باپ کی اپنی بیٹی سے محبت کی داستان، جو آپ کی آنکھیں بھی نم کر دے گی

106 ہائے اُس زود پشیماں کا...
مور شاہد حسین
اُس شخص کی داستان، جو بے حسی کی چادر اوڑھ کر اپنی ہی نسل کو فنا کر رہا تھا

110 جنون
شاہ زیب
محبت کی خاطر بہن کو زہر دینے والی دوشیزہ کی داستانِ حیرت

114 ذرا سی دیر میں
شاہدہ ذاکر
اُس رکشہ ڈرائیور کی کہانی، جسے تھوڑی سی دیر کی ملاقات ساری زندگی کا ساتھ دے گئی تھی

119 نجات
افتخار افی
خدا کے قہر کا شکار ہونے والے اُن نوجوانوں کی داستان جو گینگ ریپ میں ملوث تھے

124 ہارے بھی تو...
ایم یعقوب احمدانی
محبت کی شطرنج میں، متاع کی بازی ہارنے والی دوشیزہ کی داستان

128 ظلم کا بدلہ
ثانیہ عزیز
فیوڈل سسٹم کا شاخسانہ، ایک عبرت اثر تحریر

132 تمہارے ہاتھ میں رہتے تو...
ایم حنیف عاصم بلوچ
محبت کی ایک ایسی دربدر داستان، جس کے کردار آج بھی زندہ ہیں

146 خانقاہ
کاوش صدیقی
خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مرد درویش کی داستان عجب

162 خالی ہاتھ
افتخار چوہدری
اُس خبیث نوجوان کی عبرت ناک کہانی، جس نے زن اور زر کے لیے اپنے ماں جائے کو کاٹ ڈالا تھا

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

174 انوکھا بندھن — ایڈیسن ادریس مسیح
ایڈیسن کے زہر بجھے قلم سے ایک شعلہ سامانی

176 ہاپوکا نڈریا — سعدیہ سیٹھی
اُس ظالم شخص کی عبرت سرائی جو خود کو خدا کہلوانے لگا تھا

180 زندگی جلتا دیا ہے — سیدہ نسیم زہرا رضوی
اُس ماں بیٹے کی کہانی جنھیں زندگی بچانے کے لیے پاگل خانے میں قیام کرنا پڑا مگر....

186 پروفیشنل — بلال فیاض
اُس ڈاکٹر کی داستان، جو بہت پروفیشنل تھا

190 آخری وار — نیناخان
اُس معصوم بھائی کا قصہ، جو اپنے ہی بھائی بھاوج کے کرائے ہوئے کالے علم کی بھینٹ چڑھ گیا

194 صوفی نانا — فردوس بانو
اُس سادہ لوح شخص کی داستان، جو اپنی سادگی کے ہاتھوں مال ومتاع لٹا بیٹھا تھا

197 سعودی عرب کا ویزا — ممتاز احمد
لاری اڈے کے نزدیک زیرِ تعمیر مسجد سے شروع ہونے والی نوسربازی

202 میری مینا — انیسہ تاج خان
سابقہ ایڈیٹر کی والدہ کے قلم سے، مسیحاؤں کی غفلت و ناتجربے کاری کی سچی حکایت

204 سائرہ کی باجی — ارم ناز
مڈل کلاس کے محلوں میں ہونے والا تماشا، ارم ناز کے قلم سے

207 جرسی — راحیلہ منظر
اک دکھیاری ماں کی حسرتوں بھری حکایت

210 خوامخواہ — سید ملازم حسین شیرازی
اِک ایسی حکایت جس میں نیکی خوامخواہ گلے پڑ گئی تھی

213 رب نے بنائی جوڑی — الماس فاطمہ ارمان
اُس کرموں جلی کی حکایت، جو تن کی کالی مگر من کی پارس تھی

216 شرارت — فرح انیس
اُس شخص کی حکایتِ عجب، جو جانوروں کو تنگ کرتا تھا

218 تم بن آنگن سُونا — سلمیٰ سید
ماں کی یادوں سے جڑی ایک بیٹی کی دکھی حکایت

220 وفا کیسی؟ — ثناء کنول اللہ دتا
محبت کی یکطرفہ حکایت، جو دل سے پڑھی جائے گی

223 چپّی باجی — شیما عبدالقیوم
اُس دوشیزہ کی حکایت، جو ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے خود قربان ہوگئی۔

226 نواب — حمیرا خان
اُس نوجوان کی سرگزشت، جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

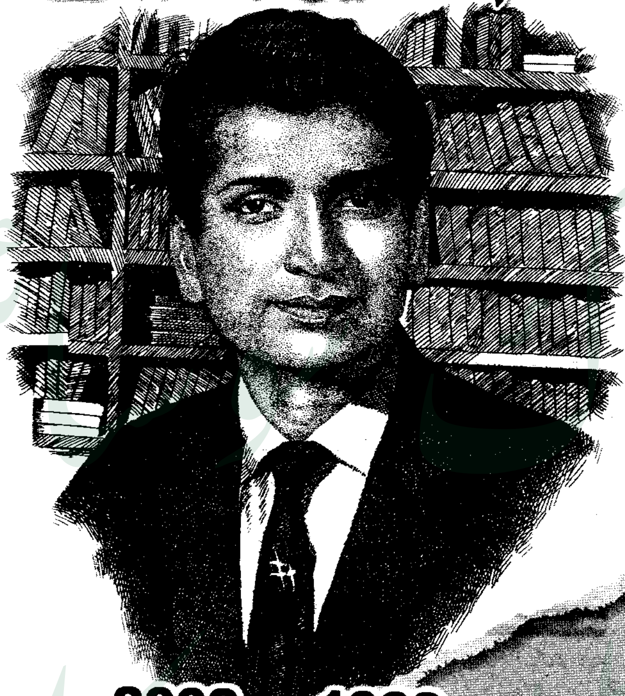
242 مسئلہ یہ ہے — ادارہ
آپ کے مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

252 ہائیڈ پارک — ڈی خان
زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

257 تیرِ نیم کش — قارئین
قارئین کی سخن فہمی کو آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان: 999 روپے، افریقہ 65 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر، ایشیا، یورپ 55 ڈالر

ہم نہیں بھولے......



1932ء......2002ء

یہ رنگ رنگ کہانی، یہ حرف حرف فسوں
تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں
یہ کام ہم نہیں کرتے ہمارے دفتر میں
یہ کام آج بھی بس آپ ہی تو کرتے ہیں

دیر نہ ہو جائے

لہریں بہت خاموشی سے ساحل کی طرف بڑھتیں اور ساحل کے قریب پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتیں..... حد نظر نیلا نیلا سمندر، اپنے اندر بہت پُراسرار خاموشی رکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی خاموشی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ آپس کی رنجشیں بھی اُس طوفان کی طرح ہوتی ہیں جو لمحوں میں سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ رنجشیں پالنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ دراصل وہ کٹھ پتلیاں ہیں، ڈوریں ہلانے والے تو کوئی اور ہیں..... بربادیوں سے فائدہ اٹھانے والے دوست نہیں ہوتے بلکہ دوست کے روپ میں بدترین دشمن..... ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور پریشانیوں میں اس قدر گم ہیں کہ دیکھ ہی نہیں پا رہے ہیں کہ ہمارے بھائی، ہمارے دوست کس عذاب سے گزر رہے ہیں..... اسلامی ممالک میں پنپتا انتشار ایسا طوفان ہے جو سب کچھ بہا لے جائے گا۔ سعودی عرب، قطر، ایران یا پھر شام سب کا ایک ہی دشمن ہے، جس نے اپنے چہرے پر دوستی کا نقاب ڈال رکھا ہے۔ کاش یہ بات سب کو جلد سمجھ آ جائے.....

ورنہ ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

ساتھیو! کیسے ہیں آپ؟ عشق کے باب میں اب سبق ختم ہوا ہی چاہتا ہے۔ حریف کو حلیف بنانے کا فن سیکھ لو۔ بھرے ہوئے زخموں کے نشان روح کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ملنے والے زخموں کو شمار کرنا عبث ہے۔ میرے پیارو! پرندے کس طرح اڑان بھرتے ہیں کبھی بند کھڑکی سے دیکھا ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان کون تھا؟ کبھی محسوس کیا؟ نہیں ناں! تم اور میں درمیان میں اسمِ اعظم کے تحت ساتھ تھے اور وہ اسمِ اعظم کیا تھا بھلا محبت...... ! محبت اور بس محبت۔ کاش کہ تم سب بھی اس محبت کے طلسم میں قید ہو جاؤ تو ہر طرف سنہرے ریشے سی ہریالیاں اور نیلگوں آسمان کی وسعتیں بے کراں ہو جائیں۔ میرا آپ کا ساتھ لگتا ہے جنموں سے ہے۔ جنم جنم ہم ملتے رہیں گے۔ ان مہ و سال میں سیکڑوں کہانیاں آپ سب کے روبرو کیں۔ پچاسیوں نئے لکھاری پہلی بار اپنے قلم کے موتی چمکاتے ادب کی دنیا میں وارد کیے۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میرے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے۔

خدا نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔ کچھ دن کے لیے اجازت دیجیے۔ آیئے احوال کی ابتداء کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے ساتھ ہیں۔ کراچی سے ہماری سابقہ ایڈیٹر مینا تاج کی والدہ انیسہ تاج خان، لکھتی ہیں۔ میں آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ مینا تاج کی یہ اسٹوری اپنے پرچے میں چھاپ دیں۔ بہت مہربانی ہوگی اور ایک رسالہ مجھے بھی بھیج دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

✽ پیاری آنٹی! آپ گزارش نہیں حکم کرتیں تو اچھا لگتا۔ لیجیے مینا کی اسٹوری اسی پرچے میں لگا دی ہے۔ خدا مینا کو جنت الفردوس میں جگہ دے، (آمین)۔

☆ فیصل آباد سے ہمارے بھائی ارشد اقبال چوہان صاحب کی پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ محترمہ مدیرہ صاحبہ السلام علیکم۔ ایک مدت سے سچی کہانیاں کا قاری ہوں۔ جب سہام مرزا صاحب ہم میں موجود تھے۔ ہر کہانی پر ایک شعر ہوتا تھا جو کہانی کی تفسیر ہوتی تھی۔ آج تک احوال میں شامل نہیں ہوا۔ آج احوال میں حاضری اسی لیے دی ہے۔ کرن شبیر صاحب کو صرف یہ پیغام دیں کہ سچی کہانیاں جیسے خوب صورت ماہ نامہ کے ساتھ ایسا مذاق کرتے ہوئے ان کو کچھ تو خیال آنا چاہیے تھا۔

✽ پیارے بھائی اقبال! خوش آمدید! کرن شبیر صاحبہ تک یقیناً آپ کا یہ پیغام پہنچ گیا ہوگا۔ آپ کی نشاندہی پر دل سے مشکور ہوں۔

☆ ژوب، بلوچستان سے ہمارے ساتھی عمران مظہر احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''مئی کا شمارہ 15 تاریخ کو ملا۔ سرورق بلاشبہ بہترین ہے۔ ایک کے بعد ایک نمبرز آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بھائی صرف احوال، اقبال بانو کی ہیر اور سیدہ کاظمی کی باپ کا گناہ ہی پڑھ پایا ہوں۔ مطالعے میں پڑوں تو خط بھیجنے کی تاریخ نکل جائے گی اور مجھے حقیقتاً آخری تاریخ بھی معلوم نہیں۔ احوال میں سب نے خوب لکھا۔ اقبال بانو صاحبہ اور سیدہ کاظمی صاحبہ دونوں کی تحریریں اچھی رہیں۔ نظر علی برمانی! سر آپ کو یوں اچانک دیکھ کر جانے کیا کچھ یاد آ گیا۔ دس سال واقعی ہو گئے؟ کتنے نام کتنی باتیں

ذہن میں آرہی ہیں۔ یقین سے زیادہ یقین ہے کہ رسالے کی باقی کہانیاں بھی اعلیٰ درجے کی ہوں گی۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ پھر آدھی ملاقات رہے گی۔ دعاؤں میں یاد رکھیئے گا۔ آپ دعاؤں میں رہتے ہیں۔ بھائی۔ کاشی بھائی واقعہ سچا ہے۔ ہمارے ہی ایک ٹیچر جو کہ اب ریٹائرڈ ہیں انہوں نے سنایا تھا۔ میں نے اسے کہانی کا روپ دے دیا۔

بہت پیارے مظہر! سلامت رہو۔ تمہاری کہانی پڑھی مجھے کہیں جھول یا جمپ نظر نہیں آئی۔ زبردست بنت رہی مگر...... سنسر کا کیا کریں۔

☆ ہمارے نئے ساتھی عبدالعزیز یافث رحیم یار خان سے احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ کاشی صاحب! کیسے ہیں آپ؟ یقینِ کامل ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ گزری عید اور رمضان بہت بہت مبارک ہوں آپ کو۔ بالکل جی کاشی صاحب! آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں وہ کہانی آپ کو دوبارہ ارسال کردوں گا۔ ٹرین نمبر میں میری کہانی کی اشاعت کر کے آپ نے مجھے مزید لکھنے کے لیے حوصلہ دیا ہے شکریہ کاشی صاحب۔ اس بار سچی کہانیاں سات جون کو ہاتھ لگا اور ہم نے بھی قسم کھالی کہ آٹھ جون کا سورج نکلنے سے پہلے پہلے سارے کا سارا ڈائجسٹ پڑھ کر ہی دم لینا ہے۔ اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے آخر اس ماہ کے سچی کہانیاں کے شمارے کو پڑھنے میں دن رات ایک کر دیا تھا میں نے۔ سرِ ورق تو ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھا۔ اداریہ بہت ہی زبردست رہا۔ پی آئی اے والوں کو ٹھیک میسج دیا گیا۔ احوال کی طرف چلوں تو یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہر بار کی طرح یہ ٹرین نمبر بھی کمال کہانیوں پر مشتمل ہے اور ہاں زیادہ تر سبق آموز کہانیاں ہیں کیونکہ ہمارے معاشرے کو اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ اور سچی کہانیاں اپنا فرض نبھاتے ہوئے بالکل ٹھیک ڈگر پر جا رہا ہے۔ اریبا نورین کی چنے کرارے سب سے پہلے پڑھی۔ سب سے پہلے پڑھی اور سب سے زیادہ اچھی لگی۔ واقعی سچی کہانی لگی اور آنکھوں سے آنسو چھلکتے رہ گئے۔ اریبہ نورین آپ نے تو آتے ہی ہمارا دل ہی موہ لیا۔ آپ کی کہانی کے جادو میں کافی دیر کھوئے رہے ہم تو۔ بنت حوا کی بوجھ بھی دلچسپ لگی۔ رانو بیچاری کا پتہ نہیں کیا ہوا بعد میں؟ فصیحہ آصف خان کی آخری بیٹا کہانی تو ایسی تھی کہ عقل دنگ رہ گئی اور دل اس بات کو تسلیم ہی نہیں کر رہا تھا کہ حقیقت میں واقعی کوئی اپنا لختِ جگر ریلوے اسٹیشن کے بینچ پر قسمت کے سہارے چھوڑ سکتا ہے۔ میں تو ابھی تک حیرت میں ہوں۔ طاہر محمود کی خودداری کافی اچھی لگی۔ مجیب بابو جیسے بہت سارے لوگ ابھی بھی دنیا میں موجود ہیں جو مفلسی کو تو ہنسی خوشی گلے لگا لیتے ہیں پر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ قید سے رہائی تک ثمینہ طاہر بٹ کی کہانی بہت ہی اچھی لگی۔ بڑی خوبصورتی سے محبت اپنے رنگ دکھاتی ہوئی ٹرین پر سوار ہو ہی گئی۔ واقعی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی کہانی تھی۔ اور اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ مراد اور فریدہ اپنی محبت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اختتام تو نہایت ہی دلکش لگا۔ افتخار چوہدری کی ایمیزون جب پڑھی تو ہنسی بھی آئی اور حیرت بھی ہوئی۔ کافی الگ تھلگ سی کہانی تھی بالکل منفرد۔ کافی محنت سے لکھی گئی کہانی ہے سچ میں۔ افریقی جنگلوں میں بستے قبائلی لوگوں کے رسم و رواج کے بارے میں معلومات ملیں۔ مگر اتنے سال ہو گئے وہ دونوں ابھی تک اکٹھے کس طرح رہ رہے ہیں؟ اختتام تھوڑا مزید واضح کر دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ بہر حال کہانی قابلِ تعریف ہے۔ مہتاب خان کی تمہیں اجازت ہے اچھی لگی۔ ثمینہ فیاض کی صبح کا ستارہ بہت ہی عمدہ کہانی تھی۔ پتہ نہیں لڑکیاں معصوم ہوتی ہیں یا پتہ نہیں انہیں کس طرح کسی انجان اور غیر لڑکے پہ اتنا ہی اعتبار آجاتا ہے کہ اس کے ساتھ بھاگ جانے کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہیں اور ایک پل کے لیے بھی پیچھے مڑ کر اپنے گھر کی جانب نہیں دیکھتیں۔ پر شکر خالدہ اس ذلت بھری زندگی سے بچ گئی جو بھاگنے کے بعد اکثر لڑکیوں کے حصے میں آتی ہے۔ پڑھ کر کافی مزہ آیا۔ ممتاز احمد کی جدائی نے تو رُلا دیا۔ ہائے کسی دا یار نہ وچھڑے۔ شبانہ بیچاری کی زندگی کتنی مکمل تھی پر اب وہ راتوں میں روتی ہے۔ نسیم سحر کی درست فیصلہ حقیقت پر مبنی کہانی ہے۔ پہلے تو کہانی تھوڑی الجھی ہوئی لگی پر جب آخر میں ارمان عرف سعید اور روبینہ عرف آرزو کا پتا چلا تو ساری الجھی کہانی ایک سیکنڈ میں سلجھ گئی۔ شاہد رفیق کی نیلا دھوبی کہانی میں قسمت نے تو نیاز

پاشا کا ساتھ دیا تھا پر اس کی بیوی حسینہ نہ دے سکی۔ وقاص حسین کی نہلے پہ دہلا نے تو کمال ہی کر دیا۔ مطلب ٹرین میں چوری کی کہانی بڑی ہی منفرد لگی۔ اور کیا ترتیب اور پوری پلاننگ سے چوری کی گئی تھی۔ سنا ہی تھا کہ چوروں کو بھی مور پڑ جاتے ہیں اور اب ایسا پڑھ بھی لیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ عائز کو اس کا حق واپس ملا۔ واقعی سچے دوست اللہ کی نعمت ہوتے ہیں۔ ویڈن وقاص حسین زبردست۔ حنا بشریٰ کی شعلوں پہ رقص نے تو خون کے آنسو رلا دیا۔ آہ محبت! بہت ہی بڑی اور خطرناک غلطی۔ نوفل چندراکھی کے عشق میں کہاں کہاں سے گزر گیا اور جب آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ وہ تو سراب کے پیچھے بھاگ گیا تھا اور سراب بس دھوکہ ہوتا ہے۔ فیصل ندیم بھٹی کی ہم کہ ٹھہرے اجنبی، نسیم سکینہ کی ٹرین کب آئے گی، ثمینہ ناز کی احسانِ عظیم اور جاوید راہی کی پلیٹ فارم سے جیل تک عمدہ اور اچھی تحریریں تھیں۔ ہائیڈ پارک اس بار بہت بہت اچھا لگا یقین کریں ہائیڈ پارک کے لطیفوں نے اس بار تو خوب ہنسایا اور تیرِ نیم کش کی تو جتنی تعریف کروں کم ہے بہت ہی عمدہ اشعار لکھے گئے ہوئے تھے۔ اب اجازت دیں آپ کا کافی ٹائم لے لیا۔ حاضر ہوتا رہوں گا۔ اللہ حافظ۔

☙ پیارے یافث! یقین کرو تبصرہ بہت زبردست لگا تمہارا۔ خوش رہو۔

☆ یہ احوال میں آمد ہے ادیبہ سرفراز کی لاہور سے لکھتی ہیں۔ کاشی بھائی سلامت رہیں۔ اس بار کا رسالہ بہت لیٹ ملا لیکن پھر بھی ہم نے ہمت نہیں ہاری اور احوال میں حاضر ہیں۔ کاشی بھائی اب سب کہانیوں پر تبصرہ کیسے کروں اتنا لیٹ رسالہ ملا ہے۔ اب تک صرف چند کہانیاں ہی پڑھ پائی ہوں۔ جن میں اریبہ نورین کی چنے کرارے بہت منفرد لگی۔ اگر ہم خدا پر یقین کر لیں تو ہمارے سب مسائل حل ہو جائیں دراصل ہم بندوں پر یقین کرتے ہیں اسی لیے منہ کے بل گرتے ہیں۔ بنت حوا کی بوجھ بھی اچھی لگی۔ فصیحہ آصف خان کی آخری بیٹا بھی اچھی رہی۔ اس کے علاوہ دو تین کہانیاں اور پڑھی جو بہت اچھی تھی۔ باقی ابھی تک پڑھ نہیں پائی۔ اس لیے اب تک کے لیے اتنا ہی اگلے ماہ اگر ٹائم پہ رسالہ ملا تو پورے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی تب تک کے لیے اجازت۔

☙ اچھی بہن! خوش آمدید، آپ کی آمد اور مختصر تبصرہ بھی اچھا لگا۔ اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

☆ وقار مشتاق کی بہاولپور سے آمد ہے، لکھتے ہیں لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی میرا غائبانہ تعارف تو پچھلی بار میری کزن ''ادیبہ سرفراز'' نے کروا دیا تھا۔ دراصل وہ مجھے بہت عرصے سے احوال میں شرکت کے لیے کہہ رہی تھی کہ تم کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے رسالہ پڑھتے ہوئے تم کوئی کہانی لکھو اگر کہانی نہیں تو کم از کم احوال میں تو شرکت کرو۔ میں اس کو کہتا کوئی فائدہ نہیں بندہ اتنی محنت کرے اور آجا کے خط ردی کی ٹوکری میں جائے۔ اس نے کہا ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ تو پھر میں نے کہا تم لکھو اگر خدانخواستہ تم احوال میں آ گئیں تو تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی آ جاؤں گا سو میں حاضر ہوں۔ فی الحال کسی بھی کہانی پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ اگلے ماہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔

☙ پیارے بھائی وقار! اگلے ماہ آپ کا انتظار رہے گا۔ دیکھتے ہیں آپ کتنا وعدہ وفا کرتے ہیں۔

☆ شہزادا اقبال کی فیصل آباد سے آمد ہے۔ لکھتے ہیں، کاشی بھائی ہر بار کی طرح اس بار بھی رسالہ شاندار رہا۔ پلیٹ فارم نمبر کی اس بار بھی ایک سے بڑھ کر ایک کہانی تھی۔ کوئی بھی لکھنے والا کسی سے کم نہ تھا۔ ہر ایک نے خوب محنت کی ہوئی تھی۔ اور اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کی۔ آپ نے ہمیشہ کی طرح خوب محنت کی کہانیوں کو ترتیب دینے میں۔ ویسے کاشی بھائی آپ انسان ہو یا جن؟؟ آپ تو کمال ہی کر دیتے ہیں ہر بار۔ اریبہ نورین کی چنے کرارے سب سے پہلے پڑھی اور اچھی لگی۔ بنت حوا کی بوجھ بھی ٹھیک رہی۔ فصیحہ آصف خان کی آخری بیٹا۔ طاہر محمود کی خودداری۔ قید سے رہائی تک ثمینہ طاہر بٹ کی کہانی۔ افتخار چوہدری کی ایمیزون مہتاب خان کی تمہیں اجازت ہے بھی اچھی لگیں اور خصوصی کہانی میں وقاص حسین کی نہلے پہ دہلا عمدہ کہانی تھی۔ اور جن کا نام نہیں لیا وہ دل چھوٹا نہ کریں ان کی کہانیاں بھی کمال کی تھی۔ بس میرے پاس ٹائم کی کمی تھی جس کی وجہ سے تفصیلی خط نہیں لکھ سکا۔

پیارے شہزاد! جتنا لکھا اچھا لگا۔ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ آمد ہو۔

☆ لائبہ شہزاد کی فیصل آباد سے پہلی بار آمد ہوئی ہے۔ لکھتی ہیں۔ کاشی بھائی خوش رہیں۔ ویسے تو اس رسالے سے تعلق کافی پرانا ہے لیکن کبھی لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا وجہ بہت ساری تھیں لیکن آخر کار ہم آ ہی گئے۔ ہم سے مطلب ''شہزاد اقبال'' موصوف میرے مجازی خدا ہیں۔ جناب پچھلی بار چپکے سے بغیر بتائے احوال میں شامل ہو گئے۔ اور جب رسالہ لاکر دیا تو اس بار ان کے ماتھے پر بل نہیں بلکہ آنکھوں میں مسکراہٹ تھی اور مجھے اس مسکراہٹ کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ لیکن جب احوال پڑھ تو سب سمجھ آ گئی۔ بس پھر ان کو بھاری قسم کا جرمانہ پڑا پھر ان کی جان چھوٹی۔ اب ہم سے چوری کا کچھ تو صلہ ملنا ہی تھا۔ کاشی بھائی آپ خوب محنت کر رہے ہیں یہ آپ کے ہر شمارے سے پتہ چلتا ہے۔ آپ نے تو خاص نمبروں کی لائن لگائی ہوئی ہے۔ آپ کی ہمت کو سلام ہے کاشی بھائی۔ کہانیوں پر تبصرا کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ ایک تو رسالہ دیر سے ملا اور کچھ ان دنوں میں کچھ زیادہ ہی پڑھائی میں مصروف ہوں جس کی وجہ سے رسالہ ابھی تک پڑھ نہیں سکی اگلی کوشش کروں گی تب تک کے لیے اجازت۔

پیاری بہن! چلو اس بار تمہیں معاف کر دیتے ہیں مگر اگلی بار اگر تبصرہ نہ کیا تو بھاری جرمانہ تمہیں بھی ادا کرنا پڑے گا اور وہ ہے ہماری ناراضگی۔

☆ احوال میں یہ آمد ہے وزیر آباد سے ریحان گل کی، لکھتے ہیں۔ کاشی بھیا! جون کا شمارہ بہت مکمل پرچہ تھا۔ احوال کا آغاز بہت اچھا کیا۔ بھیا آپ کی گفتگو بہت متاثر کن ہوتی ہے۔ اور سرِ ورق بھائی کمال کر دیا آپ نے۔ اریبہ نورین کی چنے کرارے بہت منفرد تھی۔ بنت حوا نے بوجھ بھی خوب لکھی۔ فصیحہ آصف خان کی تحریر آخری بیٹا افتخار چوہدری ایمیزون، نسیم سحر درست فیصلہ، مہتاب خان تمہیں اجازت ہے کے ساتھ نمایاں رہے۔ ہم کے ٹھہرے اجنبی، بہت دیر کر دی، اپنا خون، رستوں کے ساتھ ساتھ، ٹرین کب آئے گی بہت اچھی تحریریں تھیں۔ ثمینہ فیاض نے صبح کا ستارہ، ثمینہ ناز عبدالقیوم نے احسانِ عظیم پر خوب لکھا۔ سب نے بہت اچھا لکھا محنت کی اور پلیٹ فارم کو چار چاند لگا دیے۔ حمیرا خان نے نواب کی صورت میں اچھے ناول کا آغاز کیا۔ کاوش صدیقی کا ناول خانقاہ اچھا جا رہا ہے۔ فیصل ندیم بھٹی، ارم خان، ادیبہ سرفراز، عمران مظہر، اریبہ نورین کے خطوط اچھے تھے۔ سب سے بہترین ثمینہ طاہر بٹ کا تھا بے حد بھرپور تبصرہ تھا۔ آخر میں سب کے لیے بہت سی دعائیں اور محبت بھرا اسلام اور اللہ آپ کو ترقی، عروج صحت و زندگی عطا فرمائے (آمین) اب اجازت اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

اچھے ریحان! تمہارا یہ مختصر تبصرہ ہمیں جامع اور پیارا لگا۔ اگلے ماہ تمہاری آمد کا ابھی سے انتظار ہے۔

☆ احوال میں یہ آمد ہے کوئٹہ سے بھائی طاہر ابڑو کی، لکھتے ہیں۔ ''احوال میں یہ میری دوسری شرکت ہے۔ اس کی خاص وجہ آپ کی محبت و اپنائیت ہے۔ آپ کا خوب صورت جواب پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں ہمیشہ آپ کا مشکور و ممنون رہوں گا کہ آپ نے اگلے ماہ بھی ان ہی صفحات پر ملاقات کا اظہار کیا۔ پیارے بھائی مور شاہد حسین کا بے حد شکریہ جنھوں نے سچی کہانیاں کا تعارف کروایا۔ شاد و آباد رہیں مور شاہد حسین۔ چنے کرارے، آخری بیٹا، قید سے رہائی، جدائی، شعلوں پہ رقص بے حد پسند آئیں۔ دو پل کا ساتھ، راستے ایک ہوئے، درست فیصلہ اچھی تھیں۔ جاوید راہی پلیٹ فارم سے جیل تک اور وقاص حسین نہلے پہ دہلا بہترین تحریریں پڑھنے کو دیں۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ اب اجازت آپ سمیت تمام احوالیوں مور شاہد حسین، ممتاز احمد، عمران مظہر، وقاص حسین، حنا بشریٰ، فیصل ندیم بھٹی، نسیم سکینہ صدف، تحسین جونیجو، غزالہ کرن، عظمٰی شکور، ثمینہ طاہر، اسد الہٰی اور بلال فیاض کو سلام و دلی دعائیں۔

پیارے بھیا! احوال کے صفحات تو آپ سب کے ہیں۔ اس میں ہم آپ کے منتظر رہتے ہیں۔ جم جم آؤ۔

☆ احوال مین گوجرانوالہ سے بھائی عابد حسین پہلی بار آمد کے ساتھ لکھتے ہیں۔ میرا نام عابد حسین ہے۔ آپ کے

اجازت

پیارے ساتھیو! چند نجی مصروفیات کی بناء پر میں کچھ ماہ کے لیے آپ لوگوں کے ساتھ نہ رہ پاؤں گا۔ ہمارے سابق مدیر اور ہر دلعزیز شخصیت جناب ناصر رضا صاحب اگلے ماہ سے آپ کے ساتھ ہوں گے۔ آپ سب کی محبتیں میرا اثاثہ ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ پھر سے آپ کے روبرو ہوں گا۔ اجازت دیجیے۔

کاشی چوہان

لیے میرا نام بالکل نیا ہے کیونکہ احوال میں شرکت پہلی بار ہو رہی ہے۔ تمام احوالیوں کو محبت بھرا سلام۔ اچھا لگا تو اگلے ماہ پھر حاضری دوں گا۔ (ارے......) پلیٹ فارم نمبر نے چونکا کر رکھ دیا ہے سرِ ورق تو اتنا خوبصورت ہے کہ اپنے موبائل میں محفوظ کر چکا ہوں۔ اس کا کریڈٹ بھی آپ کو جاتا ہے۔ خطوط سب کے سب مزے کے تھے۔ رائیٹرز میں ممتاز احمد، ملازم حسین شیرازی، ریحانہ آفتاب، ثمینہ طاہر بٹ، بلال فیاض، جاوید راہی، ارم ناز، افتخار چوہدری اچھا لکھ رہے ہیں۔ باقی سب بھی بہت محنت کر رہے ہیں۔ کاشی بھیا آپ نے احوال کو ایک گلستان کی شکل دے دی ہے جس میں رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ آپ کے لیے بہت سی شاباش اور بہت سی دعائیں!

✤ پیارے عابد! 2015ء اور 2016ء میں بھی آپ کا ایک ایک تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا نام قطعاً اجنبی نہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ 2017ء میں بھی آپ کے واحد تبصرے نے ہیٹ ٹرک مکمل کی۔ پلیز عابد احوال میں اپنی آمد مستقل بنا لو بھائی۔ ہمارا مان رکھ لو۔

☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہمارے بہت پیارے بھائی قاسم خان بلوچ عرض گزار ہیں۔ احوال میں ایک بار پھر شرکت کر رہا ہوں اُمید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ تمام احوالیوں کو خلوص بھرا سلام۔ اس خط کی وجہ مختصر کہانی نمبر اور پلیٹ فارم نمبر ہے جس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ سرمد سلطان کھوسٹ کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ اریبہ نورین، بنت حوا، اسد بٹ، فصیحہ آصف خان نے بہت اچھا لکھا۔ دو پل کا ساتھ، شعلوں پہ رقص، نہلے پہ دہلا، نیلا دھوبی، ٹرین کب آئے گی۔ ابھی اتنا ہی پڑھ پایا ہوں باقی تبصرہ اگلے ماہ۔۔۔ کاشی بھائی سچی کہانیاں کو آپ نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا اللہ آپ کو مزید ہمت اور کامرانیاں دے (آمین)۔ اب اجازت دیں۔

✤ اچھے قاسم! خوش رہو، بھائی کہاں غائب ہو گئے ہو تم؟ تمہارے اس مختصر تبصرے میں تمہاری محبت کی خوشبو اسیر کر رہی ہے۔ اگلے ماہ ضرور تمہاری احوال میں آمد ہو۔ اسے تم بھلے سے ہمارا حکم سمجھو یا محبت۔

☆ گڑھی شاہو، لاہور سے احمد امتیاز کی بڑے غصے سے آمد ہو رہی ہے۔ لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں میں یہ دوسرا خط ہے۔ پچھلے ماہ بھی خط لکھا تھا مگر شائع نہیں ہوا، سوچا شاید آپ کو دیر سے ملا ہو، پلیٹ فارم نمبر کا سرِ ورق مجھے بے حد پسند آیا۔ ماڈل گرل خوبصورت انداز میں ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے دھیمی سی مسکان سجائے ہوئے تھی۔ سرمد سلطان کھوسٹ کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ کہانیوں میں حمیرا خان کے نواب کی پہلی قسط اچھی لگی۔ جاوید راہی کی پلیٹ فارم سے جیل تک پسند آئی۔ بلال فیاض نے رشتوں کے ساتھ ساتھ کو اپنے خوبصورت اندازِ تحریر کے ساتھ پیش کیا۔ نسیم سحر کا درست فیصلہ ہمیں بھی اچھا لگا۔ وقاص حسین کی کہانی اور ممتاز احمد کی کہانی بھی زبردست رہی۔ ثمینہ فیاض اور حنا بشریٰ کی تحریروں کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ہائیڈ پارک میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اس میں ہر ماہ زبردست انتخابات ہوتے ہیں۔ کاشی بھیا آپ سے گزارش ہے کہ پلیز پلیز اس ماہ میرا خط ضرور شائع کرنا۔ مجھے بہت خواہش ہے کہ میں اپنے پسندیدہ ماہنامہ میں اپنا نام دیکھوں اور خط شائع ہوتا دیکھوں۔ اجازت دیں۔ خدا حافظ۔

✤ پیارے سے احمد! یقین جانو ہمیں تمہارا یہی خط ملا ہے اور ہم اسے شائع کر رہے ہیں۔ خوش آمدید! اب تو خوش ہونا!

☆ننکانہ صاحب سے یہ آمد ہو رہی ہے جمیل رضا کی، لکھتے ہیں۔ ڈیئر کاشی چوہان! سب سے پہلے اسلام علیکم آپ کے لیے اور آپ کے پورے اسٹاف کے لیے۔اس سے پہلے میں نے کسی بھی رسالے میں خط نہیں لکھا اور نہ ہی مجھے رسالے میں خط لکھنے کا طریقہ آتا ہے۔پلیز میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو اپنے رسالے میں جگہ دیں۔مہربانی ہو گی۔جون 2017 کے شمارے میں مجھے اریبہ نورین، بنت حوا، بلال فیاض، عاطر شاہین، ثمینہ فیاض، جاوید راہی، شیخ معظم الٰہی اور نسیم سکینہ صدف کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔اس کے علاوہ فیصل ندیم بھٹی، حنا بشریٰ، دستگیر شہزاد، طارق محمود آکاش کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔کاشی جی! مہربانی فرما کر میرا خط شائع کریں تاکہ میں دوبارہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر سکوں۔نوازش ہو گی۔شکریہ۔

🙞لو بھائی جمیل رضا! اب خوش ہو ناں......اب جلد از جلد اپنی رائے کا اظہار کرنا۔

☆صباحت شفیق، لاہور سے لکھتی ہیں۔جون کا شمارہ ہاتھ آیا تو خوبصورت سرِورق دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ٹائیٹل کا معیار بہتر سے بہترین ہوتا جا رہا ہے۔احوال کا آغاز انتہائی خوبصورت انداز میں آپ نے ہمیشہ کی طرح کیا۔عظمیٰ شکور صاحبہ، ممتاز احمد صاحب، سید ملازم حسین شیرازی صاحب، ثمینہ طاہر بٹ صاحبہ کے خطوط زبردست رہے۔جدائی، ایمیزون، تمہیں اجازت ہے، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، میں اور پلیٹ فارم بہترین تحریریں تھیں۔حمیرا خان کا ناول متاثر کن رہا۔ہائیڈ پارک کے علاوہ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔

🙞پیاری بہن! تبصرے کا شکریہ۔تمام مصنفین تک آپ کی رائے پہنچا دی گئی ہے۔

☆سیالکوٹ سے ہماری بہن رقیہ یوسف کی احوال میں آمد ہے، لکھتی ہیں کاشی سر! کیسے ہیں؟ خدا آپ کو ہر مصیبت سے بچائے اور آپ کی زندگی میں سدا خوشیوں کی برسات رہے۔ماشاء اللہ بہت ترقی کر رہے ہیں اور بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔سر آپ کی ردی کی ٹوکری واحد ہو گی جس میں صرف وہی کہانیاں ہوں گی جو واقعی قابلِ اشاعت نہیں ہوتی ہیں کیونکہ آپ نے ہر کسی کو موقع دیا ہے اور ہر کسی کو قلم اٹھانے کا حوصلہ دیا ہے۔میں آپ کے بارے میں بالکل نہیں کہوں گی کہ آپ نے فلاں کہانی نہیں لگائی کیونکہ وہ واقعی اس قابل نہیں ہو گی۔آج پورے پاکستان میں سچی کہانیاں کی دھوم ہے۔جو لوگ رسالے نہیں پڑھتے وہ بھی سچی کہانیاں ضرور پڑھتے ہیں۔بلکہ میں نے تو تمام رسائل کو چھوڑ کر سچی کہانیاں کو اپنا لیا ہے۔ہر ماہ بہت بے تابی سے منتظر رہتی ہوں۔احوال میں آپ کے شوخ و شریر جملے بہت محظوظ کرتے ہیں۔اللہ آپ کو جزا دے!

🙞اچھی بہن! ہمیشہ کی طرح اپنی بات کی اور مزے کی بات یہ کہ بہت مزے کی باتیں کیں اور بس! اگلے ماہ پرچے پر تبصرہ ہونا چاہیے۔ورنہ یہ بھائی ناراض ہو جائے گا۔

☆اسلام آباد سے ہماری گڑیا بہن نور العین لکھتی ہیں۔بہت بہت سلام اور دعا۔رمضان کریم کی مبارکباد۔اللہ رمضان کریم کے صدقے میں تمام امتِ مسلمہ کو بخش دے (آمین)۔اداریہ بہت خوب تھا۔سرِورق نے میلہ لوٹ لیا۔احوال کا آغاز آپ نے ہمیشہ کی طرح بہت خوبصورت انداز میں کیا۔آپ کی نظم بھی بہت خوب تھی۔سرمد سلطان کھوسٹ سے بات چیت اچھی رہی۔مہتاب خان، ممتاز احمد، نسیم سحر، اریبہ نورین، بنت حوا، بلال فیاض، ثمینہ طاہر بٹ کی کہانیاں مجھے زیادہ اچھی لگی ہیں۔موضوع کے اعتبار سے دو پل کا ساتھ، صبح کا ستارہ، نیلا دھوبی، بزنس کلاس کا سفر، اپنا خون بھی متاثر کن رہیں۔جون کا پرچہ بہت دلفریب رہا۔ہائیڈ پارک سمیت تمام سلسلے اچھے تھے۔اب اجازت دیں۔

🙞پیاری گڑیا! خوش رہو! تبصرے کا شکریہ۔اگلے ماہ تمہاری آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ہڈالی، خوشاب سے ہمارے بھائی نعیم اللہ کی آمد ہے، لکھتے ہیں۔سب سے پہلے تمام پڑھنے والوں کی خدمت میں رمضان کریم کی مبارکباد۔جون کا شمارہ انتہائی خوبصورت سرِورق سمیت دل کو بھا گیا۔کاشی جی پرچے کی جتنی

پراسرار کہانی نمبر2

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

تعریف کروں کم ہے ویلڈن۔ بلال فیاض، عمران مظہر، ممتاز احمد، فیصل ندیم بھٹی، نظر علی برمانی، عبدالعزیز یافث کے خطوط جاندار تھے۔ کہانیوں کی لمبی فہرست ہے سب نے اچھا لکھا مگر چند کہانیوں نے زیادہ متاثر کیا۔ چنے کرارے، درست فیصلہ، راستے ایک ہوئے، صبح کا ستارہ، میں اور پلیٹ فارم، ایمیزون ان تحریروں کے رائیٹرز کو بہت مبارکباد بہت اچھا اور سچا لکھا۔ خانقاہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش سب کا سب زبردست رہا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ ہر کام میں محنت اور خلوص شامل ہو تو کامیابی جلد قدم چومتی ہے۔ کاشی صاحب آپ کے خلوص و محنت نے کتنے قلیل عرصے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھ دیے ہیں۔ سدا خوش رہیں۔

❀ پیارے نعیم! یقین کرو ہماری بڑی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے تمام لکھاری قلم برادری میں اچھے نام سے پکارے جائیں۔ تم نے تو اتنا انتظار کروانا شروع کر دیا ہے کہ کیا کہیں۔ دل برداشتہ نہ ہوا کرو۔ تم بھی اپنی محنت سے اپنے نام کے جھنڈے گاڑھ دو یار!

☆ سرگودھا سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن صائمہ بشیر کی۔ لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں کا معیار دن بدن بہت بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شمارے کی کامیابی آپ کی محنت کا ثمر ہے۔ میرا خط لکھنے کا یہی مقصد تھا کہ آپ کی حوصلہ افزائی کروں۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ احوال کا آغاز بھی شاندار تھا۔ احمد عزیز، تحسین جونیجو، ممتاز احمد، ملازم حسین شیرازی، فاطمہ لودھی، ثمینہ طاہر بٹ کے خطوط زبردست تھے۔ ایم اے راحت مرحوم کے لیے بخشش اور مغفرت کی دعائیں۔ حمیرا خان کا ناول زبردست تھا۔ اگر میں دروازہ نہ کھولتا، بہت دیر کر دی، خودداری، قید سے رہائی اچھی تحریریں تھیں۔ مجموعی طور پر پلیٹ فارم بہت بہت زبردست تھا۔ دعا ہے اللہ سچی کہانیاں کو اسی طرح ترقی عطا فرمائے جس طرح آپ نے محنت کی ہے۔ اب اجازت اللہ حافظ۔

❀ پیاری بہن! آپ کی طبیعت کا سنا تھا۔ دل سے دعا ہے کہ خدا آپ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے (آمین) احوال میں آپ کی آمد نے محظوظ کیا۔ احوال میں آپ کی آمد مہمیز کرتی ہے۔ خوش رہیے۔

☆ کراچی سے یہ آمد ہے عمر العطاس کی، لکھتے ہیں۔ میں سچی کہانیاں کا ایک خاموش قاری ہوں۔ کبھی خط لکھنے کا خیال نہیں آیا مگر سچی کہانیاں کمال پہ کمال ہی کیے جا رہا ہے۔ ابھی عشق نمبر کے سحر سے آزاد نہیں ہوئے تھے کہ مختصر کہانی نمبر نے چونکا کر رکھ دیا اور دل بے اختیار کہہ اٹھا۔ ویلڈن کاشی چوہان ویلڈن۔ ایک سے بڑھ کر ایک تحریر تھی۔ اب پلیٹ فارم نمبر دیکھ کر دل جھوم اُٹھا۔ کیا ٹائیٹل ہیں کیا کہانیاں ہیں۔ شمارے کو چار چاند لگا دیے۔ آپ کی باتوں نے مجھے آپ کا اسیر کر دیا ہے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلتی ہیں آپ کے لیے کہ آپ سدا مسکراتے رہیں اور سلامت رہیں ایسے چُن چُن کر رائیٹرز لاتے ہیں کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ہر تحریر شاندار تھی۔ اب اجازت اللہ حافظ۔

❀ پیارے عمر! اتنا شور مچا کر کہتے ہو کہ خاموش قاری ہوں! بھیا اکثر تمہاری بھیجی چیزیں ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں قاری پڑھتے ہیں تو یہ دبنگ انٹری تو بہت پہلے سے ہے آپ کی...... اب اگلے ماہ بھی ایسی ہی دبنگ انٹری دینا۔

☆ باغبانپورہ، لاہور سے یہ پہلی آمد ہے وسیم اللہ فریدی کی، لکھتے ہیں۔ میری طرف سے آپ کو اور تمام رائیٹرز کو ماہ رمضان بہت بہت مبارک ہو۔ پر جیسے جیسے سچی کہانیاں شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا ہے ویسے ویسے لیٹ بھی بہت ملنے لگا ہے۔ ہر ماہ کی آٹھ یا دس تاریخ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد ہی پرچے کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔ سر اس شکایت پر ذرا غور کیجیے گا۔ (اب لیٹ نہیں ہوگا! خوش)

ٹائیٹل بے حد حسین تھا۔ سخت گرمی کے موسم میں اتنا حسین ٹائیٹل دیکھ کر طبیعت فریش ہو گئی۔ تحریروں میں ایمیزون، جدائی، رستوں کے ساتھ ساتھ، چنے کرارے، بہترین تھیں۔ ممتاز احمد صاحب تو میرے فیورٹ رائیٹر ہیں۔ درست فیصلہ، تمہیں اجازت ہے، ہم کہ ٹھہرے اجنبی کمال تحریریں تھیں۔ حنا بشریٰ کی تحریر غم زدہ کر گئی۔ مجید احمد جائی نے

سانحہ ارتحال

پاکستان ٹیلی ویژن کا نمایاں نام، علی رضوی رضائے الٰہی سے گزشتہ ماہ زمیں کا رزق ہوئے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ ہے۔ مرحوم کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

خوب لکھا۔ ابھی بس اتنا ہی پڑھ سکا کیونکہ رمضان کی مصروفیت تھی۔ اس لیے تبصرے سے معذرت۔ خطوط میں عظمیٰ شکور صاحبہ کا تبصرہ دلچسپ رہا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ احوال میں پھر آپ سے ملاقات ہوگی۔

پیارے وسیم! تبصرہ بہت پیارا کیا تم نے۔ خوش آمدید! اگلے ماہ تمہاری آمد کا دل سے انتظار رہے گا۔

☆ ملتان سے یہ آمد ہے ہمارے بہت پیارے لکھاری ساتھی بلال فیاض کی لکھتے ہیں۔ جون 2017 کا شمارہ پلیٹ فارم نمبر کی صورت میں بے حد خوبصورت سرِ ورق کے ساتھ ملا۔ پلیٹ فارم نمبر میں کہانیوں کا انتخاب اتنا شاندار تھا کہ دل خوش ہوگیا۔ یقیناً آپ مبارکباد کے حق دار ہیں۔ سچی کہانیاں کا ہر شمارہ پچھلے شمارے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے منزہ سہام کا اداریہ التجا پڑھا جو حقیقت پر مبنی لگا۔ احوال کی ابتدا کی گپ شپ مجھے ہمیشہ ہی بہت اچھی لگتی ہے۔ تمام دوستوں نے شاندار تبصرہ کیا۔ آپ کی نظم فریاد سیدھا دل میں اتر گئی۔ اریبہ نورین کی چنے کرارے، بنت حوا کی بوجھ، اسد بٹ کی تحریر ہیرو سے قلی تک، فصیحہ آصف کی آخری بیٹا، طاہر محمود بٹ کی خودداری واقعی پلیٹ فارم نمبر کی منفرد تحریریں تھیں۔ ثمینہ طاہر بٹ کی قید سے رہائی اچھی کہانی تھی۔ ممتاز بھائی جدائی، افتخار چوہدری کی ایمیزون، اور نسیم سحر کی درست فیصلہ اچھی لگیں۔ مہتاب خان کی تمہیں اجازت ہے، فیصل ندیم کی ہم کہ ٹھہرے اجنبی اور ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی ٹرین بیتی راستے ایک ہوئے بھی قابلِ تعریف ہیں۔ پلیٹ فارم نمبر کی تین شعلہ ساماں کہانیوں نے دل جیت لیا۔ شعلوں پہ رقص حنا بشریٰ، عبدالعزیز یافث کی تحریر بہت دیر کردی اور سید محمود حسن کی تحریر اپنا خون بھی کافی اچھی کہانیاں تھیں۔ دونوں خاص طویل کہانیاں مگر زبردست تھیں۔ ویلڈن جاوید راہی اینڈ وقاص حسین۔ نواب کی پہلی قسط اچھی رہی۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ خانقاہ ٹھیک جا رہی ہے۔ تیر نیم کش میں منشی محمد عزیز، آپی رضوانہ کوثر، شعبان کھوسہ اور ایم افضل آزاد کا انتخاب اچھا تھا۔ ڈی خان ہائیڈ پارک کو ہر ماہ بڑی محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ سب کا انتخاب پڑھنے کے لائق تھا۔ خط کافی لمبا ہوگیا ہے۔ کاشی بھائی اب اجازت دیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ منزہ سہام اور آپ کے باقی اسٹاف کو بھی سلام۔ دعا گو اور دعاؤں کا طالب۔

بہت اچھے بلال! تمہارا خط گو کہ طویل ہوگیا مگر زبردست رہا۔ اتنی مصروفیت میں سے ہمارے لیے وقت نکالا، ہمارے لیے یہ محبت انمول ہے۔ خوش رہو۔

☆ ترنڈہ سرائے خان، رحیم یار خان سے یہ آمد ہے ہماری نئی لکھاری ساتھی اریبہ نورین کی، لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا! کیسے ہیں آپ؟ آپ تو بہت بہت اچھے ہیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ سب کا اتنا خیال رکھنے والے ہیں پہلے ہی اپنا خط اور کہانی آپ کو بھیج دیتی۔ خیر دیر آید پر درست آید۔ آپ نے میری کہانی شائع کی میرے خط کو احوال میں بھی جگہ دی۔ بہت اچھا لگا کہ آپ نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ اور اگر بات کروں رسالے کی تو بھیا صحیح بات ہے کہ یہ پلیٹ فارم نمبر تو مختصر نمبر سے بھی آگے نکل گیا۔ آپ کیسے کر لیتے ہیں یہ سب اتنا کچھ، اتنا عمدہ، اتنا اچھا۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ تو آئیں احوال میں چلتے ہیں۔ کیا ہی زبردست شمارہ تھا ماہ جون کا۔ پڑھ کر بہت لطف آیا۔ سرِ ورق بہت اچھا اور کہانیوں کا انتخاب بہترین تھا۔ آخری بیٹا، خودداری، بوجھ، ہیرو سے قلی تک سچ میں کمال تحریریں تھیں۔ ثمینہ طاہر بٹ کی قید سے رہائی بہت ہی عمدہ لو سٹوری

تھی۔ مجھے قید سے رہائی زیادہ پسند آئی۔ اینڈ بھی بہت اچھا لگا۔ دل یہی چاہ رہا تھا کہ فریدہ جو کہ مراد کی پری حور سب کچھ تھی اسے اس کی محبت مل جائے۔ اور دونوں ٹرین میں سوار ہو کر کہیں دور اپنا گھر بسا لیں اور ہنسی خوشی زندگی گزاریں۔ جدائی، ایمیزون، درست فیصلہ بھی مجھے بہت اچھی لگیں۔ ایمیزون کیا ہی نٹ کھٹ کہانی تھی۔ ایمیزون کافی مزاحیہ اور معلوماتی لگی۔ تمہیں اجازت ہے، ہم کہ ٹھہرے اجنبی اور راستے ایک ہوئے بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ شعلہ ساماں کہانیوں نیبھی لطف دوبالا کر دیا۔ شعلوں پہ رقص، بہت دیر کر دی اور اپنا خون یہ تین کہانیاں واقعی شعلوں سے کم نہیں تھیں۔ انسان کو سوچنے پر مجبور کر دینے والی کہانیاں تھیں۔ سب سے زیادہ حقیقت سے بھرپور کہانی عبدالعزیز یافث کی بہت دیر کر دی لگی۔ اس کہانی میں ان لوگوں کے لیے بہت ہی اچھا سبق ہے جو دوسروں کی عزتوں سے کھیلتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ عزتیں تو ان کے اپنے گھروں میں بھی موجود ہیں۔ محافظ بنیں، سچے محافظ بنیں اور دیر مت کریں۔ وقاص حسین نے بھی بہت خوب لکھا۔ کہانی میں تو واقعی نہلے پہ دہلا ہی ہوا۔ لیکن خوشی ہے کہ عائز کی دولت اس کے ہاتھوں میں واپس آ گئی۔ اب وہ بھی چین کی زندگی گزار سکے گا۔ حمیرا خان کا ناول نواب کی پہلی قسط اچھی لگی۔ اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے کیونکہ مجھے ناول اچھے لگتے ہیں۔ ہائیڈ پارک سمیت تیر نیم کش کے تمام انتخابات بہت اچھے تھے۔ اب اجازت دیں۔ میرے بی کام کے ٹیسٹ چل رہے ہیں۔ ان کی تیاری بھی کرنی ہے ورنہ امی جان سے بہت ڈانٹ پڑ جائے گی۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا کاشی بھیا۔ ہر ماہ حاضر ہونے کی بھرپور کوشش کروں گی۔ خدا حافظ۔

⁂ پیاری اریبہ! تم نے تو چھنے کرارے لکھ کر زبردست انٹری دے دی تھی اور اب اس بار اپنے تبصرے میں بھی اپنی اہمیت کا احساس دلا دیا۔ پیاری گڑیا! خدا تمہیں ہر امتحان میں کامیاب کرے (آمین)۔ ہر ماہ احوال میں حاضر ہونا ہے، یہ ہمارا حکم سمجھ لو گڑیا۔

☆ منڈی بہاؤالدین سے ہماری پیاری قاری تنزیلہ عرف تانی کی آمد ہے، لکھتی ہیں۔ تمام قارئین کی خدمت میں عیدالفطر کی بہت بہت مبارکباد۔ ماہ جون کا پلیٹ فارم نمبر کافی لیٹ 8 تاریخ کو مارکیٹ سے ملا۔ مجموعی طور پر بہت اچھا شمارہ تھا۔ میری طرف سے اتنا اچھا شمارہ نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ بوجھ، ہیرو سے قلی تک، خودداری، قید سے رہائی تک، جدائی اور درست فیصلہ اس شمارے کی خاص اور بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ راستے ایک ہوئے، اور ہم کہ ٹھہرے اجنبی، ٹرین کب آئے گی اور بزنس کلاس کا سفر زیادہ پسند نہیں آئیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ انشاءاللہ اگلے ماہ حاضری ہو گی تب تک کے لیے اللہ حافظ۔

⁂ اچھی تانی! خوش رہو۔ پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ تبصرے کے لیے شکریہ!

☆ سرائے عالمگیر سے یہ پہلی آمد ہے طاہر نوید کی لکھتے ہیں۔ میں سچی کہانیاں ہر ماہ بڑے شوق سے لے کر پڑھتا ہوں۔ پچھلے ماہ مختصر کہانی نمبر بہت اچھا لگا۔ پچاس سے زائد کہانیاں تو بہت ہی شاندار ہیں۔ اسی طرح ماہ جون کا پلیٹ فارم نمبر بھی بہت اچھا شمارہ رہا۔ شائع شدہ کہانیوں کا اچھا رسپونس تھا۔ اسد بٹ کی ہیرو سے قلی تک، طاہر محمود بٹ کی خودداری، ثمینہ طاہر بٹ کی قید سے رہائی تک، ممتاز احمد کی جدائی اور افتخار چوہدری کی ایمیزون بہت ہی اچھی اور زبردست کہانیاں تھیں۔ بہت پسند آئیں۔ پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے تو اجازت چاہتا ہوں۔

⁂ پیارے بھائی! خوش آمدید! آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ مگر یہ خوشی ہمیں ہر ماہ چاہیے۔

☆ کمالیہ سے ہماری شاعرہ ساتھی عمارہ ناز کی بڑی دنوں بعد آمد، لکھتی ہیں۔ ڈیئر کاشی اسلام علیکم۔ ماہ مئی کا مختصر کہانی نمبر 12 مئی کو کمالیہ سے ملا۔ واہ واہ جی کیا کہنے کیا زبردست اور کمال کا پرچہ تھا۔ بہت اچھا لگا اور بہت پسند آیا۔ میں نے شروع سے آخر تک سارا پرچہ پڑھا۔ سب کہانیاں بہت اچھی تھیں خاص طور پر اقبال بانو کی ہیر اور تیرے سنگ رہنا، جاوید راہی اور ممتاز احمد کی کہانیں اور ارم ناز کی گھر کا نہ گھاٹ کا اور حنا بشریٰ کی اتھری گھوڑی تو بہت ہی لاجواب اور

بے مثال کہانیاں تھیں۔ ماہ جون کا پلیٹ فارم نمبر 10 تاریخ کو ملا۔ ابھی چند ایک کہانیاں پڑھی ہیں ان میں ہیرو سے قلی تک، خودداری، قید سے رہائی تک اور جدائی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ اللہ حافظ۔

پیاری لڑکی! یہ تم غائب کہاں ہو جاتی ہو، کوئی غزل، نظم اتنے ماہ سے ہمارے پاس کیوں نہیں آئی؟ اب بھی بس تبصرہ......چلو کوئی بات نہیں، اگلے ماہ ضرور بھیجنا۔

☆سرگودھا سے یہ آمد ہے ہمارے ہر دلعزیز بھائی ممتاز احمد کی، لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی اسلام علیکم۔ اپنے خط کی ابتداء اس دعا سے کرتا ہوں کہ پوری کائنات کا مالک ہم سب کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ آمین۔ ماہ جون کا پلیٹ فارم نمبر ؟ تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائیٹل انتہائی جاذب نظر اور دلکش تھا۔ التجا کے عنوان سے منزہ سہام نے پی آئی اے کے طیارے سے ہیتھرو ائیر پورٹ پر ہیروئین کی برآمدگی کے حوالہ سے خوبصورت اداریہ لکھا۔ اللہ کریم سبز ہلالی پرچم کی حرمت کو سدا سلامت رکھے آمین۔ ماشاء اللہ اس بار احوال میں کافی رونق تھی احوالیوں کے خطوط سے جگمگا رہا تھا۔ جی الحمد للہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوا۔ جن بہن بھائیوں نے بیٹی کی شادی کی مبارکباد دی ان سب کا بہت بہت شکریہ۔ سب سے پہلے سرمد سلطان کھوسٹ کا انٹرویو پڑھا جو کہ بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں چنے کرارے، بوجھ، ہیرو سے قلی تک، خودداری اچھی کہانیاں تھیں۔ قید سے رہائی تک ثمینہ طاہر بٹ کی بہت اچھی اور لازوال کہانی لگی۔ ویلڈن۔ ایمیزون ایک اچھوتی اور منفرد کہانی تھی۔ درست فیصلہ، دو پل کا ساتھ، تمہیں اجازت ہے، بہت دیر کر دی، اپنا خون، رستوں کے ساتھ ساتھ اور صبح کا ستارہ بہترین کہانیاں تھیں۔ مجید احمد جائی کی میں اور پلیٹ فارم تھرل سے بھرپور مزیدار کہانی تھی۔ احوال کے آخر میں کاشی بھائی کی نظم فریاد بہت عمدہ تھی۔ پسند آئی۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ والسلام۔

پیارے بھائی! سلامت رہیے۔ یہ آپ کا تبصرہ اتنا مختصر کیوں ہوتا جا رہا ہے، اس موسم میں تو سنا ہے چیزیں پھیلتی ہیں۔ (یہ سائنس کا اصول ہے، ہمارا نہیں) امید ہے اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ آمد ہوگی آپ کی۔

☆فیصل آباد سے ہماری بہن بشریٰ کنول عرض گزار ہیں۔ ماہ جون کا پلیٹ فارم نمبر اس بار کافی لیٹ 8 تاریخ کو ملا۔ ٹائیٹل خوبصورت تھا۔ سرمد سلطان کا انٹرویو اچھا لگا۔ چنے کرارے، بوجھ، ہیرو سے قلی تک، خودداری، قید سے رہائی تک، جدائی، درست فیصلہ، دو پل کا ساتھ اور، تمہیں اجازت ہے بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ راستے ایک ہوئے اور ہم کہ ٹھہرے اجنبی دونوں بور کہانیاں تھیں۔ پسند نہیں آئیں۔ میں اور پلیٹ فارم بہت اچھی کہانی تھی۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ۔

ارے ارے! لڑکی! باقی سب کو تو یہ کہانیاں بہت پسند آئیں۔ خیر رائے دینے کا سب کو حق ہے۔ تبصرہ اچھا لگا۔

☆غزالہ کرن، فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا! سلام مسنون۔ جی کیا حال چال ہیں سب کے۔ کیسی گزر رہی ہے؟ اس بار بھی شمارہ لیٹ موصول ہوا۔ جناب ایڈیٹر صاحب کوشش کیا کریں کہ شمارہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو مل جایا کرے۔ کیونکہ پہلے شمارے کو پڑھنا پھر اس پر تبصرہ کے لیے خط لکھنے میں ایک ہفتہ تو لگ ہی جاتا ہے۔ اس بار سلیکٹڈ کہانیاں پڑھی تھیں۔ بوجھ، ہیرو سے قلی تک، خودداری، قید سے رہائی تک، جدائی اور ایمیزون، پڑھی تھیں جو کہ بہت اچھی لگیں۔ راستے ایک ہوئے کہانی اور ہم کہ ٹھہرے اجنبی آپ نے کیسے لگا دی؟ اب تک کے لیے اتنا ہی۔ اب اجازت چاہوں گی۔

پیاری غزالہ! تبصرے کا شکریہ! امید ہے اب پرچہ لیٹ نہیں ہوگا۔

☆جاوید جتوئی، مظفر گڑھ سے لکھتے ہیں۔ پلیٹ فارم نمبر نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ٹائیٹل تو بہت ہی دلکش تھا۔ اداریہ پڑھا اچھا لگا۔ ویلڈن منزہ جی۔ کاشی چوہان! احوال کے اختتام پر آپ کی نظم میرے دل میں اتر گئی۔ مجھے آپ کی شاعری بے حد پسند ہے اور آپ کی شاعری کی کوئی کتاب ہے تو اس کو حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بتا دیں۔ مہربانی

ہو گی۔سرمد سلطان کھوسٹ واقعی فن کے سلطان ہیں۔چنے کرارے بہت زبردست کہانی تھی۔منفرد کہانیاں واقعی منفرد تھیں۔خاص کہانیوں میں وقاص حسین اور جاوید راہی نے کمال کر دیا۔حکایتوں میں بلال فیاض، دستگیر شہزاد، نسیم سکینہ صدف اور ثمینہ فیاض کی حکایتیں بہت پسند آئیں۔نیا قسط وار ناول نواب کے شروع ہونے پر حمیرا خان کو مبارکباد۔ایم اے راحت کے انتقال پر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔اللہ ان کی مغفرت کرے۔آمین۔

❁ پیارے جاوید! تمہاری محبت کے لیے الفاظ میرے پاس نہیں۔راحت بھائی کی وفات پر ہمارا بھی یہی حال ہے۔خدا ان کی مغفرت فرمائے (آمین)۔

☆ ملتان سے بڑے دنوں بعد احمر جاوید کی آمد ہوئی ہے، لکھتے ہیں۔پلیٹ فارم نمبر موصول ہوا۔ٹائیٹل خوبصورت تھا۔ماڈل گرل تو دل میں اتر گئی۔(ہاہاہاہا)۔رنگارنگ اشتہار کی باڑ پھلانگ کر اداریہ پڑھا جو کہ بہت پسند آیا۔اس کے بعد احوال میں داخل ہوئے۔تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔پڑھ کر بہت مزہ آیا۔فریاد ایک دل گداز نظم تھی۔کہانیوں میں اسد بٹ کی تحریر ہیرو سے قلی تک، طاہر محمود بٹ کی خودداری، ثمینہ طاہر بٹ کی قید سے رہائی بلال فیاض کی رستوں کے ساتھ ساتھ بہت پسند آئیں۔تیر نیم کش میں تنویر فاطمہ، عظمیٰ شکور، خضر حیات اور رضوانہ کوثر کے اشعار اچھے لگے۔

❁ اچھے احمر! اتنے دنوں بعد ائے اور اتنی مختصر آمد! اگلے ماہ تمہارا بھرپور تبصرہ ہو۔

☆ بے نظیر آباد سے ہمارے ساتھی اسماعیل بروہی کی آمد ہے۔لکھتے ہیں۔جناب ایڈیٹر سچی کہانیاں۔اسلام علیکم۔کیسے ہیں آپ۔گزشتہ بارہ سال سے سچی کہانیاں کا مستقل قاری ہوں۔آپ نے زبردست نمبرز نکالے ہیں۔مختصر کہانیاں نمبر، پلیٹ فارم نمبر، عشق نمبر، پراسرار نمبر، کس کس نمبر کی تعریف کی جائے۔میں اور بھی بہت سے ڈائجسٹ پڑھتا ہوں مگر نہ ایسا منفرد ماہنامہ پڑھا نہ کسی نے ایسے منفرد نمبر نکالے۔یہ آپ کی محنت ہے کہ آج سچی کہانیاں ہمارے دلوں پر راج کر رہا ہے۔دعا گو اور دعاؤں کا طالب۔

❁ پیارے اسماعیل! خوش رہو! اب طبیعت کیسی ہے اور یہ تمہاری محبت ہے جو ہم سے اچھا کام لیتی ہے۔

☆ ہڑپہ سے ہمارے دوست لکھاری معاویہ عنبر ونو کا برقی نامہ آیا ہے لکھتے ہیں۔سلام کاشی بھیا! سچی کہانیاں کا پلیٹ فارم نمبر بہت پیارے سرورق کے ساتھ ملا۔احوال پڑھ کر مزہ آ گیا۔کہانیوں میں ممتاز احمد کی جدائی، ثمینہ فیاض کی صبح کا ستارہ، بلال فیاض کی تحریر رستوں کے ساتھ ساتھ بہت پسند آئی۔اس کے علاوہ وقاص حسین کی کہانی نہلا پہ دہلا، شاہد رفیق کی کہانی نیلا دھوبی (منفرد نام)، دوپل کا ساتھ، تمہیں اجازت ہے اور راستے ایک ہوئے بہت اچھی کہانیاں تھیں۔کاشی بھیا! پلیز میرا خط ضرور شائع کریں۔گو کہ لیٹ ہو گیا ہوں۔

❁ پیارے معاویہ! سچ میں تمہاری آمد نے دل خوش کر دیا۔خوش رہو!

☆ دیپال پور سے یاسر وکی لکھتے ہیں۔سچی کہانیاں گزشتہ چھ برس سے پڑھ رہا ہوں۔اس دوران میں کافی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں مگر آپ نے تو سچی کہانیاں کو عروج دیا وہ با کمال ہے۔خدا اور ترقی دے۔کاشی جی! جون کے پلیٹ فارم نمبر کا ٹائیٹل مجھے تو بے حد پسند آیا۔اندرونی صفحات پر سرمد سلطان کھوسٹ کے بارے میں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔کہانیاں سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔نیا ناول کا نام ''نواب'' مجھے بے حد پسند آیا اور پہلی قسط بھی اچھی لگی۔دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔مستقل سلسلے تو ہوتے ہی پر بہار ہیں۔اچھی اچھی چیزیں تو میں اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کر لیتی ہوں۔آخر میں دعا ہے کہ خدا آپ کو مزید ہمت دے تاکہ آپ سچی کہانیاں کو بام عروج پر پہنچا دیں۔

❁ پیارے یاسر! اتنا عرصہ دور نہ رہا کرو بھائی۔جلد از جلد احوال میں اپنی آمد مستقل بنایا کرو۔

☆ چیچہ وطنی سے ہمارے بہت پیارے ساتھی عبدالغفار عابد شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں۔سچی کہانیاں کو جون 2017 کے شمارے کے ٹائیٹل نے دل موہ لیا۔اداریہ اچھا لگا۔احوال کی محفل میری پسندیدہ محفل ہے۔تمام خطوط اور ان

اگست 2017ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام:..

مکمل پتا:..

....

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اگست 2017ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی:.............................. تعداد صفحات:..............................

نام:..

مکمل پتا:..

....

فون/سیل نمبر:..

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اگست 2017ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان:.............................. مصنف:..............................

دوم، عنوان:.............................. مصنف:..............................

سوم، عنوان:.............................. مصنف:..............................

نام:.............................. شہر:..............................

کے جواب میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ اریبا نورین، سید ملازم حسین شیرازی، نظر علی برمانی، حنا بشریٰ، بلال فیاض، ثمینہ طاہر بٹ اور مور شاہد حسین کے خطوط بہت زبردست تھے۔ کہانیوں میں شعلوں پہ رقص حنا بشریٰ، رستوں کے ساتھ ساتھ بلال فیاض، ٹرین کب آئے گی نسیم سکینہ صدف کی، صبح کا ستارہ ثمینہ فیاض، پلیٹ فارم، سے جیل تک جاوید راہی اور افتخار چوہدری کی ایمیزون بہت پسند آئیں۔ سچی کہانیاں کا معیار دن بہ دن آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے آمین۔ اب اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔

پیارے غفار! تم آئے تو گویا اجالا سا ہی ہو گیا آتے رہا کرو تا کہ ہم بھی خوش رہ سکیں بھائی۔

☆ اسلام آباد سے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب! آداب اینڈ عید مبارک! سچی کہانیاں اپنی تمام حشر سامانیوں سمیت ملا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ رسالہ کھولا تو چکر ہی آ گیا۔ اب ظاہر ہے آتی جاتی ریل گاڑیاں سر گھمانے کو کافی تھیں جی تو پھر کیا کرتی۔ چپ چاپ میں بھی پلیٹ فارم میں خالی بینچ پر بیٹھ گئی۔ ویسے ایڈیٹر صاحب کمال نہیں کرتے آپ! آپ نے سب کو اس قدر محبت سے جوڑ رکھا ہے کہ اس کی مثال نہیں۔ قسم سے آپ اس قدر خلوص دل سے سب کو مخاطب کرتے ہیں کہ ہم قلم اٹھائے بنا رہ نہیں پاتے۔ گریٹ جی۔ یہ تو ہوگئی مکھن پالش میرا مطلب آپ کی مداح سرائی۔ تو پھر آتے ہیں واپس پلیٹ فارم کی طرف۔ حقیقت پوچھیں تو ٹرین کا سفر میرا من پسند ہے اور خاص کر اسٹیشن کی گرم گرم چائے۔ آتے جاتے اسٹیشنوں پر بکتے طرح طرح کے لوازمات۔ دل خوش ہو گیا۔ رسالہ پڑھ کر ایک لمحے کو یوں لگا کہ میں کراچی جا رہی ہوں مگر ہمیشہ کی طرح ٹرین لیٹ ہے اور آنکھوں میں سچی کہانیاں کی ساری ٹیم کو ملنے کے خواب۔ واہ ری عظمیٰ۔ اریبا نورین کی لکھی تحریر چنے کرارے زبردست کہانی تھی۔ ذہن پر گہرا اثر چھوڑ گئی۔ بوجھ بنت حوا کے قلم سے آزاد ہونے والی زندگی کی حقیقتیں رلا گئیں۔ ایک تو غربت کی چکی میں پستا انسان اور پھر لوگوں کے لگائے بہتان زندگی اجیرن کر دینے کو کافی ہیں۔ آنکھیں بھیگ گئیں اس معصوم شخص کی موت پر جو خود کو مار بیٹھا۔ آخری بیٹا فصیحہ آصف خان انتہائی جذبات، احساسات اور پھر غربت کی آگ جو کہ اپنے جگر گوشے کو خود سے الگ کر دینے پر مجبور کر گئی۔ اُف حد ہے۔ کہاں جائیں کیسے دور کریں معصوم، لاچار بے بس لوگوں کے دکھوں کو۔ جانے کب جاگیں گے لوگوں کے ضمیر اور جانے کب کھلے گی غفلت کی آنکھ۔ جوان معصوم لوگوں کو بھی دیکھ سکے۔ اللہ ان سب کا حامی و ناصر ہو۔ تمہیں اجازت ہے مہتاب خان کی تحریر۔ واہ کمال۔ کبھی کبھی کچھ غلط فہمیاں ہماری زندگی کے اہم اور قیمتی وقت کو کھا جاتی ہیں مگر جب غلط فہمیاں دور ہو جائیں تو کتنے فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی اُف فیصل ندیم بھئی کیا کر دیا یہ ہیرو نے! ہائے بیچارے کے غصے نے تباہ کر ڈالا۔ غصہ حرام ہے۔ تبھی تو کہا گیا ہے کہ انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور جب وہ حواس میں آتا ہے تو کچھ نہیں بچتا۔ غرض سچی کہانیاں کی ہر کہانی لاجواب ہے اور پھر ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش کے سلسلوں نے سچی کہانیاں کو مزید حسین بنا رکھا ہے۔ اوکے جی اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا۔ سچی کہانیاں کو میرا بہت سارا پیار۔

اچھی سی عظمیٰ! تم بھی اپنا خیال رکھو۔ ریڈیو پر ماشاء اللہ تمہارا پروگرام زبردست جا رہا ہے، خوش رہو۔

☆ بورڑی شریف سے ہماری ادی زرینہ جونیجو احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ پیارے کاشی بھیا اسلام علیکم! سلامتی کی دعاؤں کے سنگ۔ ناصر بھائی کی برسوں بعد واپسی ہے۔ ہم آپ کو دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ اللہ عزوجل آپ کو تندرست و سلامت رکھے آمین۔ سچی کہانیاں، کاشی بھیا، ناصر بھائی اور ہمارا ساتھ سدا قائم و دائم رہے گا انشاء اللہ۔ اور نظر علی برمانی! کیسے ہیں آپ؟ سدرہ جیسا بڑا فنکار کوئی نہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ مذاق نہیں اڑا رہی۔ مور شاہد صاحب آپ کی تحریریں بہت سبق آموز ہوتی ہیں۔ جگ جگ جئیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اس مرتبہ کتنی کہانیاں پڑھ پائی ہوں ان میں جدائی، درست فیصلہ، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، شعلوں پہ رقص، رستوں کے ساتھ ساتھ، ٹرین کب آئے گی، صبح کا ستارہ، میں اور پلیٹ فارم پسند آئیں۔ والسلام۔

✿اچھی ادی! سلامت رہیے۔آپ کا تبصرہ، محبت کا وہ استعارہ ہے جس کا بدل ممکن نہیں۔اپنا خیال رکھا کریں۔

☆چک 58 شمالی، سرگودھا سے بہت پیارے بھائی فیصل ندیم بھٹی کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ماہ جون کا سچی کہانیاں پلیٹ فارم نمبر تھوڑا لیٹ ملا۔ جناب کاشی بھیا اس سے پہلے عشق نمبر، پراسرار نمبر، مختصر کہانی نمبر اور اب پلیٹ فارم نمبر سچی کہانیاں کی مقبولیت اور کامیابی کا سہرا آپ سب کے سر ہے۔اس بار خطوط کی کثیر تعداد سے اس کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔منزہ سہام مرزا نے اپنے اداریہ التجاپی آئی اے میں سے ہیروئین کی برآمدگی کا ذکر کر رہی تھیں جو کہ ملک پاکستان کی بدنامی ہے۔اللہ تعالیٰ پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کو ہمیشہ بلند رکھے۔آمین۔احوال میں کاشی چوہان رمضان المبارک کے حوالے سے ایمان افروز باتیں بتا رہے تھے سب سے پہلے احوال میں ایک طویل عرصے کے بعد ارم خان کرسی صدارت پر براجمان ہوئیں۔نئے آنے والے تمام خواتین وحضرات کو احوال میں خوش آمدید جن میں ادیبہ سرفراز، اریبا نورین، میمونہ سجاد، شہزاد اقبال، عبدالعزیز یافث، طاہر علی ابڑو، احمد عزیز، فاطمہ لودھی، اسد اللہ۔سید ملازم شیرازی، اریبا نورین، عبدالعزیز یافث، نظر علی برمانی، حنا بشریٰ، ثمینہ طاہر بٹ، ممتاز احمد کے خطوط بہترین تھے۔ادیبہ سرفراز، تنزیلہ عرف تانی، غزالہ کرن۔شازیہ گل، منشی عزیز، فصیحہ آصف، مسز نوید ہاشمی کو سلام۔نمایاں شخصیات میں سرمد سلطان کھوسٹ کے بارے میں فن کی اور ذاتی زندگی کے متعلق بہت پتا چلا۔پاکستان کے بہترین اداکاروں میں شمار ہوتا ہے اور ڈائریکٹر دنیا میں بھی منفرد نام ہے۔اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔پہلی کہانی ہماری نئی لکھاری اریبا نورین صاحبہ۔چنے کرارے لے کر آئیں۔ایمان افروز کہانی ہے۔اگر انسان اللہ تعالیٰ پر یقین کامل کرے تو کبھی مایوس نہیں ہوتا۔زبردست کہانی ہے۔بوجھ بنت حوا۔مجبوری کی وجہ سے شادیاں زیادہ تر کامیاب نہیں ہوتیں۔ہیرو سے قلی تک اسد بٹ۔ایک طویل جدائی کے بعد ملن قسمت کا کھیل ہے۔آخری بیٹا فصیحہ آصف۔غربت سے مجبور قلی کی دردناک کہانی دلوں کو ہلا دینے والی تحریر تھی۔خودداری طاہر بٹ، زبردست کہانی۔بے شک خوددار لوگ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔اللہ تعالیٰ ان کے مسائل کے حل کے خود ہی اسباب پیدا فرما دیتا ہے۔ثمینہ طاہر بٹ قید سے رہائی تک۔شاہ جی کا بیٹی کو قید بے جا میں رکھنا نتیجہ خود رہائی راستے کھول لیتی ہے۔جدائی ممتاز احمد۔زبردست کہانی ہے۔سندر ملن کے بعد اچانک جدائی زندگی بھر کا روگ لگا گئی۔درست فیصلہ نسیم سحر اچھی کہانی ہے۔میں اور پلیٹ فارم محبت اور خوشیوں سے جڑی بہترین مختصر کہانی ہے۔تمام اسٹاف اور ٹیم کا سلام۔والسلام۔

✿پیارے فیصل! تبصرہ جاندار اور بھرپور تھا، ہر ماہ پابندی سے تبصرہ کرتے رہو۔

☆رحیم یار خان سے یہ آمد ہے ہمارے بہت پیارے لکھاری اور دوست وقاص حسین کی، لکھتے ہیں۔ماہ جون کا شمارہ کافی دیر سے ملا یہ شکوہ رہے گا آپ سے۔خیر پلیٹ فارم نمبر ہاتھ لگا، دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں، آنکھوں نے زبردست کہانیوں کے مجموعے سے بھرپور لطف اٹھایا اور ہاتھوں نے جھوم کر قلم اٹھایا اور ہم نے خط لکھ ڈالا۔لاہور سے واپسی تو چوتھے روزے ہی کو ہوگئی تھی لیکن گھر آتے ہی گرمی نے اپنا کام کر دکھایا اور بخار نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔کافی دن یہ سلسلہ چلا لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ طبیعت بحال ہوگئی ہے۔کاشی بھائی ناصر رضا صاحب کا سنا ہے کہ وہ آ رہے ہیں کیا آپ جا رہے ہیں؟ یا آپ بھی ان کے ساتھ مل کر کام کریں گے؟ کہانیوں کی طرف آئیں تو ابھی بس چند ایک کہانیاں ہی پڑھ پایا ہوں جن میں چنے کرارے ایک نئی رائیٹر کی لکھی ہوئی کہانی بڑی زبردست رہی۔قید سے رہائی تک بھی بہت کمال کہانی تھی۔ہم کہ ٹھہرے اجنبی مجھے تو بہت اچھی لگی ہے اور اسی طرح راستے ایک ہوئے پروفیسر کی آپ بیتی بھی بہترین کہانیوں میں سے ایک تھی۔ہر کہانی لکھنے والے نے خوب محنت کی تھی۔کوئی بھی ایسی کہانی نہ تھی جو بے مقصد اور فالتو ہو۔سب کی سب بہت اچھی تھیں۔ایمیزون، دو پل کا ساتھ، تمہیں اجازت ہے، اگر میں دروازہ نہ کھولتا، بہت دیر کر

سانحہ ارتحال

ہماری لکھاری ساتھی غزالہ جلیل راؤ اور نبیلہ نازش راؤ کی والدہ گزشتہ ماہ وفات پا گئیں۔ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

دی، نیلا دھوبی اور احسان عظیم بہت ہی اچھی کہانیاں تھیں۔اپنی طرز کی منفرد کہانیاں تھیں ان میں کوئی روایتی پن نہیں تھا۔کمال کہانیاں تھیں اور لکھنے والوں نے واقعی بہت محنت کرتے ہوئے کہانی لکھنے کا حق ادا کیا۔باقی دوسری کہانیاں بھی پسند آئیں۔ہائیڈ پارک کے ساتھ تمام سلسلے بہت اچھے رہے۔مجموعی طور پر پلیٹ فارم نمبر بھی بہت اچھا شمارہ تھا۔

٭ پیارے وقاص! تمہاری طبیعت کے ذکر نے دل اداس کیا۔اللہ نظر بد سے بچائے تمہیں۔تبصرہ بہت اچھا لگا تمہارا۔

☆ بورڑی شریف سے یہ آمد ہے ہماری گڑیا تحسین جونیجو کی۔لکھتی ہیں۔اچھے بھیا کاشی اسلام علیکم! غضب ناک گرمی کے مزے ہیں ساتھیو! ماہ صیام بھی اپنی رحمتوں کے سائے میں سرکتا جا رہا ہے۔اللہ پاک ہمیں اس کی برکتیں سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین ثم آمین۔آنے والی عید الفطر تمام قارئین کو بہت بہت مبارک ہو۔واقعی عید کی خوشی دوبالا ہوگئی یہ جان کر کہ ہمارے ناصر انکل کی دوبارہ آمد ہے جو کہ ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔اللہ پاک ناصر انکل کو صحت یاب زندگی عطا فرمائے۔نظر علی برمانی بھائی سندھ سے پنجاب جانے والے ہم ہی لوگ ہیں۔سدرہ نے اپنی بیماری اور آپریشن کا ڈرامہ رچایا تھا جو کہ ہمیں پنجاب جھنگ جا کر پتہ چلا اور یہی جاننے کے لیے ہم پنجاب گئے تھے۔اور اچھا ہی ہوا کہ ہم وہاں گئے ورنہ یہ ڈرامہ Star Plus کا ڈرامہ بن جاتا جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔مور شاہد بھائی بہت جلد آپ میری تحریر پڑھ پائیں گے انشاء اللہ سلامتی ہو۔فاطمہ لودھی، طاہر علی ابڑو، فصیحہ بٹ، احمد عزیز محفل احوال میں خوش آمدید۔(فریاد) کاشی بھائی بہت عمدہ ہے۔شمارہ لیٹ ملنے کی وجہ سے بس اتنا تبصرہ ہی کرسکوں گی کہ کہانیوں میں چنے کرارے، آخری بیٹا، جدائی، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، میں اور پلیٹ فارم، نہلے پہ دہلا، پلیٹ فارم سے جیل تک بہترین کہانیاں تھیں۔

٭ اچھی گڑیا! تم نے جتنا تبصرہ کیا، بہت اچھا کیا۔تمہاری محبت کے لیے واقعی میرے پاس الفاظ نہیں۔

☆ ملتان شریف سے ہماری پیاری بہن صائمہ مجید کی آمد ہے۔لکھتی ہیں۔سچی کہانیاں اور سچی کہانیاں کے ساتھ جڑے ہر فرد کو عید سعید کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں۔بس ہمیں چاہیے کہ یہ خوشیاں پھیلائیں، اپنے اردگرد ہمارے منتظر لوگوں کو بھی ان خوشیوں میں شامل ضرور کریں۔کاشی بھائی کیسے ہیں آپ؟ آپ کا سلام و دعا مجھ تک پہنچ گئیں۔اللہ تعالیٰ ایسے بھائی ہر بہن کو دے۔بھیا گزشتہ دنوں ہم موٹر سائیکل سے گر گئے تھے، ماہ صیام کے شروع کے روزے چھوٹ گئے۔اب روزے رکھ رہے ہیں اور ماہ صیام کی مہمان نوازی کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے آمین۔کاشی بھائی، ہر نماز میں، ہر سحری و افطاری میں آپ کے لئے خصوصی دُعائیں ہوتی ہیں، میرے ماں باپ نہیں ہے لیکن باپ جیسا بھائی، اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔کاشی بھیا، اس بہن کا مان کبھی نہ ٹوٹے، بس اتنی گزارش ہے۔سلامت رہیں تا قیامت رہیں۔سچی کہانیاں ریگولر پڑھتی ہوں، تبصرہ لیٹ ہو جاتا ہے، میاں صاحب کے ایگزام ہو رہے ہیں، اُن کی خدمت کچھ زیادہ ہی کرنی پڑتی ہے۔ادار یہ پڑھتے احوال میں پہنچی جہاں آپ کی باتیں بہت پسند آئیں۔میں آپ کی باتیں، کی ڈائری بنا رہی ہوں، پھر اس کو کتاب بنالوں گی۔میرے لیے یہی قیمتی اثاثہ ہیں۔احوالی ساتھیوں کیسے ہیں سب؟ میں کچھ عرصہ غائب ہوئی کسی نے پکارا تک نہیں۔کتنے پتھر دل ہو؟ کہانیوں میں ٹرین کب آئے گی، اگر میں دروازہ نہ

کھولنا، احسان عظیم، نواب، پلیٹ فارم سے جیل تک، صبح کا ستارہ، بہت دیر کر دی، اپنا خون، رستوں کے ساتھ ساتھ، شعلوں پہ رقص، راستے ایک ہوئے، درست فیصلہ، دو پل کا ساتھ، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، بزنس کلاس کا سفر، آخری بیٹا، خودداری، خوب رہیں۔ الحمدللہ! میرے ملتان سے چار کہانیاں شامل تھیں۔ دل خوش ہو گیا۔ پلیٹ فارم کے شہنشاہ انکل ممتاز احمد ''جدائی'' لے کر آئے کمال تحریر تھی۔ اسی طرح خانقاہ ناول خوب چل رہا ہے۔ نہلے پہ دہلا، مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، پسند آئے۔ اتنا پیارا پرچہ لانے پر مبارک باد قبول کریں۔ اپنی بہن کو دُعاؤں میں یاد رکھیے گا، اللہ حافظ۔

✿ پیاری بہن خوش رہو! خدا تمہیں ہر خوشی سے نوازے۔ تم سب محبتوں کے پیامبر ہو۔ بس محبتیں بانٹو کہ اس سے سب کچھ مل جاتا ہے۔

☆ بھائی راشد لطیف بورے والا سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں جب جولائی کا پرچہ آئے گا، ہم عید الفطر کا انعام پا چکے ہوں گے پھر بھی سچی کہانیاں، کے مکمل اسٹاف، لکھاریوں اور قارئین کو بہت بہت مبارک۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں کی برسات برسائے رکھے آمین۔ گرمیوں نے امتحان میں ڈال رکھا ہے، ہم بھی پکے ایمان والے ہیں ماہ صیام کا ایک بھی روزہ نہیں چھوڑنا کیونکہ فرض ہے، اور فرض معاف نہیں ہوتا۔ ماہ جون کا سچی کہانیاں ملا۔ ٹائٹل خوبصورت ہے، منزہ سہام کا اداریہ، التجاء پڑھ کر دل غم میں ڈوب گیا۔ احوال میں پہنچا تو ساتھی مسکرا رہے تھے، گپ شپ کر رہے تھے۔ میری مشکل یہ ہے کہ ڈاک خانہ دُور ہے اور ہمیشہ لیٹ ہو جاتا ہوں۔ اب بھی معلوم نہیں تبصرہ پہنچ پاتا ہے کہ نہیں۔ کہانیوں میں چنے کرارے، بوجھ، ہیرو سے قلی تک، خودداری، آخری بیٹا، قید سے رہائی، جدائی، دو پل کا ساتھ، راستے ایک ہوئے، تمہیں اجازت ہے، شعلوں پہ رقص، نیلا دھوبی، صبح کا ستارہ، احسان عظیم، رستوں کے ساتھ ساتھ، پلیٹ فارم سے جیل تک، نہلے پہ دہلا پڑھ پایا ہوں، جو بہت پسند آئیں۔ اُمید ہے باقی بھی اچھی ہوں گی۔ مستقل سلسلے بھی اچھے ہیں۔ کاشی بھائی آپ کو ایک عدد کہانی بھیجی تھی، اس کے بارے میں آگاہی دیں تو نوازش ہوگی۔

✿ اچھے بھائی! اسی پرچے میں اپنی کہانی پڑھ لو۔ اب تو خوش ہونا! تبصرے کے لیے شکریہ۔

☆ پیارے بھائی مجید احمد جائی ملتان شریف سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ چاہنے والوں کو عید الفطر کی خوشیاں مبارک ہوں۔ ماہ جون کا پلیٹ فارم نمبر ملا، سرورق خوبصورت تھا۔ منزہ سہام کی ''التجاء'' نے غمگین کر دیا۔ احوال میں کاشی بھائی کی باتیں دل کو چھوتی ہیں۔ کاشی بھائی آپ نے ہماری اُنگلیاں پکڑ کر لفظ لفظ سکھایا ہے۔ احوال کی محفل سے طویل غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں، وجہ وہی ننھی سی جان اور مصروفیات کا اژدھام پھن پھیلائے ہوئے ہے۔ لیکن میں سچی کہانیاں کو کہاں بھول سکتا ہوں، کاشی بھائی کو کیسے بھول سکتا ہوں، اپنے چاہنے والوں کو کیسے بھول سکتا ہوں، اپنے ساتھی لکھاریوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ احوال کی محفل نئے پرانے ساتھیوں کے ساتھ جگمگا رہی ہے، اور اس کی خوشبو ملک کے کونے کونے تک، بلکہ دُنیا کے کونے کونے تک پھیل چکی ہے۔ میری کہانیاں پسندیدگی کی سند سے نوازنے والوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور دل سے دُعائیں بے شمار کرتا ہوں۔ احوال کے آخر میں کاشی بھائی کی ''فریاد'' نے دل کی نگری میں جل تھل کر دی۔ سرمد سلطان کھوسٹ کے واقعات پڑھ کر ان کے بارے جانکاری ہوئی۔ کہانیوں میں چنے کرارے، نے دل موہ لے لیا۔ ہیرو سے قلی تک، قید سے رہائی، آخری بیٹا، جدائی، راستے ایک ہوئے، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، نواب، پلیٹ فارم سے جیل تک، نہلے پہ دہلا، ٹرین کب آئے گی کمال تحریریں تھیں، ہر کہانی کا ذکر کروں تو تبصرہ پورے رسالے پر محیط ہو جائے گا، تمام کی تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ پلیٹ فارم نے دل جیت لیا، ایک ساتھ کئی کہانیاں

پلیٹ فارم ملیں اور ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک۔ واہ کمال کر دیا۔ کچھ اپنی باتیں، یادیں پھر سے شروع کریں، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، مسئلہ یہ ہے بہترین رہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صراط والے راستہ پر گامزن رکھے آمین۔

✍ پیارے مجید! محنت ہی میں عظمت ہے اور کچھ نہیں۔ تبصرہ اچھا لگا تمہارا۔

☆ کنزہ ملک، قاسم پور کالونی ملتان سے احوال میں شامل ہیں، لکھتی ہیں۔ کہہ رہے ہوں گے یہ بلا کہاں سے نازل ہوگئی۔ آپ بھی تو افطار پارٹیاں اڑا رہے ہوں گے۔ ہم نے اڑائی تو کیا ہوا؟ ویسے بھی حکومت وقت نے چھٹیاں دے رکھی ہیں تو انجوائے کرنا تو فرض بنتا ہے۔ روزے بھی رکھ رہی ہوں۔ اب ماہ جون کے پلیٹ فارم نمبر کی بات ہو جائے۔ سرورق پرانی روایت قائم رکھے ہوئے ہے۔ احوال میں بڑی پیاری پیاری باتیں کرتے ہیں، کیا کراچی میں چینی سستی ہے۔ یہاں تو کالا گڑ بھی نخرے کرتا ہے۔ سرمد سلطان کھوسٹ ٹی وی سے نکل کر سچی کہانیاں میں آگئے واہ بھائی۔ اچھا وہ لائف بوائے کہاں گیا۔ اب تو چنے کرارے ہوگئے اور بے وقت کا بوجھ بھی سر پر آن پڑا ہے۔ آخری بیٹا، قید سے رہائی اچھی رہیں، لو جی، ملتان سے۔ میں اور پلیٹ فارم، رستوں کے ساتھ ساتھ، دو پل کا ساتھ، اور ہمسائی بھی ہیں آخری بیٹا کی صورت، واہ جی واہ۔ ٹرین کب آئے گی، اب تو پاکستان کی ٹرینیں بہت انتظار کرواتی ہیں، کم بخت۔ صبح کا ستارہ، نواب، پلیٹ فارم سے جیل تک، احسان عظیم، اپنا خون، بہت دیر کر دی۔ جدائی نے جدا کرنے کی ٹھانی، مہتاب خان، تمہیں اجازت ہے دے رہی ہیں۔ خانقاہ ناول بہت پیارا ہے۔ لو جی۔ افطاری کی تیاری کروانی ہے۔

✍ اچھی کنزہ! تمہاری اتنے دنوں بعد احوال میں حاضری ہوئی اچھا لگا۔ آتی رہا کرو بھئی، احوال کی محفل تو تم سب کی اپنی ہے۔

ساتھیو! اس شمارے کے ساتھ ہی آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ اگلے ماہ سے انشاء اللہ ہمارے ہر دلعزیز بھائی ناصر رضا آپ کے ساتھ ہوں گے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی نذر۔ اور تمام قارئین اور امتِ مسلمہ کو عید کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہوں۔

رسمِ الوداع

تمہارے عشق کی قیمت ادا کروں کیا میں
میں اپنی مات پہ جشن فتح مناتا رہا
میں خود کو راضی ہی رکھتا اگر وہ تھامتا ہات
میں اس کے بعد کسی اور کا بھی ہو نہ سکا
یہ میرے عشق کی سالم مثال ہے کہ میں اب
ترے بغیر ہوں، تکمیل ذات پا نہ سکا!
بہت سے لوگ مجھے چھو کے اپنا کہتے گئے
میں احتیاطِ محبت میں خود جھلستا رہا
چراغِ دل ترے بجھتے دھوئیں کی خیر ہو اب
مرے خیال میں خوشبوئے یار آنے لگی
زمانے بھر نے کہا عشق کر سنبھل کے ذرا
مگر وہ عشق ہی کیا جس میں احتیاط ہو گر
نصیب صحبتِ یاراں ہی ہر قدم مانگے
برس گئی ہیں جو بارانِ رحمتِ یاراں
دعائیں ہر گھڑی میں ایسی بارشوں کی کروں
میں ہر مقام پہ تیرا ہی طلب گار رہا
مرے عدو، مرے ساحر، مرے قتال سنو!
مری فگار، جلی انگلیوں پہ ہاتھ رکھو
گلے سے لگ کے رسمِ الوداع ایجاد کرو
میں اپنی مات پہ یونہی جشن مناتا رہوں

آپ کا اپنا
کاشی چوہان



نمایاں شخصیات، سچے واقعات

بابرہ شریف



احمد سجاد بابر

کروڑوں دلوں کی دھڑکن، حسن و فن کا مجسمہ آسمانِ فن کا درخشاں ستارہ، کاملیت کا نشان

"یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم
کہانی محبت کی زندہ رہے گی
کبھی گیت بن کے لبوں پہ سجے گی
کبھی پھول بن کے یہ مہکا کرے گی"

سینما ہال میں ایک سکوت طاری تھا، گیت کیا تھا ایک سحر تھا، ایک جادو تھا جس نے سننے والوں کو پتھر کا بنا دیا تھا۔ ناہید اختر کی آواز کی کھنک اور ہیروئن کے چہرے کی معصومیت نے ایک سحر پھونک دیا تھا، جانے کب گیت ختم ہوا، جانے کب آنکھ سے آنسو ٹپکے، جانے کب ہال میں پہلی تالی گونجی..... اور پھر ہر طرف تالیوں کا شور تھا اور گلی گلی بابرہ شریف کے چرچے تھے۔

"میرا نام ہے محبت" اردو زبان میں ریلیز ہونے والی 1975ء کی پاکستانی فلم تھی۔ اس فلم نے سال 1975ء کے لئے بہترین فلم کا نگار ایوارڈ حاصل کیا۔ یہ 6 اگست، 1975ء کو نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ یہ فلم امریکی مصنف ایرچ سیگل (Segal Erich) کے ناول "لو اسٹوری" سے ماخوذ تھی۔ اس فلم کے فلم ساز اے حمید، ہدایت کار شباب کیرانوی، نغمہ نگار تسلیم فاضلی، موسیقار ایم اشرف، تدوین کار جاوید طاہر تھے۔ اس فلم نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ پاکستان کے علاوہ چین میں بھی ڈب کر کے نمائش کے لئے پیش کی گئی اور وہاں بھی یہ فلم اس قدر مقبول ہوئی کہ اہلِ چین نے نے ان اداکاروں کے مجسمے نصب کر دیئے۔ ہدایت کار شباب کیرانوی نے اس فلم کے مرکزی کرداروں کے لئے پہلے ندیم اور دیبا کا انتخاب کیا تھا مگر جب ندیم نے دیبا کی مخالفت کی تو ہدایت کار شباب کیرانوی نے یہ کردار نووارد غلام محی الدین اور بابرہ شریف سے کرانے کا فیصلہ کیا۔ فلم کی دیگر کاسٹ میں زرقا، بہار بیگم، ریحان، مسعود اختر اور علاؤالدین شامل تھے۔

اس فلم کی موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی جبکہ نغمات تسلیم فاضلی نے لکھے۔ اس فلم میں مہدی حسن، احمد رشدی اور ناہید اختر نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ فلم میں یہ لازوال نغمات شامل تھے۔

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم
☆ تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے
☆ آگے تم پیچھے ہم، جاؤ گے کہاں

ستر اور اسّی کی دہائی پاکستان فلم انڈسٹری کے عروج کا زمانہ تھا، اس دور نے جانے کتنے چاند چہرے انڈسٹری کو عطا کیے جو امر ہو گئے، یہ وہ دور تھا جب خود کو منوانا بھی مشکل تھا کیونکہ ایک سے بڑھ کر ایک باصلاحیت اور



خوبصورت اداکار موجود تھا مگر بابرہ شریف نے آتے ہی دلوں کو فتح کر لیا۔

☆......☆

شوخی، شرارت، خوبصورتی اور صلاحیت کا امتزاج ایک شخصیت میں ایک ساتھ دیکھنا ہو تو وہ بابرہ شریف میں نمایاں نظر آتا ہے، اس کے علاوہ عاجزی، انسان دوستی، اپنی ہستی کی نفی کر کے جینا بھی بابرہ شریف کی ذات کا نمایاں وصف ہے ورنہ شہرت اور دولت پا کر لوگ بدلتے نہیں بلکہ بے نقاب ضرور ہو جاتے ہیں۔ بابرہ شریف نے ہر قسم کے کردار اس مہارت سے ادا کیے کہ کردار میں ڈوب گئیں، المیہ اداکاری کی تو ناظرین اشکبار ہوگئے، شوخ اور شرارت پر مبنی کردار کیے تو ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے، جنگجو کردار ادا کیے تو شعلہ صفت انداز میں حواس پر چھا گئیں۔ انہوں نے پاکستان فلم انڈسٹری کو یادگار فلمیں دیں جن کو بطور حوالہ آج بھی یاد رکھا جاتا ہے۔

بابرہ شریف 10 دسمبر 1954ء کو پنجاب کے شہر لاہور میں پیدا ہوئیں۔ وہ درمیانے درجے کی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں، ان کے والد گھی کا کاروبار کرتے تھے، وہ تین بہنیں تھیں۔ بڑی کا نام فردوس شریف، منجھلی کا نام فاخرہ شریف اور سب سے چھوٹی اور دونوں کی نسبت زیادہ خوبصورت بچی کا نام بابرہ شریف تھا۔ مگر بابرہ کو اداکاری کا بالکل بھی شوق نہیں تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ اپنی بہنوں کے ہمراہ ٹیلی ویژن اسٹیشن چلی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ یہ اپنی بہن کے ساتھ تھیں کہ ڈرامہ پروڈیوسر کی نظر ان پر پڑی اور چہرے مہرے سے اداکاری کا اندازہ لگا کر ڈرامے میں حصہ لینے کے لیے کہا مگر بابرہ بجائے خوش ہونے کے یہ سن کر اداس ہوگئیں۔ ان کی بہن نے بتایا کہ وہ فلم اور ٹی وی کے نام سے بھاگتی ہے۔ اور بات وہیں ختم ہوگئی۔ لیکن چند دنوں بعد بابرہ شریف کو معروف ڈرامہ نگار کمال احمد رضوی نے ڈرامہ ''مس فور او کلاک'' کے مختصر کردار میں کاسٹ کر لیا۔ اسی دوران ہدایت کار نذیر صوفی نے انہیں اپنی فلم ''کاغذ کے پھول'' کے لیے منتخب کر لیا۔ اس فلم میں ان کے ساتھ ایک نیا اداکار تنویر تھا۔ اس فلم کا نام بدل کر ''ایک اور ایک گیارہ'' رکھ دیا گیا لیکن یہ فلم مکمل ہونے کے باوجود ریلیز نہ ہو سکی۔ انہوں نے 1973ء میں ''جیٹ واشنگ پاؤڈر'' کے کمرشل میں کام کیا۔ جیٹ کو اس وقت ایک بڑے برانڈ کے مقابلے میں متعارف کروایا جا رہا تھا۔ اس اشتہار میں دھوم مچانے کے بعد وہ جلد ہی محسن شیرازی کی سیریل ''کرن کہانی'' میں نمودار ہوئیں جو کہ پی ٹی وی کے سینٹر کراچی سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔ یہ ایک کامیڈی سیریل تھی جسے حسینہ معین نے تحریر کیا جو ان کا تعارف بن گیا۔ 1974ء میں



شمیم آرا نے اپنی فلم "بھول" میں کاسٹ کیا اور ایس سلیمان نے اپنی فلم "انتظار" میں کاسٹ کیا۔ یہ دونوں فلمیں 1974ء میں ہی ریلیز ہوئیں لیکن "انتظار" فلم "بھول" سے پہلے ریلیز ہوئی اور اسی سال نذر شباب کی "شمع" ریلیز ہوئی تھی۔

1974ء میں فلم ''میرا ناں پاٹے خاں'' میں وہ سپورٹنگ رول میں ظاہر ہوئیں جس کے ڈائریکٹر مسعود پرویز تھے جبکہ نیلو اور شاہد نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ انھوں نے اقبال کشمیری کی فلم "شریف بدمعاش" علی سفیان آفاقی کی "اجنبی" اور نذر شباب کی فلم "نوکر" میں کام کیا۔ وزیر علی کی فلم "معصوم" وہ پہلی فلم تھی جس میں بابرہ کو غلام محی الدین کے ساتھ مرکزی کردار کرنے کا موقع ملا۔

بابرہ شریف کو پاکستان فلم انڈسٹری کے ایک حقیقتاً شریف ہدایتکار شباب کیرانوی نے اپنی فلم میرا نام ہے محبت میں بطور ہیروئن کاسٹ کرلیا۔ اسی فلم میں ہیرو غلام محی الدین بھی نیا چہرہ تھے۔ اس فلم کے ہٹ ہونے کے بعد بابرہ شریف نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور میاں شریف کی اس ہونہار اور خوبصورت بیٹی نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنا شروع کر دیے۔ بابرہ شریف کی چھوٹی بہن فاخرہ شریف کو بھی شباب کیرانوی نے ایک فلم ''انسان اور آدمی'' میں رول دیا مگر فاخرہ پردہ اسکرین پر کامیاب نہ ہوسکیں اور ایک ہی فلم میں آنے کے بعد واپس اپنے گھر جا بیٹھیں۔

فلمی ہیروئنوں کو زوال بھی آتا ہے۔ کسی کا متبادل اس سے بھی خوبصورت چہرہ آجاتا ہے۔ کوئی سیٹ پر دیر سے آنے اور فلمساز و دیگر عملے کو تنگ کرنے کی وجہ سے ناپسندیدہ ہوجاتا ہے اور کسی کی جیسے ہی کوئی فلم فلاپ ہوجائے تو قسمت بھی اس سے روٹھ جاتی ہے۔ مگر بابرہ شریف سے ایسی کوئی ایک غلطی بھی نہ ہوئی۔ اس نے مشہور اینکر کامران شاہد کے والد فلمسٹار شاہد سے شادی کر لی۔ اس وقت کہا یہ جاتا تھا کہ لاہور میں دو ہی خوبصورت اور وجیہہ مرد رہتے ہیں ایک فلمسٹار شاہد اور دوسرے گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر۔ اور یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی۔ بابرہ شریف وقت کی بڑی پابند تھی کبھی دیر سے فلم کے سیٹ پر نہ آتی، فلمساز سے تعاون کرتی اس کے ری ٹیک کم سے کم ہوتے۔ خوش اخلاق بھی بلا کی تھی، وقت پر آنا اور وقت پر ہی گھر واپس چلے جانا اس کی عادت میں شامل تھا۔ عموماً جب وہ شوٹنگ پر آتی تو اس وقت صرف چھوٹا عملہ ہی سیٹ پر موجود ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو اس دور میں خال خال ہی نظر آتی تھیں اور اسی بنا پر اس کا ایک الگ میدان اور جہان تھا جس میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے جا رہی تھی۔



☆......☆

پاکستان ٹیلی ویژن کا آغاز تجرباتی سطح پر 1964 میں ہوگیا تھا اور لاہور میں ایک صنعتی میلے کے دوران ایک جاپانی کمپنی نے اسکی آزمائشی نشریات کا اہتمام کیا تھا۔ لیکن اُس وقت تک ٹی وی کی حیثیت ایک کھیل تماشے سے زیادہ نہ تھی۔ 1965 کی جنگ کے دوران ایوب خان کی حکومت نے محسوس کیا کہ شہری آبادی میں ٹیلی ویژن، پروپیگنڈے کا موثر ہتھیار ثابت ہوسکتا ہے چنانچہ جنگ ختم ہوتے ہی ٹیلی ویژن کی ترویج وترقی پر پوری توجہ مبذول کی گئی اور لاہور کے علاوہ راولپنڈی، کراچی اور

ڈھاکہ میں بی ٹی وی نشریات کا آغاز ہو گیا۔ یہ حسنِ اتفاق تھا کہ ٹیلی ویژن کا آغاز کرنے والے افراد میں سے بیشتر ڈرامے کے فن سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ ابتدائی دور ہی میں پاکستان ٹیلی ویژن نے ڈرامے کے شعبے میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اگر اس ملک میں ٹیلی ویژن شروع کرنے والے لوگوں کا تعلق حالاتِ حاضرہ کے پروگراموں یا دستاویزی فلموں سے ہوتا تو آج پی ٹی وی کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی۔

سن ستر کے عشرے کا ذکر ختم کرنے سے پہلے اس اہم موضوع پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری

خود لاہور میں فردوس، اکمل، نغمہ، سنتوش، مظہر شاہ، ساون، منور ظریف اور رنگیلا کی سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی فلموں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ فلمی موسیقی کی دنیا میں رشید عطرے، جی اے چشتی، منظور اشرف، نثار بزمی، واجد علی ناشاد، ماسٹر عبداللہ، ماسٹر عنایت حسین اور صفدر حسین کا طوطی بول رہا تھا۔ خورشید انور اور روبن گھوش بھی مصروف تھے لیکن وہ صِرف اپنی مرضی کا کام کرتے تھے..... تھوڑا اور ستھرا۔ ملک میں سینماؤں کی تعداد بھی اپنے عروج پر تھی۔ فلمی چہل پہل کا اندازہ اس امر سے لگا لیجیے کہ صرف لاہور شہر میں اُس وقت 63 سینما گھر تھے۔ بازارِ فلم کی اس



کو پاکستان ٹیلی ویژن نے کس حد تک متاثر کیا تھا۔

بہر حال جب یہاں ٹیلی ویژن کے قدم جمنے شروع ہو گئے تو اُس وقت فلم انڈسٹری بھی اپنے عروج پر تھی۔ مشرقی پاکستان میں اُردو فلموں کی ایک مضبوط روایت جڑ پکڑ چکی تھی اور مغربی پاکستان میں پنجابی فلموں کا سنہری دور (کاروباری لحاظ سے) شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ سن ساٹھ کی دہائی کے آخری برسوں میں اگر ڈھاکہ سے نواب سراج الدولہ اور چکوری جیسی معیاری فلمیں آ رہی تھیں تو

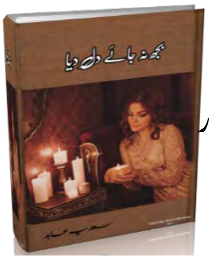
رونق اور سرگرمی کے نتیجے میں حکومت کو سینما گھروں سے لاکھوں روپے ماہانہ کا تفریحی ٹیکس وصول ہوتا تھا۔

پاکستان ٹیلی ویژن نے فلم انڈسٹری کو تازہ خون مہیا کیا۔ ان میں سے چند تو ایسے تھے کہ ایک فلم ہی کر پائے اور گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ ناکامی کی ان مثالوں کے ساتھ ساتھ ہمیں چند ایسے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے ٹیلی ویژن پر اداکاری کا آغاز کیا اور بڑی سکرین پر بھی کامیاب و کامران رہے مثلاً ننھا، علی اعجاز،



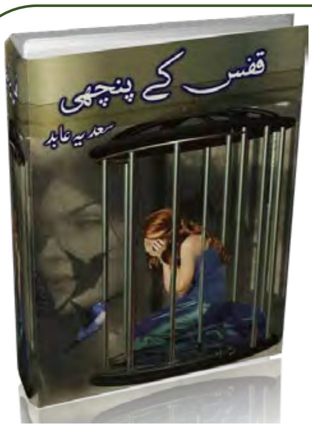
عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا منفرد ناول، محبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



بُجھ نہ جائے دِل دیا

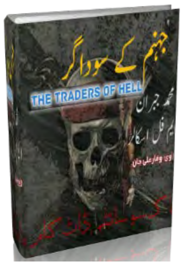
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، محبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



قفس کے پنچھی

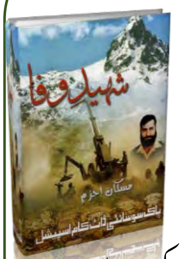
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



جہنم کے سوداگر

محمد جبران (ایم فل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



شہیدِ وفا

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے محبت کی داستان، دہشت گردوں کی بزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شاہنواز، بابر علی، ریشم اور ثناء وغیرہ۔ اس سلسلے میں بابرہ شریف اور غلام محی الدین کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کیونکہ ان دونوں نے جتنا نام ٹی وی پر کمایا اُس سے بڑھ کر شہرت فلمی دنیا میں حاصل کی۔ بابرہ شریف ٹی وی پہ چلنے والے واشنگ پاؤڈر کے ایک اشتہار میں نمودار ہو کر عوام میں مقبول ہوئی تھی اور بلیک اینڈ وائٹ زمانے میں اُس نے کئی ٹی وی ڈراموں میں کام کیا تھا۔ حسینہ معین کا لکھا اور کنور آفتاب کا پروڈیوس کیا ہوا کھیل ''پہلی عید مبارک'' بابرہ کے لئے انتہائی مبارک ثابت ہوا اور فلمی دنیا کے دروازے اس

1975ء میں شباب کیرانوی کی فلم میرا نام ہے محبت" ریلیز ہوئی۔ فلم سپر ہٹ ہوئی اور آپ کو بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ دیا گیا۔ 1976ء میں بابرہ کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں پرویز ملک کی ''قاتل کی تلاش'' شباب کیرانوی کی ''دیوار'' علی سفیان آفاقی کی ''آگ اور آنسو'' سلم ڈار کی ''زبیدہ'' جبکہ ڈائریکٹر ظفر شباب کی فلم ''شبانہ'' تھی۔ ''شبانہ'' نے پاکستانی سینما گھروں میں گولڈن جوبلی منائی۔ اس فلم میں بہترین اداکاری کرنے پر بابرہ کو بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ دیا



پر ہمیشہ کے لئے کھل گئے۔ بابرہ شریف کی پہلی فلم 'انتظار' تھی جو کہ 1974 میں بنی اور اُسی سال ٹی وی ڈراموں کے معروف ہیرو غلام محی الدین کو بھی فلم ''دِل والے'' میں کام مِل گیا لیکن ان دونوں کی قسمت کا ستارہ 8 اگست 1975 کو چمکا جب شباب کیرانوی کی فلم میرا نام ہے محبت ریلیز ہوئی جس میں ہیرو اور ہیروئن کے کردار ان ہی دو سابقہ ٹی وی آرٹسٹوں کو ملے تھے۔ اگر ان کے کیریئر کا جائزہ لیا جائے تو 1974 میں فلم "میرا ناں پاٹے خاں" میں وہ سپورٹنگ رول میں ظاہر ہوئیں جس کے ڈائیریکٹر مسعود پرویز تھے جبکہ نیلو اور شاہد نے مرکزی کردار ادا کئے۔ انہوں نے اقبال کشمیری کی فلم "شریف بدمعاش" علی سفیان آفاقی کی "اجنبی" اور نذر شباب کی فلم "نوکر" میں کام کیا۔ وزیر علی کی فلم "معصوم" وہ پہلی فلم تھی جس میں بابرہ کو غلام محی الدین کے ساتھ مرکزی کردار کرنے کا موقع ملا۔

گیا۔ 1977ء میں فلم ''عاشی'' ریلیز ہوئی اور اسی سال اداکار شاہد کے ساتھ انکی شادی ہوئی۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ ان کی یہ شادی دو ماہ سے زیادہ نہ چل سکی۔ 1980ء میں وہ اقبال اختر کی فلم "چھوٹے نواب" میں جلوہ گر ہوئیں۔ 1981 میں وحید مراد اور شاہد کے ساتھ "دل نے پھر یاد کیا" میں آئیں اس فلم کے ڈائریکٹر اقبال اختر تھے۔

1982ء میں "سنگدل" ریلیز ہوئی۔ اس فلم سے آپ نے تیسرا بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ وصول کیا۔ 1986ء سے 1990 کے دوران بابرہ شریف کی بہت سی فلمیں ریلیز ہوئیں ان میں سے کچھ فلموں نے کامیابیاں سمیٹیں جبکہ کچھ فلمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ 1984ء میں مس کولمبو" ریلیز ہوئی۔ ''دیکھتے ہی دیکھتے پیار ہو گیا'' بابرہ شریف اور ان کے ساتھی اداکار



1990ء میں ''گوری دیاں جھانجراں" ریلیز ہوئی اور اس فلم میں بھی اچھی پرفارمنس پر آپ کو بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ دیا گیا۔ پھر فلم "شانی" ریلیز ہوئی لیکن یہ فلم خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

1992ء میں انور مقصود کے کامیڈی سیریل "نادان نادیہ" میں کام کیا۔ " آخر لوگ ہمارا چہرا ہی دیکھتے ہیں" ان ہی دنوں Lux صابن کے اشتہار میں بھی جلوہ گر ہوئیں۔ 1990ء کے بعد ان کی چند فلموں کے علاوہ باقی فلمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ 1995ء میں ''ہم نہیں یا تم نہیں''، ''پیاسا ساون'' اور ''نشانہ'' ریلیز ہوئیں۔ ''ہم نہیں یا تم نہیں" اس فلم نے باکس آفس پر کامیابی حاصل کی۔ 1996ء میں ان کی فلم "سجاول" ریلیز ہوئی اور اس فلم نے کافی کامیابی حاصل کی لیکن اس کے بعد بابرہ نے مزید فلموں میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد کوئی فلم سائن نہیں کی۔

بابرہ شریف پاکستان کی واحد اداکارہ تھیں جن کی فلمیں فلم بین آج بھی کل کی ہی طرح ذوق وشوق سے دیکھتے ہیں۔ فلم ناکام ہو یا کامیاب بابرہ شریف ہمیشہ کامیاب رہیں۔ قسم منے کی، کندن، تیرے بنا کیا



فیصل پر فلمایا گیا یہ گیت کافی مقبول ہوا اور ان دونوں کی جوڑی بھی کافی مقبول تھی۔ اس فلم میں اداکاری کے جوہر دکھانے پر بابرہ کو چوتھا بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ دیا گیا۔ 17 اگست 1986ء کو ''مس بنکاک'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کی شوٹنگ بنکاک تھائی لینڈ میں کی گئی۔ اس فلم کی کاسٹ میں طلعت حسین، کمال ایرانی اور بابرہ شامل تھے۔ یہ فلم بھی فلم بینوں نے بہت پسند کی۔ اس فلم کے گانے بھی کافی پسند کیے گئے۔

"دیوانے پیار کے، متانے پیار کے"

"میں چند خواب سجالوں اگر اجازت ہو
تم کو تم سے چرالوں اگر اجازت ہو"

اس فلم کی کامیابی پر بابرہ شریف کو بیسٹ ایکٹریس کا ایوارڈ دیا گیا۔

1987ء میں ''کندن'' 1988ء میں مکھڑا (پنجابی) ریلیز ہوئی اس فلم کا ایک گانا "منڈیا دوپٹہ چھڈ میرا۔" فلمسٹار ندیم اور بابرہ پر فلمائے گئے یادگار گانوں میں سے ایک ہے۔ اس فلم میں بابرہ شریف کو بیسٹ ایکٹریس کے ایوارڈ کیلئے چنا گیا۔

جینا، شہزادہ، پیاسا ساون، استادوں کے استاد، آسمان، ضد، ایک دن بہو کا، سنگدل، قاتل کی تلاش، ڈاکو کی لڑکی، انٹرنیشنل گوریلے، راز، خواہش، مہمان، عاشی، شبانہ، نوکر، سلاخیں، قاتل کی تلاش شامل ہیں۔ بابرہ شریف کی اردو فلموں میں میرا نام ہے محبت، شبانہ، دیکھا جائے گا۔ عاشی، بڑا آدمی، آنگن، ایک دوجے کے لیے، ایک دن بہو کا، یہ زمانہ اور ہے، ضد، آسمان، انٹرنیشنل گوریلے، مس بنکاک، مس کولمبو، مس سنگاپور، تیرے بنا کیا جینا، نشیمن، لوان لندن، شمع اور انتظار نے فقید المثال کامیابیاں حاصل کیں۔ جب کہ پنجابی فلموں میں بارش، مکھڑا، میں بابرہ کی اداکاری اور ہوشربا رقص آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔



بابرہ شریف نے عصرِ حاضر کے تمام بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کیا جن میں وحید مراد، ندیم، محمد علی، شاہد، سلطان راہی، فیصل، ایاز نائیک، اشعر، راحت کاظمی، وسیم عباس، ندیم عباس، عمر شریف، معین اختر، منور ظریف، بابر، شیری ملک، اسماعیل شاہ، اظہار قاضی، محسن حسن خان، شیوا، طلعت حسین، بدر منیر، جاوید شیخ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ڈائریکٹر حسین کی فلم گھائل ان کی آخری فلم ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں ان کے ساتھی اداکار اظہار قاضی تھے۔ اس کے بعد 2005ء میں وہ لکس ایوارڈ شو میں نظر آئیں۔

☆......☆

بابرہ شریف ہمارے فلموں کے سنہری دور کی آخری یادگار تھیں۔ ان کے ساتھ ہی لولی وڈ کا ٹائی ٹینک ڈوب گیا پیندے میں ہوا سوراخ تو سب کو ہی نظر آرہا تھا مگر کسی نے اس سوراخ کو بھرنے کی کوشش ہی نہ کی تو ڈوب جانا ہی مقدر تھا۔

2016 میں معلوم ہوا کہ بابرہ شریف نے ''ٹو پلس ٹو'' کے نام سے بننے والی فلم سائن کی ہے جس میں علی عظمت، عروہ حسین، بلال اشرف، سلیم معراج اور مصطفیٰ قریشی جیسے بڑے نام بھی شامل ہیں۔

مذکورہ فلم کی نوے فیصد عکس بندی گزشتہ برس کراچی اور حیدرآباد کے مضافات میں کی گئی۔ اس میں وہ اداکار بلال اشرف کی والدہ کا کردار کررہی ہیں۔ بابرہ شریف کو ہدایتکارہ سنگیتا نے فلم ''ساج'' میں شان کے مقابل سائن بھی کیا، مگر بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر یہ چند دن کی شوٹنگ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ''ٹو پلس ٹو'' کو ڈسٹری بیوشن کلب کے تحت پاکستان سمیت دیگر ممالک میں بھی ریلیز کیا جانے کا امکان تھا، مگر فلم بھی سامنے نہ آسکی۔

بابرہ شریف اپنے کیریر کا کریڈٹ اداکارہ اور ہدایت کارہ شمیم آرا کو دیتی ہیں جس نے بابرہ کا اپنی بیٹی بنایا ہوا تھا۔ سنہرے دن بیت چکے، اب زندگی کی شام چل رہی ہے، یادوں کا دھواں ہے جس سے بابرہ محو کلام رہتی ہیں۔ اگر لولی وڈ اپنے قدموں کھڑا رہتا تو کوئی شک نہیں تھا کہ آج بابرہ اس کا اہم ستون ہوتیں مگر اس وقت وہ گوشہ نشیں زندگی گزار رہی ہیں۔ وہ پاکستانی فلمز کی شناخت رہی ہیں اور یہی ان کا بڑا تعارف ہے۔

☆☆☆

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے وصول ہونے والی سچی بیانیاں
جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو آپ کو محسوس ہوتی ہے

تیولہ شریف سے پہلی سچ بیانی

تجھ بن روئے ساون

ریاض حسین شاہد

اُن لوگوں کی داستان، جو محبت کو احترام دینا جانتے ہیں

جولائی کا پہلا ہفتہ نہایت گرمی کی زد میں چلتے گزرا تھا۔ سات جولائی کی دوپہر کو پہلے گرد و غبار کا طوفان سا اٹھا اور شہر بھر کی گلیوں کی خاک اڑاتا چلا گیا، پھر جب طوفان کا دم ٹوٹا تو مغرب کی طرف سے ساون کی پہلی مست گھٹا کی جھڑی اٹھی جو پورے آسمان پہ پھیل گئی۔ اڑتی گھنگھور گھٹاؤں کے مناظر ہر سو چھا گئے۔ محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے ٹولیوں کی صورت گلیوں میں نکل آئے اور مختلف بولیوں میں مینہ مانگنے لگے۔



''ٹکی کھڑ بھن کڑا کڑ وڈا مینہ آیا اور گڈی گڈا ساڈیا دس مہیناں کا لیا۔''

میری دکان محلے کی گلیوں کے چوک میں واقع تھی۔ میں اکیلا بیٹھا ہلکی ہلکی موسیقی لگائے موسم کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، بچے میری توجہ کا مرکز تھے۔ ابھی انہیں بولیاں گائے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ پھر پل بھر میں ہی ساون کی پہلی بارش برسات کی صورت جھوم جھوم کر برسنے لگی۔ بچے بھیگتے ہوئے ایک دوسرے کی انگلیاں پکڑے ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ بارش زیادہ بڑھی تو بچے گھروں میں جا چھپے۔ گلیاں ویران ہو گئیں، گھٹائیں گرجتی اور پھوار کا پانی گلیوں میں بہنے لگا۔ گھٹائیں اور گہری ہو گئیں، بارش کا سلسلہ دقفے وقفے سے جاری رہا۔ یکا یک فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔

''ہیلو کون.....؟'' ایک نہایت ہی مترنم آواز ایسے دلکش موسم میں میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔

''شکیل بول رہا ہوں، آپ....؟''

''شکیل صاحب، آپ گھر پر اکیلے ہیں؟''

''جی....کیا مطلب...؟ ویسے میں تو اپنی دکان سے بول رہا ہوں۔''

''اوہ سوری....آپ کے ابو کہاں ہیں؟''

''وہ تو مسقط عمان میں ہوتے ہیں، آپ کون بول رہی ہیں......؟''

''اچھا....اچھا....آپ کی بیگم تو گھر پر ہوں گی۔''

''جی..... بھئی میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ آپ کون ہیں.....؟''

''سوری شکیل صاحب.....ویسے آپ کون سے نمبر سے بول رہے ہیں۔'' لہجہ اب بھی سپاٹ تھا۔

''تھری۔ فائیو۔ ایٹ۔ سیون۔'' میں نے نمبر بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے نمبر دہرا کر کہا۔

''بھئی آپ نے فون کہاں کیا تھا؟'' میں نے پھر تجسس سے پوچھا۔

''شکیل صاحب! آپ دکان پر بیٹھے موسم سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی بھی سن رہے ہیں۔ بھئی تھوڑی سی آواز تو کھولیں، ہم بھی مکیش کی مدھ بھری آواز کا لطف اٹھائیں۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور میں حیرت میں ڈوبا اس عجیب لڑکی کی باتیں سن کر کبھی ریسیور کو گھورتا، کبھی ٹیپ ریکارڈر کو، پھر میں نے ذرا سی آواز کھول دی۔ مکیش کا گیت

''میں راہی بھٹکنے والا ہوں۔'' ریسیور کے راستے اس تک پہنچنے لگا۔ گیت ختم ہوا تو میں نے ریسیور سے دوبارہ ناتا جوڑا۔

''شکیل صاحب، بڑے عجیب سے گیت سنتے ہیں آپ۔ کہیں آپ بھی راہی بھٹکنے والے تو نہیں ہیں .....''

''کیا مطلب؟ بھئی مجھے لتا، مکیش، شمشاد بیگم، زبیدہ خانم اور غلام علی کی گائی ہوئی ہر چیز پسند ہے، مگر خدا کے لئے آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہی ہیں۔'' میں نے زچ ہو کر پوچھا۔ وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

''شکیل صاحب۔ آپ آدمی باذوق اور دلچسپ ہیں۔ میرا نام ...... میرا نام ..... بھلا کیا ہو سکتا ہے.....؟'' وہ رک رک کر بولی۔

''کمال ہے بھئی، مجھے کیا پتا۔ آپ بتائیں نا جو بھی نام ہے.....''

''ٹھیک ہے آپ مجھے بینا کہہ لیں، اور ہاں میں پھر فون کروں گی، خدا حافظ۔'' اور فون بند ہو گیا۔

''عجیب لڑکی ہے۔'' میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر زیر لب کہا۔ اس نے ضرور رانگ نمبر کر کے مجھے خواہ مخواہ تنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے سوچا۔ پھر گاہک آنے لگے، ہلکی ہلکی بوندیں اب بھی برس رہی تھیں۔ کام کرتے ہوئے میرا ذہن بار بار اس کے متعلق سوچنے لگ جاتا۔ اس نے پھر فون کرنے کا وعدہ کیا تھا، مگر آخر وہ ایسا کیوں کر رہی تھی، وہ کون تھی، خیر اب جو اس نے فون کیا تو ضرور پوچھوں گا۔ میں نے اپنے سوالوں کے جواب میں آپ ہی کہا۔ بارش ایک بار پھر اپنی پوری گھن گرج سے برسنے لگی۔ مکیش کا وہی گیت کیسٹ پر بج رہا تھا، جو بینا سن چکی تھی۔ کوئی پون گھنٹے بعد جب دو گاہک دکان پر کھڑے بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے، فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔

''ہیلو....کون....؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''شکیل جی! آپ نے میرے فون کا انتظار کیا؟''

بینا نے چھوٹتے ہی سوال داغ دیا۔

''نن.....نہیں.....تو۔''میں نے گڑ بڑا کر کہا۔

''کیوں! میں نے کہا تھا نا کہ میں دوبارہ رنگ کروں گی۔ پھر بھی آپ نے انتظار نہیں کیا۔''

''بھئی پلیز۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ اپنے متعلق تو کچھ بتائیں پلیز......!''میں نے کوفت سی ظاہر کی۔

''شکیل صاحب! آپ تو پریشان ہو گئے، ٹھیک ہے اگر میرا فون کرنا آپ کو اچھا نہیں لگا تو میں دوبارہ آپ کو تکلیف نہیں دوں گی، او کے.....''

''بینا! میں نے یہ کب کہا، میں تو پوچھ رہا ہوں کہ آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''میں نے کئی سوال داغ دیئے۔

''او.....میرا نام بینا نہیں ستارہ ہے اور آپ سے ایسی ہی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے، اسی لئے فون کر دیا، اب کہو.....!''

''کمال ہے، پہلے آپ نے اپنا نام بینا بتایا، اب ستارہ بتا رہی ہو، بھئی یہ کیا مذاق ہے.....؟''

''چلو چھوڑو بھی ناموں میں کیا رکھا ہے۔ اگر آپ کو بینا اور ستارہ دونوں نام پسند نہیں تو آپ کسی بھی نام سے مجھے پکار سکتے ہیں مثلاً فرحی، نرگس، رضیہ یا کسی بھی دوسرے نام سے۔''

''اوہو.....بھئی.....خواہ مخواہ تنگ کر رہی ہو۔ دیکھو میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میرا زندگی میں کسی اجنبی خاتون سے کبھی اس طرح واسطہ نہیں پڑا۔ آپ مثلاً مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتی ہیں۔''

''چلو آپ کے متعلق یہ جان کے بھی خوشی ہوئی کہ آپ ایک شریف آدمی ہیں ورنہ میں سمجھی تھی کہ آپ راہی بھٹکنے والے ہیں۔''اس نے پھر مجھ سے مذاق کیا۔

''پلیز مس.....خدا کے لیے اگر آپ اپنے متعلق مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتیں تو بند کر دیجیے فون۔''میں نے اکتا کر کہا۔

''شکیل صاحب! آپ تو جذباتی ہو گئے۔ خیر میں آپ کو اپنے متعلق مثلاً کیا بتاؤں.....؟ فون میرا ذاتی نہیں اس لیے نمبر نہیں بتا سکتی، ہاں یہ بتا دوں کہ میں آپ کے شہر میں مہمان آئی ہوں، اور پوچھو.....کیا بتاؤں تمہیں.....؟''

''بھئی کسی کو فون کرنے کا کوئی مقصد ہوتا ہے، میں ذرا سنجیدہ واقع ہوا ہوں اس لیے اگر میرے لائق کوئی بات ہے تو حکم کریں، بے جا مذاق مجھے چڑ چڑا کر دیتا ہے۔''میں نے نروس ہو کر کہا۔

''ٹھیک ہے اگر میں نے آپ سے کوئی مذاق کی بات کی ہو تو معافی چاہتی ہوں۔''

''او کے، خدا حافظ۔''میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ عجیب قسم کی لڑکی ہے۔ خیر اب تنگ نہیں کرے گی۔ میں نے سوچا۔ شام تک برسات لگی رہی، ہر سو پانی ہی پانی بھر گیا۔ ہلکی ہلکی بونداباندی رات گئے تک جاری رہی۔ رات کو سونے لگا تو ایسے ہی فون والی کا خیال آ گیا۔ مگر میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور خواب خرگوش میں اتر گیا۔

☆......☆

اگلے دن گھٹا کا سلسلہ پھر نئے سرے سے شروع ہوا۔ کچھ دوست آ گئے، آم منگوائے اور دکان ہی میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ ایسے ہی باتوں باتوں میں کل کے فون آنے کی کہانی میں نے بھی کو سنا دی۔

''کمال ہے یار۔ اگر تمہاری جگہ ہم ہوتے تو اس لڑکی کو ایسا شیشے میں اتارتے کہ یاد رکھتی۔''

''دفع کرو یار، فضول ہے سب۔ امید ہے، اب آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گی۔''میں نے کہا اور باتوں کا رخ بدل کر کرکٹ پر چلا گیا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی اور ہماری توجہ اس طرف ہو گئی۔

وحید نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔''جی وحید عرض کر رہا ہوں۔ شکیل بینا کا فون ہے۔''وحید نے ماؤتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''دفع کرو۔''میں نے ہاتھ کے اشارے سے وحید کو منع کر دیا۔

''ہیلو.....شکیل صاحب ذرا مصروف ہیں، آپ پیغام دے دیں، ٹھیک ہے، ویسے میرا نام وحید ہے، بڑا دلچسپ آدمی ہوں، جب دل چاہے اور جتنی دیر چاہے اسی نمبر پر آپ باتیں کر سکتی ہیں۔''وحید عجیب سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''یار یہ کیا بکواس ہے۔ بند کرو فون۔''میں نے غصے سے وحید کو گھورا، اس نے فون بند کر دیا۔

''کمال کرتے ہو شکیل! لڑکی سے بھی بے عزتی کروادی اور تم نے بھی ڈانٹ پلادی۔'' وحید نے گلا کیا۔

''تم نے فون پر بدتمیزی کی بات جو کی تھی، تمہاری باتوں کا کیا جواب دیا اس نے۔'' انور نے وحید سے پوچھا۔

''بس وہی کہا تھا اس نے کہ بکواس نہیں کرو۔'' تو انور کے ساتھ ساتھ میرے ہونٹوں پر بھی ہنسی آ گئی۔

''ویسے ایک بات بتادوں! لڑکی معمولی قسم کی نہیں، بڑے کام کی شے ہے، یہ تو شکیل ٹھکرا رہا ہے اسے، ورنہ وہ تو سیریس لگ رہی ہے۔''

''چھوڑو یار، مجھے تو اب وہ ویسے ہی زہر لگنے لگی ہے۔'' میں نے بات لاپروائی میں اڑا دی۔ شام ہونے کو تھی، تھوڑی سی دھوپ نکل آئی تھی کہ وہ ایک بار پھر فون پر مجھے آواز دے رہی تھی۔

''کون.... شکیل۔ دوپہر آپ نے فون پر لفٹ ہی نہیں کرائی حالانکہ فون کے پاس موجود تھے۔ آپ کے دوست وحید نے میرے ساتھ بڑی بدتمیزی کی۔ آپ نے اسے ڈانٹا تھا۔ میں نے آواز سن لی تھی۔ تمہارے دوست کم از کم تمہاری ذاتی کال پر تو گھٹیا حرکتیں نہ کیا کریں۔ آپ نے نہ جانے اس سے میرا تعارف کیسے کروایا ہوگا جو وہ ایک لمحے میں ہی بے تکلفی پر اتر آیا، بہرحال میں نے بھی اس کی خاصی جھاڑ کی۔ آئندہ کسی سے فوری بے تکلف نہیں ہوگا۔'' اس نے گلہ کیا۔

''ہاں.... وہ مجھے افسوس ہے کہ وحید نے تم سے ناشائستہ گفتگو کی، سوری۔''

''شکریہ شکیل.... آپ نے مجھے فون نہ کرنے کی ہدایت کی تھی، میں بغیر اجازت پھر آ گئی۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟'' وہ بے حد سنجیدہ معلوم ہو رہی تھی۔

''دیکھو محترمہ! تم یہاں مہمان ہو۔ لوگوں کو بے مقصد فون کرتے رہنا تمہارا شوق ٹھہرا لیکن کم از کم اپنے میزبان کے فون کو اپنے مصرف میں اتنا نہ لاؤ کہ وہ تمہاری میزبانی سے یعنی مہمان نوازی سے بیزار ہو جائیں۔''

''او.... نو شکیل، یہ بات درست ہے کہ میں یہاں مہمان آئی ہوں۔ مگر یہ بات شاید آپ کو عجیب لگے کہ یہ گھر میرے سسرال کا ہے۔''

''کیا.... آپ سسرال میں مہمان بن کر آئی ہیں، پلیز محترمہ.... میں ایسا مذاق قطعی پسند نہیں کرتا۔'' میں جھنجلا کر رہ گیا۔

''میں سیریس ہوں شکیل۔ میں عجیب سی ٹریجڈی میں پھنس کر رہ گئی ہوں۔ یہ بات سچ ہے کہ میں یہاں مہمان بن کر آئی ہوں اور یہ بھی سچ ہے کہ یہ گھر میرے سسرال کا ہے مگر.... دراصل وہ.... خیر دفع کریں آپ۔ ہر ایک کی اپنی پریشانی ہوتی ہے، میں کیا دکھڑے سناؤں آپ کو۔ نہ جانے آپ سے کتنی مشکلیں وابستہ ہوں گی۔'' وہ ٹالنے لگی۔

''ٹھیک ہے، آپ نہیں بتانا چاہتیں تو آپ کی مرضی۔ ویسے آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔'' میں نے کچھ بے دلی سے کہا۔

''شکیل! رات کتنے بجے دکان بند کرتے ہیں آپ....؟''

''یہی کوئی نو بجے، مگر کیوں؟''

''آں.... شاید میں نو بجے فون کروں۔ ویسے بائی داوے آپ کس علاقے میں رہتے ہیں؟''

''بوہڑ محلہ کی پانچ نمبر گلی میں دکان ہے میری۔'' میں نے ایسے ہی بتادیا۔

''ٹھیک ہے، سوا نو بجے تک اگر فون نہ آئے تو انتظار نہ کرنا، اچھا... خدا حافظ۔'' اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

اس کے دماغ میں ضرور کوئی فتور ہے جو یہ ہاتھ پاؤں دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے۔ ضرور مجھے یہ کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسائے گی۔ بلیک میل کرے گی، ہوسکتا ہے کسی اور چکر میں ڈال کر مجھ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی ہو۔ دال میں کچھ نہ کچھ روڑا ضرور ہے۔ مگر اب اس سے نجات کیونکر حاصل کی جائے۔ مجھے نہ تو اس کی ذات میں دلچسپی پیدا ہوئی اور نہ اس کے واقعات جو مجھے تو فرضی ہی لگ رہے تھے، ان پر کچھ یقین آیا۔ خواہ مخواہ میں نے اسے فون نمبر اور دکان کا پتا دے دیا۔ میں اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ بہرحال یہ لڑکی میرے لیے لمحہ بہ لمحہ معمہ بنتی جارہی تھی جبھی تو آٹھ بجے سے ہی میں نے بار بار گھڑی دیکھنا شروع کی۔ جیسے مجھے اس کے فون کا شدت سے انتظار ہو مگر یہ بے تابی ایسی نہ تھی کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا، اور نہ ہی اس

کے مخفی واقعات جاننے کا اشتیاق تھا۔ مجھے تو یہ تجسس لگا تھا کہ وہ کون ہے اور مجھ سے کیا چاہتی ہے۔

نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ گھنٹی نے میری دھڑکنوں کو تیز تر کر دیا۔

''دیکھو شکیل! میرا تم سے رابطہ محض رانگ نمبر سے ہوا، میں نے فون پر ہی دو تین چھوٹی موٹی ملاقاتوں میں آپ کی شخصیت کو پرکھا۔ جو چیز مجھے آپ کی شخصیت میں پسند آئی وہ یہ تھی آپ اپنے دوست وحید کی فطرت جیسے اوباش قسم کے انسان نہیں ہیں ورنہ اب تک آپ مجھ پر قربان ہو چکے ہوتے۔ میں نے تمہیں ایک ہمدرد انسان سمجھا ہے۔ میں ایک الجھن میں گرفتار ہوں۔ میرا تعلق ایک بڑے صنعتی شہر سے ہے، والدین کی اکلوتی ہوں۔ میری ماں کا رویہ شروع ہی سے میرے باپ کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ ابو ہارٹ کے مریض تھے۔ نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے اپنی ساری جائیداد اور بینک بیلنس جو لاکھوں کا ہے، زندگی ہی میں میرے نام کر دیا تھا جس پر میری ماں بہت سیخ پا ہوئی تھیں۔ میں اس وقت چودہ برس کی تھی کہ ابو کی موت واقع ہو گئی۔ امی نے چھ ماہ بعد ہی دوسری شادی کر لی۔ اب میرا سوتیلا باپ میری جائیداد ہتھیانا چاہتا ہے۔ امی اور سوتیلے باپ نے بہت کوشش کی مگر میں نے ابھی تک انہیں کچھ نہیں دیا۔ اب سوتیلے ابو جن کا نام عبید ہے اس نے مجھے اپنے ایک عزیز رشتہ دار کے ہاں جو آپ کے شہر میں بزنس مین ہے، کے ہاں شفٹ کر دیا ہے تاکہ میں اس کے لڑکے امجد کی شریک سفر بنوں۔ اب یہ لوگ مجھے بے حد لاڈ پیار دے رہے ہیں۔ حسین مستقبل کے سپنے دکھا کر صرف اور صرف میری جائیداد کے وارث بننا چاہتے ہیں۔ امجد سے میری منگنی بھی زبردستی ہی کروادی گئی ہے۔ جلد ہی وہ ملک واپس آنے والا ہے۔ اس کے آتے ہی نکاح ہو جائے گا۔ مگر میں ایسے لوگوں میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اس لئے آپ کو کہا تھا کہ میں یہاں مہمان ہوں۔ اور یہ میرا زبردستی کا سسرال بھی ہے۔ دن بھر ٹی وی دیکھنے، ناول پڑھنے اور بے مقصد فون کرنے کے لیے میں کمرے میں تنہا پڑی رہتی ہوں۔ آپ پہلے شخص ہیں جسے میں اس صورت حال سے آگاہ کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ میری پریشانی پر غور کریں گے، مجھے اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائیں گے۔'' اس نے پوری تفصیل بتا ڈالی۔

''دیکھو..... مس.....''

''سائرہ، یہ میرا اصل نام ہے، ہاں اب بات کرو۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''ہاں تو مس سائرہ! آپ نے مجھے اجنبی ہونے کے باوجود اپنا ہمدرد سمجھا اور مجھے اپنے مکمل حالات سے آگاہ کیا۔ آپ کی حالت واقعی قابل رحم ہے، مجھے کچھ سوچنے دو، شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔''

''ٹھیک ہے، کافی دیر ہو گئی ہے، میں صبح بات کروں گی۔ بہت شکریہ۔'' اور فون پر خاموشی چھا گئی۔

سائرہ کی باتیں پہلی بار میرے دل میں اس کے لیے کچھ جگہ بنا گئیں اور میں سنجیدگی سے اس کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ایک زندہ دل شخصیت ہے، اس کا کردار بھی کچھ ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ اس پر شک کیا جائے۔ قطعی اجنبی ہونے کے باوجود اس نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے ذاتی واقعات بتا کر آئندہ کے لیے مشورہ طلب کیا۔ اب انسانیت کے ناتے اس کے اعتماد پر مجھے پورا اترنا چاہیے لیکن میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔

میں دن بھر اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ساون کی بوندیں دوپہر کو پھر جی بھر کے برسیں۔ اس عرصے میں جب بھی فون کی گھنٹی بجتی میرا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔ سہ پہر اس کی مانوس سی آواز مجھ سے آملی۔

''کیا ہو رہا ہے شکیل.....''

''بس تمہارے ہی متعلق سوچ رہا ہوں۔''

''ہوں..... پھر..... کس نتیجے پر پہنچے۔''

''سائرہ! یہ تمہارے مستقبل کا فیصلہ ہے جو یقیناً مجھ سے کہیں بہتر طور پر تم خود کر سکتی ہو۔ والدین کی خواہش پر یہاں رہنا تمہیں پسند نہیں، تم خود مختار ہو کر بھی دوسروں کے رحم و کرم پر ہو۔ آپ اپنے خاندان میں جہاں بھی بہتر ہمسفر اور اچھے لوگ دیکھیں، اپنے متعلق بات طے کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری دولت اور جائیداد تمہیں کہیں سے بھی مایوس نہیں کرے گی، لہٰذا میری رائے تو یہی ہے کہ آپ اپنے طور پر خاندان کے

اندر ہی جگہ پیدا کرلیں۔''

''تمہاری رائے مناسب ہے شکیل۔ میری جائیداد ہی میری دشمن بن کر رہ گئی ہے۔ خاندان بھر کے لوگ مجھے اپنانے کو بے تاب ہیں بلکہ مجھے اپنانے کی پیشکش کر چکے ہیں، مگر ان باتوں میں ان کی نگاہوں میں دولت کی ہوس چھپی ہے، ہر بشر مجھے صرف اس لیے اپنا بنانے پر رضامند ہے کہ میں لاکھوں کی وارث ہوں، ورنہ مجھ جیسی بھینگی لڑکی کو کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ ہاں شکیل صاحب، خدا نے مجھے شکل وصورت اور قد قامت کے علاوہ بے پناہ دولت کے ساتھ ساتھ ایک نقص بھی دیا ہے جو کسی کو بھی قابل قبول نہیں۔ میں جانتی ہوں میں نے جس سے بھی مستقبل کا ناتا جوڑا وہ پہلے میری جائیداد طلب کرے گا پھر جلد ہی مجھے ٹھکرا دے گا۔ امجد سے میری منگنی ہوئی، میں نے قبول کرلیا۔ مگر اب ان کا اصرار ہے کہ میں جائیداد امجد کے نام کروں پھر نکاح ہوگا۔ یہ بات اس امر کی واضح دلیل ہے کہ میرے ساتھ آگے چل کر کیا ہوگا اور اسی بات نے مجھے اس سے متنفر کردیا ہے، اب اگر وہ...... پہلے ایسا نہ بھی کریں تب بھی میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتی، پھر میرے لیے دوسرا خطرہ خود میری ماں اور میرا سوتیلا باپ عبید ہے جو دوسرے لفظوں میں میرا نکاح اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ آدھی جائیداد ان کو ملے اور بقیا میرے سسرال والوں کو۔ عجیب الجھن ہے جو دن رات میرا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی ہے۔''

''وہ بڑی کنفیوژن ہے تو۔'' میں نے دکھ سے کہا۔

''ویسے شکیل صاحب، بلا تکلف۔ ایسی صورت میں آپ..... خیر چھوڑیں۔'' وہ رک گئی۔

''ہاں ہاں، آپ رک کیوں گئیں، کھل کر بات کریں۔''

''کچھ نہیں شکیل، آپ کو ملنے کو دل چاہتا ہے مگر ..... سوچتی ہوں آپ مجھے دیکھ کر نفرت سے آنکھیں نہ پھیر لیں۔'' اس کی آواز میں بے بسی سمٹ آئی۔

''نہیں نہیں سائرہ! ایسا نہ سوچیں۔ میں نے زندگی میں ہمیشہ اپاہج، معذور اور بدصورت لوگوں کو زیادہ محبت سے دیکھا ہے، خواہ وہ بھکاری ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ مجھے اس بات پر خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے اپنی ذات سے متعلق یہ بات بھی بتادی۔ مجھے آپ کی صاف گوئی پسند ہے۔''

''آ.... اچھا رضیہ خدا حافظ۔'' اس کی آواز گڈمڈ سی ہوگئی اور فون خاموش ہوگیا۔

ہائیں ..... رضیہ ..... یہ کیا بات ہوئی۔ میں الجھ سا گیا..... وہ تو رات نو بجے سائرہ نے بتایا کہ کمرے میں خالہ آگئی تھی اس لیے میں نے رضیہ کہہ کر بات ختم کردی تھی۔

شب بھر وہ میرے خوابوں میں چھائی رہی۔ پچھلے تین دنوں کی فون کالوں نے ہمیں ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا بلکہ رازداں دوستوں کی طرح اپنائیت کے ایک رشتے میں بندھ سے گئے۔ ایک ذرا سی ہیلو کہہ دینے سے ہم ایک دوسرے کو پہچان لیتے تھے۔ ہمارے درمیان آواز کا رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا تھے مگر خلوص بھرے جذبوں نے اجنبیت کی ہر دیوار گرادی تھی۔

☆......☆

اگلی صبح سے ہی میں اس کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی دس بجے اس نے رنگ کی۔

''شکیل، میں اپنے متعلق آپ کو سب کچھ بتا چکی ہوں، مگر تم نے.....'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''سائرہ! میں نے بی اے کیا تو سروس کی تلاش میں دو سال دھکے کھاتا پھرا۔ ابو عرصہ دس سال سے باہر ہیں۔ مجھ سے دو بہنیں چھوٹی ہیں۔ بڑا ہونے کے ناتے مجھے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں۔ کوئی اچھی سروس نہ ملی تو اپنا بزنس کرلیا۔ محلے ہی میں گھر کے قریب جنرل اسٹور کھول لیا جو کامیاب رہا۔'' میں نے مختصر سا تعارف کرایا۔

''بہت اچھا کیا تم نے شکیل۔ اپنا بزنس خواہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، نوکری سے بہتر ہوتا ہے۔ ہاں تو ازدواجی زندگی کے متعلق کیا ہوا۔'' سائرہ نے جیسے مجھ پر بجلی گرادی۔

''سائرہ وہ ..... میری کزن سے منگنی ہوئی تھی۔ شادی کی تیاریاں تھیں کہ ..... نصرت مجھے ویران کرگئی۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''کیا..... اس کی.....'' وہ چونک کر رہ گئی۔

''ہاں چاند رات اس نے مہندی لگائی، صبح بخار ہوگیا جو ٹائیفائیڈ میں بدل گیا اور پندرہ دن بعد ہی وہ دنیا سے منہ موڑ گئی۔'' میں نے بے حد کرب سے کہا۔

''اف، ویری سوری، مجھے بے حد افسوس ہوا شکیل۔ بہت ہی دکھ۔'' اس کی آواز روہانسی ہوگئی۔

''تمہاری سنجیدگی اب سمجھی میں، ویری سیڈ، آہ نصرت، جو اپنے سارے ارمان لے کر ہمیشہ کی نیند سوگئی۔ تمہارا دکھ تو مجھ سے بھی گہرا نکلا۔ کاش..... ایسا نہ ہوا ہوتا۔ کوئی مر کر دوسرے کو زندگی بھر کے دکھ دے جاتا ہے اور کچھ لوگ زندہ رہ کر دوسروں کی زندگیوں کو موت سے بھی بدتر کر دیتے ہیں۔'' اس کا اشارہ اپنی طرف تھا۔

''میں تمہارا غم کیسے بانٹ سکتی ہوں شکیل۔ کاش تمہارا یہ غم بھی میرا مقدر بن جائے۔''

''کوئی کسی کی آگ میں نہیں جلتا سائرہ۔ سبھی کو اپنی آگ میں خود ہی جلنا پڑتا ہے۔''

''ہاں اب پچھلے کئی دنوں سے ساون کی برکھا دن رات آنسو برسا رہی ہے۔ لوگ اب اس کے آنسوؤں سے بھی بیزار ہونے لگے ہیں، ہونہہ بیری دنیا۔'' وہ زمانے کی بے حسی پر تلملا اٹھی۔ اسی لمحے ساون کی ٹپ ٹپ شروع ہوچکی تھی۔

''میں کتنی بے بس ہوں شکیل! کہ چاہتے ہوئے بھی تم سے نہیں مل سکتی۔ جب بھی موقع ملا میں آؤں گی۔'' وہ جذبات کی رو میں بہنے لگی۔

''مل کر کیا کرو گی سائرہ۔ ہر بات تو فون پر ہوسکتی ہے پھر بھلا اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''نہیں شکیل! میں ایک بار تم سے روبرو ملنا چاہتی ہوں۔ بہت سی باتیں ہیں جو میں تمہارے روبرو بیٹھ کر کرنا چاہتی ہوں۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ زیادہ پریشان نہیں کروں گی۔''

''نہیں سائرہ۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ تمہیں یہاں آنے میں پریشان نہ ہونا پڑے۔''

''اگر کچھ پریشانی اٹھانا بھی پڑی تو میں اٹھالوں گی۔ اچھا تو بائے....'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سائرہ مجھ سے ملنے پر بضد ہوگئی تھی۔ تم بھی تو اس سے روبرو ملنا چاہتے ہو۔ یہ آواز میرے من سے آئی۔ ایسے میں ایک پردہ نشین ایک بچے کے ہمراہ شاپنگ کو آگئی۔ لمحے بھر کو مجھے یوں لگا جیسے سائرہ آ کھڑی ہوئی ہو۔ پھر اس کے بعد جو بھی پردہ نشین اکیلی دکان پر آتی مجھے لگتا وہ آگئی۔ ادھر فون کی ہر گھنٹی میری رگوں میں تلاطم برپا کر جاتی۔ عجیب حالت ہوئی جارہی تھی۔ آخر میں سائرہ سے اتنا امپریس کیوں ہوتا جارہا ہوں۔ اس کی شخصیت میرے من کی گہرائیوں میں کیوں اترتی جارہی ہے۔ پل پل اس کی یاد مجھے کیونکر بے قرار کرنے لگی ہے؟

میں انہی سوچوں میں ڈوبا تھا کہ چھوٹی بہن فوزی نے آکر بتایا کہ بھیا لاہور سے آنٹی منور آرہی ہیں۔ امی کہہ رہی ہیں کہ آپ انہیں اسٹیشن سے لے آئیں۔'' میں نے چھوٹے بھائی عدیل کو دکان پر چھوڑا اور موٹر سائیکل لیے اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ گاڑی پون گھنٹہ لیٹ تھی۔ میں کچھ دیر بکسٹال پر کھڑا رسائل کی ورق گردانی کرتا رہا پھر ایک خیال بجلی کی صورت میرے ذہن میں کوندا۔ اگر سائرہ کا فون آگیا تو کیا ہوگا۔ میں نے خود نزدیکی پی سی او سے دکان پر نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو..... عدیل۔ میں شکیل بول رہا ہوں، گاڑی ابھی لیٹ ہے، میرا فون تو کوئی نہیں آیا؟''

''نہیں بھیا! فون تو نہیں آیا۔ لاہور والی پارٹی بل لینے آئی تھی۔ ابھی بازار سے ہوکر واپس آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے، اور ہاں! کوئی عورت میرا پوچھنے آئے تو اسے بٹھالینا، کوئی کال آئے تو کہہ دینا میں اسٹیشن تک گیا ہوں، ابھی آجاؤں گا۔''

''اچھا بھیا!'' عدیل نے کہا۔ میں نے ریسیور رکھا۔ رسٹ واچ کی سوئیاں جام سی ہوکر رہ گئی تھیں اوپر سے بوندا باندی نے حشر کر رکھا تھا۔ لگتا تھا اب کی بار پورا ساون اسی طرح گزرے گا۔ خدا خدا کر کے ٹرین پہنچی۔ ذرا سی دیر بعد میں خالہ کو لیے گھر چلا آیا۔ خالہ نے بتایا لاہور سے بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ وہاں بھی پورے زوروں سے ساون کی جھڑی لگی ہے ....گھر پہنچتے ہی میں دکان پر جا بیٹھا۔

''کوئی آیا تو نہیں...؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں بھیا۔'' عدیل نے کہا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہر پل یہی لگتا تھا کہ ابھی فون کی گھنٹی بج اٹھے گی مگر اس روز کم بخت فون اس کا پیغام نہیں لا رہا تھا۔ رات دیر گئے تک بیٹھا رہا۔ اگلے دن کی دوپہر بھی ڈھل گئی۔

''یا الٰہی کیا ماجرا ہے؟'' میں فون نہ آنے پر پریشان ہو گیا تھا۔ آج کچھ عرصہ تیز دھوپ نکل رہی تھی۔ پھر بادل گھرے ہونے شروع ہو گئے۔ دوپہر سے شام ہو گئی، میری بے قراری حد سے بڑھ گئی۔ پھر دوسری گھنٹی بجی تو میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو شکیل! بھئی سوری، کل سے فون نہ کر سکی، دراصل خالہ مجھے ایک دعوت پر لے گئی تھیں۔ رات بھی ہمیں وہاں ٹھہرنا پڑا۔ پھر آج ذرا موسم صاف تھا اس لیے شاپنگ ہوتی رہی، باوجود کوشش کے فون نہ کر سکی کہ خالہ ساتھ ساتھ لگی تھیں۔ تم نے برا تو نہیں منایا۔'' اس نے پہلی ہی سانس میں میرے پوچھے بغیر میرے ہر سوال کا جواب دے دیا۔

''ہاں.... وہ.... انتظار کرتا رہا، رات بھی اور آج دن کے چودہ گھنٹے بھی۔'' میں نے مختصر کہا۔

''اوہ.... لگتا ہے کافی برہم ہو مجھ سے، جبھی تو میری غیر حاضری کے لمحوں کا حساب بھی لگا رکھا ہے۔ یقین جانو شکیل! میں خود کل سے کتنی پریشان رہی۔ آپ اس بات کا اندازہ لگالیں کہ کل صبح دس بج کر سولہ منٹ پر ہماری بات ختم ہوئی تھی اور آج چھ بج کر بیالیس منٹ پر ہم ایک دوسرے سے مخاطب ہیں یعنی پورے بتیس گھنٹے اور چھبیس منٹ تک سلسلہ منقطع رہا جس کے لیے ہاتھ باندھ کر معذرت چاہتی ہوں اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ.... اوکے۔''

''تمہارے ذہن میں کیلکولیٹر نصب ہے کیا؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی ایک ایک منٹ اکاؤنٹ رکھتی ہو۔'' میں نے اس کے ذہن کی داد دیتے ہوئے کہا۔ ''کمال ہے۔ خیر، اور سنائیں تازہ ترین کیا پروگریس ہے۔'' میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا بتاؤں شکیل! کل خالہ مجھے لے کر اپنے جس جس عزیز سے بھی ملیں، میری تعریفوں کے پل باندھتی رہیں کہ یہ میری ہونے والی بہو ہے۔ میں نے تمام عرصہ سیاہ چشمہ پہنے رکھا تا کہ خود کو سب کے تمسخر سے بچائے رکھوں۔''

''سائرہ! تم کچھ کچھ احساس محرومی کا شکار بھی ہو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''شاید..... دراصل میں کچھ کچھ منہ پھٹ بھی ہوں اور حساس بھی۔ کسی کی چوٹ برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے شوق، میری پسند، میری فطرتیں کچھ عجیب سی ہیں۔ مثلاً مجھے کھانے میں نمکین چیزیں پسند ہیں۔ موسموں میں ساون رت یا پت جھڑ کا سماں، رنگوں میں ہلکے رنگ زیادہ پسند ہیں۔ نیلے اور زرد پھول اچھے لگتے ہیں، مطالعہ اور موسیقی سے لگاؤ ہے، کلاسیکل میوزک زیادہ سنتی ہوں، اپنی مرضی کے خلاف فیصلے اچھے نہیں لگتے، صاف گو لوگوں سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، کبھی بالکل تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ اب خدا جانے آپ کو میری عادات جان کر کیسا لگا.....!''

''اپنے اپنے شوق اور پسند کی بات ہے۔ اب مجھے کھانے میں میٹھی چیزیں، پہننے میں پھیکے رنگ، موسموں میں سرما کے سارے رنگ، میوزک میں پرانے کلاسیکل گیت، ہنگاموں سے زیادہ تنہائی، سیاحت کا بہت شوق ہے، سرمئی بادل، اونچے پربت، گہری وادیاں، بل کھاتی ندیاں، پرندوں کی چہکار، صاف گو مخلص دوست پسند ہیں اس لیے دوستوں کا حلقہ محدود ہے۔ زیادہ باتونی لوگ اچھے نہیں لگتے۔''

پھر تو میں بھی باتونی ہوں۔'' وہ میری بات کاٹ کر بیچ میں بول پڑی۔

''لیکن تمہاری باتوں میں کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ شروع کی چند کالوں نے مجھے بیزار کیا تھا۔''

''وہ تو مذاق تھا..... واقعی میں نے آپ کو بہت تنگ کیا جس کا مجھے جلد ہی احساس ہو گیا تھا۔''

اگلے چند روز تک وہ پابندی سے دن میں دو مرتبہ فون کر کے ڈھیروں باتیں کرتی رہی۔ پھر میں دو دنوں کے لیے لاہور مال لینے گیا تو وہاں بھی اس کی یاد نے مجھے بے چین کیے رکھا۔ میں اسے بتا کر گیا تھا کہ وہ دو دن تک فون نہ کرے۔ لاہور سے واپس آیا تو خانیوال

ایک شادی میں شرکت کے لیے جانا پڑا۔ دو دن وہاں لگ گئے۔

واپس آیا تو اسی شام سائرہ نے بتایا کہ میں کچھ زیادہ ہی غیر حاضریاں کرنے لگا ہوں۔ اس نے یہ تمام عرصہ میرے بن کیسے گزارا، ساون کی رم جھم نے اسے کتنا رلایا۔ میں نے وعدہ کیا کہ اب غیر حاضریاں ہرگز نہیں کروں گا، تب جا کر وہ مانی۔

اگلے دن دوپہر کو سائرہ کا فون آیا کہ امجد کا خط آیا ہے۔ وہ اسی ماہ کے آخر میں وطن واپس آ رہا ہے۔ اس کے آنے کی اطلاع نے گھر میں ہلچل مچادی ہے، دوسرے لفظوں میں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ابو بھی امی کو لیے آج شام کو پہنچ رہے ہیں اس لیے میں اب زیادہ فون نہ کرسکوں گی۔

''شکیل! میں بہت پریشان ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔'' وہ پریشان محسوس ہو رہی تھی۔

''میں جلد سے جلد تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ جب تک میں تم سے مل نہ لوں میں اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی، میں کوشش کر رہی ہوں کہ آج تین چار بجے کے درمیان تم سے ملنے آؤں کیونکہ اس عرصہ میں خالہ انکل کے ساتھ بازار جا رہی ہیں۔ تم دوکان پر میرا انتظار کرنا۔''

''ٹھیک ہے، میں دوکان پر ہی ہوں،'' میں نے کہا اور فون خاموش ہوگیا۔

☆......☆

اس وقت ایک بجنے کو تھا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد سائرہ مجھ سے ملنے آ رہی تھی۔ اف..... میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ نہ جانے مجھ سے مل کر وہ کیا فیصلہ کرنا چاہتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کسی امتحان میں ڈالنا چاہتی ہے۔ دو بجے کچھ لیڈیز آگئیں۔ میں نے جلدی جلدی ان کو نمٹایا پھر اور گاہک آگئے۔ میں عجیب سی اضطراری کیفیت سے بار بار دروازے سے باہر گلیوں کے چوک میں نظر اٹھا کر دیکھ لیتا۔ پھر تین بجے تو میری دھڑکنوں میں تبدیلی آگئی، ایک ایک پل گزارنا مشکل ہوگیا۔ ایک دیہاتی کچھ چیزیں خریدنے چلا آیا۔ وہ مجھ سے کچھ طلب کرتا، میں اسے کچھ اور دکھا دیتا۔ تین بج کر نو منٹ ہوگئے تو گلی میں رکشے کی آواز نے مجھے چونکا دیا، میں نے دیہاتی کا بل کیلکولیٹ کیا اور ساتھ ہی دروازے سے باہر جھانکا۔ ایک برقع پوش رکشے سے اتر رہی تھی، اس کا سیاہ چشمہ دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق سے باہر آنے لگا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی سیدھی دوکان پر آنے لگی۔ دیہاتی نے کاؤنٹر چھوڑا تو وہ کاؤنٹر پر پہنچ گئی۔ ادھر سورج کے سامنے گہرا بادل آگیا۔

''السلام علیکم.....'' سر کو ہلکی سی جنبش دے کر اس نے دھیرے سے کہا۔ برقع کا نقاب اور سیاہ چشمہ مل کر حشر برپا کر رہے تھے۔ میں نے جواباً سلام کیا۔

''جی شکیل۔'' میں نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر چلی آئی اور آخری کونے میں جا بیٹھی۔

''کوئی دقت تو پیش نہیں آئی آنے میں.....؟''

''جی ..... جی نہیں۔ میں بڑی جلدی میں آئی ہوں۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھ سکوں گی۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''کیا پئیں گی.....؟''

''ک ..... کچھ نہیں۔'' اس نے نقاب اتار دیا۔ اندھیرے میں اجالا ہوگیا۔ مگر میں نے سامنے کھڑے بچے کو پروگرام کے تحت اشارہ دے دیا، وہ چلا گیا۔

''آپ کو یقین تھا..... میں آؤں گی.....؟''

''سو فیصد۔'' میں نے کہا۔ باہر گہرے بادلوں کا ملگجا سا اندھیرا چھا گیا۔ موسم بڑا گڑبڑ لگ رہا تھا۔

''اس بار ساون رت کچھ کر کے رہے گی۔'' اس نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا اور رومال سے آنکھیں صاف کرنے لگی جس سے اس کی کلائی کی چوڑیاں چھنکنے لگیں۔

''ہاں! ساون رت کی نیت اب کی بار کھل کر برسنے کی ہے۔'' میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھنے میں بے پناہ جھجک محسوس کر رہی ہے۔

''ہاں تو شکیل! میں اپنے متعلق جو بھی فیصلہ کروں اس میں میرے ساتھ..... کچھ معاونت کرو گے۔'' اس نے نظریں مجھ پر گاڑ دیں اور پوچھا۔ صرف ایک آنکھ ہلکی سی بھینگی تھی جو کچھ زیادہ بھی بری نہ لگتی تھی۔

''میں جس قابل بھی ہوا آپ کے کام آنے میں خوشی محسوس کروں گا۔''

''آ.....آپ میرے چہرے کی بدصورتی دیکھ کر بیزار تو نہیں ہوئے۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

''بخدا ہرگز نہیں، بلکہ میں تو کہوں گا کہ آپ نے ایسے ہی ذہن پر ایک خوف سا بٹھا رکھا ہے ورنہ کوئی بھی آپ کی صورت دیکھ کر بیزار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' میں نے اسے سہارا دیا۔ ایسے میں لڑکا کولڈ ڈرنک لے آیا۔

''یہ کیا تکلف کیا آپ نے...؟ میں نے منع بھی کیا تھا۔'' وہ تکلف پر اتر آئی۔

''تکلف کی کیا بات ہے، پانی ہی تو ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور بوتل اسے تھما دی۔

''شکیل صاحب! اگر میں آپ سے کچھ مانگوں تو آپ انکار تو نہیں کریں گے.....؟''

''بھئی! آپ ہر بات تکلف سے دور رہ کر کریں۔''

''نصرت کے بعد آپ نے اپنے لیے کسی منزل کا تعین کیا؟''

''ہاں.....وہ.....ایک دو جگہ بات چل رہی ہے، حتمی فیصلہ ابو کے آنے پر ہوگا۔'' میں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، آپ نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ دوبدو کرلیا ہے۔ اب میں بھی اپنی مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرسکوں گی۔'' اس نے بوتل کے آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''جو بھی فیصلہ کریں، کرنے سے پہلے ہو سکے تو مجھے بتا دینا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، فون پر رابطہ رہے گا، لیکن آج شاید بات نہ ہو سکے۔ اچھا اب میں چلوں گی۔'' وہ چشمہ پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے فوراً دراز میں رکھا ننھا سا پیکٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا...؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''کچھ نہیں، ایک حقیر سا تحفہ ہے، دراصل ہماری ریت رہی ہے جو پہلی بار ہمارے گھر آتے ہیں ہم خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے، کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی چیز تحفہ سمجھ کر دے دیتے ہیں، پلیز.....آپ انکار نہ کریں۔''

''ہے تو زیادتی مگر.....آپ کی خوشی کے لیے انکار نہیں کروں گی۔'' اس نے پیکٹ تھام کر کہا۔ ''شکریہ۔ ہاں تو رکشہ کہاں سے ملے گا۔'' اس نے پوچھا۔

''کہاں جائیں گی آپ؟'' میں نے سوالیہ پوچھا۔

''بخاری چوک۔''

''ٹھیک ہے آئیں۔''

ہم ایک ساتھ چل دیے۔ مشرقی گلی ہی میں رکشہ مل گیا۔ میں نے ڈرائیور کو بخاری چوک کا کہہ کر پیسے رکشا والے کو تھما دیے جس کا سائرہ کو پتا نہ چلا۔ کوئی بیس منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔

''شکیل! تم نے اتنی قیمتی جیولری کا تحفہ دینے کے بعد دوسری زیادتی رکشے والے کو کرایہ دے کر کی۔ یہ بری بات تھی۔ میں تو رکشے والے سے الجھ پڑی کہ تم نے کرایہ اس سے کیونکر لیا۔''

''پھر کیا ہو گیا سائرہ۔ میں نے کون سا ہوائی ٹکٹ لے کر دیا ہے۔ تم یہ بتاؤ خیریت سے گھر پہنچ گئیں نا۔''

''ہاں۔ انکل اور آنٹی سے پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ کبھی وقت آنے پر آپ کا یہ بدلہ چکاؤں گی ضرور۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

فون پر ملاقاتوں کے بعد سائرہ سے سامنے بیٹھ کر چھوٹی سی ملاقات نے اس کی شخصیت کو میرے سامنے کچھ اور نکھار دیا۔ وہ میرے بارے میں مستقبل میں چل کر کیا رائے رکھتی ہے۔ کیا میں اس کی توقعات پر پورا اتر سکوں گا، میں خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔

☆......☆

اگلی صبح اس نے مجھے پوری تفصیل سے بتایا کہ امی اور ابو رات آئے تھے، آج چار بجے سہ پہر واپس لوٹے ہیں۔ رات جو ان کی خالہ اور انکل سے بند کمرے میں باتیں ہوتی رہیں، آج دوپہر کو مجھے بھی اپنے درمیان بلایا گیا۔ ابو نے مجھ سے کہا کہ سائرہ! امجد چند دنوں تک یہاں پہنچ رہا ہے۔ اس کے آتے ہی ہم تمہارا اس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ تمہاری امی بیمار رہتی ہیں، میری پنشن سے بمشکل گھر کا گزارا چل رہا ہے، ہمیں کافی پیسوں کی ضرورت ہے۔ کمروں کی حالت بھی خستہ ہو چکی ہے، انہیں بھی سنوارنا ہے۔ ویسے بھی تمہاری جائیداد میں تمہاری ماں کا برابر حصہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنی ماں کا حصہ ان کے نام

انتقال کر دو، باقی حصہ میں کچھ تمہیں امجد کے نام کروا دینا چاہیے تا کہ بیٹا کل کو وہ تمہیں کسی اذیت میں مبتلا نہ کرے، تمہاری آنکھیں تمہارے چہرے کو کچھ بدصورت ظاہر کرتی ہیں، ہمیں ڈر ہے کہ امجد تمہیں کبھی اس بدصورتی کا طعنہ نہ دے۔ اگر وہ تمہاری جائیداد میں تمہارا شریک دار ہو گیا تو ہمیں یقین ہے وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا، اس لیے یہ کام ہم چاہتے ہیں جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے۔''

''ہاں بیٹی .... ہم تو تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔ میں تمہاری ماں ہوں، مجھے تمہارے اچھے مستقبل کی فکر رہتی ہے۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ تمہیں اس پر قطعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''لیکن امی! مجھے اس بات پر اعتراض ہے۔ اس بات کا مطلب صاف ہے کہ یہ لوگ صرف اور صرف میری جائیداد کی وجہ سے مجھے اپنانا چاہتے ہیں۔ میری بھینگی صورت انہیں ہرگز گوارا نہیں۔ اگر شادی کے بعد امجد نے مجھے ٹھکرا دیا تو ہم کیا کر لیں گے۔ جائیداد بھی جائے گی اور میرا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔'' میں نے چیخ کر احتجاج کیا۔

''یہ تمہاری بھول ہے سائرہ! جو بات ہم سوچتے ہیں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کیا تم اپنی ماں کے حق سے بھی اسے محروم رکھنا چاہتی ہو۔'' ابو نے تلملا کر کہا۔

''میں نے یہ کب کہا ہے کہ ماں کو محروم رکھنا چاہتی ہوں۔ جب تک ان کی زندگی ہے میں ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کو تیار ہوں۔ ابھی میں ان کے علاج کے لیے اور دکان کی مرمت کے لئے رقم کا چیک دے دیتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں چیک کی ضرورت نہیں ہے، بات بینک بیلنس کی نہیں، جائیداد کی ہو رہی ہے۔ کیا جائیداد پر میرا کوئی حق نہیں....'' اب کی بار امی نے خفگی سے کہا۔

''دیکھیں امی! میں آپ کو صاف بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کا میرے ابو کے ساتھ سلوک اچھا رہتا تو وہ کبھی آپ کو اپنی جائیداد سے محروم نہ رکھتے۔ پھر آپ نے ان کی موت کے چھ ماہ بعد اپنا نیا ہمسفر چن لیا۔ اس وقت میں آپ کو نظر نہ آئی کہ آپ نے بیٹی پر سوتیلے باپ کو مسلط کر دیا۔ اب آپ کو اپنا حق یاد آ رہا ہے۔ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر سکتی ہوں، آپ مجھ پر احسان نہ کریں۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کو ایک لاکھ روپیہ دے سکتی ہوں، وہ بھی اس لیے کہ آپ میری ماں ہو۔'' میں غصے میں بھر کر تمام باتیں کہہ گئی۔

''یہ تم کہہ رہی ہو سائرہ! اپنی ماں پر طنز کر رہی ہو۔ مت بھولو کہ تم ابھی خود مختار نہیں ہو۔ تمہارے مستقبل کا فیصلہ ہم نے کرنا ہے، بغاوت کرو گی تو میں عدالت سے رجوع کر کے اپنا حصہ وصول کروں گی، جس سے زمانے بھر میں تمہاری رسوائی ہوگی۔'' امی مجھے پچھاڑتے ہوئے بولیں۔

''بیگم! تم جذبات میں نہ آؤ۔ ہم سائرہ پر کوئی دھونس نہیں جمائیں گے۔'' ابو نے ایک نیا لقمہ دیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! ایسے فیصلے غصے اور جذبات میں نہیں کیے جاتے۔ تم مزید سوچ لو، فی الحال جتنی رقم تم نے خود کہی ہے اتنی ہی دے دو، باقی سوچ سمجھ کر اپنا فیصلہ سنا دینا۔''

''میں تو فیصلہ کر چکی ہوں۔ اگر آپ ابھی لاکھ روپیہ لینا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن پھر زندگی بھر مجھ سے آپ ایک روپیہ بھی نہیں مانگ سکیں گے۔'' میں اپنے فیصلے پر اڑ گئی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جیسے تمہاری خوشی۔'' ابو جلدی سے بولے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو عبید علی!'' امی نے حیرانگی سے کہا۔

''تم چپ رہو بیگم، بٹیا رانی جو کر رہی ہیں کرنے دو۔ اب ہم اس پر زور تو نہیں دے سکتے۔ امجد سے شادی پر بھی اگر وہ رضامند نہیں تو ہم زور نہیں دیں گے۔ ویسے ہم نے اس کی بہتری کے لیے ہی امجد کا انتخاب کیا تھا۔ ابھی وقت ہے مزید سوچ لے۔'' ابو نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔

میں فوراً اندر گئی اور لاکھ روپے کا چیک دستخط کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ اب امی بھی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے بھی ماں کو خوش دیکھ کر اطمینان سا ہو گیا، پھر نہ جانے وہ خالہ اور انکل سے کیا باتیں کر کے مجھے پیار دے کر چلے گئے۔ اب مزید قدم امجد کی آمد کے

بعد اٹھاؤں گی۔ بہرحال آپ بتائیں کہ میں نے یہ سب کچھ صحیح کیا ہے....؟'' ایک طویل گفتگو کے بعد سائرہ نے پوچھا۔

''تم نے تو بھرپور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت ہی اچھا کیا۔ اب ان سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی، لیکن تمہارے ابو کا ایک لاکھ کی پیشکش کو مان جانا اور تمام باتیں سن کر ہمدردانہ رویہ رکھنا میری نظر میں بہت دوررس نتائج رکھتا ہے، مثلاً تمہاری ماں کی خواہش کے باوجود اس نے ایک لاکھ پر بات طے کرلی۔ ہوسکتا ہے وہ اسی رقم سے عدالت کا رخ کرکے کل کو تمہارے لیے کوئی مشکل پیدا کردے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہاں! ان دونوں کی آخر میں مشترک رضامندی ظاہر کررہی تھی کہ وہ مجھ سے دلی طور پر خوش نہیں جارہے، بہرحال یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور میں ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتی ہوں۔ بہرحال ان پر آج یہ بات روزِروشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ میں اب ان کے اختیار میں نہیں ہوں بلکہ خودمختار ہوں۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں نے کہا اور ایک طویل کال اختتام کو پہنچی۔

☆......☆

اگلے چند روز تک اسی بات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میرے پوچھنے پر سائرہ نے بتایا کہ خالہ اور انکل کا رویہ میرے ساتھ بدستور پہلے جیسا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے خلاف ان کے سامنے کوئی بات نہیں کی گئی۔

ساون کے بادل برستے رہے، بھادوں نے بھی اپنا آغاز گھن گرج سے کیا، فون کی گھنٹی بجتی رہی اور سائرہ کا سلسلہ کلام مجھ سے برابر جاری رہا۔ پھر وہ دن بھی آپہنچا جس دن سائرہ کے منگیتر نے گھر پہنچنا تھا۔ خالہ اور انکل اس کے استقبال کو ایئرپورٹ گئے اور سائرہ نے اس عرصے میں مجھ سے فون کا ناتہ جوڑے رکھا۔

''کیا امجد کی آمد پر بھی فون کا رابطہ اسی طرح رہے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، امجد میری ذاتی مصروفیات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔'' سائرہ نے بتایا۔

''مگر شریک سفر بن جانے کے بعد تو ایسا کرنے سے روک سکتا ہے۔''

''ہاں، وہ بعد کی بات ہوگی۔''

اور شام کو وہ پھر مخاطب ہوکر کہہ رہی تھی کہ دیکھ لو.....امجد آگیا ہے مگر میں آپ سے پہلے کی طرح ہم کلام ہوں۔ امجد کچھ تحائف لے کر آیا ہے میرے لیے.... ہمارا سامنا پہلی بار ہوا ہے۔ ہم نے کھانا بھی ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا ہے۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں ہوں اور وہ باہر عزیزوں اور چند دوستوں میں بیٹھا ہے۔'' سائرہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

اگلی صبح دس بجے وہ رات کے چار پہر کی آپ بیتی سنا رہی تھی کہ رات دس بجے امجد مجھ سے ملنے آیا۔ کہہ رہا تھا کہ تم میری سوچوں سے زیادہ حسین ہو، تمہیں پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے، شادی کے بعد میں جلد ہی تمہیں اپنے ساتھ تبوک لے جاؤں گا، دو سال بعد معاہدہ ختم ہوگا، پھر ہم مستقل یہاں آباد ہوجائیں گے۔''

میں نے اسے صاف کہہ دیا کہ ''دیکھو! اگر کل کو تم نے میری بدصورتی کے مجھے طعنے دینے ہوں تو ابھی سے بتادو، مجھے تم سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔''

''نہیں، نہیں سائرہ! ایسی کوئی بات دل میں بھی نہ لاؤ۔ میں زندگی میں کبھی تمہاری اس کمی کا تمہیں احساس نہیں دلاؤں گا۔'' امجد نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''اگر میں اپنی جائیداد اپنے ہی نام رکھوں تو اس پر آپ کو کوئی اعتراض ہوگا....؟''

''مگر.... امی ابو بتارہے تھے کہ تمہارے والدین نے تمہاری آدھی جائیداد میرے نام کرنے کا وعدہ کررکھا تھا۔'' امجد نے کچھ جھینپ کر کہا۔

''جائیداد میرے نام ہے امجد صاحب! اور میں نے آپ لوگوں سے کوئی وعدہ نہیں کررکھا۔ اپنے ماں باپ سے کہو کہ وہ اس سلسلے میں میرے والدین سے بات کرلیں۔ میں اس شرط پر آپ سے نکاح کروں گی کہ جائیداد میرے نام رہے گی۔ اگر یہ بات آپ کو گوارا نہ ہو تو وہ سوچ لیں، ورنہ میری طرف سے صاف انکار سمجھیں۔'' میں نے دوٹوک لفظوں میں بات کی۔

امجد کچھ سوچ میں ڈوبا اٹھ کر چلا گیا۔ صبح اس کے ماں باپ نے مجھے میرے والدین کا وعدہ یاد دلایا مگر میں نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو رات امجد کو بتا چکی تھی۔ اب وہ مجھے ساتھ لے کر امی ابو کے پاس جا رہے ہیں۔ میرا تمہاری وجہ سے جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا مگر مجبوری ہے۔ ویسے بھی میں اب مزید اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔ میں جان چکی ہوں کہ میرا فیصلہ ان لوگوں کو قطعی گوارا نہیں لیکن یہ مزید جستجو کرنا چاہتی ہیں مگر یہ کبھی اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ تم مجھے بھول نہ جانا شکیل، میں ہر روز تم سے فون پر بات کروں گی کیونکہ میرے لیے تمہاری اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ اچھا اب فیصل آباد پہنچ کر رابطہ ہوگا، خدا حافظ۔''

سائرہ نے بات ختم کرتے ہی اجازت چاہی اور لائن کٹ گئی۔

کوئی روز آپ کو اپنائیت سے ملے، دکھ سکھ کی باتیں کرے پھر اچانک ایک دن کہہ دے کہ اچھا آج میں تمہارا شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں تو دل کو کتنا دھچکا لگتا ہے، اس کا اندازہ مجھے اس لمحے ہوا۔ میں کچھ لمحوں کے لیے گم صم بیٹھا فون کو گھورتا رہا۔ میرے چار سو اداسی سی چھا گئی، لگتا تھا بہار کا ایک جھونکا سوکھے گلستان میں آیا اور اگلے ہی لمحے آگے نکل گیا، مگر سائرہ سے میرا رشتہ ہی کیا تھا۔ محض خلوص کا رشتہ۔ اجنبی مسافر بھی تو کچھ لمحے آپ کے پاس بیٹھ کر دکھ سکھ کی چار باتیں کر کے چلا جاتا ہے۔ اب اس کا غم دل میں پال لیا جائے کہ وہ کیوں گیا تو فضول ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا مگر آنے والے کئی دنوں تک فون کی خاموشی اور میری اداسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ساون کے بعد بھادوں بھی روتے برستے گزر گیا۔ مکیش کا گیت ''میں راہی بھٹکنے والا ہوں، کوئی کیا جانے متوالا ہوں'' دن میں کئی بار مجھے بیتے دنوں کی یاد دلاتا رہا۔ برسات کے بعد سردی کی آمد ہوگئی، سائرہ نہ جانے کہاں جا کر گم ہوگئی۔ ایک بار بھی اس نے فون نہ کیا۔

ایک دن ایسے ہی کہیں گم بیٹھا تھا کہ فون نے مجھے پکارا۔ ''ہیلو.... شکیل بول رہا ہوں۔''

''شکیل! میں سائرہ ہوں، آپ تو شاید مجھے بھول گئے ہیں مگر میں نے آپ کو ہمیشہ یاد رکھا مگر رابطہ نہ کر سکی، حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔ اس دن میں امجد کے والدین کے ہمراہ یہاں پہنچی تو انہوں نے میرے باپ پر زور دیا کہ سائرہ کو رضامند کرو۔ اس نے ہمیں صاف انکار کر دیا ہے۔ امی اور ابو پہلے تو مجھے سمجھاتے رہے پھر تشدد پر اتر آئے مگر میرا انکار برابر جاری رہا، مایوس ہو کر وہ لوگ واپس لوٹ آئے۔ میں کئی روز بیمار پڑی رہی۔ اس عرصے میں امی نے عدالت میں کیس کر دیا کہ مجھے حصہ ملنا چاہئے، میری صحت بحال ہوئی تو میں نے بھی اپنا وکیل کھڑا کر دیا۔ کیس ابھی زیر سماعت ہے، ادھر گھر میں رہنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ اگر کیس نہ چل رہا ہوتا تو میں سیدھی آپ کے پاس پہنچ جاتی مگر مجبوراً مجھے ایک سہیلی کے گھر ٹھہرنا پڑا جو تمہاری ہم نام ہے۔ ''شکیلہ''، پھر شکیلہ ہی نے ایک جگہ میرا رشتہ طے کر دیا۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں، لڑکا سرکاری ملازم ہے، تمہیں فون پر صرف یہ بتا رہی ہوں کہ پرسوں شام میرا نکاح ہے جس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔ تم نہ آئے تو مجھے بہت دکھ ہوگا کہ ایک اچھے دوست نے دوست کی خوشی میں شرکت نہ کی۔ اسٹیشن سے رکشہ لے کر اس پتے پر پہنچ جانا، میں انتظار کروں گی۔'' اس نے پتا دیا اور لائن کٹ گئی۔

مجھے ایک انجانی خوشی ہوئی کہ چلو سائرہ نے رابطہ تو کیا اور امجد کے چنگل سے بھی آزاد ہوگئی۔ اسے اچھی منزل مل رہی ہے تو مجھے ضرور اس کی خوشیوں میں شامل ہونا چاہئے۔ میں نے جانے کی تیاری کی اور جمعہ کی صبح فیصل آباد روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر مارکیٹ سے چند گفٹ خریدے اور مطلوبہ ایڈریس پر جا پہنچا۔ شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور پانچ بجے نکاح کا وقت بتایا گیا تھا۔ گلی میں نصب شامیانے کے قریب چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شاید بارات پہنچ چکی تھی، دروازے پر کھڑے دو نوجوان لڑکوں نے جو غالباً مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، مجھ سے بڑھ کر استقبال کیا۔

''آپ.....؟'' ایک نے بڑھ کر سوالیہ پوچھا۔

''شکیل!'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔

''تو آپ اوکاڑہ سے....؟''

''جی ہاں۔''میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''بھئی! کافی دیر سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ سائرہ باجی نے صبح سے مجھے پابند کر رکھا ہے کہ شکیل صاحب کو خصوصی طور پر ریسیو کرنا، خیر..... آپ بروقت پہنچے، اندر تشریف لے چلیے۔''اس نے میری مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ میں نے گفٹ پارسل اس کے حوالے کیے اور اندر بھرے ہال میں ایک خالی نشست پر جا بیٹھا۔ اسٹیج پر دلہا اپنے دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھا، تھوڑی دیر بعد وہی لڑکا میرے لیے کولڈ ڈرنک لے آیا جس نے مجھے ریسیو کیا تھا، اس نے کولڈ ڈرنک دیتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''شکیل بھائی! نکاح کے وقت آپ اندر جائیں گے، یہ سائرہ باجی کا حکم ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے دھیرے سے کہا اور کولڈ ڈرنک سے گھونٹ بھرنے لگا۔ ابھی کولڈ ڈرنک پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ مجھے وہی صاحب بلانے آ گئے۔

''شکیل صاحب، آئیے۔'' میں اس کے ہمراہ ہو گیا۔ نکاح خواں مولوی صاحب اور تین دوسرے شخص پہلے ہی باہر جا رہے تھے، ہم بھی ان کے ہمراہ ہی اندر پہنچے جہاں عورتوں اور بچوں کا میلہ لگا تھا۔ ہم ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچے جہاں سائرہ دلہن بنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھونگھٹ ٹکائے بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب نے نکاح کی اجازت چاہی، ایک معمر شخص نے اجازت دی اور مولوی صاحب نکاح پڑھانے لگے۔ وہ لمحے مجھ پر بڑے عجیب تھے، جیسے کوئی مجھ سے میرا سب کچھ چھین رہا ہے۔ نکاح ختم ہوا میرے ساتھی لڑکے نے رجسٹر پر پانچ حصوں پر سائرہ کے دستخط کروائے، سبھی لوگ جانے لگے تو مجھے روک لیا گیا۔

''سائرہ باجی! شکیل بھائی کھڑے ہیں۔'' میرے ساتھی نے سائرہ کو مخاطب کر کے کہا۔ تب سائرہ نے گھونگھٹ اٹھا دیا۔ دھیرے سے سر ہلایا، کھلتے گلاب کے چہرے پر حسن کی سرخی براجمان تھی۔

''شکریہ شکیل کہ آپ آئے.... آپ کھانا کھا کر جانا۔ سلسلہ ریسیور جاری رہے گا، شکریہ۔'' اس نے ہلکے تبسم سے کہا اور آنچل گرا لیا۔

''خدا آپ کو زندگی کے سفر پر خوشیوں سے نوازے۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور کمرے سے باہر چل دیا۔ کھانے کا پروگرام گھنٹہ بھر کے بعد ایک ہوٹل میں تھا۔ جاوید کے ساتھ ایک گاڑی میں ہم بارات کے ہمراہ ہوٹل پہنچے۔ پرتکلف کھانے کی دعوت سائرہ کی طرف سے دی گئی تھی۔ کھانے کے دوران بھی میں جانے کہاں کھویا رہا۔ پھر جاوید کے بے حد اصرار کے باوجود میں رات ہی واپسی کے لیے چل دیا۔ پانچ دن بعد سائرہ کا فون آیا۔

''کیسی ہو سائرہ....؟''

''ٹھیک ہوں۔''لہجہ کچھ سنجیدہ تھا۔

''نئے ہمسفر کا انتخاب.....کیسا رہا....؟''

''ایک عزیز دوست نے منزل چن کر دی ہے، ہمسفر بھی بظاہر تو اچھا ہے لیکن اس کی سوچ کچھ کاروباری معلوم ہوتی ہے۔''

''اچھی بات ہے، زندگی آسان رہے گی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔''اور کیا یہاں تو امجد والی صورت حال پیش نہیں آئی، اور تمہارے والدین نے اس موقع پر کیا کردار ادا کیا؟''میں نے پوچھا۔

''نہیں....امجد والی صورت حال یہاں درپیش نہیں آئی۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے.....بھی سرمایہ لڑکی کے نام ہی رہے گا۔ سائرہ ہماری ہے تو اس کی دولت بھی ہماری ہے، اور امی ابو نے شادی میں رسمی سی شرکت کی اور مہمانوں کی طرح مجھے رخصت کرتے ہی چلے گئے۔ میرے نکاح کی اجازت ابو نے ہی تو دی تھی۔ آپ بھی پاس کھڑے تھے۔''

''اچھا، اچھا، میں متعارف نہ تھا اس لیے نہ جان سکا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی شادی کی تمام رسومات تمہاری دوست شکیلہ کے گھر انجام پائیں۔''

''ہاں! تمام جھنجھٹ انہوں نے اٹھایا، جاوید شکیلہ کا بھائی تھا جس نے تمہیں گائیڈ کیا۔ اب خدا جانے وہ آپ کی تواضع بھی کر سکا یا نہیں۔''

''بھئی جاوید بہت ہی مخلص لڑکا ہے۔ میری بہت خدمت کی۔ ہاں تو اس وقت آپ کہاں ہیں؟''

''میں شکیلہ کے گھر ہوں، کل جاوید لینے آئے گا تو میں سسرال چلی جاؤں گی۔''

''اور مقدمے کی بات کہاں تک پہنچی....؟''

''کیس چل رہا ہے۔ میں نے اسلم سے بات کی تھی، کہہ رہا تھا میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ لیکن پیروی میں خود کروں گی۔''

''ہاں تو اور کچھ...؟''

''شکیل ایک بار تم نے کہا تھا کہ میں احساس محرومی کا شکار ہوں۔''

''ہاں۔''

''اور تم نے یہ خوف دل سے نکال دینے کو کہا تھا۔ لیکن شکیل! اسلم جب بھی میرے چہرے کی طرف دیکھتا ہے تو فوری نظریں چرا لیتا ہے۔ کیا اس کی یہ حرکت مجھے احساس کمتری کا احساس نہیں دلائے گی بھلا۔'' وہ روسی دی۔

''سائرہ پلیز.... ٹھیک ہو جائے گا۔ وہم ہوگا تمہارا۔ تم اسے اتنی محبت دو کہ وہ تمہاری ہر کمی کو بھول جائے۔'' میں نے اسے ڈھارس دی لیکن اس کی ہچکیاں فون کی آواز میں کہیں دب کر آنے لگیں جو میرے دل میں ایک گہری کسک چھوڑ گئیں۔ خدا سائرہ کو ہر غم اور محرومی سے دور رکھے۔ میرے دل سے دعا نکلی۔ سائرہ اپنے پیا کے گھر بس گئی تھی۔ میں ایک بار پھر اپنے شب و روز میں کھو کر رہ گیا مگر دن میں کئی بار اس کی یاد لمحے بھر کو ستا جاتی۔

اگلے دو ماہ بعد ابو پاکستان آئے تو میرے رشتے کے لیے گوجرانوالہ جا کر میرے ماموں کی بیٹی نرگس سے نہ صرف میری بات طے کر دی بلکہ ایک ماہ بعد شادی کا پروگرام بھی بنا ڈالا۔ اس ماہ میں دن رات بھاگ دوڑ لگی رہی۔ میں نے سائرہ اور جاوید کے نام کارڈ ڈاک میں روانہ کر دیے۔ دونوں کارڈ جاوید کے ایڈریس پر بھیجے کیونکہ براہ راست سائرہ کا ایڈریس یا فون نمبر میرے پاس نہ تھا۔ اب خدا جانے کیا بات ہوئی کہ شادی پر جاوید اور سائرہ دونوں میں سے کوئی بھی نہ آیا۔ مجھے بہت انتظار رہا مگر مایوس ہی رہا۔ نرگس چپکے سے میری دنیا میں داخل ہوگئی۔ اس کی قربت نے مجھے بہت سہارا دیا۔ پھر بھی کبھی کبھی میں کھو جاتا تو وہ

پوچھتی۔ ''شکیل کیا ہو جاتا ہے تمہیں....؟ باتیں کرتے کرتے کہیں کھو جاتے ہو۔ تم پر اداسی چھا جاتی ہے۔''

''ایسے ہی نرگس! میں شروع سے ہی کچھ سنجیدہ واقع ہوا ہوں، بس کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ میں تنہا سا ہو جاؤں، یادوں کے مناظر پر مسرت موقع مجھ پر اداسی سی طاری کر جاتے ہیں۔ جو لوگ اندر سے تنہا ہوں وہ ایسے مناظر میں اداس ہو جایا کرتے ہیں۔''

''کیا تم بھی اندر سے ویران اور تنہا ہو، میری محبت کہیں بھی تمہارے دل میں موجود نہیں....؟''

''نہیں نرگس! ایسی کوئی بات نہیں، تم مجھے عزیز ہو، میری بہترین رفیق ہو، پر کیا ہے نہ کہ جب کبھی چپ سا ہو جاؤں تو برداشت کر لیا کرو۔''

''یہ بات میرے بس میں نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم نصرت کو ابھی تک نہیں بھولے، میری قربت بھی اس کمی کو پورا نہیں کر سکی۔''

''نہیں نرگس! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے تم سے بہت پیار ہے۔ بس یہ تو ایسے ہی کبھی کبھی چپ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں'' میں اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور وہ مختلف وسوسے ظاہر کرتی رہتی۔

☆......☆

شادی کے دو مہینے بعد لاہور مال لینے گیا۔ واپسی پر عدیل نے بتایا کہ کسی سائرہ کا فون آیا تھا۔ میں نے بتایا شکیل بھیا لاہور گئے ہیں۔ اس نے کوئی پیغام نہیں دیا۔ عدیل نے بتایا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں اسے نہ مل سکا۔ پھر دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نرگس کو لینے سسرال گیا ہوا تھا۔ واپس پہنچا تو عدیل نے پھر سائرہ کے فون کا بتایا کہ گوجرانوالہ گئے ہیں، کوئی پیغام ہو تو دے دیجیے مگر اس نے صرف یہی کہا کہ شکیل کے آنے پر بتا دینا کہ سائرہ کا فون آیا تھا۔

''اس نے میرے گوجرانوالہ جانے کی وجہ نہیں پوچھی؟''

''نہیں....اور نہ ہی میں نے بتایا'' عدیل نے کہا۔

''اچھا.... آئندہ اگر کبھی میری عدم موجودگی میں اس کا فون آئے تو.... لیکن نہیں.... تم اس سے کوئی بات نہیں کرو گے، کوئی پیغام دے تو نوٹ کر لینا۔'' میں نے الجھ کر کہا۔ عدیل اس لمحے خاموش ہو گیا مگر اس نے

اپنی بھابی نرگس کو بتادیا کہ بھیا کے نام کسی سائرہ کا فون آیا تھا۔ پاگل سے عدیل نے ایسے ہی بات کردی جس کو نرگس نے گہرائی سے نوٹ کیا۔

''یہ سائرہ کون ہے؟'' اس نے رات کو مجھ سے پوچھا۔

''ک....کون....سائرہ؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''جس کے فون تمہارے نام آتے ہیں۔ مجھے عدیل بتارہا تھا کہ دو تین بار اس کا فون آچکا ہے۔''

''نرگس! وہ ایک مظلوم سی لڑکی ہے، فیصل آباد میں رہتی ہے، بے چاری کی گھریلو زندگی بڑی تلخ گزر رہی ہے۔'' میں نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

''لیکن تمہارا اس بے چاری سے کیا تعلق ہے؟'' نرگس نے جل کر پوچھا۔

''دیکھو نرگس! تم ایک ذرا سی بات کا برا اثر لے رہی ہو۔ وہ شادی شدہ ہے اور اپنے گھر میں رہ رہی ہے۔ میرا اس کے بھائی سے رسمی سا تعلق ہے۔ ایک بار سائرہ سے اس کے بھائی کے سامنے چھوٹی سی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آنکھوں سے بھینگی ہے، کوئی اسے قبول نہیں کرتا۔ پھر غیروں میں ایک جگہ اس کی شادی ہوگئی، اب پتا نہیں وہ کیوں فون کرتی ہے، ایک بار فون کیا تو میں لاہور مال لینے گیا ہوا تھا، دوسری بار آیا تو ہم دونوں گوجرانوالہ میں تھے۔'' میں نے اسے کچھ تفصیل فراہم کی کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوجائے۔ مگر عورت کی فطرت ہے کہ وہ شوہر کی ذرا سی کمزوری کو شک کا نام دے کر ایسا دل میں بٹھاتی ہے کہ ساری زندگی اس تیر کو دل سے نہیں نکال سکتی۔

''تمہارا ہر وقت کھویا کھویا سا رہنا، بات کرتے کرتے چڑ جانا، اداس گیت سننا، مناظر سے متاثر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تم سائرہ کی یادوں کے سہارے ہی جی رہے ہو۔'' نرگس نے مجھے جھنجھوڑا۔

''خدا کے لیے نرگس! اپنے من میں شک کا بیج پیدا نہ کرو، زندگی تلخ ہوجائے گی۔ میرا سائرہ سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ رقابت کی چنگاری من میں سلگا رہی ہو۔ شک کی اس چنگاری کو بجھادو نرگس۔ نہیں تو خود بھی پل پل سلگتی رہوگی اور مجھے بھی جلاتی رہوگی۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر وہ رونے پر اتر آئی تھی۔ ماحول گھمبیر سا ہوگیا تھا۔ میں نے اکتا کر کروٹ بدل لی۔ اس کی سسکیاں برابر گونجتی رہیں۔

صبح نرگس کا موڈ مجھ سے برہم تھا۔ اس نے میرے ساتھ بول چال ترک کردی۔ میں دوکان پر چلا گیا۔ مجھ پر خاموشی مسلط ہوگئی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی دوکان پر منگوا کر کھایا۔ رات نو بجے گھر پہنچا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ جانے کتنا رو چکی ہے۔ اس نے چپکے سے کھانا میز پر لاکر رکھا۔ پہلے وہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھاتی تھی۔ میں نے چند نوالے دوپہر کی طرح زہر مار کیے۔

''دیکھو نرگس! تم خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہی ہو۔'' سونے سے پہلے میں نے اسے منانا چاہا۔

''بات کافی بگڑ چکی ہے شکیل صاحب! میں نے میکے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے، تمہیں میری پروا ہی کیا ہے۔ لے آنا اپنی سائرہ کو جس کی زندگی تلخ گزر رہی ہے، اور تم یہاں اس بن اداس رہتے ہو۔''

''نرگس....!'' میں چیخ پڑا۔ ''اس سے زیادہ کچھ بات نہ کرنا۔ میں ایسا طنز ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔''

''آپ تو مجھے بھی برداشت نہیں کرسکتے، پھر میں کیوں رہوں یہاں....'' اس نے تکرار کی اور ساتھ ہی اشک بہانے لگی۔

''نرگس....خدا کے لیے، خدا کے واسطے اپنی اور میری زندگی کو زہر نہ بناؤ۔ سائرہ کے وجود کو آسیب نہ بناؤ، اچھی بھلی زندگی کو دوزخ میں نہ جھونکو، برباد ہوجائے گا سبھی کچھ....'' میں جھنجھلا کر رہ گیا۔

''تو میں برباد کررہی ہوں سب کچھ....! یہ سب میرا کیا دھرا ہے؟'' وہ روتے ہوئے بول اٹھی۔

''اوہ مائی گاڈ.....میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی پڑھی لکھی ہوکر اس قدر پستیوں میں بھی گرسکتی ہو، تمہیں اپنے شوہر پر....اس کی کسی بات پر اعتماد ہی نہیں ہے۔'' میں بے بسی سے دھاڑ کر رہ گیا، اور ایسے میں اچانک امی جان کمرے میں آگئیں۔

''یہ رات گئے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے شکیل آپ دونوں نے.....ایک گھنٹے سے تمہاری تکرار جاری ہے، کل سے تمہارا رویہ بدلا بدلا ہوا ہے، کیا ہوگیا ہے تمہیں؟'' امی جان نے حیرت سے پوچھا۔

نرگس امی کو دیکھ کر اور روتے ہوئے آہیں بھرنے

لگی اور ساتھ ہی امی جان کے سامنے مجھے بے عزت کرنے لگی۔

''امی.... میں شکیل کو پسند نہیں ہوں.... نفرت کرتا ہے مجھ سے.... نہیں چاہتا مجھے.... گلے پڑ گئی ہوں میں اس کے.... جب سے بیاہ کر آئی ہوں مجھ سے.... باتیں کرتے کرتے کہیں اور کھو جاتا ہے.... کہتا ہے میری مجبوری ہے.... آخر آپ نے اسے.... اس کی پسند کیوں نہیں لے کر دی....'' نرگس سبھی حدیں پھلانگ رہی تھی۔

''نرگس! حد سے بڑھ رہی ہو تم.... لگام دو اپنے آپ کو.... تمہارا خود یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔'' میں چیخ اٹھا۔

''شکیل.... کیا کہہ رہے ہو تم.... کیا سن رہی ہوں میں....؟''

''امی جان.... خدا گواہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں، کسی غلط فہمی کو شعلوں میں بدل رہی ہے یہ۔''

''ہاں ہاں، میرا دماغ خراب ہے جبھی تو میں غلط بات کو طول دے رہی ہوں۔'' نرگس میری بات کاٹ کر بولی۔

''بیٹی.... آخر ہوا کیا ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' امی نے تفصیل چاہی۔

''کوئی سائرہ نامی لڑکی ہے جو اپنے شوہر کے گھر تنگ رہ رہی ہے۔ وہ اسے فون کرتی ہے اور یہ اس کے خیالوں میں کھو کر مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔'' نرگس نے اپنے من میں چھپی چنگاری کو زبان کے چولہے میں رکھ کر ہوا دی جس کی تپش امی نے خود محسوس کی۔

''یہ سائرہ کون ہے شکیل؟ اور تمہارا اس سے کیا ناتا ہے....؟''

''امی! یہ میرے ایک دوست کی بہن ہے۔ بڑی مشکلوں سے اس کا ایک جگہ رشتہ ہوا تھا، لیکن اب وہاں اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ میں نے ایک بار اسے سمجھایا تھا کہ وہ حالات کا مقابلہ کرے۔ اب وہ میرے اسی خلوص کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے دوبارہ فون کیا ہے اور اتفاق سے میں دونوں مرتبہ ہی اسے نہیں ملا، بلکہ عدیل نے فون ریسیو کیا اور اس نے نرگس کو بتا دیا جس کا اس نے الٹا اثر لے کر بات کا بتنگڑ بنا دیا اور اب اپنا گھر برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔'' میں نے امی کو مطمئن کرنا چاہا۔

''جہنم میں جائے تمہارے دوست کی بہن، ٹھیکہ لے رکھا ہے تم نے اس کا.... خبردار جو آئندہ کبھی تذکرہ بھی ہوا اس کا اس گھر میں تو....'' امی نے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''اور نرگس بیٹی.... تم بھی جذبات میں اتنی آگے نہ نکل جاؤ کہ شوہر کی نظروں سے گر کر رہ جاؤ، تم مجھ سے تو بات کرتیں، میں خود ہی سنبھال لیتی سب کچھ.... اب کوئی شکایت نہیں ہوگی تمہیں....'' امی نے حاکمانہ لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ نرگس ایک بار پھر مجھے اذیت دینے والے آنسو بہانے لگی۔ لمحے بھر کو میرا جی چاہا کہ ابھی اسی وقت اسے آزاد کر دوں یا خود کو ختم کر لوں مگر میں زہریلے گھونٹ پینے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

☆......☆

صبح ناشتے پر نرگس پھر غصے میں ہر چیز کو پٹخ پٹخ کر رکھ رہی تھی۔ میں چپکے سے ناشتا کیے بغیر دوکان پر چلا گیا۔ عدیل کی میں نے اچھی خاصی درگت بنادی کہ اس نے یہ گھٹیا حرکت کیوں کی۔ اس نے معافی مانگی اور آئندہ محتاط رہنے کا کہا۔ دوپہر اور رات بھی نرگس کا موڈ برہم رہا۔ میں نے بھی اسے بلانے کی کچھ ضرورت محسوس نہ کی۔ چوتھے دن اس کی ماں چھوٹے بچے کے ساتھ ملنے آگئی۔ رکشے سے اتر کر سیدھی دوکان پر آئی، مجھے پیار دیا، خیریت پوچھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مختصر کہا اور وہ اندر چلی گئی۔ میں نے کھانے کا سامان گھر بھجوا دیا، خود گھر نہ گیا۔ کوئی چار بجے کے قریب عدیل نے آکر بتایا کہ امی سے خالہ اور نرگس بھابی کا جھگڑا ہو رہا ہے۔ میں اسے دوکان پر چھوڑ کر گھر پہنچا تو ساری فضا بدلی ہوئی تھی۔ ایک طرف امی تھیں اور دوسری طرف نرگس اپنی ماں کے مقابلے پر کھڑی تو تو میں میں کر رہی تھی۔ خالہ مجھے دیکھ کر چیخیں۔

''آ گئے اب تم بھی ماں کی حمایت کرنے ظالم انسان، تم میری بیٹی پر ظلم ڈھاتے رہے ہو، تمہاری ماں بھی حکم چلاتی ہے اس پر.... یہاں ایک پل بھی نہیں

رہنے دوں گی میں اسے۔''

''ہاں ہاں لے جائیں اپنی لاڈلی کو، ایسی بدزبان بہو کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔'' یہ امی کہہ رہی تھیں۔

''بدزبان ہوگی تُو اور تیرا سارا خاندان.... خبردار جو اب زیادہ زبان چلائی تو.....''

''امی پلیز.... کیا ہوگیا ہے آپ لوگوں کو....'' میں نے امی کی طرف بڑھ کر کہا۔

''ہاں.... ہاں، ماں کی زبان بند کراؤ، بیوی اور ساس عزیز ہیں نا تمہیں۔'' امی نے مجھے طعنہ دیا۔

''خالہ آپ ہی خاموش ہوجائیں۔ میری بات تو سن لیں۔'' میں خالہ کی طرف بڑھا۔

''اب تم مجھے کیا سنانا چاہتے ہو، تمہارے سارے کرتوت تو میں پہلے ہی سن چکی ہوں۔ چار دن سے میری بیٹی بھوکی پیاسی روتی رہی ہے اور رو رو کر وہ ہلکان ہوچکی ہے، اوپر سے تم ماں بیٹے نے اسے کوسنوں اور طنز کا نشانہ بنائے رکھا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ہمیں تمہاری۔ اگر تمہیں کوئی سائرہ مل سکتی ہے تو اسے بھی کوئی شکیل مل جائے گا۔'' خالہ حد سے بڑھ گئیں۔

''ہاں ہاں تمہاری چہیتی کو دوسرا خصم مل گیا تو ہم بھی ڈھونڈ لیں گے کوئی....'' امی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور میرا دماغ پھٹنے لگ گیا۔ امی اور خالہ بپھری ہوئی ایک دوسری پر بری طرح حملہ آور تھیں۔ پھر نرگس کپڑوں کا بیگ سمیٹ لائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنائیت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ خالہ جاتے ہوئے دروازے میں پلٹ کر مجھے کہہ گئیں کہ اب ادھر کا رخ نہ کرنا، ہمیں صرف تمہارے نوٹس کا انتظار رہے گا.... اور وہ چلی گئیں، شام گئے آشیاں کے مکین واپس لوٹ گئے اور میں جلنے کے لیے تنہا رہ گیا۔

رات امی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ کیسے نرگس کی ماں نے میری بات سنے بغیر جھگڑا شروع کردیا۔ نرگس اسے نہ جانے کیا کیا الٹی سیدھی سناتی رہی کہ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر مجھ سے تکرار پر اتر آئی۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ تو حد سے بڑھتی گئی۔ تب مجھے بھی غصہ آگیا، پھر تم نے خود دیکھ لیا کہ اس نے تمہیں بھی پچھاڑ کر رکھ دیا۔ تمہاری شادی کو ابھی چھ ماہ ہی گزرے ہیں، خود اس مختصر عرصے میں ہی نرگس نے زبان کھول لی۔ دید لحاظ تو نام کو نہیں رہا اسے۔ تم کوئی غم دل پر نہ لانا بیٹا۔ ٹھیک ہوجائے گا۔''

''مگر امی اس کا انجام کیا ہوگا؟'' میں نے آئندہ کے لیے پوچھا۔

''دیکھو شکیل! جہاں تک میرا خیال ہے فیروزہ اپنی بیٹی کو کبھی نہیں بھیجے گی، ہاں تمہارے ماموں ہیں، شاید وہ میری خاطر کچھ لحاظ رکھ جائیں۔ مگر فرض کریں اگر میرا بھائی مان بھی گیا تو فیروزہ بیٹی کو نہیں بسنے دے گی۔ نرگس کے لچھن بھی کچھ گھر بسانے کے نظر نہیں آتے۔ بہرحال ہمیں آنے والے وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔'' امی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆

''نرگس ماں بننے والی تھی۔ اسے کسی بھی بات کا خیال نہ رہا تھا۔ امی نے شاید ٹھیک کہا تھا کہ وہ گھر بسانا نہیں چاہتی ورنہ بھلا اپنی ماں سے سب باتیں کہنے کی اسے کیا ضرورت تھی۔ کچھ بھی نہ سوچا اس نے۔ میں کمرے میں پڑا تنہائیوں میں جلتا رہا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر نرگس کی ہنستی مسکراتی تصویر پڑی تھی۔ چار سو اس کی چیزیں رکھی تھیں مگر وہ سبھی کچھ چھوڑ کر جاچکی تھی۔ سائرہ نے اسے برباد کیا تھا، مگر نہیں سائرہ کا اس میں کیا قصور تھا۔ وہ تو جانے اپنے کن مصائب میں گزر رہی ہوگی کہ اسے میری یاد ہی بھول گئی تھی۔ کتنا عرصہ گزر چلا تھا، اس سے بات تک نہ ہوسکی تھی۔ عدیل نے تمام حالات نرگس کے ابو کو لکھ کر بھیجے، کوئی ایک ماہ بعد نرگس کے ابو ہمارے گھر آئے۔ کافی گلے شکوے کیے کہ تم نے فیروزہ کی گھر آنے پر بے عزتی کی۔ امی نے تمام صورت حال سے انہیں آگاہ کیا مگر انہیں یہ گلہ تھا کہ جو کچھ بھی ہوا شکیل کو میرے پاس آنا چاہئے تھا، نرگس اس کی بیوی ہے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں گھر میں جس کا یہ مطلب نہیں کہ لوٹ کر خبر ہی نہ لی جائے۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ میں صبح چلا جاؤں گا، شکیل اگلے چند دنوں میں نرگس کو لینے آئے۔ امی نے اس بات پر رضامندی ظاہر کردی۔ میں بھی انکار میں کچھ نہ بول سکا۔

اگلے دن میں گوجرانوالہ پہنچا۔ خالہ نے کافی

بحث کی۔ بالآخر نرگس کو تیار کر دیا گیا اور وہ میرے ہمراہ چلی آئی۔ میں نے اسے راستے بھر میں سمجھانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی کہ وہ شک کو دل سے نکال دے اور دو گھرانوں کو اجڑنے سے بچالے مگر وہ میری ہر بات کے جواب میں خاموش سی بیٹھی رہی۔

مگر گھر پہنچنے پر اس نے ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا کہ میں تمہاری ماں کے ساتھ نہیں رہ سکتی، اپنی ہر چیز بانٹ کر علیحدہ رہوں گی۔ یہ بات اس کی ماں نے بھی کی تھی مگر میں نے ابھی فوری ایسا کرنے سے معذرت کر دی تھی، مگر نرگس اس بحث پر اڑ گئی کہ میں ایک پل بھی ماں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ یہ میرے لیے قطعی ناممکن تھا کہ میں ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر ابھی سے علیحدہ گھر بسالوں۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ کم از کم ایک سال تو ایسا کرنا میرے لیے مشکل ہے مگر اس کا اصرار تھا کہ میں ایسا فوری نہیں کر سکتا تو اسے واپس چھوڑ آؤں۔ میں نے فوراً ماموں کو فون کر کے اس نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔

''کیا حرج ہے بیٹا! کھانا پکانا علیحدہ کر لو، باقی تم اپنے ماں باپ سے میل جول رکھو، نرگس خوش ہو جائے گی۔ بیٹا! آخر تمہیں ایک روز تو والدین سے علیحدہ ہونا ہی ہے نا۔'' ماموں نے بھی اپنی بیٹی کی طرف داری کی۔

''مگر ماموں میں نہیں چاہتا کہ ابھی سے ایک گھر میں دو چولہے جلنے لگیں۔ ابو پردیس میں رہتے ہیں، آخر لوگ کیا کہیں گے۔'' میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''لوگوں کی بات چھوڑو شکیل! اپنا گھر بسانے میں تمہیں ایسا کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ تم باپ بن رہے ہو، آخر کب تک ماں باپ کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے رہو گے۔'' ماموں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ میں نے امی سے بات کی کہ ماموں نے بھی مجھے فوری علیحدہ ہو جانے پر زور دیا ہے۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹا! تم اپنا گھر بساؤ، ہمیں خدا کا سہارا ہی کافی ہے۔'' امی کے لہجے میں کاٹ تھی۔

''مگر امی! میں کب ایسا کرنا چاہتا ہوں، میں نرگس کو تو چھوڑ سکتا ہوں مگر آپ لوگوں کو نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ساس اور بہو کے بعد بھاوج اور نند کا رشتہ ایسا ہوتا ہے جو ایک بار بگڑ جائے تو پھر زندگی بھر کے لیے خاردار راستہ بن جاتا ہے جس پر چلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ اب نرگس مجھے ایک ساس اور اس کی ماں اپنی نند سمجھ کر میری حریف بن چکی ہے جبھی تو انہوں نے اب یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ مجھے تمہاری علیحدگی پر کوئی اعتراض نہیں مگر بیٹا! اگر نرگس کی یہ بات مان لی گئی تو کل وہ تمہارے لیے کوئی اور مشکل کھڑی کر دے گی اس لیے جو بھی فیصلہ ہے تم نے خود کرنا ہے۔''

نرگس اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔ امی نے اپنا فیصلہ سنا کر مجھے ایسا کرنے کا اختیار دے دیا تھا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نرگس اپنے کمرے میں پڑی تھی۔ کھانا پکانے کا وقت ہو رہا تھا۔

''نرگس کھانا نہیں پکاؤ گی؟''

''علیحدہ سامان لا کر دے دو تو پکا دوں گی ورنہ کوئی ضرورت نہیں مجھے وہاں جا کر پکانے کی۔''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔

''ہاں!'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''تو پھر سن لو نرگس کہ میں وہ ہرگز نہیں کر سکتا جو تم چاہتی ہو۔ تم صرف برباد ہونا چاہتی ہو اور میں اب بھی ایسا نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے کمرہ چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نرگس نے بھوک ہڑتال کر دی اور گھر کو ماتم کدہ بنا دیا۔ صبح امی کی طرف سے ہم دونوں کا ناشتا آیا مگر نرگس نے اسے دیکھنا بھی پسند نہ کیا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ میں نرگس کے لیے بازار سے کھانا لے آیا مگر اس نے اسے بھی منہ نہ لگایا۔ دن بھر میں ڈپریشن کا شکار رہا۔

''امی! نرگس نے کل سے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا، گھر کی یہ گھمبیر صورت حال مجھے پاگل کر دے گی۔''

''ٹھیک ہے شکیل! میں اسے کل ہی ہر چیز علیحدہ بانٹ کر دے دوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری طرف سے کوئی بات دل میں لاؤ۔'' امی

نے ہار مانتے ہوئے کہا اور مجھے اپنے اندر کچھ توڑ پھوڑ سی محسوس ہونے لگی۔

اگلے دن ایک ہی گھر دو حصوں میں بٹ گیا۔ دکان میرے نام کردی گئی، گھریلو استعمال کی اشیا بھی امی نے بانٹ کردے دیں اور نرگس نے اپنا فیصلہ منوا کر گھر کا کام سنبھال لیا۔

زندگی کی ڈگر ہی بدل گئی۔ امی دلی طور پر خوش نہ تھیں، رفتہ رفتہ تعلقات میں کمی آنے لگی۔ پھر جب میرے ہاں بیٹی نے جنم لیا تو خالہ فیروزہ نرگس کی جوان بہن برجیس کو ساتھ لے آئیں اور پندرہ دن قیام کیا۔ اس تمام عرصے میں خالہ اور امی رسمی سا بھی ایک دوسرے سے نہ ملیں۔ حالات نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں دن بدن اپنی گھریلو مصروفیات میں الجھ کر رہ گیا۔ بچی کی ولادت پر میرے گھر والوں کا رویہ رسمی سا رہا۔ میں اپنی گھریلو زندگی کو ہنسی خوشی نہیں بلکہ ایک مجبوری سمجھ کر نبھا رہا تھا۔ ابو نے میرے اس قدم کا برا منایا اور خط میں میرے نام سلام تک لکھنا چھوڑ دیا۔ عدیل دوکان پر غیروں کی طرح آتا، جس سے مجھے کہیں جانا ہوتا دوکان بند کرنا پڑتی۔

☆......☆

ساون کی رت پھر پلٹ کر آ گئی، کالی مست گھٹائیں مجھے سائرہ کی یاد ہر روز دلانے لگیں جس سے میں پھر کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ رم جھم کے اس موسم میں بھی اس نے لوٹ کر آواز نہ دی تھی، جانے کہاں اور کس حال میں تھی۔ ممکن ہے وہ یکسر بھول گئی ہو۔ یہ سوچ کر میرے دل سے ہوک سی اٹھتی، پر کہتے ہیں نا جس کو دل کی گہرائیوں سے یاد کیا جائے وہ ضرور ملتا ہے۔

ساون کو آئے ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا، میں دوکان پر بیٹھا کچھ حساب کتاب کر رہا تھا۔ آسمان پر بادلوں کی چٹانیں سر نکالے کھڑی تھیں جن کے نیچے سست رو چیلیں بڑے بے پروائی اور آہستگی سے فضا میں دائرے بنا رہی تھیں کہ دکان کے عین سامنے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے ایسے ہی ایک اچٹتی نگاہ ادھر دوڑائی۔ گاڑی کی چھت پر دو بھاری بھرکم بیگ بندھے تھے۔ میں اپنے کام میں پھر مشغول ہو گیا۔

''السلام علیکم...'' کسی نے مجھے چونکا دیا۔

''وعلیکم السلام۔'' ادھیڑ عمر کا آدمی ہاتھ میں گاڑی کی چابی گھما رہا تھا۔

''سر! آپ کے مہمان ہیں۔'' ادھیڑ عمر نے کہا اور میں حیران سا اٹھ کھڑا ہوا۔ سیاہ چشمہ لگائے سائرہ ایک ننھے سے بچے کو سنبھالتی ہوئی کار سے برآمد ہو رہی تھی۔

کچھ دیر کے لیے تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

سائرہ نے آہستہ سے سلام کیا اور دوکان کے اندر چلی آئی۔ ڈرائیور بیگ کھولنے لگا تھا۔

''آؤ، آؤ کیسی ہو......؟'' میں گڑبڑا کر بولا۔

''پلیز......آپ ذرا سامان تو پکڑائیں۔'' سائرہ نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ میں بڑھ کر بیگ پکڑنے لگا۔ ساتھ ہی میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس غیر یقینی کیفیت نے مجھے بوکھلا سا دیا تھا۔ بیگ رکھ کر میں نے ایک پڑوسی لڑکے کو ٹھنڈا لانے کو بھیج دیا۔ ڈرائیور بھی اندر آن بیٹھا۔

''اور سب خیریت رہی نا......؟؟'' میں نے اپنی بوکھلاہٹ چھپا کر مسکراتے ہوئے سائرہ سے پوچھا۔

''ہاں......تم سناؤ۔'' سائرہ کی آواز سوز بھری تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور میرے اندر اتھل پتھل ہونے لگی۔ وہ بچے کو فیڈر پلا رہی تھی۔

''کتنے بجے چلے...؟ میں نے کوئی بات نہ پا کر پوچھا۔

''صبح کوئی ساڑھے سات بجے نکلے تھے۔'' ڈرائیور نے بتایا۔ ایسے میں کولڈ ڈرنک آ گئی جو خاموشی سے پی جانے لگیں۔ پھر سائرہ نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا، وہ جانے لگا تو میں نے اسے کھانے کا پوچھا مگر اس نے معذرت کی اور شکریہ کہہ کر چل دیا۔

''میرا اچانک چلے آنا برا تو نہیں لگا تمہیں......؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''ن......نن......نہیں تو۔'' میں نے بے چینی چھپا کر کہا۔

''تم مجھے سہاگ کے جوڑے میں گونجتی شہنائیوں میں چھوڑ آئے تھے شکیل! پھر کئی بار میں نے فون کیا مگر ہر بار تم نہ مل سکے۔ ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصے میں مجھ پر کیا کیا قیامتیں گزر گئیں۔ مقدمے کا

فیصلہ میرے حق میں ہوا، میری شادی کے بعد جیسے ہی فیصلہ ہوا، عبید علی امی کو چھوڑ کر کراچی چلے گئے، امی بیمار ہوگئیں۔ میں ان کا علاج کراتی رہی مگر امی چھ ماہ پہلے ہی انتقال کرگئیں۔ اس موقع پر بھی میں نے فون کیا تھا، ادھر میرے شوہر نے مجھ پر جائیداد کے لیے زور دینا شروع کردیا، میں نے اسلم سے پوچھا تو وہ بگڑ گیا اور مجھے بند کمرے میں پیٹنا شروع کردیا، ساتھ ہی اس نے یہ دھمکی دے کر مجھ سے ایک لاکھ کا چیک مانگا کہ اگر تم نے فوری چیک نہ دیا تو میں تمہیں طلاق دے کر دھکے مارتے ہوئے گھر سے نکال دوں گا۔ میں نے کہا آپ بے شک مجھے طلاق دے دیں، میں اب خود بھی تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ وہ ایسا غصہ میں تھا کہ اس نے مجھے اسی لمحے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ میں شکیلہ کے گھر آگئی اور اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ مگر اب وہ کیا کرسکتی تھی۔ الٹا اس نے مجھے کہا کہ تم اسلم کی بات مان لیتیں تو یہ نوبت نہ آتی۔ میں نے کہا کہ پہلے ہی اسلم مجھ سے اچھی خاصی رقم لے کر عیاشیوں کی نذر کرچکا ہے، سروس بھی اس نے چھوڑ دی۔ شکیلہ نے چند دن تو مجھے پناہ دے رکھی پھر اس کے گھر والوں کا رویہ مجھ سے بدلنے لگا۔ شکیلہ بھی کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی۔ تب میں نے یہ شہر ہی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اونے پونے داموں جائیداد فروخت کی اور خدا کے بعد تمہارے بھروسے پر ہمیشہ کے لیے یہاں آگئی ہوں۔''

سائرہ نے اپنے بربادی کی ساری داستان کہہ سنائی جسے سن کر میں اور بھی چکرا گیا۔ وہ روتے ہوئے اپنی گزری زندگی بتا رہی تھی۔ پھر کچھ گاہک آگئے۔ میں نے انہیں نمٹایا، وہ سر جھکائے سسکتی رہی۔

''اس ایک سال میں قسمت نے میرے ساتھ بھی عجیب کھیل کھیلے سائرہ۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''نرگس میری کزن ہے جس سے میری شادی ہوئی۔''

''کیا...؟ تمہاری شادی ہوگئی؟'' سائرہ اچھل سی پڑی۔

''ہاں سائرہ..... مگر ہماری زندگی تلخ گزر رہی ہے۔ تمہارے دونوں فون چھوٹے بھائی عدیل نے سنے۔ اس نے نرگس کو بتادیا کہ بھیا کے نام کسی سائرہ نامی لڑکی کے فون آتے ہیں، بس اسی بات کو نرگس نے دل میں بٹھا کر ہنگامہ کھڑا کردیا۔ میں نے لاکھ یقین دلایا، قسمیں کھائیں مگر وہ بددماغ تو تمہیں اپنا رقیب سمجھنے لگی۔''

''اوہ مائی گاڈ....'' سائرہ نے بیچ میں کہا۔

''بات لڑائی تک پہنچ گئی، وہ ایک ماہ روٹھ کر میکے گھر رہی، پھر ماموں نے اسے میرے ساتھ بھجوادیا مگر گھر آتے ہی وہ علیحدہ رہنے کی ضد کرنے لگی جو نہ مجھے بات پسند تھی اور نہ والدین کو، مگر میرے سسرال اور نرگس کی ضد دیکھ کر امی نے ہمیں علیحدہ کردیا۔ پھر گڑبڑ پیدا ہوگئی۔ ایک ہی چار دیواری میں رہ کر امی اور بھائی میرے لیے بیگانے بن گئے ہیں۔ ابو عمان میں رہ کر مجھے سلام تک لکھنا پسند نہیں کرتے۔ بڑی سنجیدہ اور غمناک زندگی بسر کررہا ہوں۔'' میں نے مختصر طور پر سائرہ کو تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''اف.....'' وہ بجھ سی گئی۔ ''یہ کیا ہوگیا شکیل..... تقدیر نے ہمارے ساتھ کتنا بھیانک کھیل کھیلا۔ میں تو زمانے بھر سے مایوس ہوکر لاکھوں امیدیں لیے نہ جانے کتنے سپنے سجائے یہاں پہنچی تھی مگر..... مگر منزل نے یہاں بھی مجھے ٹھکرادیا، اور پھر..... تمہاری زندگی میں صرف میرے فون کالوں نے زہر گھول دیا۔'' وہ چھم چھم روتی ہوئی بمشکل کہہ پائی۔ ماں کو روتا دیکھ کر بدنصیب سامی بھی چیخنے لگا، پورا ماحول غم میں ڈوب گیا۔ میں اذیت ناک لمحوں کی گرداب میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔

''حوصلہ کرو سائرہ، رونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہو۔ شاید ہماری قسمت میں ایسے ہی ہونا تھا۔'' میں نے اسے ڈھارس دینے کی کوشش کی مگر اس نے جی بھر کر دل کا غبار نکالا۔ ادھر دوپہر کے کھانے کا وقت ہورہا تھا۔ میں اٹھ کر گھر جانے لگا تو سائرہ نے پوچھا۔

''کہاں جارہے ہو شکیل...؟''

''گھر... کھانے کا وقت ہورہا ہے، ویسے بھی اب کیا تم دوکان پر بیٹھی رہوگی...'' میں نے کہا۔

''نہیں شکیل! مجھے بھوک نہیں ہے، ویسے بھی تم اپنی بیوی کو میرے آنے کی اطلاع نہیں دوگے۔''

''کیوں.....؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میں یہاں نہیں رکوں گی۔'' وہ یک لخت برسات کی مانند مجھ پر برس پڑی، بجلیاں سی گرنے لگیں۔

''پلیز..... سائرہ! خود کو سنبھالو، ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔'' میں نے شاید اسے جھوٹی تسلی دی۔

''میں تمہارے دامن کی آگ نہیں بنوں گی شکیل۔ میرے نصیب میں تو ساون بھادوں کی جھڑی ہے، کاٹ لوں گی جینے کی سزا، پوری دنیا پڑی ہے کہیں بھی کسی کٹیا میں گمنامی کے دن گزار لوں گی۔ میں تمہارے دکھوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی، تم بھی مجبور ہو۔ مجھے تم سے کچھ گلہ نہیں، تمہارا کیا دوش ہے بھلا۔ یہ تو اپنے نصیب کی ٹھوکریں ہیں۔'' اس نے ایک ایک فقرہ رک رک کر کہا۔

''مگر سائرہ..... میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ خواہ مجھے اب کتنے ہی طوفانوں سے گزرنا پڑے۔ تم میرے پاس رہو گی۔''

''نہیں شکیل، میرا تمہارے گھر میں داخل ہونا ہی قیامت لے آئے گا۔ نرگس کچھ بھی کر سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ نرگس کی زندگی میری وجہ سے برباد ہو، مجھے کوئی ٹیکسی ڈھونڈ دو، میں یہیں سے لوٹ جانا چاہتی ہوں۔''

''مگر کیوں سائرہ..... آخر کیوں.....؟ اس ننھی سی جان کو لے کر زمانے میں کہاں بسیرا کرو گی، زمانہ تمہیں کہیں بھی عزت کی زندگی گزارنے نہیں دے گا۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''بے وطن پرندے بھی تو کہیں نہ کہیں بسیرا کر ہی لیا کرتے ہیں نا شکیل..... میں بھی کہیں چار تنکے جوڑ کر سر چھپا لوں گی۔''

''ہمارا دامن اتنا تنگدست بھی نہیں سائرہ..... کہ تمہارے وجود کو نہ سما سکے۔ جب تک میں تمہارے لیے کوئی اچھا آشیاں نہ ڈھونڈ لوں، تم میرے پاس ہی رہو گی۔'' میں نے کہا اور رکے بغیر گھر چل دیا۔ وہ پکارتی رہ گئی مگر میرے قدم اٹھ چکے تھے۔

☆.....☆

''میری بات غور سے سنو نرگس اور خدا کا خوف دل میں رکھ کر کچھ دنوں کے لیے سائرہ کے وجود کو اس گھر میں قبول کر لو جو زمانے کی ستم ظریفی کا نشانہ بن کر کسی بے وطن مسافر کی طرح اس وقت صرف اور صرف تمہارے رحم و کرم پر یہاں پہنچ چکی ہے۔ صرف چند دن، پھر میں کسی جگہ اس کے لیے سہارا ڈھونڈ لوں گا، وہ اپنے گھر بس جائے گی۔'' میں نے نرگس کو چونکاتے ہوئے کہا۔

''تو بالآخر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سائرہ تم تک پہنچ گئی نا۔ تم تو میرے سامنے قسمیں کھایا کرتے تھے کہ میرا اس سے رسمی تعارف ہے، اب وہ گھر بسانے یہاں آ پہنچی۔ کیا رسمی سا تعارف اتنے بڑے گل کھلایا کرتا ہے۔'' نرگس نے حسب توقع مجھے پچھاڑ کر رکھ دیا۔

''یہ کسی منصوبے کی کڑی نہیں ہے نرگس..... اسے طلاق ہو گئی ہے، اس کا سوتیلا باپ اسے چھوڑ گیا، اس کی ماں مر گئی۔ وہ اپنے ننھے سے بچے کے لیے زمانے میں تنہا رہ گئی ہے۔'' میں نے اسے رام کرنا چاہا۔

''لیکن وہ اس کا بھائی کہاں چلا گیا جو تمہارا دوست تھا اور جس کی معرفت سائرہ سے تمہاری مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔'' نرگس نے میرے جھوٹ کو پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ دیا۔

''نرگس! وہ اس کا منہ بولا بھائی تھا۔ وہ بھی اسے چھوڑ چکا ہے۔'' میں نے ایک اور جھوٹ بولا۔

''جب سارے ہی اسے چھوڑ چکے ہیں تو اس کا کردار واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کتنی نیک عورت ہے۔'' نرگس نے سائرہ پر کیچڑ اچھالنا چاہا جو مجھے قطعی پسند نہ تھا۔

''نرگس! سائرہ کے کردار پر وار نہ کرو، وہ ایک نہایت شریف لڑکی ہے۔ بدنصیبی نے اسے ہر ایک سے دور کر دیا ہے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''ہاں اسی لیے تو وہ شریف زادی اب ہمارے آشیاں کے تنکے بکھیرنے یہاں آن پہنچی ہے۔'' نرگس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''یہ میرے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھو نرگس..... اگر تمہیں ذرا سی بھی مجھ سے محبت ہے..... دیکھو میں اپنی معصوم بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں سائرہ کو کسی برے ارادے سے یہاں نہیں

ٹھہرانا چاہتا اور نہ ہی تمہاری محبت میں شریک دار بنانا چاہتا ہوں۔'' میں نے نہایت کرب سے کہا۔

''کیا زمانے بھر میں ایک تم ہی اس کا دکھ بانٹنے والے رہ گئے ہو۔ ٹھیک ہے لے آؤ اسے۔ یہ میرا گھر ہی کب ہے، کون سی سکھ کی گھڑیاں گزر رہی ہیں یہاں۔'' وہ بدستور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

ادھر ہماری تکرار جاری تھی اور ادھر سائرہ اکیلی دکان میں بیٹھی میرے اور اپنے مستقبل کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔

''میں اسے لینے جا رہا ہوں نرگس! میں یقین رکھوں گا کہ یہ زہر کچھ دنوں کے لیے تم پی لوگی۔'' میں نے اپنی طرف سے کہا اور باہر چل دیا۔ وہ چہرہ چھپائے بین کرنے لگی۔

''بہت دیر کر دی شکیل.... تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ میرا اندر جانا کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔'' سائرہ نے کہا۔

''نہیں سائرہ۔ تمہاری آمد کی خبر سن کر نرگس کا جذباتی ہو جانا ایک یقینی بات تھی۔ بہرحال میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائرہ چند دن یہاں مہمان رہے گی پھر میں اسے مستقبل کا ٹھکانا ڈھونڈ دوں گا تو وہ اپنے گھر آباد ہو جائے گی، بس تم ہماری ملاقات کو راز میں رکھنا۔''

''مگر شکیل.... میں اب کسی غیر کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتی۔ مجھے زمانے پر اعتبار ہی نہیں رہا۔ میں اب بھی یہی کہوں گی کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔'' سائرہ نے بے دلی سے کہا۔

''سائرہ! دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اگر تمہیں مجھ پر کچھ اعتبار ہے تو یقین کر لو کہ میں تمہارے لیے اچھے مستقبل کی تلاش کروں گا اور ہمیشہ تمہاری شب و روز کی خبر رکھوں گا۔ آؤ...'' میں نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دوکان بند کی، دونوں بیگ اٹھائے۔ سائرہ میرے عقب میں بڑھنے لگی۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ایک طرف بیگ رکھے، سائرہ سہمی سہمی سی اندر داخل ہوئی، سوئے ہوئے سامی کو صوفے پر لٹا دیا اور خود باتھ روم میں چلی گئی۔

''نرگس کھانے کی کیا پوزیشن ہے۔ کم ہے تو بازار سے لے آتا ہوں۔ سائرہ باتھ روم میں گئی ہے۔ میں تم سے اچھے اخلاق کی امید رکھوں گا۔'' میں نے نرگس سے کہا۔

''سالن تو ہے، روٹی بنانا پڑے گی۔'' نرگس نے خلاف توقع بھیگی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم کھانا لگاؤ میں روٹی لے کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور باہر چل دیا۔ بازار سے کچھ فروٹ اور ہوٹل سے روٹیاں لے کر پہنچا تو ٹیبل پر کھانا لگا تھا۔ سائرہ میری بیٹی کو گود میں لیے پیار کر رہی تھی اور نرگس شاید باورچی خانے میں تھی جو اسی لمحے اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھیں، میں نے تیسرے حصے کی کرسی سنبھال لی۔ بچی کو نرگس نے لے لیا تھا۔

''بہت تکلف کیا آپ لوگوں نے، مجھے بھوک نہیں تھی۔'' سائرہ بولی۔

''کوئی بات نہیں، جتنی بھوک ہے کھالو۔'' نرگس نے جواب دیا۔ ''یہ ساتھ ہی بیڈ روم ہے، آرام کر لو، وہی تمہارا کمرہ رہے گا۔'' نرگس نے سائرہ سے کہا۔

''مگر آپ....؟''

''ہم بھی رہ لیں گے، آپ آرام کریں۔'' نرگس نے سنجیدگی سے کہا اور سائرہ سامی کو لیے بیڈ روم میں چلی گئی۔ ہم نے کھانا ختم کیا تو نرگس برتن سمیٹنے لگی۔ میں دوکان پر چلا آیا اور فوری نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اپنے عزیز دوست انور کو بلایا اور اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ پھر ہم نے مل کر ایسے شخص کی تلاش شروع کر دی جو سائرہ کو نیک نیتی سے اپنانے کو تیار ہو۔ ایک ہفتے کی بھرپور جدوجہد کے بعد نواز نامی ایک شخص ملا جس کا اپنا فارم تھا۔ اس کی جواں سال بیوی کا ایک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا، کوئی اولاد بھی نہ تھی۔

''میں نے سائرہ کی ساری زندگی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی، ساتھ ہی ایک جھوٹ بھی بول دیا کہ اس وقت سائرہ کے پاس دولت نہیں ہے، جہیز بھی نہ ہوگا۔ یہ اس لیے کہا کہ نواز دولت کے بل بوتے پر نہ رضامندی ظاہر کر دے، مگر اس نے یہ جان کر بھی ہاں کر دی کہ مجھے دولت کی نہیں ایک غمگسار ساتھی کی ضرورت ہے۔ اس سے اگلی ہی شام میں نے نواز کو گھر آنے کی دعوت دے

دی تا کہ سائرہ اور نواز ایک بندھن میں بندھنے سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ اور مل لیں۔

ملاقات نتیجہ کن رہی پھر ایک ہفتے کی تاخیر کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ سائرہ نکاح کے بندھن میں بندھ گئی۔ میں نے چند شرائط کا اہتمام اور پچاس ہزار کا حق مہر نواز سے لے لیا تا کہ آگے چل کر سائرہ کو پھر کسی آزمائش سے نہ گزرنا پڑے۔ اس تمام عرصے میں نرگس نے نہایت بردباری کا مظاہرہ کیا۔ میں نے بھی گھر میں سائرہ سے ملاقات کو کھانے کی میز تک محدود رکھا۔ سائرہ گھر کے کاموں میں نرگس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ امی جان اس تمام واقعے سے دور ہی رہیں۔ سائرہ کو اپنے ہاتھوں بیگانہ کرنے کے تمام مراحل بڑے ضبط سے گزرے۔ نرگس کے اس غیر یقینی کردار نے مجھے اس کے اور قریب کر دیا۔ میں کبھی کبھار سائرہ سے ملنے اس کے گھر چلا جاتا اور مہینے میں ایک آدھ بار وہ ملنے آجاتی۔ نواز نے اسے بہت پیار دیا۔ وہ سامی کو بھی اپنی اولاد کی طرح چاہتا۔ سائرہ نے مجھے کہہ کر اپنی تمام رقوم فیصل آباد سے یہاں کی ایک برانچ میں ٹرانسفر کرالی جن کی نواز کو خبر نہ تھی۔ میں نے سائرہ کو بتا دیا کہ میں نے نواز کو تمہاری دولت سے بے خبر رکھا ہے۔ اسے تم اپنے ہی مصرف میں لاسکتی ہو۔ سائرہ نے میرے اس اقدام کو بہت سراہا۔

نرگس کے بھائی کی شادی آرہی تھی۔ اس نے اپنی طرف سے سائرہ کو بھی دعوت دے دی جسے سائرہ نے نا صرف قبول کیا بلکہ جانے کا وعدہ بھی کر لیا۔ پھر وہ بے شمار قیمتی تحائف کے ساتھ ہمارے ہمراہ گوجرانوالہ پہنچی۔ نرگس نے امی سے سائرہ کا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا کہ اسے بری نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ سائرہ نے وہاں بھی بہت خرچ کیا بلکہ سبھی کو حیران کر دیا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ شادی سے واپسی پر نرگس اور سائرہ اتنی گھل مل کر باتیں کرتے ہوئے بہت گہری سہیلیاں محسوس ہو رہی تھیں، گھر پہنچ کر نرگس کہنے لگی۔

''میں نے سائرہ کو جتنا اپنی رقیب سمجھ کر نفرت کی اب مجھے اس سے اتنا ہی پیار ہے۔''

''کمال ہے نرگس! حالانکہ میں سوچ رہا تھا کہ جتنے دن سائرہ ہمارے گھر رہے گی تم روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرتی رہو گی اس لیے میں سائرہ سے قطعی اجنبی بن گیا، صرف کھانے کی میز تک وہ بھی تمہاری موجودگی میں کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جسے تم سیریس لے رہی تھیں۔''

''ہاں شکیل! اگر میں تم دونوں میں کوئی مشکوک بات دیکھتی تو ایک دن بھی سائرہ کو گھر میں نہ رہنے دیتی۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ ایسی کوئی بات نہیں جو میں سمجھتی رہی ہوں۔ مجھے اپنے آپ میں شرمندگی ہوئی کہ خواہ مخواہ گھر میں جھگڑے کھڑے کرتی رہی۔ سائرہ بے چاری تو بہت ہی نروس سی لڑکی ہے۔ بے چاری کے ساتھ کتنی ٹریجڈی ہوئی۔ ویسے شکیل! اس کے پاس پیسہ بہت ہے۔ پتا ہے اس نے میرے، تمہارے اور منی کے لیے کپڑے لا دیے ہیں۔ ہزار روپیہ تو اس نے ہماری رانی کو اسی دن دیا تھا جس روز ہمارے گھر آئی تھی، پھر بیاہ کر جانے لگی تو پانچ ہزار پھر دیئے اور ساتھ ہی مجھے قیمتی جیولری کا سیٹ لے کر دیا....''

''یہ کیا کہہ رہی ہو، تم نے مجھ سے کسی بات کا کبھی تذکرہ ہی نہیں کیا۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں شکیل کو کچھ بھی نہ بتاؤں۔ اب جب کہ وہ میری دوست بن چکی ہے اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہو چکا ہے کہ تمہارے درمیان کوئی بھی جذباتی تعلق نہیں رہا تو تمہیں سب کچھ بتا رہی ہوں۔''

''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا نرگس! کیا سوچے گی وہ....'' میں نے ناراضگی سے کہا۔

''میرے بار بار انکار کے باوجود وہ ایسا کرتی رہی۔ وہ نہ جانے کتنی مالدار ہے۔''

''تم اس کی دولت پر نگاہ رکھے ہوئے اسے دوست بنا رہی ہو۔ میں نے کبھی اس سے اس کی دولت کا نہیں پوچھا اور نہ ہی مجھے کچھ ضرورت ہے۔ تم پوچھ لینا۔'' میں خفا ہونے لگا۔

''تم تو ایسے ہی بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو، مجھے کیا ضرورت ہے پوچھنے کی۔'' نرگس نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ چلو اچھا ہوا نرگس کا دل ہماری طرف سے مطمئن تو ہوا۔ میں نے سوچا اور ٹی وی کھول لیا۔

اگلے دن سائرہ نے مجھے فون کیا..... ''شکیل! نرگس کا رویہ اب کیسا ہے تمہارے ساتھ.....؟''

''میں حیران ہوں سائرہ کہ نرگس کے اندر اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی۔ اس نے تمہارے فون کرنے کی وجہ بنا کر زندگی اجیرن کر دی اور اب وہ تمہاری دوست بن چکی ہے۔ جو دن تم نے ہمارے گھر گزارے میرے نزدیک کسی بھی لمحے نرگس کچھ بھی کر سکتی تھی مگر اس نے تو مجھے حیران کر کے رکھ دیا۔''

''ہاں شکیل! نرگس ایک جذباتی لڑکی ہے، مجھے اپنی رقیب سمجھ کر اس نے تم سے نفرت کی۔ میں جتنے دن تمہارے گھر رہی، تمہاری طرف سے اجنبی بن کر رہی۔ حالانکہ نرگس نے میری ہر ہر حرکت ہر بات کا گہرا مشاہدہ کیے رکھا۔ میں نے اسے اپنے اور تمہارے متعلق صرف اتنا بتایا کہ ہماری ایک چھوٹی سی ملاقات ہوئی تھی وہ بھی جاوید بھائی کے سامنے، بہر حال جیسے بھی ہوا میں نے اسے مطمئن کر دیا کہ وہ مجھے اپنا رقیب نہ جانے۔ ہر انسان میں ایک نہ ایک کمزوری ہوتی ہے۔ میں نے تمہاری بیٹی کو پہلے ہی روز کچھ رقم اپنی بیٹی سمجھ کر دی تو نرگس کے رویے میں کچھ نرمی آئی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ روپیہ نرگس کی کمزوری ہے۔ بس یہ جو بھی ہوا سب سکوں کی کھنک نے ایک پتھر کو موم کر دیا۔ میں یہ باتیں بتا کر اپنا کوئی احسان نہیں جتا رہی بلکہ میں گزارش کروں گی کہ اس بات کا ہلکا سا تذکرہ بھی آپ نرگس سے نہیں کریں گے۔ آپ کے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ میں مر کر بھی ان میں سے کسی ایک کا بھی قرض نہیں چکا سکتی۔ ایک بات جو آج تک میں نے آپ سے چھپائے رکھی وہ........ مجھے تم سے محبت تھی شکیل.....اور ہمیشہ رہے گی۔ میں نے تمہیں پانے کی بہت کوشش کی مگر حالات نے مجھے ایسا کرنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ میں اب نواز کی امانت ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے، میں نے قبول کر لیا صرف اس لیے کہ وہ تمہارا انتخاب ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ زندگی بھر تمہیں اپنی طرف سے کوئی گلہ نہ آنے دوں لیکن تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔ ایک محسن کی طرح، ایک دوست کی طرح اور ...... اور ایک محبوب کی طرح۔ ساون کی رت ہمیشہ تڑپاتی رہے گی، میری پلکوں سے جب بھی رم جھم برسے گی وہ تمہارے ہی نام کی ہوگی شکیل..... صرف تمہارے نام کی۔'' فون پر سسکی گونجی اور ادھر ریسیور رکھ دیا گیا۔

سائرہ نے میرے من میں چھپی ہوئی چنگاری کو نئے سرے سے سلگا دیا۔ کاش .....! میں بھی سائرہ کو بتا سکتا کہ میرے من کی گہرائیوں میں چھپا درد صرف اسی کے نام کا ہے۔ نرگس کو تو میں نے اپنے زخم پر صرف مرہم کی صورت رکھا ہے جو میرے زخموں کو سہلانے کے بجائے ہمیشہ نوچتی رہی ہے۔ وہ دلی طور پر اب بھی مطمئن نہ تھی شاید .....سائرہ ملنے آئی تو وہ ہماری ہر بات کو ایسے سنتی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ ادھر امی ابو کی بے رخی نے حالات کو اتنا سنگین کر دیا کہ اس گھر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ میں نے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ شہر ہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ نرگس نے اپنے میکے شہر میں اپنے ابو سے بات کر کے ہمارے لیے مکان ڈھونڈا۔ میں نے جانے سے پہلے آخری بار سائرہ کو فون کیا۔

''سائرہ..... تمہیں یہ سن کر دکھ تو ہوگا مگر مجبوریاں انسان کو بے بس کر دیتی ہیں۔ آج حالات نے مجھے یہ شہر ہی چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم صبح ہونے سے پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ حالات کی خبر رکھوں گا، میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ زندگی کے کسی موڑ پر میری ضرورت محسوس ہو تو مجھے آواز دے دینا، ساون کے بادلوں کی طرح لوٹ آؤں گا۔ اس کی رم جھم مجھے ہمیشہ خون کے آنسو رلاتی رہے گی..... جانے کیوں.....؟'' میں نے اپنا سارا درد سمیٹ کر کہا۔

''مجبوریوں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے شکیل! میں تمہاری یہ جدائی بھی برداشت کر لوں گی، مگر یاد رکھنا .... جب بھی ساون لوٹ کر آئے تم بھی لوٹ آنا، نہیں تو میری پلکوں کا ساون بن بادل برسات برستا رہے گا، برستا رہے گا۔'' سائرہ نے کہا اور میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

ایبٹ آباد سے دوسری سچ بیانی

تریاق نہیں ملتا

اُم منال

اُس شخص کی داستانِ عبرت، جس نے ہر رشتہ پامال کیا اور خدا کے قہر سے ڈرنا بھول گیا

میں اس وقت فلم انڈسٹری کے شہر لاہور کے ایک نجی اسپتال میں آپریشن تھیٹر کے باہر نہایت بے چینی کے عالم میں ٹہلتا ہوا ڈاکٹر کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں سختی سے دبا لیا ہو۔ میں اپنے اندر بہت گھٹن محسوس کر رہا تھا حالانکہ جولائی کا مہینہ تھا۔ ساون کی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں باہر بہت تیز طوفانی بارش ہو رہی تھی۔ لگتا تھا آسمان آج ہی ٹوٹ کر برس جائے گا۔ بارش کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن میرے اندر جو طوفان برپا تھا اس کی آواز سوائے میرے کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

میری ماں جس سے کبھی میں نے محبت سے بات نہیں کی تھی آج شدت سے یاد آ رہی تھی۔ دل کر رہا تھا کہ اس کی گود میں سر رکھ کر سارے آنسو بہا دوں۔ اس پریشانی کے عالم میں وہ مجھے اپنی ممتا کی گرم بانہوں میں چھپا لے۔ اس کی تسلی کے دو بول سننے کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔

انسان عمر کی کتنی ہی منزلیں پار کر لے مگر ماں کی ممتا میں کھو کر وہ اپنے آپ کو بچہ ہی تصور کرتا ہے۔ آج میری حالت بھی اسی دودھ پیتے بچے جیسی تھی جو بھوک کی شدت سے بلبلا کر ماں کے لیے روتا ہے میں بھی دنیا کے مصائب سے گھبرا کر ماں کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ اس سے معافی مانگنے کے لیے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا وہ اس دنیا میں واپس آ جاتی اور میں اس کے قدموں میں سر رکھ کر اپنے پچھلے تمام گناہ اللہ سے معاف کرا لیتا۔ کا...... کا...... کاش ایسا ہوتا۔ میں بھی کتنا بدنصیب ہوں جب تک ماں رہی اس کی قدر نہ کی آج اپنی تکلیف پر اس کی اہمیت پتا چلی تو اس کے لیے رو رہا ہوں۔

میری بیوی سجدے میں گری زار و قطار روتی ہوئی اللہ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی دعا مانگ رہی ہے اور میں جو اتنے سالوں سے اپنے رب کو بھولے بیٹھا تھا آج شدت سے اپنے رب کو یاد کر رہا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے مصیبت کے وقت اللہ اور ماں ہی یاد آتے ہیں مگر آج سے پہلے میرے اوپر اتنی مصیبت نہیں پڑی تھی۔ صرف دوسروں پر میں نے ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔ آج اپنے اوپر پہاڑ ٹوٹا تو تکلیف کا احساس ہوا۔ بہر حال اس وقت میرا جوان بیٹا آپریشن تھیٹر میں اپنی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا اور میں گڑگڑا کر اپنے حبیبؐ کے صدقے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا



کہ اے اللہ مجھے اچھی خبر سنانا مگر اسی وقت ڈاکٹر نے باہر آکر جو خبر سنائی وہ کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں زلزلوں کی زد میں آگیا ہوں۔ اسپتال کی چھت میرے سر پر آگری ہو۔ کاش یہ خبر جھوٹی ہوتی۔ میری ساری دعائیں التجائیں ضائع گئیں۔ ڈاکٹر نے تو Sorry کہہ کر اپنا فرض پورا کرلیا لیکن مجھے اپنا ذہن تاریکی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا اور میں ستر سال پیچھے اپنے ماضی میں چلا گیا۔ جب میں بچہ تھا ایک گناہ کے لیے دو لوگ قصور وار ہوتے ہیں ایک کو ہی موردِ الزام ٹھہرا دینا سراسر ناانصافی ہوتی ہے۔ آپ قارئین میری کہانی پڑھ کر بتائیے گا میرے ان حالات کا ذمہ دار کون تھا میں، میری ماں یا میرا باپ۔

☆......☆

میری ماں نے نورالدین زنگی کی زندگی سے متاثر ہو کر میرا نام نورالدین رکھا مگر نورالدین جیسا کوئی کام میں نے کیا نہیں اگر کیا تو بس بیوی بچے پالے اس لیے میرے نزدیک تو یہ کام عظیم اور نیک ہی تھا کیونکہ میں نے اپنی حق حلال کی کمائی سے بیوی بچے پالے مگر ایک کام مجھ سے حرام ہوا اور ایک بہت بڑا۔ یہ دونوں گناہ میرے لیے خدا کا عذاب بن گئے جو میں نے جوانی کے جوش میں بہہ کر کیے تھے جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔

☆......☆

میں اپنے والدین کی شادی کے پانچ سال بعد بہت منت مرادوں سے لاہور میں 1926ء کو پیدا ہوا۔ میرے بعد کوئی بہن بھائی اس دنیا میں نہیں آیا لہٰذا میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اس لیے ماں کا زیادہ لاڈلا تھا۔ ابو تو نکھٹو کام چور تھے۔ طبیعت چاہی تو کام کرلیا ورنہ ہفتوں گھر میں بیٹھے رہتے۔ مہینوں کے بعد کچھ لاتے تو وہ دنوں میں ہی ختم ہو جاتا۔ مہینے کے باقی دن وہ گھر میں چارپائی توڑتے یا گالی گلوچ مار کٹائی کرتے رہتے حالانکہ میرے باپ اپنے ایک دوست کی دکان پر زنانہ کپڑوں کی سلائی کا کام کیا کرتے تھے اور بہت اچھے کاریگر مشہور تھے۔ پوری مارکیٹ میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا ان کے

دوست کا اس زمانے میں چلتا کاروبار تھا اگر وہ چاہتے تو اپنی کمائی بیوی بچے تو کیا بہت اچھا گھر بھی بنا سکتے تھے مگر ان کی سستی اور کاہلی نے ہمیشہ ان کی صلاحیتوں پر پردہ ڈالے رکھا۔ جس زمانے میں لوگ ایک کمائی سے دس بچے پال لیتے تھے میرا باپ ایک بچہ نہ پال سکا مجھے یاد نہیں کہ اکلوتا ہونے کی باوجود میرے باپ نے کبھی مجھ سے پیار و محبت سے بات کی ہو۔

☆......☆

میری ماں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ لاہور میں میرے نانا کا بہت بڑا گھر تھا جس میں نانا نانی دو ماموں اور میری فیملی جوائنٹ رہا کرتے تھے جب کہ دو ماموں اپنی فیملی کے ساتھ کراچی شفٹ ہو چکے تھے لہٰذا دور ہونے کی وجہ سے سالوں میں ہی ان کا چکر لگتا تھا۔ ددھیال والوں کا مجھے کچھ علم نہیں، میں نے اپنی زندگی میں نہ کبھی انہیں دیکھا اور نہ ہی ماں باپ نے انکار کیا۔ بس مجھے یہ معلوم تھا کہ میرے دادا دادی اور چچا پھوپیاں بھی ہیں جو کسی اور شہر میں رہتے ہیں یہ بات ایک دن مجھے ماموؤں کی باتوں سے پتا چلی تھی۔ شاید میرے باپ کی فطرت اور گھر دامادی کی وجہ سے سب نے انہیں چھوڑ رکھا ہو۔ مجھے نہیں معلوم۔ میری ماں کیونکر میکے میں رہتی تھی اور میرے باپ نے کیوں گھر دامادی قبول کی یہ مجھے پتا نہیں۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد ان ہی رشتوں کو اپنے قریب دیکھا۔ لہٰذا میری زندگی ننھیال کے گرد ہی گھومتی رہی۔

باپ کی نااہل اور کاہل طبیعت کی وجہ سے مجھے ماموؤں نے ہی پڑھایا اور ان ہی کی کاوشوں کی بدولت میں لیکچرار بھی بنا مگر میں نے کبھی ماموؤں کا احسان نہیں مانا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ میری ماں تھی۔ انہوں نے شروع سے ہی میری تربیت غلط انداز سے کی تھی۔ ماں نے بچپن سے ہی میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ چیز استعمال کرو اور پھینک دو مثلاً مجھ سے کوئی کھلونا ٹوٹ جاتا تو ماں کہتی کوئی بات نہیں، ماموں اور لا دیں گے، پھر ماموؤں کے بچوں کے کھلونے آتے یا نہیں مگر ماں لڑ جھگڑ کر میرے لیے ضرور منگواتی۔ ایسا وہ اس لیے کرتیں تا کہ ماموؤں کے بچے ایک ایک چیز کو ترستے رہیں۔ بھاوجوں اور بھتیجا بھتیجی کی جلن میں ماں نے میری شخصیت بالکل ہی تباہ کر دی تھی۔

گھر کے بچوں میں، میں سب سے بڑا تھا اس لیے سب بہن بھائیوں پر میرا رعب بھی خوب چلتا تھا۔ ماموؤں کے بچوں کو مارنے اور جھگڑا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا۔ بقول میرے ماموں ممانیوں کے عادتوں میں، میں بالکل اپنے ماں باپ کا نچوڑ تھا۔ اسی بڑے پن نے مجھے احساس برتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ بچپن سے ہی میرے مزاج میں خود سری موجود تھی اپنے سوا مجھے کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ یہی چیز میری تنہائی اور بربادی کا سبب بنی۔

گھر کا خرچ ماموؤں کی تنخواہ سے چلتا تھا۔ ان حالات میں بھی ماں، ماموؤں کا احسان مند ہونے کی بجائے بھاوجوں سے کھنچی رہتیں۔ گھر میں فساد پھیلانے اور ممانیوں سے جھگڑا کرنے میں ماں کو بہت لطف آتا تھا۔ ادھر باپ بھی گھر میں ہر وقت جنگِ عظیم کا ماحول بنائے رکھتے۔ ماں باپ کی یہی خود غرضی اور احسان فراموشی مجھے بھی ورثے میں ملی تھی۔

☆......☆

ان ہی دنوں دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت پاکستان کے نام سے عمل میں آئی۔ قیام پاکستان کا اعلان ہوتے ہی پورے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی لہر پھوٹ پڑی۔ ان فسادات سے ہمارا لاہور بھی نہ بچ سکا۔ ہندوستان سے آنے والی ٹرینیں امرتسر کے ذریعے لاہور پہنچتیں تو کھچا کھچ بھری ہوئی ہوتیں۔ بعض ٹرینیں تو ایسی ہوتیں جن میں ایک آدمی بھی زندہ نہیں ہوتا۔ گھر کے فرسودہ ماحول کی وجہ سے میں لاہور اسٹیشن چلا جاتا اور ہندوستان سے آنے والے لٹے پٹے مہاجرین کی ہر ممکن مدد کرتا جس سے مجھے اندرونی سکون ملتا مگر گھر آتے ہی میں ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا۔

پاکستان بننے کے بعد نانا نانی یکے بعد دیگرے رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ لڑائیاں اتنی بڑھتیں کہ گھر کم اور پانی پت کا

میدان زیادہ نظر آتا کیونکہ ممانیاں بھی کہاں تک ماں کی زیادتیاں برداشت کرتیں۔ ان لڑائیوں کی وجہ سے میں گھر سے بیزار رہتا کیونکہ میری پڑھائی ڈسٹرب ہوتی۔ پڑھنے کا مجھے جنون کی حد تک شوق تھا جب مجھے غصہ آتا تو میں بھی ان لڑائیوں میں شریک ہو جاتا، کبھی ماموؤں کے بچوں کو مارتا کبھی ماں پر چڑھ دوڑتا کبھی ممانیوں سے بدزبانی کرتا، کھانا تیار نہ ہونے پر ماں کو مارتا اور چٹیا سے پکڑ کر ان کا منہ زمین سے رگڑ دیتا اور کہتا کہ بتا بڑھیا اب تک کھانا کیوں نہیں بنا ہے۔'' باپ کی طرح خود بھی گھر میں گالیاں دیتا اور تہلکہ مچائے رکھتا اور وہی ماں جو بھاوجوں کے آگے شیرنی کی طرح لڑتی اپنی اولاد کے آگے بھیڑ بن جاتی مگر میں تو قصوروار ماں کو ہی ٹھہراؤں گا جب میں ماں کو مارتا تھا تو ماں نے میرا ہاتھ پکڑ کر میرے منہ پر تھپڑ کیوں نہیں مارا۔ اگر وہ میرا ہاتھ روکتی تو آگے سے میری ہمت نہیں ہوتی۔ ان کی خاموشی سے پٹنے کی وجہ سے مجھے اور شہ ملتی اگر وہ میری اچھی تربیت کر کے غلط بات پر مجھے نصیحت کرتیں تو آج میں پچھتاوے کی آگ میں نہیں جل رہا ہوتا اور ایک کامیاب انسان کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوتا۔

ماں کے ساتھ اتنا برا سلوک کرنے کے باوجود ماں مجھے ہمیشہ میرا چاند شہزادہ کہہ کر مخاطب کرتیں۔ اس لیے کہ ان کی ساری امیدیں مجھ سے ہی وابستہ تھیں۔ ماں کا اگر کوئی مقابلہ کر سکتا تھا تو وہ میں تھا بھاوجوں کی تو ماں کے آگے ایک نہیں چلتی تھی۔ سچ ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی جو کچھ ماں اپنی بھاوجوں کے ساتھ کرتی بدلے میں بیٹا اس کے ساتھ کر دیتا اور جو کچھ میں نے اپنی ماں کے ساتھ کیا اس کا قدرت نے مجھ سے بہت بھیانک بدلہ لیا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے جب چلتی ہے تو آواز نہیں آتی مگر چوٹ بہت بری لگتی ہے۔ میں گھر میں جو طوفان کھڑا کرتا وہ تو ختم ہو جاتا لیکن تقدیر نے میری زندگی میں جو طوفان برپا کیا اس کی موجیں آج تک میرے اندر بل کھاتی ہیں اور ان سے پیچھا نہیں چھڑا پاتا ہوں۔

☆......☆

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میں کامیابی سے تعلیم کی منزلیں طے کرتا رہا۔ آخر ماموؤں کے پیسے اور اپنی لگن سے ایم اے انگلش میں فرسٹ پوزیشن سے پاس ہو گیا۔ اس دن میرے ماں باپ بہت خوش تھے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے باپ کو اتنا خوش دیکھا تھا۔ ورنہ ان کے چہرے پر ہر وقت غصے کے آثار نمایاں رہتے۔ حالانکہ میری اس کاوش میں ماں باپ کا کوئی رول نہیں تھا۔ ایم اے کی ڈگری ہاتھ میں آتے ہی میں نے گارڈن کالج پنڈی میں لیکچرار شپ کے لیے اپلائی کر دیا۔ ڈگری کی بدولت فوراً ہی بغیر رشوت اور سفارش کے مجھے لیکچرار کی جاب مل گئی۔ وہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا لیکن پنڈی میں رہائش کا مسئلہ تھا جو میرے ایک کولیگ نے کرائے پر ایک چھوٹا سا گھر دلا کر حل کر دیا۔ اب میں چھٹی والے دن لاہور آتا اور چھٹی گزار کر پنڈی چلا جاتا۔

میں نوجوانی میں بہت ہینڈسم تھا۔ مردانہ وجاہت کی میرے اندر کوئی کمی نہیں تھی۔ اپنے حسن پر نازاں میں حسن پرست بھی بہت تھا۔ ان دنوں فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن ہو رہے تھے کہ داخلے کے لیے ایک لڑکی علیشہ انصاری آئی۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی۔ اس کا حسن دیکھ کر میرا دل چاہا کاش یہ حسین لڑکی میرا مقدر بنے جس حسن کا میں دلدادہ تھا وہ سب اس میں موجود تھیں۔ میدے کی طرح سفید رنگ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں لمبے گھنے سیاہ بال جنہیں وہ کالج کی کسی تقریب میں کھولتی تو گھٹنوں تک آتے۔ نازک سے ہاتھ پیر اور سرو قد، اس کے حسن کو چار چار چاند لگا دیتا۔ قدرت نے اسے بڑی فرصت سے بنایا تھا۔ اسے دیکھ کر کسی پرستان کی شہزادی کا گمان ہوتا پھر کلاسز شروع ہوئیں تو فرسٹ ایئر انگلش کا پیریڈ میرے پاس آیا۔ خوشی میری خوشی دیدنی تھی۔ قسمت میرے اوپر مہربان ہو گئی تھی۔ اس طرح روز علیشہ سے ملاقات ہونے لگی۔ لیکچر کے دوران ہماری بے تکلفی بڑھتی گئی۔ علیشہ میرا کوئی پیریڈ مس نہیں کرتی تھی۔ ہم آنکھوں کے اشاروں میں بہت سی باتیں

کرلیا کرتے تھے۔ پھر علیشہ اور میں بہانے بہانے سے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ مثلاً اگر میں لیکچر دے رہا ہوتا تو زیادہ تر علیشہ انصاری سے ہی سوال کرتا اور علیشہ بھی مجھ سے بے مقصد سوال کے جواب طلب کرتی رہتی۔ ہماری یہ باتیں کلاس کے اسٹوڈنٹ سے چھپی نہ رہ سکیں اور کالج میں ہمارے متعلق مختلف قسم کی باتیں ہونے لگیں تو ہم نے محتاط رویہ اختیار کر کے کالج سے باہر ملنے کا پروگرام بنایا۔ اس طرح ہماری ملاقاتیں باہر ہونے لگیں۔

جب علیشہ کا مجھ پر اعتبار بڑھا تو میں اسے گھر بھی لانے لگا پھر ہم دنیا سے بے خبر محبت اور آنے والے مستقبل کی ڈھیروں باتیں کرتے۔ اسی دوران ہم نے محبت کے عہد و پیمان بھی کیے اور ساتھ جینے مرنے کی قسمیں بھی کھائیں۔ ہم پیار کی رو میں بہکے تو بہکتے ہی چلے گئے۔ اس وقت مجھے اپنے عہدے کا بھی خیال نہیں رہا۔ جذبات کی آندھی میں بہہ کر ہم نے اپنے مقدس رشتے کو خوب پامال کیا۔ علیشہ تو مجھ سے حقیقی محبت کرنے لگی تھی مگر میں اپنی فطرت سے مجبور اس سے صرف دل بہلاتا رہا۔

پھر ایک دن علیشہ نے مجھے ماں بننے کی خبر سنائی۔ اس بات کو سن کر میں غصے سے بھڑک اٹھا اور تھپڑ مار کر کہا۔ ''علیشہ تم...... تم نے یہ کیا...... کیا۔ تم اس بچے کے لیے میرا نام مت لینا ورنہ میری بہت بدنامی ہوگی۔''

علیشہ بولی۔ ''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے اس گناہ میں، میں اکیلی شامل ہوں۔''

''تو اور کیا یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔'' میں نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

میرا رویہ دیکھ کر علیشہ روتی ہوئی میرے گھر سے چلی گئی۔ اس کے بعد وہ مجھے کالج میں کبھی نظر نہ آئی۔ پھر ایک اس نے دو خوب صورت بچوں کو جنم دیا اس کی ماں میرے گھر آئیں اور مجھے خدا رسولؐ کے واسطے دے کر بولیں۔ ''ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ یہ بچے تمہارا خون ہیں ان بچوں پر ترس کھا کر تم علیشہ سے نکاح کرلو۔ ورنہ ہم غریب لوگ برباد ہوجائیں گے۔''

میں نے ان کی خوب بے عزتی کر کے نکاح سے انکار کردیا۔ مجھے اپنے خاندان والوں کا بھی خوف تھا جب میں نے علیشہ کو قبول نہیں کیا تو اس کی اولاد کو کیسے قبول کرتا۔

☆......☆

اس دن میں گھر میں لیکچر کی تیاری کر رہا تھا کہ ماموں غصے کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ علیشہ، بچے اور میری اور اس کی والدہ بھی تھیں۔ وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔ ''یہ لوگ کون ہیں اور جو کچھ میں سن رہا ہوں کیا وہ سچ ہے؟''

میں نے جلدی سے علیشہ کا ہاتھ سے بچوں کو چھینتے ہوئے کہا۔ ''ماموں یہ میرے نہیں ہیں نہ جانے یہ کس کا گناہ میرے سر تھوپ رہی ہے۔ یہ تو مجھے کب سے اپنے پیار کے جال میں پھنسا رہی تھی مگر میں نے اسے منہ نہیں لگایا تو یہ اتنا گھناؤنا الزام میرے اوپر لگا رہی ہے۔ یہ مجھے معاشرے میں بدنام کرنا چاہتی ہے۔''

اس وقت مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری اولاد ہیں۔ ماموں نے بچوں کو میرے ہاتھ سے چھینا جو بے چارے میرے دبوچنے پر بے دم ہو رہے تھے۔ پھر ماموں بولے۔ ''میں نے کب کہا یہ تمہارے ہیں۔ میں نے تو صرف یہ پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں، ان لوگوں کو دیکھ کر اتنا طیش میں آنا تمہارے جھوٹے ہونے کی علامت ہے۔ نہ میں نے کسی الزام کی بات کی ہے۔ تم خود ہی الزام کو قبول رہے ہو۔ دیکھو جس وقت علیشہ کی ماں نے مجھ سے یہ بات کہی تھی تب میں نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا تھا مگر علیشہ کے اصرار پر جب میں نے کالج سے تمہارے بارے میں پوری معلومات حاصل کرلی اس کے بعد ہی یہاں لایا ہوں۔ تمہارے کالج سے پتا چلا ہے کہ تم دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو اور کالج میں تمہاری کیا پوزیشن ہے اس کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ علیشہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے اور پھر علیشہ کو دیکھ کر اتنے غصے میں آجانا۔ یہ سب کیا ہے اب بھی کچھ نہیں بگڑا تم

ان بچوں کو قبول کر کے علیشہ سے نکاح کر لو۔ ہم خاندان میں کہہ دیں گے کہ سادگی سے نکاح کر دیا تھا۔ اب بچوں کی پیدائش پر خوشی کر رہے ہیں۔''

مگر میں نے کبھی زندگی میں ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ فوراً ہی علیشہ کو چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹا اور اس پر لاتوں گھونسوں کی بارش کر دی اور بچوں سے بھی لاتعلقی اختیار کر لی۔ وہ تڑپ کر روتے ہوئے التجائیں کرنے لگی۔ آپ ایسا مت کہیے ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی۔ آپ کو اپنی محبت کا واسطہ اپنا گزرا ہوا وقت یاد کیجیے یہ بچے آپ کے ہیں۔'' علیشہ کے آنسو اس کی سچائی کی گواہی تھے۔ ماموں علیشہ کو بچانے آئے۔ میں نے انہیں بھی دھکا دے دیا۔ علیشہ کی ماں آگے بڑھی میں نے انہیں بھی پیچھے دھکیل دیا۔۔ کوئی بھی میری گرفت سے علیشہ کو نہ بچا سکا۔ میں جنون کی حالت میں علیشہ کو مارتا جاتا اور وہ مجھ سے التجائیں کرتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ لہولہان ہو گئی اور میں اسے مار مار کر تھک گیا تو گھسیٹ کر دروازے تک لایا اور گھر سے باہر دھکا دے دیا۔ تب علیشہ گھر کے اندر آئی۔ بچوں کو اٹھا کر مجھے بددعا دیتے ہوئے بولی۔

''آج آپ اپنی اولاد کو اپنا ماننے سے انکار کر رہے ہیں کل آپ کی اولاد آپ کو ماننے سے انکار کرے گی۔ تم اولاد کے ہوتے ہوئے بھی بے اولاد رہو۔ کبھی اپنی اولاد کا سکھ چین نہ دیکھ سکو۔ تم نے اپنی اس اولاد کو دربدر کیا ہے۔ تمہاری وہ اولاد بھی دربدر رہے گی میرا صبر تمہیں کبھی سکون سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کیا وہ میرا انصاف کرے گا۔'' پھر آسمان کی طرف منہ کر کے بولی۔ ''اے اللہ! تو گواہ ہے کہ میرے ساتھ اس گناہ میں کون شریک ہے۔'' پھر ماں کا ہاتھ تھام کر مجھے یاس بھری نظروں سے دیکھا اور دونوں بچوں کو ماں بیٹی اٹھا کر گھر سے نکل گئیں۔ میری ماں نے بھی علیشہ کو بہو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ماموں بولے۔ ''شاید ہم نے تمہیں اسی دن کے لیے پڑھایا تھا کہ تم ہماری عزت کو داغدار کر کے چار چاند لگا دو۔ تم نے تو خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ کاش یہ دن دکھانے سے پہلے اللہ ہمیں اٹھا لیتا۔ جیسا بے غیرت باپ تھا ویسا ہی بیٹا نکلا۔ آج سے میرے دل میں تمہارے لیے کوئی مقام نہیں۔ میں اپنے گھر میں تمہیں مجبوری میں برداشت کروں گا۔'' میں نے ماموں کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا مگر مجھے علیشہ پر بہت غصہ تھا کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ علیشہ لاہور تک پہنچ جائے گی اور صورتِ حال اس حد تک بگڑ جائے گی میں نے تو علیشہ کو عزت سے پانے کی چاہت کی تھی مگر نہ جانے کیسے ہمارے درمیان شیطان آ گیا اور ہم دونوں ہی انسانیت کے درجے سے گر گئے اور حالات ایسے بگڑے کہ بات رسوائی تک آ گئی۔ آج مجھے علیشہ کی ویران آنکھیں یاد آتی ہیں تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ کاش میں اس وقت علیشہ اور بچوں کو قبول کر لیتا تو آج زندگی کی کہانی ہی کچھ اور ہوتی۔

☆......☆

اس واقعے کے بعد جب میں کالج گیا تو کالج میں میری خوب جگ ہنسائی ہوئی۔ ہر شخص کی زبان پر اس قصے کا ذکر تھا کیونکہ علیشہ کی ماں نے لاہور کے گھر کا پتا کالج سے ہی معلوم کیا تھا۔ میرے کولیگ نے بھی فوری طور گھر خالی کرنے کے آرڈر دے دیئے۔ میں نے کالج سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی اور لاہور ٹرانسفر کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ لاہور ٹرانسفر تو نہ ہوا مگر مری کیڈٹ کالج ضرور ہو گیا۔

مری میں میری ملاقات زرینہ شاہ سے ہوئی اور ایک دفعہ پھر زرینہ کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھا اس دفعہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہونے سے پہلے زرینہ کے متعلق ماں کو بتا دیا پھر دونوں طرف کی رضامندی کے بعد ہم رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ شادی کے بعد میں نے اپنا ٹرانسفر لاہور کروا لیا۔ لاہور آنے کے بعد میں نے اپنے ماضی کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ زرینہ میرے لیے اچھی شریک حیات ثابت ہوئی۔

دس سال کے عرصے میں، میں دو بیٹے اور دو بیٹیوں کا باپ بن گیا۔ یوں تو زندگی خوش حال گزر رہی تھی مگر جب بچے یا زرینہ کوئی بات میری مرضی

کے خلاف کردیتا یا کھانا وغیرہ میری مرضی کے خلاف پکا ہوا ہوتا تو میرے اندر جنون کی حالت ایک بار پھر بیدار ہو جاتی ویسے بھی میں بچپن سے ہی جنونی اور غصہ ور تھا۔ اسی جنون کی حالت میں، میں بیوی بچوں کو دھنک کر رکھ دیتا۔ اس حالت میں ماں اگر انہیں بچاتی تو وہ بھی میرے عتاب سے نہ بچتی۔

وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ زندگی ریل گاڑی کی طرح سفر کرتی ہوئی مختلف اسٹیشن چھوڑتی ہوئی ہماری شادی کی سلور جوبلی تک پہنچ گئی۔ ان برسوں میں حالات بہت حد تک بدل چکے تھے۔ دونوں ماموں نانا کا گھر بیچ کر کراچی ہجرت کر گئے۔ میرے ماں باپ اپنی عمر کی منزلیں طے کر کے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ میں بھی اپنی فیملی کے ساتھ الگ گھر میں شفٹ ہو گیا۔ بیٹے پڑھ لکھ کر نوکری کرنے لگے۔ گھر میں خوشحالی آگئی۔ دونوں بیٹوں کی اچھے گھرانوں میں شادیاں ہو گئیں۔ میں بھی ریٹائرمنٹ کے قریب تھا اور مختلف بیماریوں نے جکڑا ہوا تھا۔ اس لیے مرنے سے پہلے بیٹیوں کو ان کے گھر کا کرنا چاہتا تھا۔ میری یہ پریشانی میرے ایک دوست نے حل کردی اور اپنے دونوں بیٹوں کے لیے میری بیٹیوں کے رشتے مانگ لیے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے میں نے جلد ہی تمام معاملات نمٹا کر انہیں رخصت کر دیا۔ بیٹیاں سسرال پہنچ کر روایتی دیورانی جٹھانی بن گئیں۔ ان کی شکایت مجھ تک پہنچتی اب پتا نہیں قدرت میرا امتحان لے رہی تھی یا پھر ماں باپ کی تربیت ہی صحیح نہیں تھی۔ ان کی لڑائیاں ہوتیں، میں انہیں سمجھاتا مگر آفرین ہے زرینہ پر اس نے بھی بچیوں کو نصیحت نہیں کی۔ یہ مائیں ہی تو ہوتی ہیں جو اولاد کو بگاڑتی ہیں وہ اپنی تربیت پر شرمندہ ہونے کی بجائے ان کو ساس سسر سے لڑنے کے طریقے سکھاتی جس سے بیٹیوں کو اور شے ملتی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بتنگڑ بنا کر خوب لڑتیں جس کی وجہ سے سسرال میں انہوں نے ہماری عزت خاک میں ملادی۔

روز روز کی لڑائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شادی کے تیسرے سال بڑے داماد کا برین ہیمرج ہو جانے کی باعث انتقال ہو گیا۔ اتنی چھوٹی عمر میں بیوہ ہو جانا اور پہاڑ جیسی زندگی بسر کرنا بیٹی کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ میں نے اس کے ساس سسر سے عدت کے بعد واپس لانے کی بات کی۔ ان لوگوں نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی جس طرح ہمارے اور بچے کھا رہے ہیں یہ بھی کھالے گی ہم اپنے دوسرے بیٹے سے اس کا نکاح کر دیں گے۔ اس کی اولاد بھی اس کے پاس رہے گی اور اس کا گھر بھی بس جائے گا مگر میں اور میری بیٹی اس کے لیے راضی نہ تھے۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ وہ لوگ بیٹی کو بھیجنے میں مشکلات نہ کریں۔

میں عدت کے بعد ان سے لڑ جھگڑ کر بیٹی کو گھر لے آیا اور داماد کا وہ پیسہ جو اس نے اپنے بچوں کے نام رکھا ہوا تھا وہ بھی اپنی بیٹی کے نام کرالیا۔ وہ لوگ تو اپنے جوان بیٹے کی موت کے صدمے میں تھے۔ ان چیزوں کا کہاں دھیان رکھتے۔ بچوں کو میں یہ سوچ کر چھوڑ آیا کہ بیٹی کی شادی کروں گا تو مسئلہ بنے گا۔ چلتے وقت بیٹی کی ساس نے آنچل پھیلا کر بددعا دی۔ ”جس طرح تُو نے میرے بچوں کو بے ماں کا کیا ہے تو بھی بے اولاد ہو جائے۔ تجھے بھی اولاد کا ایسا ہی غم دیکھنا نصیب ہو۔“

مگر میں نے کب اس کی بددعا کا اثر لیا تھا جو اس کی بددعا پر کان دھرتا حالانکہ میں اگر تحمل مزاجی سے کام لیتا تو معاملہ اطمینان سے حل ہو جاتا۔ اس گھر میں میری ایک اور بیٹی بھی تھی وہ چاہتے تو اس سے بدلہ لے سکتے تھے مگر ان کا بڑا ظرف تھا کہ ان شریف لوگوں نے اسے تنگ نہیں کیا۔ اپنی بیٹی داماد کے علاوہ میں نے اس گھر میں کسی سے رشتہ نہیں رکھا۔ میری اس حرکت کی وجہ سے ہماری دوستی بھی ختم ہو گئی مگر مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی یہیں سے میری بدنصیبی کے دن شروع ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس دن سے میری خوشیوں کے الٹے دن شروع ہو گئے ہیں۔

بیٹی کے بیوہ ہو جانے کے دو سال بعد میں نے دوبارہ اس کا رشتہ دیکھ کر شادی کر دی اب جہاں اس کی شادی ہوئی وہ بہت امیر کبیر لوگ تھے مگر بیٹی چھ ماہ کے اندر ہی گھر بیٹھ گئی۔ پتا چلا کہ وہ لوگ بہت بڑے

اسمگلر تھے اور بیٹی سے غلط کام کروانا چاہتے تھے۔ میں نے کورٹ کے ذریعے اسے خلع دلوائی۔ بیٹی تو واپس آ گئی مگر میں نے لاکھوں کا جو جہیز دیا تھا وہ واپس نہیں آیا۔ مقدمے میں الگ پیسہ برباد ہوا۔

☆......☆

چند سال بیت گئے۔ زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی کہ وقت نے ایک دم پلٹا کھایا۔ میرا چھوٹا بیٹا آفس جانے کے لیے نکلا اور راستے میں ہی ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ڈاکٹر نے آپریشن کر کے اسے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر آپریشن کے درمیان ہی اس کا انتقال ہو گیا جب میری بیٹی نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے اس کے انتقال کی خبر دی تو میں ہوش کی دنیا میں آیا۔ میرے گھر صف ماتم بچھ گئی جس وقت میرے بیٹے کا جنازہ اٹھا تب مجھے یاد آیا کہ میرے داماد کی میت اٹھنے پر اس کے ماں باپ کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔

بہو نے عدت کرنا بھی گوارا نہ کیا اور چہلم کر کے بچے لے کر میکے چلی گئی اور جاتے جاتے بیٹے کے نام کا بینک بیلنس اور جائیداد وغیرہ اپنے نام کروا کر لے گئی خود تو گئی گھر بھی ویران کر گئی۔ تب مجھے یاد آیا میں بھی تو کسی کا مال اسی طرح دھوکے سے لے آیا تھا۔ میں بھی تو کسی کا گھر اسی طرح برباد کر کے آیا تھا۔ میں اپنے پوتے پوتیوں کی شکل دیکھنے کو ترس گیا خوشیاں مجھ سے ایسی روٹھیں کہ گھر میں خوشی ہونے کے باوجود خوشی خوشی نہ لگتی تھی۔

☆......☆

آج میں اپنے گھر کے خالی در و دیوار کو دیکھتے ہوئے سوچتا ہوں شاید علیشہ اور بچوں کی بددعا مجھے لگ گئی کیونکہ پنڈی کے ایک دوست کے ذریعے مجھے علیشہ کے بارے میں پتا چلا تھا کہ علیشہ کی ماں نے اس کی دوسری شادی کر دی ہے اور بچوں کو خود پال رہی ہیں لیکن بچے اپنے ماموں ممانیوں کے رحم و کرم پر انتہائی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں اور جوان ہونے ان پر معاشرے کے ذریعے ناجائز ہونے کی مہر لگ چکی ہے۔ بیٹی کی شادی کے بعد اس کی زندگی بھی ماں کی طرح ہی بدحال ہے اسے بھی ناجائز ہونے کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ بیٹا بھی نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔

علیشہ کے دوسرے شوہر کو بھی علیشہ کے ماضی کے بارے میں پتا چل گیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس پر خوب تشدد کرتا اور طعنے مارتا۔ ان ہی اذیتوں کو برداشت کرتے کرتے ایک دن وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملی مگر اس وقت میں نے ان سب باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ علیشہ جو میری پہلی محبت تھی اور سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیواؤں جیسی زندگی بسر کرتی رہی جس کو قدم قدم پر بدکردار اور بدچلن ہونے کے طعنے ملتے نہ جانے کیسے وہ ان تکلیفوں کو برداشت کرتی ہو گی جو صرف میری وجہ سے برباد ہوئی حالانکہ قصور وار میں بھی تھا مگر سزا کی حقدار صرف وہ ٹھہری۔ وہ اُدھر اپنی کانٹوں بھری زندگی میں تڑپتی تھی اور میں اِدھر اپنی خوشیوں بھری زندگی میں خوش تھا۔ وہ تو چند دن کی سزا پا کر دامن چھڑا گئی مگر میں آج تک سزا بھگت رہا ہوں۔ میرے بچے جو باپ کے ہوتے ہوئے یتیمی کی زندگی بسر کرتے رہے، جن کو میں نے اپنی اولاد ماننے سے انکار کر دیا تھا جو صرف میری وجہ سے دربدر ہوئے۔ آج دل چاہتا ہے کہ انہیں اپنے سینے سے لگا لوں۔ میری بیٹی جو رخصت ہوتے وقت ماں باپ کی دعائیں لے کر نہیں گئی جن بچوں کو میں نے اپنی خوشحال زندگی میں کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا تھا آج شدت سے یاد آ رہے ہیں پھر سوچتا ہوں شاید میرے نواسے نواسیوں کی بددعا ہے جن کے سر سے باپ کی شفقت کا سایہ تو اٹھ ہی چکا تھا میری وجہ سے ماں کی ممتا سے بھی محروم ہوئے۔ پھر سوچتا ہوں شاید بیٹی کے ساس سسر کی بددعا ہے جو جوان بیٹے کی موت کے صدمے میں تھے لیکن میرے پاس ان کے لیے تسلی کے دو بول بھی نہیں تھے بلکہ میں نے اپنے رویے سے ان کے دکھ کو مزید اجاگر کیا۔ پھر سوچتا ہوں شاید علیشہ کی ماں کی بددعا مجھے لگ گئی جس کی اولاد کو میں نے زمانے بھر میں ذلیل و خوار کیا پھر یاد آتا ہے کہ یہ ماموں کی بددعا ہے جو انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ

میں مجھے بددعا دی تھی کیونکہ میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ ان سب کی بددعاؤں کے کارن تو خوشی چند دن میرے پاس رہتی تھی۔

مگر نہیں سب سے بڑی بددعا اور صبر تو میرے ساتھ میری ماں کا ہے۔ دنیا میں جس ہستی کا درجہ ان سب رشتوں سے اونچا ہے میں نے اس رشتے کو دکھ اور تکلیف دی۔ جس ہستی کے قدموں تلے میری جنت تھی میں نے اس ہستی کو پیروں تلے روندا تو میں نے تو اپنے ہاتھوں سے اپنی جنت کو برباد کیا اب کیوں میں جنت نما گھر کا طلب گار ہوں۔ جن ہاتھوں سے میں اس کی چٹیا پکڑ کر کھینچ لیتا تھا ان ہی ہاتھوں سے میں نے اپنے جوان بیٹے کا جنازہ اٹھایا۔ شاید میں اپنے زمانے کا فرعون بنا ہوا تھا۔ جب میں نے اپنی اولاد کا غم اٹھایا تب مجھے یاد آیا کہ میری ماں کو بھی میرا اسی طرح غم ہوتا ہوگا میں بھی تو کسی کی اولاد تھا۔ میں نے تو نہ جانے کتنی ماؤں کے دل دکھائے، بددعا سے زیادہ صبر خطرناک ہوتا ہے۔ بددعا تو کوئی ماں اپنی اولاد کو نہیں دیتی ہے۔ میری ماں بھی نہیں دیتی ہوگی مگر خاموش رہ کر صبر تو کرتی تھی...... اس کی چپ آہ مجھے لگ گئی۔ کاش وہ مجھے منہ سے بددعا دے دیتی مگر خاموش رہ کر صبر نہ کرتی تو آج میری زندگی کانٹوں سے لیس نہ ہوتی لیکن اس کی خاموشی ہی مجھے اور شے دیتی تھی۔ بچپن میں، میں نے سلطانہ ڈاکو کی کہانی پڑھی تھی۔ جو انڈا چرا کر لایا تھا اور ماں نے خاموشی سے اسے تل کے دے دیا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ انڈا کہاں سے آیا اس کی خاموشی کی وجہ سے وہ ڈاکو بن گیا تھا۔ میں بھی تو ماں کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر اچھا انسان نہ بن سکا مگر پھر بھی وہ میری ماں تھیں۔ مجھے ان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

☆......☆

اولاد نہ ہونے کا ایک غم اور ہونے کے ہزار غم ہوتے ہیں۔ میں بھی بے اولاد رہتا تو صرف ایک دکھ جھیلتا مگر اللہ نے مجھے صاحب اولاد اس لیے کیا تاکہ میں بھی جان سکوں کہ اولاد کا غم کیا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جیسا تم اپنے ماں باپ کے ساتھ سلوک کرو گے ویسا ہی تمہاری اولاد تمہارے ساتھ برتاؤ رکھے گی۔ میں اولاد کی سزا سے تو بچ گیا مگر قدرت کی سزا سے نہ بچ سکا۔ اللہ نے اولاد بد دے کر تو مجھے سزا نہ دی مگر گھر کی خوشیاں چھین کر مجھے میری اوقات یاد دلا دی۔ اگر میں ان سب کی بددعاؤں سے بچ بھی جاتا تو ماں کے صبر سے کیسے بچ سکتا تھا۔ آج میں اسی (80) سال کے قریب ہوں اس عمر میں، میں نے جوان اولاد کی موت کا صدمہ جھیلا۔ دو دفعہ میری بیٹی کا گھر اجڑا۔ ان سب صدمات کے باوجود میں کتنا سخت جان رہا کہ کسی بھی صدمے پر میرے دل کی دھڑکن بند نہیں ہوئی۔ ان سالوں میں، میں نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ نہ جانے کس کس کو میں نے برباد کیا اور صرف ایک اللہ نے مجھے برباد کر دیا۔ میں جو کبھی کسی رشتے کے معاملے میں ہارنا نہیں چاہتا تھا آج اپنی تقدیر سے بری طرح ہار چکا ہوں۔

☆......☆

آج میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نہ تو اچھا بیٹا بن سکا، نہ اچھا باپ، نہ اچھا شوہر، نہ اچھا رشتے دار ثابت ہوا۔ میں نے جو یتیم بچوں کا پیسا کھایا تھا وہی پیسہ میرے بیٹے کا کفن بن گیا۔

آخر میں میری آپ سب سے گزارش ہے کہ اللہ کی خوشنودی چاہتے ہو تو ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری نہ کریں۔ ان کی مرضی کے خلاف بات نہ کریں جس سے ماں باپ راضی نہیں ہوتے اس سے اللہ بھی راضی نہیں ہوتا جو ماں باپ کو دکھ دیتا ہے اسے اپنی اولاد سے بھی فیض حاصل نہیں ہوتا اور آخر میں پچھتانا پڑتا ہے۔ اللہ کے بندوں پر بے جا ظلم نہ کرو۔ جو اللہ کے بندوں کو ستاتا ہے تو اللہ اس سے ناخوش رہتا ہے۔ ماں کی نافرمانی اور علیشہ سے بے وفائی کے نتیجے میں ناجائز اولاد کا گناہ۔ یہ دو گناہ میرے لیے قدرت کا انتقام بن گئے۔ آج میری انا، خود پرستی سب کچھ مٹی میں مل چکی ہے اور میں بھی مٹی میں ملنے والا ہوں۔ آپ نے میری کہانی پڑھی فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ ان تمام حالات کا ذمہ دار کون تھا۔

☆☆☆

چوری چوری



منشی محمد عزیز مئے

اُن بیٹیوں کے لیے عبرت اثر تحریر، جو شادی کے بعد بھی آنکھیں بند کیے ماؤں کے اشاروں پر چلتی ہیں

ماسٹر اسلم اگرچہ کوئی بہت بڑی سیاسی یا معروف شخصیت نہیں تھی لیکن علاقے میں اس کی اچھی خاصی عزت تھی۔ قصبے کے واحد ہائی اسکول کا وہ ایک استاد تھا اور بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا اپنا نصب العین سمجھتا تھا۔ ماسٹر اسلم کی چار بیٹیاں اور ایک ہی بیٹا تھا۔

ماسٹر اسلم ایک دبو قسم کا انسان تھا۔ اس کے برعکس اس کی بیوی کنیزاں عرف کجو ایک دھڑلے والی اور بڑے رعب و دبدبہ کی مالک عورت تھی۔ کنیزاں اسلم کی تایا زاد تھی۔ وہ دونوں بچپن سے اکٹھے رہتے اور پلے بڑھے تھے اور کنیزاں کا شروع ہی سے اسلم پر رعب قائم ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج انتہائی کم تھا۔ چنانچہ اسلم جو جیب خرچ کے طور پر جو چار آنے ملتے تھے وہ کنیزاں اس سے چھین لیتی اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ اسلم سے اس حد درجہ تابعداری سے اس کے ہونے والے ساس سسر بھی کڑھتے تھے بلکہ ایک مرتبہ اس کے تایا نے اسلم سے کہا تھا۔ ''اسلم بیٹا! تم مرد ہو اور مرد بن کر رہا کرو، ذرا رعب رکھا کرو کجو پر۔''

''جی تایا ابو۔'' اسلم صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

اسلم اسکول میں ایک پڑھاکو طالب علم شمار کیا جاتا تھا۔ ہر جماعت میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ اس کے ہم جماعت اس کی کم گویائی پر اکثر اسے طعنے مارتے مگر اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں تعلیم کی بہت قدر تھی اور بطور ایک ''کاروبار'' کے ابھی اس کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ آج کل تو تعلیم بھی ایک کامیاب کاروبار بن چکا ہے۔ گلی محلوں میں پرائیویٹ اسکول جابجا کھل چکے ہیں لیکن اصل علم و ادب آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔

میٹرک مکمل کر لینے کے بعد اسلم نے پی ٹی سی کیا اور اسی اسکول میں پڑھانے لگے۔ جہاں وہ خود پڑھتے رہے تھے۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ انہوں نے اردو میں ماسٹر کر لیا اور وہ ہیڈ ماسٹر بن گئے۔

اس دوران میں ان کی شادی ہو چکی تھی اور وہ یکے بعد دیگرے چار بیٹیوں کے باپ بن گئے، چار بیٹیوں کے بعد جب اللہ نے انہیں بیٹے کی نعمت سے نوازا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

ماسٹر اسلم کے گھر میں ان کی بیوی کنیزاں کی حکمرانی تھی۔ ایک دن ماسٹر اسلم نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے کنیز کے کیا معنی ہیں؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے مطلب جاننے کی۔'' کنیزاں نے حسب معمول نخوت سے کہا تو ماسٹر اسلم کھسیا گئے۔ پھر کہنے لگے۔

''کنیز کا مطلب ہے ملازمہ یا نوکرانی۔''

''اچھا۔'' کنیزاں ایک دم غصے میں آ گئی۔

''تمہارا مطلب ہے میں تمہاری نوکرانی ہوں؟''

''ارے نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' ماسٹر اسلم صفائی پیش کرنے لگے لیکن کنیزاں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور پھر ماسٹر اسلم گھر سے نکل پڑے تا کہ گھر کی فضا ساز گار ہو سکے لیکن جب وہ رات کو چوپال سے لوٹے تب بھی کنیزاں کا غصہ کم نہیں ہوا تھا اور وہ مسلسل بڑ بڑائے جا رہی تھی۔

''اچھا بھاگوان! اب جانے بھی دے۔'' ماسٹر اسلم نے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن کنیزوں کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ مسلسل بڑ بڑانے کے بعد جب ماسٹر اسلم کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں آیا تو کنیزاں خاموش ہو گئی۔

اس وقت لڑکیوں کی تعلیم صرف قرآن مجید تک محدود تھی لیکن اس کے باوجود بھی ماسٹر اسلم اپنی بیٹیوں کو گھر پر ہی دنیاوی تعلیم بھی دیا کرتے تھے تا کہ آنے والے وقت میں ان کو کسی قسم کا احساس کمتری نہ ہو اور اس طرح شاید دیگر رشتے دار بھی بیٹیوں کی دنیاوی تعلیم کے حق میں اپنی بیٹیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے لگیں۔ سب سے بڑی بیٹی زبیدہ جب جوان ہوئی تو اس کی



شادی برادری میں رشتے کی خالہ کے گھر کر دی۔

زبیدہ کا ہونے والا شوہر شبیر سعودی عرب میں رہتا تھا اور وہیں کسی کمپنی میں سینیٹری ورکر کے طور پر کام کرتا تھا۔ شادی کی ساری بات چیت رواج کے مطابق بڑوں کے درمیان طے ہوئی اور زبیدہ کی تصویر تک شبیر کو نہیں دکھائی گئی۔ شبیر بھی اگرچہ اسی قصبے کا رہائشی تھا اور اس کا اپنی خالہ یعنی ماسٹر اسلم کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن اسے سعودیہ میں ملازمت کرتے آٹھ برس گزر چکے تھے اور اس نے جوان ہونے کے بعد زبیدہ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

شادی کی رات جب شبیر نے زبیدہ کو اپنی دلہن کے روپ میں حجلۂ عروسی میں دیکھا تو اسے اپنی قسمت پر رشک آ گیا۔ زبیدہ اس کے تصور سے بھی زیادہ خوب صورت حسین تھی۔ وہ تو بس دیوانا ہی ہو گیا۔

شبیر دو ماہ کی چھٹی پر آیا تھا اور دو دو لمحے بن کر رہ گئے۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ زبیدہ کو چھوڑ کر واپس سعودیہ جائے اور اس بات کا اس نے دبے لفظوں میں جب اپنے گھر والوں سے ذکر کیا تو اس کی بہنیں اور بھابیاں اسے زبیدہ کے حوالے سے چھیڑنے لگیں۔

''بس بھابی!'' شبیر نے اپنی بڑی بھابی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ چاہے جو بھی کہیں میں یا تو مستقل طور پر پاکستان آ جاتا ہوں یا پھر زبیدہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔''

''یہ بات ہم سے نہ کہیں دیور جی۔'' اس کی بھابی نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے کون سا آپ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ اجازت لینی ہے تو ابا اماں سے لیں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔''

اس کی بات پر سبھی ہنس پڑیں۔ ''ہاں بھائی'' اس کی چھوٹی بہن نے کہا۔ ''آپ کو بڑوں سے اجازت لینا ہوگی۔ ہمارا کیا اعتراض ہے۔''

''او کے او کے'' شبیر نے کہا۔ ''یہ میرا مسئلہ ہے اور مجھے ہی حل کرنا ہوگا۔''

اس نے اپنی والدہ سے کہا تو انہوں نے کشادہ دلی سے اجازت دے دی۔ شبیر بڑا خوش تھا۔ اس نے سعودیہ میں مقیم اپنے ایک دوست سے بات کی اور پھر جلد ہی زبیدہ کے سارے کاغذات مکمل کروا لیے گئے اور جب شبیر اپنی چھٹی کاٹ کر واپس سعودیہ جا رہا تھا تو اس کے ساتھ اس کی بیوی زبیدہ بھی شریک سفر تھی۔ زبیدہ بھی بہت خوش تھی کہ اسے چاہنے والا شوہر مل گیا تھا۔

آج کے اس تیز ترین دور میں سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ پوری دنیا سمٹ کر انسان کی جیب میں باآسانی سما سکتی ہے۔ زبیدہ بھی اگرچہ اپنے میکے، سسرال اور سبھی رشتے داروں سے ہزاروں میل دور چلی گئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ روزانہ فون پر سبھی سے باتیں کیا کرتی تھی اور خوش رہتی تھی۔ اس کا شوہر بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا اور اپنے تئیں ہر ممکن کوشش کرتا کہ زبیدہ کبھی اداس نہ ہو۔

دوسری طرف کنیزاں بھی بہت خوش تھی کہ اس کی بیٹی کا اچھا گھر بن گیا تھا۔ وہ فطری طور پر ایک لالچی عورت تھی اور بیٹی سے زیادہ اس کو اس بات کی فکر رہتی تھی کہ وہ اپنے کماؤ داماد سے کس طرح زیادہ رقم بٹور سکے۔ زبیدہ سے جب بھی اس کی گفتگو ہوتی اس کی باتوں کا بنیادی مقصد یہی ہوتا وہ یعنی زبیدہ اپنی ماں کو زیادہ سے زیادہ رقم بھیجے تاکہ وہ اس کی چھوٹی بہنوں کی شادی بڑے اچھے طریقے سے کر سکے۔ وہ زبیدہ کو یہی تلقین کرتی۔ ''زبیدہ بیٹی! اللہ کے کرم سے تمہارا تو بڑا اچھا گھر بن گیا ہے۔ اللہ تمہیں خوش رکھے لیکن بیٹی! تم ہمارے حالات تو جانتی ہی ہو۔ تمہاری شادی پر ہم نے جو قرضہ لیا تھا وہ ابھی سر پر ہے۔''

''امی آپ پریشان نہ ہوں۔'' زبیدہ ماں کو دلاسہ دیتی۔ ''آپ کی بیٹیاں، میری بھی بہنیں ہیں اور مجھ سے جو بن سکا میں بھرپور انداز میں اپنی بہنوں کی شادی کرواؤں گی۔''

''بس بیٹی! اللہ کے بعد تم ہی ہمارا آسرا ہو۔'' کنیزاں چاپلوسی سے کہتی۔

اور زبیدہ اپنے شوہر سے مختلف حیلوں بہانوں سے پیسے لے کر گھر اپنے والدین کو مختلف ذرائع سے بھجوا دیتی۔ اسے آہستہ آہستہ ہر جدید سہولت کو استعمال

کرنے کا طریقہ بھی آ گیا تھا اور اس کے شوہر شبیر نے اسے ہر کام سکھلا دیا تھا۔

ایک مرتبہ جب شبیر کے علاقے کا ایک اور لڑکا عارف جو کہ شبیر کے ساتھ ہی کام کرتا تھا اور کبھی کبھار شبیر کے ساتھ اس کے گھر بھی چلا آتا تھا، عارف جب چھٹی پر پاکستان آ رہا تھا۔ زبیدہ کی وجہ سے کنیزاں کو بھی عارف کے پاکستان آنے کا پتا چلا تو اس نے زبیدہ سے کہا۔

''زبیدہ بیٹی! تم نے اپنی بہن کے لیے جو سر مشین لی ہے وہ عارف کے ہاتھ گھر بھجوا دینا۔''

''ٹھیک ہے امی جان۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''میں کوئی بندوبست کرتی ہوں۔''

''اور ہاں شبیر کو تو پتا نہیں ہے ناں، اس بات کا؟'' کنیزاں نے پوچھا۔

''نہیں اماں۔'' زبیدہ نے کہا۔ ''میں آپ کی ہدایات پر حرف بحرف عمل کرتی ہوں۔''

''ہاں بیٹا۔'' کنیزاں نے کہا۔ ''اگر اسے پتا چل گیا کہ تم ہمیں مختلف چیزیں بھیجتی ہو تو وہ ہر وقت تمہیں طعنے دے گا اور اپنے احسان جتلاتا رہے گا۔''

''نہیں امی، میں اسے ہوا تک نہیں لگنے دوں گی۔'' زبیدہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔'' کنیزاں نے کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔''

زبیدہ نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

چند دن بعد عارف، شبیر کے ساتھ ان کے گھر آیا تو شبیر نے کہا۔ ''زبیدہ! تم نے اگر کوئی چیز پاکستان بھجوانی ہے تو عارف کو دے دو، وہ وہاں جا کر دے دے گا۔''

''نہیں فی الحال تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔'' زبیدہ نے کہا تو شبیر نے سر ہلا دیا۔

عارف جب ان کے گھر سے نکلنے لگا تو زبیدہ غیر محسوس طریقے سے اس کے قریب ہو کر اس سے کہنے لگی۔ ''عارف! پاکستان جانے سے پہلے مجھ سے مل کر جانا۔''

عارف کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر زبیدہ نے سر ہلا دیا تو عارف نے کہا۔ ''او کے۔'' شبیر کی غیر موجودگی میں زبیدہ کا یہ فقرہ سن کر عارف کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا لیکن زبیدہ کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر اس نے بھی ہاں کر دی۔

چند روز بعد جب شبیر ڈیوٹی پر تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ زبیدہ نے دروازہ کھولا تو سامنے عارف کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر زبیدہ دروازے سے ہٹ گئی اور عارف اندر آ گیا۔ زبیدہ نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ عارف شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بانہیں پھیلائے زبیدہ کی طرف بڑھا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' زبیدہ نے حیرت سے کہا۔

''تو مجھے کس لیے شبیر کی غیر موجودگی میں بلایا تھا؟'' عارف نے پوچھا۔ تب زبیدہ کو سمجھ آئی کہ عارف غلط فہمی بلکہ خوش فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔

''آپ کی فلائٹ کل کی ہے ناں؟'' زبیدہ نے پوچھا تو عارف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ہاں تو پھر؟''

''وہ...... دراصل مجھے ایک چیز امی کو بھجوانا تھی۔'' زبیدہ نے وضاحت کرنا چاہی لیکن اس کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ عارف کے ساتھ ساتھ زبیدہ بھی چونک اٹھی۔

''یہ کون آ گیا؟'' اس نے خود کلامی کی اور پھر عارف کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی اور اسے کپڑوں کی الماری میں چھپا کر بند کر دیا۔

دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی اور ساتھ ہی شبیر کی آواز آئی۔ ''زبیدہ! دروازہ کھولو میں ہوں شبیر۔'' اس وقت تک زبیدہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' دروازہ کھولتے ہی زبیدہ نے سوال کیا تو شبیر نے بتایا۔ ''دراصل آج صبح جلدی میں سائٹ سے متعلقہ ایک فائل گھر پر ہی بھول گیا تھا۔ وہی لینے آیا ہوں۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ اندر چلے آئے۔ اس وقت زبیدہ کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ مختلف جگہوں پر ہاتھ مارنے کے بعد جب شبیر نے کپڑوں والی

الماری کھولی تو اس وقت تک زبیدہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

شبیر نے جب الماری میں چھپے عارف کو دیکھا تو اسے شدید غصہ آیا لیکن وہ سمجھدار آدمی تھا۔ چنانچہ اس نے عارف سے کچھ بھی نہ کہا اور اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر باہر آ گیا۔ اب اندر عارف بلاوجہ کا مجرم بن کر کھڑا تھا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس نے زبیدہ کا کہنا مان کر شبیر کے مکان کے اندر یوں آنے کا کیوں کر لیا۔

شبیر باہر نکلا اور زبیدہ سے پوچھا۔ ''کب سے یہ کھیل چل رہا ہے؟''

''شبیر! بات دراصل یہ ہے کہ میں آپ سے چوری چھپے امی کو کچھ چیزیں بھجوانا چاہتی تھی اسی لیے عارف کو بلایا تھا اور کوئی بھی بات نہیں ہے۔'' زبیدہ نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا تو شبیر نے پوچھا۔ ''ایسی کیا چیز جو مجھ سے چوری چھپے بھیجنی تھی؟''

''وہ...... وہ ایک جوسر مشین ہے۔'' زبیدہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''اگر اس بات کو سچ مان لیں تو کیا میں نے کبھی تمہیں اپنے میکے والوں کو کوئی بھی چیز بھیجنے سے منع کیا ہے؟'' شبیر اپنے غصے پر بڑی مشکل سے قابو پا رہا تھا۔ ان کی باتوں کے دوران میں عارف خاموشی سے ان کے مکان سے باہر نکل گیا۔ شبیر اسے باہر جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ اس وقت اس کی ساری توجہ کا مرکز زبیدہ تھی۔

''آپ نے تو کبھی انکار نہیں کیا۔'' زبیدہ نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ انکار نہ کر دیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' شبیر جانے لگا تو زبیدہ اس کے پاؤں پڑ گئی۔ ''شبیر! خدا کی قسم بس یہی بات ہے اور کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''اچھا! اب یہ چاپلوسی اور مکاری چھوڑو۔'' شبیر کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ گویا اس کی وہ خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ زبیدہ رونے لگی لیکن اس وقت شبیر گویا پتھر کا بن چکا تھا جس پر کسی بھی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ خاموشی سے گھر سے نکل گیا۔

باہر نکل کر اس نے اپنے سسر کا نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر سلام کے بعد کہنے لگا۔ ''انکل! جوسر مشین کے علاوہ کوئی اور چیز منگوانا ہو تو وہ بھی بتا دیں۔''

''کیا مطلب؟'' ماسٹر اسلم سے چونکہ کنیزاں ایسے سارے معاملات مخفی رکھتی تھی اور اسے اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ کنیزاں اپنی بیٹی سے کیا کچھ لیتی رہتی ہے اس لیے اس کا چونکہ جانا فطری بات تھی لیکن اس درپردہ بات کا علم شبیر کو بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اپنے تئیں بڑے طریقے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ماسٹر اسلم سے کہا۔

''انکل! زبیدہ بتا رہی تھی کہ آپ لوگوں نے جوسر مشین کا کہا ہے اسی لیے میں نے سوچا کہ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو وہ بھی اکٹھے ہی بھیج دیتے ہیں۔''

''نہیں بیٹا۔'' ماسٹر اسلم نے پختہ لہجے میں کہا۔ ''ہم نے تو ایسی کسی چیز منگوانے کا نہیں کہا زبیدہ کو۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' شبیر نے کہا اور الوداعی کلمات کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

اگلے دن اس نے زبیدہ کو واپس بھجوانے کے مکمل انتظام کے بعد اسے دو گواہوں کی موجودگی میں تین طلاقیں دے دیں اور زبیدہ روتی پیٹتی اور صفائی پیش کرتی رہ گئی لیکن شبیر نے اس کی ایک نہیں سنی۔ صرف یہی کہا۔ ''اگر تمہارے میکے والے اس بات کا اعتراف کر لیتے کہ انہوں نے جوسر مشین منگوائی ہے تو شاید میں اپنے دل کو سمجھا لیتا لیکن اب میں آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگل سکتا۔ تمہارا اور میرا راستہ آج سے الگ ہوا۔''

اور زبیدہ روتی پیٹتی واپس پاکستان اپنے ماں باپ کے گھر آ گئی۔ بعد میں آہستہ آہستہ ساری بات واضح ہو گئی۔ تب کنیزاں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ اپنی دوسری بیٹی کو بیاہتے بیاہتے اپنی شادی شدہ بیٹی کو بھی طلاق دلوا بیٹھی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا بس اب تو ساری زندگی کے پچھتاوے ہی اس کے ہاتھ رہ گئے تھے۔

☆☆☆

نیکی گلے پڑ گئی

نصرت سرفراز

اُس رحم دل جوڑے کی کتھا، غریبوں پر مہربانی جنھیں پھانسی گھاٹ تک لے گئی تھی

فون کی گھنٹی مستقل بج رہی تھی۔ زہرا کار پورچ سے بھاگ کر آئی اور فون اٹھایا۔

''جی ہیلو کون؟ کس سے بات کرنی ہے، کون سعدیہ شاہ!'' زہرا کی دوست یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتی تھیں۔

''اوہ سعدیہ یہ تم ہو!''

''ہاں میں زہرا بات کر رہی ہوں۔''

''میرے خدا کتنے سالوں بعد تم سے بات ہو رہی ہے نمبر کہاں سے ملا امی کا تمہیں؟ میرے آنے کا پتا کیسے چلا؟ بچے کیسے ہیں کن کلاسوں میں پڑھ رہے ہیں؟ بیٹا تو بہت بڑا ہو گیا ہوگا؟ موٹی تو نہیں ہو گئیں؟'' زہرا نے



تواتر کے ساتھ سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

دوسری جانب سے سعدیہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''سارے سوالات ابھی ہی کر لو گی یا کچھ ملاقات کے لیے بھی بچا رکھو گی مجھے معلوم ہے تمہیں کینیڈا سے آئے ہوا ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا تم امی اور بہن بھائیوں سے اچھی طرح مل چکی ہو اب دوستوں کی باری ہے۔ کھانا تم نے کل رات کا ہمارے ساتھ کھانا ہے۔ بچوں اور آنٹی کو بھی لے کر آنا تمہارے اعزاز میں ہم نے فرینڈز ری یونین پارٹی رکھی ہے اور ہمارے شیطانی ٹولے کا جو ممبر یہاں پاکستان میں موجود ہے۔ میں نے سب کو بلایا ہے۔ نازش، سونیا، گل وش امبرین، احمد وقار سارے ہی آ رہے ہیں۔ صرف شاہ میران دنوں عمرہ کرنے گیا ہوا ہے اپنی امی کے ساتھ لیکن اس کے بچے اور گل وش تو آ رہے ہیں نا پارٹی میں۔ ویسے وہ کہہ رہا تھا کہ موقع ملا تو اسکائپ پر کچھ دیر کے لیے ہمیں جوائن کر لے گا۔'' سعدیہ نے بھی ایک ہی سانس میں سارا کچھ زہرا کے گوش گزار کر دیا۔

''ارے واہ سعدیہ تم نے تو مابدولت کے اعزاز میں کچھ زیادہ ہی اہتمام کر ڈالا۔'' زہرا خوشی سے لبریز لہجے میں بولی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آج سے سترہ سالوں والی بالی عمر والی دوشیزہ بن گئی ہو اور دوستوں کے ساتھ ہینگ آؤٹ پر جانے والی ہے۔

''چلو تو پھر ڈن ہے ایک شام دوستوں کے نام اللہ حافظ۔ انشاء اللہ کل ملاقات ہوتی ہے۔''

فون رکھنے کے بعد زہرا خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے اپنی امی سے بولی۔ ''امی سعدیہ کی کال تھی اس نے کل یونیورسٹی کے سارے دوستوں کو اپنے گھر کھانے پر انوائٹ کیا ہے۔ تقریباً سارے ہی یونیورسٹی ٹائم کے دوست وہاں پر ہوں گے۔''

سعدیہ شروع سے ہی ایسی ہے دوستوں کی دوست سب کے کام آنے والی۔ اپنا لنچ تک وہ اکثر و بیشتر چڑ اسی کے بیٹے کو دے دیتی تھی اور ہاں اس کا بیگ تو اس زمانے میں بھی گویا کوئی چھوٹا موٹا فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ سنی پلاسٹ سے لے کر پیناڈول تک سب کچھ اس کے عمرو عیار کی زنبیل میں موجود ہوتے تھے۔ اس کے چاکلیٹی تھیلا نما بیگ کو ہم سب دوست عمرو عیار کی زنبیل بولا کرتے تھے۔

زہرا تو جیسے اپنے یونیورسٹی کے زمانے میں پہنچ گئی تھی۔ سنہری یادیں یکے بعد دیگرے چھم چھم کرتی اس کی نگاہوں کے سامنے سلائیڈ شو چلا رہی تھیں۔ ایک بار کالج کا اسٹڈی وزٹ مری جا رہا تھا۔ راستے میں مریم کی طبیعت وومٹ کر کے خراب ہو گئی تھی اور ایسے وقت میں بھی سعدیہ کا چاکلیٹی زنبیل ہی کام آیا تھا۔ اس میں موٹیلیم کی گولیاں نکال کر مریم کو کھلائی گئیں تو تب جا کر ہمارا سفر بخیریت کٹا۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی اس کی شادی بھی گروپ میں سب سے پہلے ہو گئی تھی اور اینورسری سے پہلے ہی ایک بیٹے کی ماں بن کر وہ پہلے سے بھی زیادہ خدا کی شکر گزار اور مہربان بن گئی تھی۔

زہرا کو اچھی طرح یاد تھا جب سعدیہ کی نند کی شادی تھی تو اس وقت سعدیہ کی شادی کو صرف آٹھ ماہ ہی ہوئے تھے اور اس کا بڑا بیٹا ہونے والا تھا اور سعدیہ نے اپنے جہیز کے کئی ایک سوٹ اپنی نند کو دے ڈالے یہاں تک کہ اس کا جہیز کا فریج جو اس وقت تک پیک حالت میں تھا اس نے وہ بھی اپنی نند کے جہیز میں شامل کر دیا ایسی ہی دریا دل تھی۔

وہ کالج کے زمانے میں اگر K.F.C جا کر ہم تمام دوستیں ایک ڈیل لیتیں اور بنا ڈکار کے وہ تمام ہضم کر لیتیں تو وہ اپنی ڈیل کا 50% سامان پیک کروا لیتی اور باہر نکلتے ہی جو پہلا فقیر اس کو نظر آتا اس کو دے دیتی تھی۔ جواز یہ بناتی کہ یار میں زیادہ کھاؤں گی تو موٹی ہو جاؤں گی۔ اور K.F.C والے آدھی ڈیل تو دیتے ہی نہیں تو کیوں نہ یوں ہی ثواب کما لیا جائے۔

گل وش اور شاہ میر کیسے گھنے اور میسنے تھے آپس میں کیا چل رہا تھا کچھ پتا ہی نہیں چلنے دیا۔ فیئر ویل والے دن ایک سرپرائز باکس تھا جو تمام دوستوں کے بیچ رکھ کر کھولا گیا اور اس میں گل وش اور شاہ میر کی شادی کا کارڈ رکھا ہوا تھا۔ ہم سب کتنا ناراض ہوئے تھے اس وقت ان دونوں سے۔ جب کہ گل وش کا کہنا تھا کہ مجھے کا کہنا تھا مجھے خود کچھ معلوم نہ تھا شاہ میر نے مجھ سے خود کچھ نہیں کہا۔ بس اپنے گھر والوں کو رشتہ لے کر بھیج دیا اور ایک ہی ہفتے میں شادی کی تاریخ طے کر ڈالی گئی۔ تو ہم نے تم لوگوں کو سرپرائز دینے کا سوچا اور پھر ہم سب کو ان کی شادی میں ہی سب سے زیادہ مزہ آیا۔ اس وقت پورا گروپ ہی اکٹھا تھا۔ لڈی، بھنگڑا، مہندی، آتش بازی۔

برائیڈل شاور پر ڈھولکی اور ہاں اسی شادی کے دوران ہی تو فراز اپنا دل ہار بیٹھے تھے۔ پروانے کی مانند آگے پیچھے پھرنا کام آگیا اور چھٹے ہی مہینے زہرا جمال اپنا سرنیم چینج کر بیٹھیں اور زہرا فراز بن گئیں۔

یادوں کی ایک حسین مالا تھی جس میں سے موتی ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہوئے جگمگا رہے تھے کہ اچانک امی کی آواز آئی۔

''زہرا کہاں ہو بیٹا۔ یہ دیکھو آکر ایمان نے سارے کپڑے گیلے کر لیے ہیں۔ پودوں میں پانی ڈال رہی تھی مالی بابا کے ساتھ آکر چینج کراؤ۔''

ایمان کے کپڑے چینج کراتے ہوئے بھی زہرا آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کتنا مزہ آئے گا۔ سترہ سالوں بعد تمام دوستوں کا ری یونین اور گیٹ ٹوگیدر ہوگا۔

''آں ہاں سعدیہ کے لیے کوئی گفٹ بھی پیک کر لیتی ہوں۔ کینیڈا سے پاکستان آتے ہوئے اس نے کئی ایک گفٹ ایکسٹرا بھی لے لیے تھے کہ یہاں پاکستان میں دینے دلانے کے کام آئیں گے۔

اگلے دن بڑے بیٹے اذلان کو ماموں کے پاس چھوڑ کر دو چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر بمع امی سعدیہ کے دیے گئے ایڈریس پر پہنچ گئی۔ سعدیہ کا گھر تو بہت بڑا تھا یہ تو بہت چھوٹا ہے پتا نہیں وہ یہاں کیوں شفٹ ہوئی زہرا سوچتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئی سعدیہ کا گھر بہت بڑا تو نہیں تھا مگر بہت دلکش اور خوبصورت انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ ریڈ ٹف ٹائلز سے مزین کار پورچ باؤنڈری وال کے اطراف موتیا کے پھولوں سے لدی ڈالیاں۔ سیدھے ہاتھ پر سفیدا۔ ستون پر گہرے سرخ رنگ کے بوگن ویلا سے لدی شاخیں ٹی وی لاؤنج سے کچن اور بیڈ روم تک سفید ٹائلز۔ بلو فلورل ماربل بارڈر کے ساتھ سعدیہ کے ذوق کی نمائندگی کر رہے تھے۔

سعدیہ پر نظر پڑتے ہی وہ حیرت اور استعجاب سے اس کے گلے لگ گئی۔'' ارے یہ کیا کیا تم نے سعدیہ اتنا خوبصورت گھر ڈیکوریٹ کیا تم نے مگر وزن اتنا بڑھا لیا۔''

''چھوڑو بھی زہرا بہت لمبی داستان ہے۔ اندر آؤ ڈرائنگ روم میں۔''

نازش، سونیا، گل وش، احمر اور امبرین بیٹھے تھے۔ زہرا کو اندر داخل ہوتے دیکھا تو کھڑے ہو کر ویلکم ٹو پاکستان کا نعرہ بلند کیا۔ دعا سلام کے بعد تو جیسے نہ پوچھیں۔ باتوں یادوں، وعدوں اور ارادوں کا ایسا سیلاب آیا کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ سعدیہ نے شاندار ڈنر کا اہتمام کیا ہوا تھا بہت لذت تھی اور خلوص کا تو کوئی مول ہی نہیں تھا۔

رات دس بجے تک کے بعد دیگرے تمام دوست رخصت ہوتے چلے گئے صرف زہرا سعدیہ بچے اور امی رہ گئے۔ آج اس کا ارادہ اس کے گھر قیام کرنے کا تھا۔ سعدیہ برتن سمیٹ کر ماسی کو دیتی جاتی اور وہ اسے دھو کر خشک کر کے سیٹ کرتی جا رہی تھی۔ ایک بات جو زہرا نے نوٹ کی کہ سعدیہ تمام گفٹ اور فوڈ سمیٹ کر فریج میں رکھتی جا رہی تھی۔ اس نے ماسی کو بھی کھانا کھانے کا نہیں پوچھا۔ نہ ہی بچے ہوئے کھانے میں سے کچھ کھانا شاپر میں ڈال کر ماسی کو دیا بلکہ تمام Left Over فریج میں رکھ لیا۔

یا اللہ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ کہاں وہ سعدیہ جو اپنا لنچ بھی بچا کر فقیروں اور غریبوں کو دے دیتی تھی مگر آج ماسی اور اس کی بچی بھوکے رہے مگر اس نے ان کو کھانے کا نہیں پوچھا جب کہ کافی سارا کھانا بچ گیا تھا جو اس نے فریج میں رکھ دیا۔ البتہ سعدیہ نے ماسی کو رخصت کرتے ہوئے پانچ سو کا نوٹ پکڑایا کہ آج تم دیر تک رکی ہو لہٰذا بچوں کے لیے کھانا لیتی ہوئی جانا۔

جب وہ ماسی کو رخصت کر کے پلٹی تب تک میں حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطہ لگا رہی تھی کہ اس طرح کایا پلٹ کیسے گئی کہ اس کو اپنی ماسی کا کوئی خیال بھی نہیں اور وہ بھوکی چلی گئی۔ بہر حال وہ اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکی اور سعدیہ کے پلٹتے ہی پوچھ بیٹھی۔

''یار! تم نے اپنی ماسی اور اس کی بیٹی کو کھانے کا نہیں پوچھا۔ وہ دونوں بھوکی ہی چلی گئیں جبکہ تمہاری دریا دلی اور فیاضی کا تو زمانہ قائل تھا اور لنچ بچا کر غریبوں کو دینا تو تمہاری زندگی کا اولین مقصد ہوا کرتا تھا اور وہ تمہاری چاکلیٹی زنبیل میں موجود دواؤں کا اسٹاک جو سب کے کام آتا تھا یہ کایا پلٹ کیسے گئی۔''

سعدیہ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔'' ڈیئر زہرا! دو

کنال کے گھر سے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ اور فیاضی اور دریا دلی سے کنجوسی و بخیلی تک ایک طویل خار دار سفر طے کیا ہے مگر یہ داستان امیر حمزہ پھر کبھی سہی۔'' وہ ٹالتے ہوئے بولی مگر زہرا فراز نے بھی ضد پکڑ لی کہ آج ہی سناؤ کہ ایسا کیا ہو گیا کہ تم اتنا بدل گئی۔ وگرنہ انسان اپنی فطرت کب بدلتا ہے۔

سعدیہ نے گرین ٹی بنائی اور ہم ادھر کچن میں ہی رکھی چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ اصل میں یہی وہ کہانی بلکہ سچی داستان ہے جو قارئین کے ساتھ شیئر کرنی ہے کہ تصویر کے دو پہلو اور سکے کے دو رخ کتنے الگ الگ ہوتے ہیں۔

☆......☆

''یار زہرا بعض اوقات جھوٹ جب دولت کا لبادہ پہن کر میدان میں اتر کر چیختا ہے تو سچائی خاموشی کی نیند سو جاتی ہے اور یہی ہمارے ساتھ ہوا۔'' سعدیہ نے بتایا۔

''جب میری شادی ہوئی اس کے کچھ دنوں بعد تم کینیڈا چلی گئیں اور یہ تو تمہیں معلوم بھی تھا کہ شادی سے قبل ہی فرحان (سعدیہ کے شوہر) نے ڈیفنس میں ہزار گز کا بنگلہ بنایا ہوا تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد سسرال میں رہنے کے بجائے وہ اپنے اسی بنگلے میں شفٹ ہو گئی عادات تو اس کی ایسی تھیں دل کھول کر سب کی مدد کرتی تھی اس کے گھر ایک فل ٹائم ملازم ڈرائیور تھا جو اپنی بیوی اور ایک چھ سالہ بیٹی کے ساتھ بنگلے میں موجود سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ ڈرائیور باہر کے تمام کام سرانجام دیتا جب کہ اس کی بیوی گھر کے کاموں اور صفائی وغیرہ میں سعدیہ کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ ان دنوں سعدیہ کا ایک دیور اور نند بھی اس کے ساتھ ہی رہا کرتی تھیں کیونکہ دونوں کی یونیورسٹی اسی گھر سے نزدیک تھی۔ حسب عادت سعدیہ ان دونوں ملازموں کا حد سے زیادہ خیال رکھتی تھی جو یہ خود کھاتے وہی یہ دونوں ملازم بھی کھاتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ظہور اور رقیہ (ڈرائیور اور اس کی بیوی) کے یہاں دوسرے بچے کی آمد متوقع ہوئی اور انہوں نے اپنی ایک رشتے کی بہن کو گاؤں سے اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ گو کہ سعدیہ کو وہ پہلے ہی دن سے کچھ زیادہ نہیں بھائی مگر بہر حال گزارا تو کرنا تھا۔ ان ہی دنوں سعدیہ نے بھی نئی نئی خوش خبری سنی تھی کہ خدا جلد ہی ان کے آنگن میں ایک پھول کھلانے والا ہے اور خود اس کی طبیعت آج کل ایسی نہ تھی کہ گھر کے کاموں کی زیادہ دیکھ بھال کر پاتی۔ بعد میں وہ اپنے اس فیصلے پر بہت پچھتائی۔ اس لڑکی جاناں نے ایسے ایسے گل کھلائے کہ ان کی جان پر بن گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کو اپنا شاندار بنگلہ فروخت کر کے نسبتاً کم پوش علاقے میں یہ چھوٹا سا گھر خریدنا پڑ گیا۔ جاناں گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی ایک چالاک لڑکی تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے سعدیہ کے میاں پر ڈورے ڈالنے شروع کیے جب یہاں سے منہ کی کھائی تو ظہور کو لے ڈوبی۔ سعدیہ تو حسب عادت تمام Leftover کھانا اسی وقت نوکروں میں تقسیم کر دیا کرتی تھی۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا جب سعدیہ کی گود بھرائی کی رسم تھی اس دن سارا دن تیار ہونا مہمانوں کو اٹینڈ کرنا تحفے تحائف کی وصولی فوٹو گرافی سیشن کے بعد وہ دونوں اتنا تھک گئے کہ ایسا سوئے کہ صبح ان کی آنکھ پولیس کی آمد کے بعد ہی کھلی۔ پولیس سعدیہ کے شوہر کو ڈرائیور ظہور کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی اور یہ الزام لگانے والا کوئی اور نہیں بلکہ رقیہ کی کزن جاناں تھی جو رو رو کر یہ دہائی دے رہی تھی کہ صاحب نے جو کھانا ظہور کو کھلایا اس میں زہر ملا ہوا تھا اور اسے کھا کر اس کی موت واقع ہوگئی۔ ظہور کی ڈیڈ باڈی کے قریب ہی فرحان کا والٹ بھی موقع واردات پر پولیس کو ملا۔ جو وہ ثبوت کے طور پر اپنے ساتھ لے گئی۔ ابھی سعدیہ وکیل وغیرہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اگلے ہی روز جاناں نے کسی عورتوں کے حقوق کی علمبردار این جی او کے ساتھ مل کر تمام چینلز اور نیوز پیپرز کے ساتھ پریس کانفرنس کر ڈالی اور وہ سارے زخم اور کھرنڈ جو اس کے میاں نے دوران ادائیگی حق زوجیت اور مار پٹائی کے دوران اسے عطا کیے تھے۔ اس نے اسے اللہ کی طرف سے عطا کردہ نعمت سمجھتے ہوئے فرحان کے کھاتے میں ڈال دیئے اور ایسے ایسے الزامات عائد کیے کہ الامان والحفیظ۔ اس کے بیان کے مطابق چونکہ صاحب کی بیوی امید سے تھی تو اسی لیے صاحب اپنی بیوی کے سونے کے بعد اسے طلب کرتا اور اس کے ساتھ من چاہا سلوک بمعہ تشدد کے کرتا اور وہ بیچاری غربت کی ماری اپنے بچوں کی

خاطر یہ سب کچھ سہنے کے لیے تیار تھی۔ آہ زاری بے با کانہ طریقے سے مظلوم تشدد کے نشانات اور شاندار ایکٹنگ کے تمام لوازمات سے مزین این جی او کی شہہ پر اس نے بتایا کہ ایک دن جب صاحب نے مجھے بلایا ہوا تھا کہ ظہور اچانک ادھر آنکلا اور اس نے جاناں اور فرحان کو غیر مہذبانہ حالت میں دیکھ لیا بس اس دن سے فرحان صاحب ظہور بھائی کا دشمن بن گیا کہ کہیں ظہور بیگم صاحبہ کو کچھ نہ بتا دے اور اکثر اوقات تنہائی میں ظہور کو کہا کرتا کہ اس بارے میں اپنا منہ بند رکھے ورنہ وہ اسے جان سے مار دے گا۔ جاناں جس این جی او کے ساتھ ملی ہوئی تھی وہ غریب ملازمہ خواتین کی حقوق کی علمبر ار تھی اور اپنے ذاتی مفادات کی خاطر پیسا پانی کی طرح بہا رہی تھی اور ایک مصری کہاوت ہے کہ جب دولت جب بولتی ہے تو بعض اوقات سچائی خاموش ہوجاتی ہے۔ ہر چینل مرچ مصالحے لگا لگا کر خبریں اور ٹیکرز چلاتے رہے کہ ظالم مالک مظلوم و مفلس جاناں کی عزت خریدتا رہا۔ تشدد و زیادتی کا نشانہ بناتا رہا اور جب اس کے شرمناک کارنامے کا علم غلطی سے ظہور کو ہوا تو وہ اسے جان سے مارنے کی دھمکی دیتا رہا اور ایک دن موقع پا کر اس نے گود بھرائی کی دعوت والے دن کھانے میں زہر ملا کر دیا اور اسے موت کی نیند سُلا دیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ عزت اسی کو بچانی ہوتی کے جس کی کوئی عزت ہوتی ہے جاناں نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس قدر روانی کے ساتھ اپنی عزت کے لوٹے جانے کے واقعات بیان کرتی کہ ہر چینل اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے P.G لگا کر اور اس کی شکل وصورت بلر کر کر کے نت نئے طریقوں سے فرحان اور سعدیہ کی تذلیل کرنے اور تمام این جی اوز اور چینل کہتے کہ بنتِ حوا کا غریب ہونا اس کا جرم نہیں ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہیں یہ بہادر ہے ایسا کسی اور بنتَ حوا کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ ظہور کی بیوی بھی جاناں کی طرف دار تھی کہ اسے نام نہاد مظلومہ نے سبز باغ دکھائے تھے کہ میاں تو گیا اب اس کے دام کھرے کرو۔'' سعدیہ تو یہاں تک بتاتے بتاتے اسقدر روہانسی ہوگئی کہ زہرا کو اسے پانی پلانا پڑا۔''بس نہ پوچھو کس قدر ٹینشن میں تھے ہم دونوں میاں بیوی۔ ان دنوں میری طبیعت خراب تھی۔

پہلا بیٹا ہونے والا تھا اور میاں ناکردہ گناہوں کی پاداش میں بے عزتی سمیٹ رہا تھا۔ جاناں این جی او کی شہہ پر منہ پر دوپٹہ لپیٹ کر اور رو رو کر اپنا برہنہ جسم میڈیا کے سامنے پیش کرتی رہی گواہ کے طور پر کچھ عرصے پہلے ہمارے گارڈن میں کام کرنے والے ایک بچے کو پیش کیا کہ مالکن اسے بھی گلا سڑا پرانا کھانا کھانے کو دیتی تھی۔ جس کو کھا کر اسے ہیضہ ہوگیا تھا اور وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ ہمارا شریف ہونا اور ملازموں کا حد سے زیادہ خیال رکھنا ہی ہمارا جرم بن گیا تھا۔ مقصد تو ان کا پیسے بٹورنا اور شہرت حاصل کرنا تھا۔ ہم نے اپنا ڈیفنس والا گھر بیچ کر ان کی جیبیں بھریں تو ان کا مقصد پورا ہوگیا۔ اس دینے دلانے میں اتنا خرچ ہوا کہ ہزار گز کا بنگلہ بیچ کر یہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ خریدنا پڑا۔ فرحان دیت کی ادائیگی کے بعد جو گھر آئے تو جذباتی طور پر جو گھاؤ ان کی روح پر لگے تھے ان کا مندمل ہونا آسان نہ تھا۔ فرحان کا اعتماد انسانیت پر سے ہمیشہ کے لیے اٹھ چکا تھا۔ جو تذلیل تحقیر اور بے انصافی کی سزا انہوں نے اپنے ناکردہ گناہوں کی کاٹی ہے اس کی چبھن ابھی بھی ان کی آنکھوں میں موجود ہے۔ آج کل کے دور میں جھوٹ اتنے تواتر اور مفادات کے تحت بولا جاتا ہے کہ سچائی اس کی تہوں میں کہیں دب کر رہ جاتی ہے۔ فرحان تو اب گھر میں ملازم رکھنے کے قائل ہی نہیں ہیں وہ تو اب میرے جوڑوں وغیرہ میں درد رہنے لگا ہے اور صفائی وغیرہ کا کام مجھ سے نہیں ہوتا اس لیے اتنے دنوں بعد یہ جز وقتی ملازمہ رکھی ہے مگر میں گھر میں پکا یا بچا ہوا کسی قسم کا کھانا یا کوئی بھی چیز اسے دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا وہ غریبوں ضرورت مندوں کو کھانا دینا، دوائی دینا، کھانے کی کوئی بھی چیز مہیا کرنا سارے شوق ختم ہوگئے ہیں۔ اب صرف روپے کی مد میں صدقہ خیرات دیتے ہیں۔''

زہرا دکھی دل کے ساتھ سعدیہ کے گھر سے اٹھ کر آگئی کہ واقعی قانون نہ صرف اندھا ہوتا ہے بلکہ گونگا اور بہرا بھی ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ جھوٹ اور فریب کے کاندھوں پر سے ہوتے ہوئے سچائی کی گردن پر فٹ ہو جاتے ہیں۔ دھوکا ایک شخص دیتا ہے اور اعتبار ہر انسان سے اٹھ جاتا ہے۔

☆☆☆

صبرے والا سے پانچویں سچ بیانی

سودا

راشد لطیف

اُس دوشیزہ کی داستان، جس سے اُس کی سہیلی نے خوب فائدہ اٹھایا

موسم نے اچانک ہی رُت بدل لی تھی۔ اسے سب کچھ سراب بن بکھرتا نظر آیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر آواز کہیں دُور حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی تھی۔ بہار جیسی خوب صورت پرسکون اور حسین زندگی کے سرسبز پتے، اُس نے خود ہی نوچ ڈالے تھے۔ اب خزاں رسیدہ درخت کی مانند حیران و پریشان تھی، بے یقینی کی اتھاہ گہرائیوں میں خودکو ڈوبتا ہوا محسوس کررہی تھی۔

جن راستوں کو وہ عیش پرستی اور آزادی سمجھتی تھی۔ انہی راستوں کی پُرخار جھاڑیوں نے اسے بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر ان جھاڑیوں سے نکلنے کی کوشش کی تو ان کے سخت اور نوکیلے کانٹے اس کے پُور پُور کو زخمی کردیں گے۔ اسے حیرت ہورہی تھی کہ لوگ کتنی ہوشیاری سے چہرے بدل بدل کر سامنے آتے ہیں اور معصوم اور سیدھے سادے لوگ کتنی آسانی سے ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔

دور کہیں اس کی سماعتوں میں اپنی ماں کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

''بیٹا! ہمیشہ اپنی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ تعلق رکھنا۔'' پھر کہیں سے بابا کی پُرشفقت نصیحت سنائی دی۔

''بیٹا تعلق میں ہمیشہ اعتدال رکھنا۔''

الفاظ بہت سادہ اور عام سے تھے مگر بہت طاقت ور تھے۔ جوکئی پرفریب مناظر کا نقاب چاک رہے تھے۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔

ایک کھلکھلاتی ہوئی شوخ لڑکی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

''دوستی کروگی؟'' کچھ جھجکتے ہوئے اس نے ہاتھ آگے بڑھادیا۔ جیسے نووارد نے گرم جوشی سے تھام لیا۔

''مجھے مصباح کہتے ہیں۔''

''اور میرا نام انعم ہے۔'' دوستی کا آغاز ہوا تو پھر پتا ہی نہ چلا۔ تمام حدود کو کراس کرتے ہوئے پہلے ان کی دوستی کالج میں مشہور ہوئی پھر تمام فاصلوں کو چھوڑ کر گھروں میں آنا جانا شروع ہوگیا۔

اُن دونوں کے معیار میں بالکل بھی توازن نہ تھا۔ مصباح بہت امیر فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اُن کے گھر کا ماحول بھی بہت ایڈوانس تھا۔ کسی بھی قسم کا گھٹیا فیشن کرتے ہوئے اسے کوئی عار محسوس نہ ہوتی، نہ ہی کوئی روک ٹوک ہوتی جبکہ انعم ایک متوسط اور سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی لیے پہلے پہل مصباح سے دوستی میں وہ کچھ ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی مگر بہت جلد مصباح کے بے تکلف ہونے کی وجہ سے اس کا احساس کم مائیگی جاتا رہا۔



مصباح کو گھر سے بلا روک ٹوک کہیں بھی جانے کی اجازت حاصل تھی جبکہ انعم کے والدین اولاد کو حدود میں رکھنے کے قائل تھے۔ انعم والدین کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی جبکہ مصباح کے علاوہ سید عالم مراد کا ایک بیٹا افنان عالم بھی تھا۔

مصباح جب پہلی بار انعم کے گھر آئی تو انعم کے سیدھے سادے والدین اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ شولڈر کٹ بال، باریک ساڑھی نما دوپٹہ گلے میں بے پروائی سے جھول رہا تھا۔ پاؤں میں دو تسموں سے بنی ہوئی لمبی سی ہیل کی سینڈل اور جینز کے اوپر ہاف آستینوں والی شرٹ اس کے وجود کو نمایاں کر رہی تھی۔ مصباح کے جانے کے بعد انعم کے والدین نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ وہ مصباح سے دوستی ختم کر دے مگر وہ انعم ہی کیا جو پیچھے ہٹتی۔

انعم، مصباح کے بنگلے ''عالم ولاز'' سے بہت متاثر تھی۔ پھر نوکروں کی فوج اور ہر چیز سے ٹپکتی امارت سے وہ خصوصی مرعوب ہو چکی تھی۔ جتنی جلدی ان کی دوستی میں پختگی آئی تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ جلدی مصباح نے اُسے اپنے رنگ میں تقریباً رنگ لیا تھا۔

''یار! یہ کیا جبّہ سا پہن کر آ گئی ہو اتنی گرمی میں؟''
انعم ایک دن مصباح کے گھر آئی تو مصباح نے اس کے گاؤن کو دیکھتے ہی کہا تھا۔

مصباح! تمہیں پتا تو ہے۔ میرے امی ابو کا۔ کسی طرح آ تو گئی ہوں۔ یہ گاؤن نہ پہنتی تو امی نے آنے بھی نہیں دینا تھا۔'' اُس نے وجہ بتائی۔

''عجیب ہو یار! اتنی گوری رنگت اور اتنی پیاری شکل ہے پھر کیوں چھپاتی ہو خود کو''

انعم خاموشی سے گاؤن اُتارنے لگی۔ وہ واقعی اتنی خوب صورت تھی کہ اُس کا حسن مصنوعی چیزوں کا محتاج نہ تھا

۔مصباح جیسی لڑکی بھی اس پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔
"یار! تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔" مصباح نے جوش سے کہا تھا جبکہ انعم سوالیہ نشان بن گئی۔
"سنو! میری سالگرہ ہے اور تم نے ڈانس کرنا ہے اوکے؟" اُس نے بلا جھجک تحکمانہ لہجے میں عجیب سی خواہش کی تھی۔
"مگر یار مجھے ڈانس کب آتا ہے۔"
"ڈونٹ وری ،تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں سب سکھا دوں گی۔"
"مگر یار! میری امی بابا کو پتا چل گیا تو۔" وہ جز بز سی ہو رہی تھی۔
"کم آن یار! میں تمھاری امی کو ڈانس کی سی ڈی نہیں بھجواؤں گی کہ اُنہیں پتا چلے۔ اور اگر تم ان کو پارٹی پر ساتھ لے آؤ تو الگ بات ہے۔" اس نے کندھے اُچکا کر کہا تھا۔ اُس کے اصرار پر اُسے ہار ماننی پڑی آخر وہ اس کی خاص سہیلی جو بن چکی تھی۔

اُس نے اپنے تئیں ایک اچھے اور معیاری سوٹ کا اپنے لیے انتخاب کیا اور پریس کر کے بیگ میں رکھ دیا۔ جلدی سے ناشتہ کیا اور چہرے کی لیپا پوتی کر کے گاؤن پہنا۔
"اچھا اماں! میں اردو بازار جا رہی ہوں کام سے۔" اُس نے نقاب لگا کر کہا تاکہ چہرہ اماں کو نظر نہ آسکے۔
"اللہ حافظ! بیٹا! دھیان سے جانا اور سیدھی گھر آنا۔" اس کی ماں نے روٹی ڈالتے ہوئے اُسے ہدایت دی۔ وہ تیزی سے باہر نکل آئی، رکشہ پکڑا اور "عالم ولاز" کا ایڈریس بتا کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔ دس منٹ بعد وہ ان کے چوڑے گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ میوزک اور قہقہوں کا عجیب سا شور گیٹ کے باہر تک سنائی دے رہا تھا وہ سر جھٹک کر اندر داخل ہوگئی۔

مصباح کی تمام کزنز اور فرینڈز آئی ہوئی تھیں وہ ایک ایک کو دیکھ کر حیران ہوئے جا رہی تھی۔ دیکھنے والے کی نظریں جھکا دینے والے ملبوسات، دوپٹوں سے بے نیاز سر۔ کچھ لڑکیاں میوزک کی دھن پر رقص کرتے ہوئے ہر اک کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ مصباح انعم کو دیکھتے ہی اس کے پاس آگئی۔ مصباح کو معلوم تھا کہ وہ کوئی بہانا بنا کر آئی ہے اس لیے اسے یونیفارم میں دیکھ کر اُسے حیرت نہ ہوئی۔
"مصباح یار! میں نے چینج کرنا ہے، یہ والا سوٹ لے کر آئی ہوں۔" انعم نے ہلکے مونگیا رنگ کا سوٹ نکال کر اُسے دکھایا۔
"کس کا سوگ منانے آئی ہو یہاں؟" اس نے سوٹ دیکھتے ہی کہا۔
"مجھے تو یہی مناسب لگا تھا۔ ویسے یہ پیارا لگتا ہے مجھ پر۔"
"دفع کرو یار! ایسے موقعوں پر ڈارک کلر چلتے ہیں۔ میں لے کر آتی ہوں تمہارے لیے ڈریس۔ فوراً اسے پہن لو۔" وہ گہرے نیلے رنگ کا جارجٹ کا سوٹ لے آئی۔ جس پر شیشوں کا نفیس کام کیا ہوا تھا ہاف بازو، چوڑی دار چست پاجامہ اور نیٹ کا چھوٹا سا دوپٹہ ساتھ تھا۔
"مصباح! میں تو ایسے کپڑے کبھی نہیں پہنتی ،کوئی فل بازو والا سوٹ۔"
"زیادہ ماسی نہ بنو، سب چل رہا ہے آج کل۔ چپ چاپ جلدی سے چینج کر آجاؤ۔" چار و نا چار ،اُسے چینج کرنا ہی پڑا۔ گہرے نیلے رنگ میں اس کی رنگت خوب کھل اٹھی تھی، وہ خود کو آئینے میں دیکھ کر شرما گئی۔۔ ہال میں ڈانس شروع کیا تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ اُسے مصباح نے شربت میں نجانے کون سا نشہ پلا دیا تھا۔ وہ خود سے بے نیاز جھوم جھوم کر ڈانس کر رہی تھی ۔ ڈانس میں اب لڑکے لڑکیاں بھی مل چکے تھے۔ وہ بھی کس کی بانہوں میں جھوم رہی کبھی کس کی۔ وہ مدہوش تھی۔ اس کے حسن کی تعریف اور بہت سراہتے پر وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ انجان باہوں میں ہی جھول گئی پھر کوئی یارا نہ رہا۔

شام سات بجے اُس کی آنکھ کھلی تو وہ بہت ہی خوبصورت بیڈ پر دراز تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھی تو اس کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ اتنے میں مصباح آئی تو اُس نے کپڑے چینج کیے اور اپنے گھر کی راہ لی، وہ پریشان تھی کہ وہ لیٹ ہو چکی تھی۔

☆......☆

ایک دن وہ معمول کے مطابق گھر کے کام کر رہی تھی کہ اچانک مصباح اپنے مما پاپا کے ساتھ ان کے گھر

آ گئی۔ وہ حیرت سے اُنہیں دیکھتی رہ گئی۔

''بیٹھنے کا نہیں کہو گی کیا؟'' مصباح نے کہا تو وہ شرمندہ سی اُنہیں کمرے میں لے آئی۔ جہاں ایک پرانا مگر صاف ستھرا پلنگ بچھا تھا۔ مصباح کے مما پاپا باہر صحن میں انعم کے والدین کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔

مصباح! تم یوں اچانک کیسے؟'' وہ ابھی تک ان کی اچانک آمد پر حیران تھی۔

''کیوں ہم نہیں آسکتے کیا؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''نہیں میرا مطلب ہے۔''

''چھوڑو یار! ہم اپنی کوئی چیز لینے آئے ہیں۔''

''کک کیا؟ مم! میرا مطلب ہمارے ہاں؟''

''چھوڑو مطلب و طلب..... کوئی مشرقی روایتی مٹھائیاں، عربی مٹھائیاں، بنگالی فریش کریم کیکس، ربڑی رس ملائی، آئسکریم، قلفی فالودہ نہ سہی سادہ پانی ہی پلا دو یار!'' وہ نان سٹاپ بولے جا رہی تھی۔ آج وہ بہت ہی شوخ نظر آ رہی تھی جبکہ انعم نا سمجھی سی اپنی اماں کو دیکھا۔ جو زبردستی اُن کی آمد پر اپنی ناگواری چھپا رہی تھیں۔ مصباح کی طرح ان کی مما بھی بہت فیشن ایبل نظر آ رہی تھیں۔ عمر کے تقاضے سے بڑھ کر لڑکی بننے کی کوشش میں تھی۔ پھر مصباح کی معنی خیز مسکراہٹوں اور شریر جملوں اور اُن کے جانے کے بعد آخر کار یہ عقدہ بھی کھل ہی گیا کہ وہ لوگ کس مقصد سے آئے تھے۔

سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کہاں انعم جیسی مڈل کلاس عام سی لڑکی اور کہاں سید عالم مراد کا بیٹا ''سید افنان عالم'' جس کے نام کے آگے ڈگریوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

انعم کے والدین تو اپنے سے اونچے طبقے کے لوگوں سے تعلق میں بھی فاصلے کے قائل تھے اور یہاں تو بات ہی رشتے کی تھی۔ مالی حیثیت سے تو زمین و آسمان کا فرق تھا ہی لیکن یہ کوئی معقول اعتراض نہ تھا اصل وجہ تو لڑکے کی بڑی عمر اور ان کی فیملی کے رہن سہن پر آ کر ٹھہر جاتی جو ہر قسم کی آزادی کی حدود توڑے ہوئے تھے پھر لڑکے کی عمر چالیس سال کو چھو رہی تھی جبکہ انعم ابھی بمشکل انیس سال کی تھی۔ اُن لوگوں کی طرف سے اصرار بہت زیادہ تھا۔ اس لئے انعم کے والد کو ''سوچ کر جواب دیں گے'' کہہ کر ٹالنا پڑا۔ معلومات لینا تو بہر حال ضروری تھا۔

☆......☆

وہ کالج سے گھر آئی تو امی اور بابا صحن میں نہیں تھے۔ یقیناً کمرے میں ہوں گے۔ یہ سوچ کر نجانے کیوں قدموں کی آہٹ ہلکی رکھتے ہوئے وہ دروازے تک آئی۔ اندر سے اس کے پاپا کی آواز آ رہی تھی جو کہ اونچی نہ تھی مگر اتنی آہستہ بھی نہ تھی کہ وہ سن نہ پاتی۔

''یہ لوگ غلط بزنس کرتے ہیں۔ سود پر پیسہ آتا ہے۔ خاندانی لحاظ سے بھی اچھے نہیں اور یہ افنان عالم بڑے بڑے فراڈ کیس بھگت کر دوبارہ اپنا نام بنانے میں کامیاب ہوا ہے''

یہ اُس کے والد کی آواز تھی۔ اُسے لگا جیسے زمین و آسمان گھوم رہے ہوں۔ مزید کچھ سننے کی اُس میں ہمت نہیں تھی جو تھوڑی بہت امارت کا رُعب و لالچ تھا وہ رفو چکر ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہیں ڈھے جاتی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆......☆

''انعم تمہیں اپنے والدین کو قائل کرنا ہو گا۔'' کالج میں بریک کے دوران مصباح نے اُسے کہا۔

''تمہارے اور ہمارے اسٹینڈرڈ میں بہت فرق ہے مصباح۔''

''یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ محدود سوچ رکھنے والے لوگ اسٹینڈرڈ کو پرابلم بنا لیتے ہیں۔''

''مم مگر۔''

''اگر مگر کچھ نہیں چلے گا تمہیں ماننا ہو گا۔'' مصباح نے حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔

''میرے امی ابو؟'' وہ شدید اُلجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ اپنے امی ابا کو بھی تم نے ہی منانا ہو گا۔

''مصباح! تم نے یہ.....'' اُس کی ساری باتیں آج ادھوری رہ رہی تھیں۔ مصباح اُسے بولنے نہیں دیتی تھی۔

''دیکھو انعم! ہم اپنے اکلوتے بھائی کی کسی بھی خواہش کو رد نہیں کر سکتے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھی۔

''مطلب یہی کہ بھائی جان نے تمہیں میری سالگرہ پر ڈانس کرتے ہوئے دیکھا اور بس فدا ہو گئے تمہارے حسن پر۔ پھر ڈانس کے دوران تم بھی تو خوب ان سے لپٹ رہی تھیں۔ ان کی بانہوں میں جھوم رہی تھیں۔''

انعم کی پھٹی پھٹی آنکھیں اُسے دیکھتی رہ گئی۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ مصباح کیا بول رہی ہے۔

''اچھا سنو! میں کل کالج نہیں آؤں گی۔ تم کالج کا کہہ کر میرے گھر آجانا۔ پھر ڈسکس کریں گے اور تمہیں یقین بھی ہو جائے گا۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوتی چلی گئی جبکہ انعم کتنی ہی دیر بے یقینی کے عالم میں سوچوں میں غوطہ زن وہیں بیٹھی رہی۔

☆......☆

''مصباح! میرے والدین کبھی نہیں مانیں گے۔'' وہ اس کے گھر بیٹھی اس سے ڈسکس کر رہی تھی۔

تم کوشش کرو تو مان جائیں گے۔ مصباح نے لاپروائی سے کہا۔

''نن نہیں...... ہمارے خاندان میں تو لڑکے بھی فورس نہیں کرتے۔ میں تو پھر لڑکی ہوں۔''

''چھوڑو! اب وہ دور نہیں رہا۔ تم منوا سکتی ہو اگر چاہو تو کیونکہ تم ان کی اکلوتی اولاد ہو۔ تمہارے سامنے ہار مان ہی جائیں گے۔'' اس کے لہجے میں سختی سی آگئی تھی۔

''میں نہیں چاہتی بس۔'' انعم نے بھی تنگ آکر جواب دیا اور یہیں پر مصباح کی اصلیت کھل کر سامنے آگئی۔

''شٹ اپ انعم!'' وہ چیخ پڑی۔ ''تم لوگ ہم سے نہ ہی بگاڑو تو اچھا ہے۔ تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔ ہم سے پنگا لیا تو ساری زندگی ''یہ افنان عالم'' کے نام کو یاد رکھوگی۔'' لہجے میں دھمکی اور سرد مہری تھی۔ کہاں وہ پیار اور نرمی سے بات کرنے والی مصباح اور کہاں وہ جواب زہریلی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔

''ادھر آؤ میڈم!'' مصباح اسے ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے آئی۔ کمپیوٹر کے سامنے رکھی ایک کرسی پر وہ خود بیٹھ گئی اور دوسری پر بیٹھنے کا انعم کو اشارہ کیا۔ کچھ ہی دیر میں کمپیوٹر کی شفاف اسکرین پر نیم عریاں لباس میں ڈانس کرتے ہوئے انعم کا وجود اُبھرا۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہ بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی کے ہاتھ میں جھولنے لگی اور بھرپور مست انداز میں ڈانس کرتے اس سے لپٹنے لگی۔ پھر وہی آدمی اسے بانہوں میں لئے بیڈ روم میں لے آیا۔

کک...... ک...... کون! کب تم نے! یہ سب کیسے مصباح؟'' انعم کا رنگ سرخ پڑ چکا تھا۔ بے ربط سے جملے کہتی ہوئی وہ نڈھال سی ہونے لگی۔

حوصلہ رکھو بی بی! مصباح نے خون خوار نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کس نے...... کیسے ہوا یہ سب مصباح؟'' انعم چیخ اُٹھی۔ یہ سب ڈرنک کا کمال تھا۔ ڈارلنگ جو تم نے کمال کا ڈانس کر کے ہمارے بھیا کا دل چرالیا۔ اُس نے اطمینان سے کہا اور چند اور بٹن پش کئے تو انعم کی نہایت ہی بے ہودہ قسم کی تصاویر سامنے آگئیں۔ کچھ افنان عالم کے ساتھ اور کچھ انجان لوگوں کے ساتھ۔

''نن...... نہیں...... میں نے نہیں بنوائیں یہ۔''

مجھے معلوم ہے کہ تم نے نہیں بنوائیں۔ ہم نے خود ہی تمہاری سمپل تصاویر P.C پر سیٹ کر کے یہ شکل دی ہے لیکن یہ بات اور کوئی نہیں سوچے گا۔ بیوٹی فل بے بی؟ ہر کسی کی انگلی تمہارے کریکٹر کی طرف ہی اُٹھے گی۔

اُس کی زبان بے یقینی اور صدمے سے گنگ ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خود کو ویسٹ مت کرو لٹل گرل! مصباح نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اُس لمحے پہلے جیسی مصباح لگ رہی تھی۔ انعم کی ''مخلص'' دوست!!!

مجھے اُمید ہے اب تم ہمیں مایوس نہیں کروگی۔

☆......☆

اُن کے کرائے کے دو کمروں والے چھوٹے سے پرانے گھر میں معمول سے زیادہ سناٹا طاری تھا۔ اُسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ اُس کا دماغ کسی بھی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ رہا تھا۔ بہت سوچ وچار کے بعد بھی وہ سمجھوتہ نہیں کر پائی تھی۔ اُسے کسی مخلص ہم راز کی شدت سے طلب ہو رہی تھی جس کو اپنی داستان الم سُنا کر وہ کوئی درست فیصلہ کر سکے۔

پھر ضمیر نے رہنمائی کی کہ ''ماں'' سے زیادہ مخلص

"ہم راز" کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ بے اختیار اُس کے قدم ماں کی طرف اُٹھ گئے۔ اُس کی ماں اُس کے بھل بھل بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر حیران و پریشان سی رہ گئی۔

"کیا ہوا ہے انعم میری بیٹی! بتا کیا ہوا ہے۔؟ وہ اس کا سر اور کمر سہلاتے ہوئے بولیں مگر آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔

"چپ کر انعم! کچھ بول تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟"

اماں! مجھے معاف کر دو۔ اماں! اس نے زار و قطار روتے ہوئے اپنی ماں کے پاؤں پکڑ لیے۔ اور آنسوؤں کے درمیان سب کچھ اُسے بتا دیا۔ اب رونے کی باری اُس کی ماں کی تھی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر رونے لگی۔ انعم کو رہ رہ کر پچھلی باتیں یاد آنے لگیں۔ اُسے اپنے والد کی بات یاد آئی۔

"بیٹا! دشمن سے زیادہ دوست سے محتاط رہنا کیونکہ وہ تمہارے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔"

"ہائے ہائے انعم یہ تو نے کس آزمائش میں ڈال دیا" اُس کی ماں بے تحاشا رو رہی تھی۔

"یقیناً! تمہارے والدین یہ سب برداشت نہیں کر سکیں گے دوست!" مصباح کی چبھتی ہوئی آواز سماعتوں میں گونجنے لگی۔

"بیٹا! ہمیشہ اپنی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ تعلق رکھنا۔ تعلق میں ہمیشہ اعتدال اور فاصلہ رکھنا۔"

"بیٹا!"

یہ اس کے امی ابو کی آوازیں تھیں۔ آوازوں میں شفقت ہی شفقت تھی مگر اس نے بہت پہلے یہ باتیں ہنسی میں اُڑا دی تھیں۔ اب پچھتاوے ہی پچھتاوے چاروں طرف اُسے نظر آرہے تھے۔ اُس کی بے دھیانی نے بھنور میں کشتی کی طرح اُسے پھنسا دیا تھا۔ وہ بھولی بھالی، سیدھی سادی زمانے کے شاطر لوگوں کو نہ سمجھ پائی۔ چہروں پہ بناوٹی خلوص کو حقیقت سمجھ بیٹھی۔

"امی! مجھے معاف کر دو۔ میں نے آپ دونوں کو بہت دکھ دیا ہے۔" وہ اپنی ماں کو چپ کرواتے ہوئی معافی مانگ رہی تھی۔ شام تک ساری بات اس کے والد کو بتا دی گئی۔ وہ بھی سکتے میں آگئے۔ ایک طرف عزت و عصمت، بدنامی کا خوف اور دوسری طرف جان سے زیادہ عزیز بیٹی کا مستقبل۔ کافی سوچ و بچار کے بعد انہوں نے راتوں رات وہ کرائے کا گھر چھوڑ دیا اور بہت دور دوسرے شہر چلے گئے۔ جہاں "عالم مراد" کی فیملی جیسا کوئی بھی شخص اُنہیں نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

کراچی سے چھٹی سچ بیانی

کس پہ اعتبار کریں

سمیں غزالہ نہاں

اُس کالی دیوی کے پجاری کا قصہ، جس نے خزانے کے لالچ میں مسلمان ہونے کا ڈرامہ رچایا تھا

رات کے ڈھائی یا تین کا وقت تھا۔ مولوی فضل دین، تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اچانک برابر والے کمرے سے ان کی بیگم کے زور زور سے قرآنی آیات پڑھنے کی آواز آنے لگی۔ مولوی فضل دین جلدی جلدی سلام پھیر کے بیگم کے کمرے میں گئے تو دیکھا ان کی بیگم بہت زور سے سورۃ الفلق کی تلاوت کر رہی تھیں۔ انہوں نے غور سے دیکھا وہ تو نیند میں تھیں مگر زبان پر تلاوت جاری تھی انہوں نے اپنے چار سالہ بیٹے کو بانہوں کے گھیرے میں لیے سینے سے لگا رکھا تھا۔ مولوی صاحب نے آہستہ سے آواز دی۔

"فرزانہ...... فرزانہ......" دوسری آواز پر ان کی بیگم گھبرا کر اُٹھ بیٹھیں۔ "کیا ہوا فرزانہ......" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"مولوی صاحب میں نے بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔" انہوں نے بچے کو اور مضبوطی سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"خواب ہی تھا نا...... اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آیت الکرسی پڑھ کر بائیں طرف تھتھکار دو...... اور اُٹھ کر تہجد کی نماز ادا کرو۔" مولوی صاحب نے کہا تو وہ اُٹھ کر نماز کی تیاری کرنے لگیں۔ مولوی فضل دین کا گھرانہ دین پر پوری طرح کاربند تھا۔ وہ اور ان کا پورا گھرانہ اسلامی تعلیمات کی پوری طرح پابندی کرتے تھے مولوی صاحب قریبی مسجد کے موذن تھے۔ وہ پانچوں وقت مسجد میں اذان دینے کے علاوہ کچھ دم درود بھی کرتے تھے۔ جس کی انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے استاد نے اُن کو روحانی علوم سے روشناس کرایا تھا۔ وہی ان کے مرشد بھی تھے۔ تعویذات وغیرہ کا علم بھی سکھایا تھا۔ اور مولوی صاحب کے گھر دم درود کروانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ ان کے روحانی علاج کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کے جھاڑ پھونک سے سب کو شفا ہوتی اور مولوی صاحب کا سر ہمیشہ اللہ کے آگے جھکا رہتا۔ ہر وقت وہ خدا کا شکر ادا کرتے رہتے کہ اللہ ان کے ذریعے مخلوق کی خدمت کروا رہا تھا۔

یہ برصغیر کے تقسیم سے پہلے کی بات ہے وہ انڈیا کے صوبہ بہار کے ایک پس ماندہ سے گاؤں میں رہتے تھے۔ چھوٹا سا گاؤں تھا اور وہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مولوی صاحب نجیب الطرفین سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی شرافت، ان کے علم اور رحم دلی کے ہندو بھی معتقد تھے۔ کبھی کبھی تو ہندو گھرانے سے بھی عورتیں اُن سے تعویذ لینے اور بچوں کو دم کروانے آ جاتی تھیں۔ مولوی صاحب اُن کو تعویذ اعداد میں لکھ کر دیتے تھے تاکہ قرآنی آیات کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ ان تعویذوں کو جسم سے مل کر جلانے اور پانی میں گھول کر پلانے سے بچے بیماری سے شفا پاتے تھے۔

ان کے گاؤں سے تھوڑی دور ایک گاؤں میں ٹھاکر رام چند کی حویلی تھی۔ ٹھاکر رام چند ایک بڑا زمیندار تھا اور اپنے

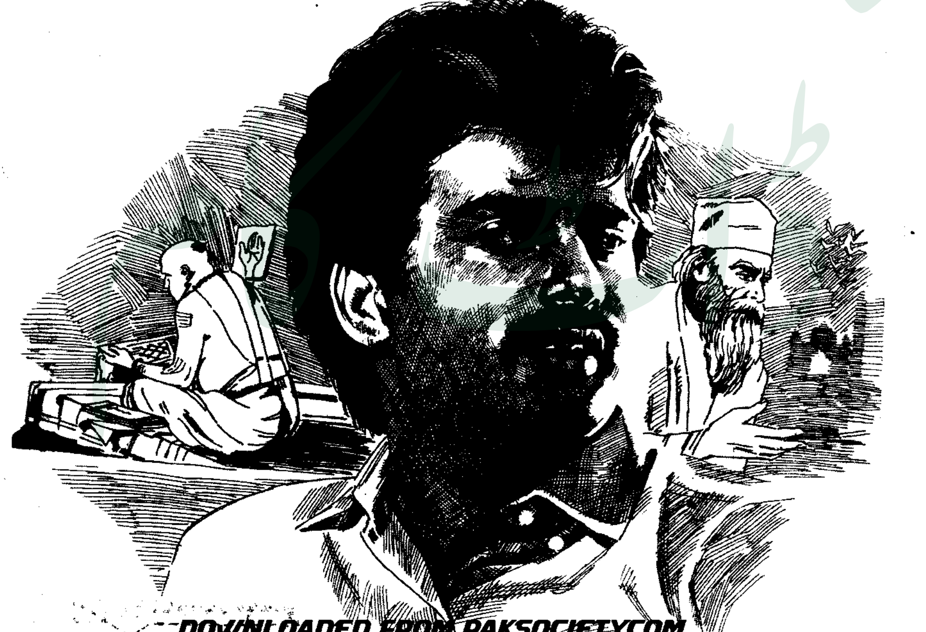
خاندان کے ساتھ ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ ٹھاکر رام چند اور مولوی صاحب کے دادا سید اسلام الدین بچپن کے دوست تھے۔ رام چند کا بیٹا اور مولوی فضل دین کے والد فخر الدین بھی آپس میں گہرے دوست تھے۔ اس زمانے میں ہندو اور مسلمان آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے دلوں میں ابھی تعصب پیدا نہیں ہوا تھا۔ دونوں گھرانوں کے بزرگوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب حویلی میں رام چند کے پوتے بھگوان داس کا راج تھا اسی طرح مولوی فضل دین بھی اپنے دادا اور والد کے بعد گھر میں اکیلے رہ گئے تھے اور اپنی بیگم فرزانہ کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ ان کی بیگم بھی انہی کی طرح دین دار اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ شادی کے پورے پندرہ سالوں بعد اللہ نے بیٹا عنایت کیا تھا۔ جو تقریباً چار پونے چار سال کا تھا۔ دونوں میاں بیوی اکلوتے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے اور اس کو ابھی سے اسلامی تعلیمات سکھا رہے تھے۔

بچہ بے حد خوبصورت اور گول مٹول سا تھا۔

مولوی صاحب کے گھر کے پچھواڑے کافی بڑی اراضی تھی جس میں وہ تھوڑی بہت کھیتی باڑی کر کے اپنے لیے اناج سبزی اور پھل کاشت کرتے تھے جو ان کی مختصر فیملی کے لئے کافی تھا۔ وہیں ایک چھوٹا سا حجرہ بنا ہوا تھا جس میں وہ لوگوں کا روحانی علاج کرتے تھے۔ زندگی بہت پُرسکون گزر رہی تھی کہ اچانک ان کی بیگم کو کچھ ڈراؤنے اور ناسمجھ میں آنے والے خواب نظر آنے لگے اور وہ خواب کی ہی کیفیت میں بلند آواز سے قرآنی آیات کی تلاوت شروع کر دیتیں آواز اتنی بلند ہوتی کہ مولوی صاحب دوسرے کمرے سے اُٹھ کر آ جاتے۔ سب سے پہلا خواب جو انہیں نظر آیا وہ یہ تھا کہ کوئی جانور نما انسانی مخلوق ان کے بیٹے کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی مگر قریب آتے ہی چیختی ہوئی دور ہو جاتی کیونکہ اس کا ہاتھ قریب آتے ہی وہ نیند اور خواب میں سورۃ الفلق پڑھنے لگ گئیں۔ وہ روزانہ سوتے وقت چاروں قل آیت الکرسی اور بہت سی دوسری حفاظت کی قرآنی دعاؤں کا حصار اور بچے پر دم کر کے سوتی تھیں۔ مولوی صاحب بھی روزانہ رات کو پورے گھر کا حصار کر کے سوتے تھے۔

دوسرا خواب چند دنوں بعد پھر نظر آیا کہ جیسے کوئی ہندو آدمی ہے جس کی شکل ان کو جانی پہچانی محسوس ہوئی لیکن یاد نہیں آیا کہ وہ کون ہے؟ وہ بھی ان کے بچے کو اپنی طرف بلا رہا ہے اور وہ پھر خواب میں ہی زور زور سے آیت الکرسی پڑھنے لگ گئیں۔ اس بار بھی مولوی صاحب نے ان کو جگایا۔

آج بھی رات کا وہی وقت تھا۔ جس وقت پہلا خواب نظر آیا تھا اور دوسرا خواب بھی بچے سے متعلق تھا۔ اب تو مولوی



صاحب بھی کچھ فکر مند ہو گئے اور انہوں نے پہلی فرصت میں بچے کے گلے میں حفاظت کا تعویذ ڈال دیا۔

مولوی صاحب لوگوں پر سے جن بھی اُتارا کرتے تھے۔ ان کی بیگم کو یہ خیال ہوا کہ شاید یہ کسی جن کی کارستانی ہو۔ جس کو مولوی صاحب نے کسی پر سے اُتارا ہو اور وہ اب ان کو پریشان کر رہا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا صورتحال پریشان کن تھی۔ تیسرا خواب جو نظر آیا وہ یہ تھا کہ ان کا بچہ ان کے گھر کے پیچھے جو زمین تھی اس میں کھڑا ہے اور کوئی ہندو پنڈت غیر مبہم سے الفاظ بول رہا ہے ان کو جو الفاظ سمجھ میں آئے اور خواب سے جاگ کر جو یاد رہا وہ یہ تھا۔

چندر ما...... تین تاریخ...... چار سال اور...... بلی...... مسلا...... اس بار بھی وہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی تلاوت کر رہی تھیں۔ گویا ان کو خواب میں بار بار یہ اشارہ مل رہا تھا کہ کوئی پریشانی آنے والی ہے اور اس کا حل قرآنی آیات میں ہے۔ کہتے ہیں کوئی پریشانی آنے والی ہوتی ہے تو ہر حال میں آتی ہے۔ یعنی ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ البتہ اللہ کی مدد شامل حال ہو تو بڑے نقصان سے بچا جا سکتا ہے۔ اور اللہ کو بچانا مقصود ہوتا ہے تو تدبیر کا اشارہ بھی مل جاتا ہے۔ اور اللہ اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈال کر امتحان بھی لیتا ہے کہ اس کے بندے کا ایمان کتنا مضبوط ہے۔

بار بار خواب کے ذریعے ان کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ بچاؤ کا انتظام کر لیا جائے۔ سو مولوی صاحب بچے کے گلے میں تعویذ پہنا کر اور کچھ صدقہ دے کر اللہ کے بھروسے پر اس مصیبت کے ٹلنے کا انتظام کر کے بے فکر ہو گئے۔ پھر کئی دن تک ان کو خواب نہیں آئے تو ان کی بیگم بھی بے فکر ہو گئیں۔

☆......☆......☆

چند دن سکون سے گزرے کہ اچانک ایک دن بھگوان داس ان سے ملنے ان کے گھر آیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے مولوی صاحب سے اپنے آنے کا خاص مقصد بیان کیا کہ ان کے گھر کے پیچھے جو زمین ہے اس میں ایک بڑا خزانہ دفن ہے۔ اگر وہ اس زمین پر اس کو ایک خاص جاپ کرنے کی اجازت دے دیں تو خزانہ ملنے کے بعد اس کا آدھا حصہ وہ ان کو دے دے گا۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہاں خزانہ دفن ہے۔'' مولوی صاحب نے پوچھا۔ ''مجھے پنڈت جی نے بتایا ہے...... ان کو ان کے 'بیروں' نے اطلاع دی ہے۔''

''بیر'' غیر انسانی شیطانی وجود ہوتے ہیں جن کو جادو کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔ اور ان سے ناجائز کام کروائے جاتے ہیں۔

''الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور شیطانی عمل کرنے کی اجازت میں اپنی زمین پر ہرگز نہیں دوں گا۔'' مولوی صاحب نے تحمل سے کہا۔ ''سوچ لیجیے...... بادشاہوں کے وقت کا بہت بڑا اور قیمتی خزانہ یہاں مدفون ہے۔ پھر آپ کو اس کا آدھا حصہ بھی ملے گا آپ راتوں رات کروڑ پتی ہو جائیں گے۔'' بھگوان داس نے ان کو لالچ دیا۔

''مجھے کسی دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ تم کہیں اور جا کر خزانہ تلاش کرو۔ بادشاہوں نے اور بھی کئی جگہ خزانہ دفن کیا ہوگا۔'' مولوی صاحب نے سختی سے جواب دیا۔ ''مگر ہمیں اس جگہ کی نشاندہی بڑے خطرناک 'جاپ' کے بعد ملی ہے۔'' ''تو پھر اپنے اس شیطانی جاپ کے ذریعے خزانے کو زمین کے اندر ہی اندر سے اپنی طرف منتقل کر لو۔''

''ایسا نہیں ہوتا ہے۔'' بھگوان داس نے کہا۔

''تو پھر ایسا بھی نہیں ہوگا۔'' مولوی صاحب نے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے ہر صورت میں خزانہ حاصل کرنا ہے۔ میں آپ سے اجازت مانگ رہا ہوں آپ اجازت نہیں دیں گے تب بھی میں حاصل کر لوں گا' اِس صورت میں آپ کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''مجھے چاہیے بھی نہیں...... اور نہ میں تمہیں اجازت دوں گا۔'' یہ کہہ کر مولوی صاحب نے اس کو غصے میں گھر سے نکل جانے کو کہا۔

اس وقت تو وہ چپ چاپ چلا گیا اور مولوی صاحب بے فکر ہو گئے۔ لیکن ان کی بیگم بہت فکر مند ہو گئیں۔ یکدم اُن کو آخری خواب کے الفاظ یاد آئے۔ چندر ما...... تین تاریخ...... بلی...... اور مسلا چار سال...... مولوی صاحب ہمارے بیٹے کی تاریخ پیدائش چاند کی تین تاریخ ہے نا۔'' انہوں نے اپنے شوہر سے پوچھا۔'' ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔ وہ یکدم جذباتی ہو گئیں۔ ''مولوی صاحب آپ دوسروں کو جادو اور جنات سے چھٹکارا دلاتے ہیں۔ خدا کے لیے کچھ کیجیے۔ ہمارا بچہ اگلے ماہ چاند کی تین تاریخ کو چار سال کا ہو جائے گا اور ہندو اپنے مذموم مقصد کے لیے مسلمان کی 'بلی' یعنی قربانی دیتے ہیں۔ کہیں بھگوان داس خزانے کی لالچ میں ہمارے بچے کو بھینٹ نہ چڑھا دے۔ ہمیں مسلسل خواب میں اشارہ ملتا رہا ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر انشاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

ہماری مدد اللہ کرے گا۔'' مولانا صاحب نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ مگر فکر مندی ان کے لہجے سے بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

اس کے بعد کئی دن پُرسکون گزرے۔ ان کو کوئی خواب بھی نظر نہیں آیا اور بھگوان داس نے بھی پھر کوئی بات نہیں کی۔ کئی دن کے بعد ایک دن جب مولوی صاحب کھانا کھا رہے تھے بھگوان داس معہ اپنی فیملی کے آدھمکا۔ اس کی فیملی میں بھی مولوی صاحب کی طرح صرف تین افراد تھے۔ یعنی وہ خود اس کی بیوی آرتی اور بیٹی پریہ...... بیوی اور بیٹی مولوی صاحب کی بیوی کے پاس اندر چلی گئیں اور بھگوان داس مولوی صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر زارو قطار رونے لگا۔ مولوی صاحب نے اس کو چپ کرایا۔ تسلی دی اور پانی پلا کر اس سے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا مولوی صاحب میں آپ سے پہلی بات کی معافی مانگتا ہوں کہ خزانہ حاصل کرنے کے لیے آپ سے سخت لہجہ میں بات کی۔''

''کوئی بات نہیں میں نے تمہیں پہلے ہی معاف کر دیا ہے۔ اب اس بات کو بھول جاؤ۔''

''اب دوسری بات بھی سن لیں۔''

''وہ کیا ہے بولو......'' مولوی صاحب نے نرمی سے پوچھا۔ ''آپ پتا نہیں میری بات کا یقین کریں گے یا نہیں میں نہیں جانتا مگر مجھے تین دن سے برابر ایک ہی خواب آ رہا ہے کہ کوئی کہتا ہے تم مولوی صاحب سے معافی مانگو اور مسلمان ہو جاؤ۔ مولوی صاحب میں سچے دل سے مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ یہ بات میں نے اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کو بھی بتا دی ہے کہ میں اپنا دھرم تبدیل کر رہا ہوں۔ میری بیوی اور بیٹی بھی مسلمان ہونا چاہتی ہیں۔'' مولوی صاحب نے کچھ دیر اس کی طرف خاموشی سے دیکھا۔ پتا نہیں کیوں انہیں اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔

''پہلے تم اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر آؤ۔'' بھگوان داس خوش ہو گیا۔ اس نے اُن کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے مسلمان کر لیں گے نا...... آپ اپنے دین میں مجھے قبول کر لیں گے۔'' ''ہاں کیوں نہیں تم اگر واقعی سچے دل سے مسلمان ہونا چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بھائی بنا لیں گے۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی کی طرح ہیں۔''

پھر بھگوان داس نہا کر صاف کپڑے پہن کر بیوی اور بیٹی کو لے کر آ گیا۔ مولوی صاحب اس کو مسجد کے پیش امام کے پاس لے گئے اور انہی کے ہاتھوں پر اس نے اور اُس کی بیوی اور بیٹی نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام اللہ بخش اس کی بیوی آرتی کا نام سلمہ اور بیٹی پریہ کا نام آمنہ رکھا گیا۔ وہ خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گیا۔

مسلمان ہونے کی خوشی میں مولوی صاحب کی بیگم نے اس کی دعوت کی اور اُس کی بیوی کو تحائف دیے۔

پھر سلمہ اور آمنہ مولوی صاحب کی بیگم کے پاس اکثر آنے لگیں اور وہ ان کو اسلامی رسم و رواج ...... نماز اور دین کی باتیں سکھانے لگیں۔ بھگوان داس جو اب اللہ بخش تھا روزانہ مولوی صاحب کے پاس آتا اور خاموشی سے ان کا درس سنتا' مولوی صاحب بھی اُس کو دین کی باتیں سمجھاتے۔ مگر پتہ نہیں کیوں مولوی صاحب کو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا کہ اللہ بخش دل سے مسلمان نہیں ہوا ہے۔ وہ جب اُس کی طرف غور سے دیکھتے تو وہ گھبرا کر نظریں چرا لیتا۔

چند دنوں کے بعد پھر اللہ بخش ان کے قدموں میں بیٹھا رو رہا تھا کہ میرے خاندان والے مجھ سے اور میری بیوی سے بہت برا سلوک کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے ان لوگوں سے میل جول تقریباً ختم کر دیا ہے پھر بھی وہ مجھے پریشان کرتے ہیں اور مجھے طعنے تشنے دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے قریب رہائش اختیار کر لوں۔ میں اپنا گاؤں چھوڑ کر آپ کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔'' مولوی صاحب کی اجازت سے اس نے ان کے گھر کے قریب رہائش کا انتظام کر لیا۔ اب اس کی بیوی اور بیٹی ان کے گھر روزانہ حاضری دینے لگیں اور ان کے بیٹے سے بہت محبت سے پیش آتیں۔ رفتہ رفتہ ان کا بیٹا ان لوگوں سے بہت مانوس ہو گیا۔ اب وہ اکثر اس کو اپنے گھر بھی لے جانے لگیں اور گھنٹوں اپنے پاس رکھ کر واپس پہنچا دیتیں۔

مولوی صاحب کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ اپنی بیوی پر ناراض ہوئے کہ بچے کو ان کے گھر کیوں جانے دیتی ہو۔

مولوی صاحب کی بیوی کو ان پر اب مکمل اعتماد ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ دراصل ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے وہ اس کو بیٹے کی طرح پیار کرتی ہیں اور آمنہ تو بالکل سگا بھائی سمجھتی ہے۔ ان کی محبت دیکھ کر مجھے ہمت نہیں ہوتی کہ میں منع کروں۔'' بہر حال زیادہ دیر تک ان کے گھر نہیں چھوڑا کرو۔'' مولوی صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

چند دنوں تک مولوی صاحب کی بیگم نے بہانے بنا کر بچے کو ان کی طرف جانے سے روکے رکھا۔ مگر ایک دن آمنہ نے بڑی منت سماجت کی کہ ''تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ کھیلنے کو بھیج دیں۔ آج ماں اور بابا بھی گھر میں نہیں ہیں...... میں اکیلی

ہوں۔'' تو انہوں نے بچے کو جانے کی اجازت دے دی۔

کافی دیر گزر گئی اور بچہ واپس نہیں آیا تو اُن کو فکر ہوئی مگر پھر اپنے آپ کو تسلی دی کہ آمنہ کے والدین گھر آ جائیں گے تو وہ بچے کو لے کر آ جائے گی۔

لیکن جب دن ڈھلنے لگا تو ان کو گھبراہٹ شروع ہو گئی اتنے میں مولوی صاحب بھی گھر آ گئے اور جب ان کو پتہ چلا کہ بچہ صبح سے گیا ہوا ہے اور اب تک واپس نہیں آیا تو وہ فوراً اس کے گھر دیکھنے گئے۔ یہ دیکھ کر تو مولوی صاحب بھی پریشان ہو گئے کہ گھر میں تالا لگا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اللہ بخش تو اپنے گاؤں کل ہی واپس چلا گیا ہے۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا مولوی صاحب گھر آ کر مصلا بچھا کر بیٹھ گئے۔ وہ کافی دیر پڑھنے میں مشغول رہے۔ پھر اچانک جائے نماز سے اُٹھ کر بیوی سے بولے۔

''میں ابھی آیا۔'' اور گھر سے باہر نکل گئے۔

وہ بڑی تیزی سے قریبی قبرستان گئے جس کی نشاندہی ان کو استخارے کے ذریعے ہوئی تھی۔ وہاں جا کر انہوں نے دیکھا کہ ان کا بچہ......ایک درخت سے ٹیک لگائے مطمئن سا کھڑا ہے سر کے بال مونڈے ہوئے تھے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا اور جسم پر لمبا سا پیلے رنگ کا چغہ تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک موٹی رسی کا سرا مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا اور شاید دوسرا سرا دوسری طرف کوئی پکڑے ہوئے تھا کیونکہ رسی تنی ہوئی تھی اور کافی دور تک جا رہی تھی۔ دور سے اللہ بخش نہیں بلکہ بھگوان داس کی آواز آ رہی تھی جو زور زور سے کوئی اشلوک پڑھ رہا تھا۔ مولوی صاحب قرآنی آیت کا ورد کرتے ہوئے بچے کے قریب گئے اسی وقت ایک غیر انسانی وجود اس رسی پر تیزی سے چلتی ہوئی بچے کے قریب آئی مولوی صاحب نے آیت الکرسی پڑھتے ہوئے بچے کے ہاتھ سے رسی لے کر پیچھے پیپل کے درخت کی ایک شاخ سے باندھ دیا جس سے ٹیک لگائے ہوئے اُن کا بچہ کھڑا تھا۔

جیسے ہی بچے کے ہاتھ سے رسی نکلی وہ مخلوق بڑی کریہہ آواز میں چیختی ہوئی واپس پلٹی۔ مولوی صاحب نے اور زور سے آیت الکرسی کا ورد شروع کیا۔ اس وقت ان کا بچہ جیسے نیند سے جاگ گیا۔ اور 'ابا جی' کہہ کر بیہوش ہو کر گر پڑا۔

مولوی صاحب نے کچھ دعائیں پڑھ کر بچے پر دم کیا اور اس کو ہاتھوں میں اُٹھا کر قبرستان سے واپسی کے لیے مڑ گئے۔ آیت الکرسی اب بھی ان کے ورد زبان تھی۔

اسی وقت بھگوان داس کے جنتر منتر کی آواز بھی بلند ہونے لگی اور وہ بھی شیطانی مخلوق رسی پر نمودار ہوئی وہ رسی کے سرے تک آئی اور پھر تیزی سے پلٹ گئی۔ اتنی دیر میں مولوی صاحب بھی قبرستان کے باہر نکل گئے۔

تبھی انہوں نے ایک چیخ سنی اور 'چٹاخ' سے کسی کو طمانچہ پڑنے کی آواز سنائی دی۔ آواز اتنی زوردار تھی کہ پورے قبرستان میں گونج گئی۔ مولوی صاحب جلدی جلدی گھر کی طرف چل پڑے گھر واپس آ کر انہوں نے بیہوش بچے کو بیوی کے ہاتھ میں دیا کہ اس کو غسل کروا دیں۔ اور خود وضو کر کے دوبارہ جائے نماز پر بیٹھ کر کوئی ورد کرنے لگے۔

ورد مکمل کر کے انہوں نے پانی پر دم کیا اور بچے کے منہ میں ڈال کے اس کے جسم پر چھینٹے مارنے لگے۔ اسی وقت بچے کو ہوش آ گیا۔ انہوں نے دوسرا تعویذ لکھ کر اس کے گلے میں ڈالا اور گھر اور بچے کو دعا پڑھ کر حصار کھینچ دیا۔ پہلے والا تعویذ بچے کے گلے سے اُتار کر اللہ بخش نے ایسا عمل کیا تھا کہ بچہ مکمل طور پر ان کے قابو میں تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ اللہ بخش جو بھگوان داس تھا قبرستان میں مردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا اور چہرے پر کسی غیر انسانی ہاتھ کے تھپڑ کا نشان ابھرا ہوا تھا۔ بعد میں اِدھر اُدھر سے پتہ چلا کہ بھگوان داس نے مسلمان ہونے کا ڈرامہ صرف خزانہ حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ اور اس دن چاند کی تین تاریخ تھی جب اس کو اپنے پنڈت کی ہدایت کے مطابق عمل پورا کر کے ایسے بچے کی قربانی دینی تھی جو چاند کی تین تاریخ کو پیدا ہوا ہو اور مسلمان ہو اور اس کی عمر چار سال سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن اس کو یہ نہیں پتہ تھا کہ مسلمان کی مدد اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے اور شیطان کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے یہ مولوی صاحب کے قرآنی اعمال اور وظائف تھے جس سے بھگوان داس کا عمل الٹا ہو گیا اور وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا خزانہ حاصل کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ حق و باطل کی جنگ میں ہمیشہ حق کو فتح حاصل ہوتی ہے یہ بھلا بھگوان داس جیسے شیطان کے پجاریوں کو کب معلوم ہے۔ شیطان نے بھی اللہ تعالیٰ سے ٹکر لی اور ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ بعد میں مولوی صاحب نے بتایا کہ ان کو پہلے ہی دن سے بھگوان داس پر یقین نہیں تھا۔ مگر چونکہ کلمہ پڑھ لیا تھا اس لیے اس کو آزمانے میں حرج نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت جلدی حقیقت آشکار ہو جائے گی۔

☆☆☆

شہرِ قائد سے ساتویں سچ بیانی

چاچی بانوری

مومنہ بتول

ایک میمن سیٹھ کی زندگی کی بساط الٹتی ایک کتھائے خاص، جو آپ کو مدتوں یاد رہے گی

نام تو ان کا بانو تھا مگر عرصہ چار سال میں ان کی بے لوث خدمت، سوجھ بوجھ اور کم گوئی سے متاثر ہو کر غفار بھائی نے جب پہلی بار پکارا تو بانوری ہی پکارا۔ پھر یہ نام ایسا مشہور ہوا کہ بس!

گزشتہ کئی دنوں سے زکریا کا دل بیسن کے میوہ بھرے حلوے کو چاہ رہا تھا اور کوشش کے باوجود وہ اس خواہش کو پورا نہ کر سکا تھا۔ اماں تو خود ساختہ دمے کے مرض میں مبتلا دن بھر بالکونی میں پڑی دھوپ سینکتیں



اور وقفے وقفے سے لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو دائم المریض کہلوانے سے لے کر دوا دارو کے لیے کبھی اسے اور کبھی چاچی بانوری کو پکارتیں۔ یوں تو وہ چاہتا تو حاجی شبو کے حلوائی سے بھرپور قسم کا حلوہ پوری کھا کر اپنی خواہش پوری کر سکتا تھا مگر اس مد میں خرچ ہونے والے پیسے اس کے پاس تھے ہی نہیں اس کا کنجوس مکھی چوس جیسا باپ ہر ہفتے کے اختتام پر جو ہاتھ پر رکھتا تھا اس کا بھی حساب کتاب جاری رہتا اور ہمیشہ کا دبو بزدل سا زکریا دل مسوس کر رہ جاتا۔ اب لے کے چاچی بانوری ہی نظر آتی تھیں جو اس کے لیے گرم گرم میوے والے حلوے کی خواہش کو پورا کر سکتیں اور اس اضافی میووں کی سفارش وہ خود اپنی سوجھ بوجھ سے حل کر سکتی تھیں کیونکہ گھر کے سیاہ سفید کی مالک ہونے کے ناتے سیٹھ غفار بھائی ہر مہینے کا راشن خود اپنی نگرانی میں گھر میں ڈلواتے تھے۔ ایک ایک چیز کی جانچ پڑتال، حساب کتاب کے بعد ہی وہ مطمئن ہوتے۔ حالانکہ جوڑیا بازار کے عین بیچوں بیچ ان کے میووں اور اجناس کی بڑی سی ہول سیلر کی دکان تھی مگر برا ہو ان کی فطرت جو اس حد تک تنگ تھی کہ اگر کبھی مہینے ختم ہونے سے پہلے کسی اجناس کی کمی ہو جاتی تو آنے والی تاریخوں کا انتظار کرایا جاتا اور چلتے پھرتے لاپروائی اور پیسے کی اہمیت گرنے کاروبار کا رونا رویا جاتا۔ جس کا براہ راست حملہ چاچی بانوری کی ذات پر ہوتا مگر آفرین ہے اس بندی پر کہ انہوں نے پلٹ کر اپنے جیٹھ کو جواب دیا نہ برا منایا خاموشی سے اپنے کام میں لگی رہتیں۔

تقسیم ہند کے بعد سیٹھ غفار بھائی کے والد محترم بیوی کی رحلت کے بعد اپنے دو بیٹوں غفار اور جبار کو لے کر پاکستان پہنچے تو صدر کے اریب قریب کے علاقوں میں واقع گاڑی کھاتہ جیسی اولڈ ایریا کی ایک تین منزلہ تکون عمارت میں ایک ایک کر کے دو فلیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ زیورات کی شکل میں لائے جانے والے سرمایہ سے انہوں نے جوڑیا بازار میں ایک چھوٹی سی دکان کھول لی جو ترقی کرتے کرتے ہول سیلر شاپ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر انہوں نے بڑے بیٹے غفار کی شادی برابر میں رہنے والے داؤد بھائی کی بیٹی سے کر دی جو جہیز میں صرف اپنے لیے بھاری زیورات لائی تھی اور ان کی مکمل حفاظت کرنا بھی جانتی تھی۔ غفار بھائی کو اپنے باپ سے پہلی شکایت ہی یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنے برادری کی روایات کے برعکس بہت سستے میں بیٹے کو بیاہ دیا۔ ورنہ دو تین فلیٹ بمع سامان کیش کہیں نہیں گیا تھا اور ان کا یہ شکوہ مرتے دم تک باپ سے رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ بیوی کو وہ حق نہیں دے سکے تھے۔ کلثوم بائی بھی برابر میں میکہ ہونے کے سبب غفار بھائی کی بے توجہی کو محسوس نہ کر سکیں۔ کچھ وہ کام چور ٹھس طبیعت کی واقع ہوئی تھیں لہٰذا گھر گرہستی، شوہر، دیور، کچھ بھی نہ سنبھال سکیں۔ کام میں کوری تھیں لہٰذا آئے دن ہوٹلوں کے کھانوں سے گزارا کرواتیں جو کہ غفار بھائی کی نظر میں بہت بڑی فضول خرچی تھی۔ ان گرجنے برسنے پر وہ ایک آدھ کام کر بھی لیتیں تو دنوں بستر پر پڑ جاتیں۔ بقول ان کے دمہ جیسی لعنت نے انہیں کام کے قابل ہی چھوڑتی۔ ماسیوں کی خدمت کے نتیجے میں انہیں تنخواہ دینا بھی غفار بھائی کے لیے سوہان روح بن جاتا۔ مسئلہ تھا کہ حل کے ہی نہیں دے رہا تھا آخر جوڑ توڑ کے ماہر غفار بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کی صورت میں اسے کیش کرانا ضروری سمجھا اور اپنے باپ کے برعکس بڑے بڑے بیوپاریوں سے گٹھ جوڑ شروع کر دی۔ ویسے بھی جبار شکل و صورت کا غنیمت سا نوجوان تھا جس کے باگ ڈور باپ کے مرنے کے بعد غفار بھائی کے ہاتھ میں تھی۔ اونچے سے اونچا ہاتھ مارنے کے چکر میں مہینوں سالوں مصروف رہے۔

ان کی کوشش تھی کہ کسی مالدار بیوپاری کی بیٹی سے رشتہ ہو جائے جو کیش بینک بیلنس زیورات گھر سب ہی کچھ لے کر آئے اور اسی کی وجہ سے وہ کئی جگہ رشتہ چھوڑ چکے تھے۔ آنے والی کی جہیز کی رقم کے لالچ میں وہ ان ماسیوں کو بھی برداشت کر رہے تھے کہ ان کی تنخواہ والے دن وہ خوب خوب گرجتے برستے مگر کلثوم بائی وہ تو ازلی دمہ کو وجہ بنا کر گھر تو گھر......اولاد کے نام پر زکریا جیسا بیٹا پیدا کر کے ہر کام سے بری الذمہ ہوگئی تھیں۔ ان کا واحد دل

پسند مشغلہ بالکونیوں میں سے لٹک لٹک کر میکے والوں سے باتیں کرنا، گھنٹوں مذاکرات کے بعد اپنی خاندانی پونجی جو کہ ٹھوس زیورات کی شکل میں تھی کو نکال نکال کر دیکھنا اور اسے شوہر کی حریص نگاہوں سے بچانا تھا۔ ابھی سیٹھ غفار بھائی اپنی کوشش میں لگے ہوئے بھی تھے کہ مسینی سا جبار ایک دن سرخ کپڑوں میں ملبوس لڑکی کو دلہن بنا لایا۔ جس کے میکے کا پیشہ تھا نہ جہیز کی نوید ایک زلزلہ تھا جو غفار بھائی کی ذات پر آگرا تھا۔ دوسری مرتبہ ایک بونڈ پھر کیش ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ایک طوفان پھر اطوفان اٹھا تھا گھر میں۔ مگر جبار نے زبان کھولی نہ اس کی آنے والی بیوی نے۔ بس دوسری صبح سے جو اس نے گھر سنبھالا پھر پیچھے نہیں ہٹی۔ سب سے پہلے پانچ سالہ روتے زکریا کو اس نے اپنی ماماتا کی آغوش میں یوں چھپایا کہ سگی ماں ہوتے ہوئے بھی کلثوم بائی اولاد کے حق میں خود دست بردار ہوگئیں۔ پھر نپے تلے آنے والے راشن میں گھر میں پکتا کھانا۔ دکان بھی پہنچنے لگا تو ہوٹل کی مد میں خرچ ہونے والی رقم بھی آدھی ہوگئی۔ گھر بھی صاف ستھرا نظر آنے لگا۔ بلکہ کلثوم بائی کی دوا دارو کے ساتھ ان کے سر کی جوئیں نکال کر صاف ستھرا رہنے میں مدد کرنا بھی اپنی ذمہ داری بنا لیا۔ یوں دو سال سے پہلے ہی کلثوم بائی کا ووٹ بانو کے حق میں ہو گیا تھا۔ یوں بانو گھر کی اضافی بوجھ بنی مگر گھر کی اہم ضرورت بھی بن چکی تھی۔ اور ان کی شادی کے پانچویں سال ان کی بے ضرر مگر قابلیت آمیز وجود کو سیٹھ غفار بھائی نے نہ صرف دل سے قبول کر لیا بلکہ جب پہلی بار پکارا تو بانو کے بجائے ''اے بانوری'' ہی کہہ کر پکارا پھر تو یہ نام ان کے وجود کا کچھ اس طرح حصہ بنا کہ چھوٹا بڑا اپنا پرایا سب ہی نے بانوری کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔ خود زکریا بھی اسے چاچی بانوری کہہ کر مخاطب کرتا اور جب ایک دن اچانک دل کے دورے میں جبار دنیا سے اٹھا تو بھی سیٹھ غفار بھائی نے چاچی بانوری کو گھر سے بے دخل کیا نہ اس کے میکے کے حوالے۔ اور سونی گود والی چاچی بانوری نے اسی گھر میں رہنے کو ترجیح دی۔

اور جب جبار کی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے زکریا کو اسکول سے اٹھا کر دکان لے جانا کا فیصلہ ہوا تو یہ چاچی بانوری ہی تھیں جو سینہ ٹھونک کر پہلی بار غفار بھائی کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔

''اے بھائی غفار ابھی چھوکرے کو پڑھنے دو۔ کاروبار چل تو رہا ہے۔''

معاملہ کافی بگڑا مگر چاچی بانوری نے آدھے دن اسکول سے آنے کے بعد اسے دکان پر جانے کا فیصلہ قبول کرا لیا تھا مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر نہیں چل سکا تھا۔ ہوتا کچھ یوں تھا کہ سامنے گول بلڈنگ میں واقع اسکول سے چھٹی کے بعد اگر کبھی وہ غلطی سے بھی لڑکوں میں جا بیٹھتا یا اسنوکر کھیل لیتا تو رات کو باپ کے ہاتھوں درگت تو بنتی ہی تھی وہیں واہی تباہی بکے گئے القابات کھلی کھڑکیوں سے نکل کر فضا میں پھیل جاتے اور دوسرے دن چھٹی پر شرارتی لڑکوں کا ٹولہ آوازیں کستا ہوا ملتا۔

''اے زکریا تو بگڑ گیا۔'' اور پھر گاڑی کھاتہ جیسی پررونق جگہ..... شرارتی لڑکوں کے قہقہوں سے گونج اٹھتی۔ ایسے میں زکریا کا خون کھول اٹھتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اک اک کا گلہ دبوچ لے مگر اس کی فطرت میں ڈالی گئی۔ ازلی بزدلی اسے روک دیتی اور جو بھی دل کے ہاتھوں مجبور زکریا، اقبال چھولے والے کے پاس چھولے اور کڑک ڈبل روٹی سے فیض یاب ہوتا تو اے غفار یہ تُو لُٹ گیا'' کی گونج چاروں اور گونجنے لگتی۔ دراصل یہ لڑکے اس کے محلے دار تو تھے ہی مگر اس کی نھیال سے تعلق رکھتے تھے جن کی ماؤں کو بھائی بہنا خالہ جیسے رشتے نبھانے والی اس کی ماں کلثوم بائی بالکونی میں لٹک کر گھر میں ہونے والی ایک ایک خبر اپنی میگا فون جیسی آواز میں نشر کرتی رہتیں۔ اس نشریات کے دوران کبھی فنی خرابی دمہ میں مبتلا کھانسی نمودار نہیں ہوتی تھی۔ اپنی کھسیاہٹ اور لڑکوں کے شرارتی حملوں سے بچنے کے لیے زکریا نے اسکول چھوڑ دیا اور صبح باپ کے ساتھ دکان جانا شروع کر دیا۔

کلثوم بائی کی خودساختہ بیماری مزید پھیل گئی اور چاچی بانوری کی گھر میں مزید دلچسپی بڑھ گئی۔

سیل زدہ کمروں کو سجانا اور سنوارنا۔ چاچی بانوری کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

کبھی وہ کمرہ ڈرائنگ روم بن جاتا کبھی لاؤنج اور کچھ ہفتے بعد وہ فرشی نشست کا نوابی ماحول کا حصہ بن جاتا۔ جس کے کھردرے فرش پر اپنے جہیز کی چاندنی بچھا کے گاؤ تکیوں سے سجاوٹ کی جاتی۔ زکریا اور چاچی بانوری نے کئی مرتبہ غفار بھائی کی عدالت میں پیش ہو کر مطالبہ کیا تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے لہٰذا کسی اچھی جگہ خوب صورت سا فلیٹ خرید ا جائے مگر شنوائی ہو کے نہ دی تھی۔

رفتہ رفتہ گزرتے وقت نے زکریا کو لڑکپن سے نکال کر جوانی میں پہنچا دیا تھا اور پہلی مرتبہ کلثوم بائی کو گھر آنگن سونا محسوس ہوا تو اپنے خاندانی زیورات کی صندوقچی نکال کر بہو لانے کا خیال کیا سوچا کہ وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مترادف غفار بھائی کے پیچھے پڑ گئیں۔

خود چاچی بانوری نے اس خیال کو نہ صرف لبیک کہا بلکہ دم خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئیں مگر اس مرتبہ غفار بھائی سستے چھوٹنے والے نہیں تھے۔

اس آخری چیک کو بہت احتیاط سے کیش کرانا چاہتے تھے۔ رہا زکریا..... ! اس کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ درحقیقت وہ ایک کم ہمت نوجوان تھا جس کی ذہنی بالیدگی کی پرورش غفار بھائی جیسے چابک دست ہاتھوں ہوئی تھی۔ اندرون خانہ غفار بھائی نے چند مالدار بیوپاریوں کو نہ صرف نظروں میں رکھا ہوا تھا بلکہ موقع کی تلاش میں تھے۔

اس کی عین العین جوانی بڑھتے قدموں گزرا وقت نہ بن جائے اور کچھ اس کی آنکھوں میں دوڑتے شادی کے نام پر ہلکورے لیتے خمار نے بانوری چاچی کو آمدِ طوفان سے جیسے آگاہ کر دیا تھا۔ پھر یہ اس کا شرعی حق بھی تھا اور اسی شرعی حق کو دلوانے کے لیے کلثوم بائی کو ہمنوا بنا گیا اور معاملہ غفار بھائی کے کورٹ تک جا پہنچا تھا۔

غفار بھائی جیسے زیرک آدمی کے لیے یہی اچنبھا کم تھا کہ ان کی بیوی اور بھاوج..... ایک مرتبہ پھر انہیں نقصان پہنچانا چاہتی ہیں۔ دل تو ان کا بہت چاہا کہ کسی بدماغ ساس کی طرح وہ صلواتیں سنائیں کہ دونوں کے چودہ طبق روشن ہو جائے مگر! آدمی کائیاں تھے۔ کھلم کھلا بغاوت کر کے چنگاری کو بھڑکتا شعلہ بنانے کے بجائے اسے ٹھنڈی راکھ تبدیل کرنے کا ہنر جانتے تھے سو بڑے دلار سے بولے تھے۔

”اے بانوری..... تھوڑا ہاتھ ہلکا رکھ..... سیٹھ الیاس چھوہارے والے کی پوتی ہے میری نظر میں! پتا ہے کروڑوں کا کیش دیں گے جہیز میں۔ میں بھی فارغ نہیں بیٹھا کہ یہ بھری پرات کسی اور کو بخش دوں۔ کوشش میں لگا ہوں کہ اپنے زکریا کا مقدر کھل جائے۔“

اور حسب معمول کلثوم بائی نے گردن ہلا کر شوہر کے خیالات کی تائید کر دی تو میدان میں چاچی بانوری اکیلی کھڑی رہ گئیں۔ خود زکریا نے دل کی بھڑاس ان کی گود میں سر رکھ کر رو رو کر نکالی اور چاچی بانوری اس کے دکھ پر تڑپ کر رہ گئیں۔

☆.....☆

دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ جب ایک دن صبح گیارہ بجے تک زکریا دکان نہیں پہنچا تو اس کو بلانے کے لیے غفار بھائی نے لڑکا دوڑایا۔ جس نے جا کر اطلاع دی کہ زکریا تو صبح ہی گھر سے نکل گیا۔

”تو پھر کہاں گیا؟ نانجار۔“ شام تک غفار بھائی انتظار کرتے رہے اور دکان کے ملازمین ان کے عتاب کا نشانہ بنتے رہے۔ غصے میں آگ بگولہ غفار بھائی گھر پہنچے تو زندگی میں پہلی مرتبہ بالکونی کو کلثوم بائی کے وجود سے خالی پایا، یہی نہیں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہیں کلثوم بائی کے واویلے سنائی دے رہے تھے۔ الٰہی خیر.....! ایک لمحے کو تو وہ بھی دہل سے گئے۔

”اے زکریا کے ابا؟“ گھر میں قدم رکھتے ہی کلثوم بائی کے بین مزید تیز ہو گئے۔ ان کا سیل زدہ دو کمروں کا فلیٹ محلے کی عورتوں سے پٹا پڑا تھا اور بیچ میں اپنی جہیز کی صندوقچی کو سینے سے لگائے کلثوم بائی دہائی دے رہی تھیں۔

”اے زکریا کے ابا میں لٹ گئی۔ جانے کون نامراد میرے زیورات لے اڑا۔“

اس درجہ صدمہ آمیز خبر کے باوجود وہ کسی

ہوشیار تھانے دار کی طرح بانوری کی طرف مڑے۔

''اے بانوری! اپناز کریا کہاں ہے؟''

اور تب یہ عقدہ کھلا کہ کلثوم بائی کے خاندانی زیورات کوئی اور نہیں ان کا اپنا بیٹا ہی لے اڑا ہے۔

اے میرے اللہ۔

پھر تو کلثوم بائی کی دہائی نے وہ واویلا مچایا کہ گاڑی کھاتہ کی تمام اریب قریب آمنے سامنے فلیٹوں کی کھڑکیوں سے پردے اٹھنے لگے۔ بالکونیاں نئی مزیدار کہانی دیکھنے والی عورتوں سے بھر گئیں۔ سیل زدہ مخدوش بلڈنگوں کی جن کھڑکیوں کو کیل لگا کر پاٹ دیا گیا تھا وہ بھی کھٹا کھٹ کھلنے لگیں۔ جلد ہی یہ خبر ''ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی'' کے مصداق محلے میں گردش کرنے لگی اور جب مزید معلوم ہوا کہ دکان کا بھی کافی کیش اور آرڈر بک ہونے پر بھاری رقم بھی زکریا لے اڑا ہے تو غفار بھائی کی تو گھٹیا ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ مارے صدمے کے ہوش گنوا کر جوش میں مغلظات بکنے لگے تھے۔ لوگ باگ۔ افسوس بھی کرتے رہے اور تبصرے بھی۔

''ارے بھئی لوگوں کی تو بیٹیاں گھر سے بھاگتی ہیں اپنے غفار بھائی کا تو بیٹا گھر کو لوٹ کر فرار ہو گیا...... ہاہاہا......''

''وہ تھا بھی تو ایک شرمیلی بزدل لڑکی کی مانند......''

ہنسی ٹھٹول ہوتا رہا۔

اور جلے پاؤں کی بلی کی طرح غفار بھائی خود اپنے بیٹے کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہتے تھے مگر بیچ میں برادری کے بڑوں نے پڑ کر انہیں بہ مشکل اس کام سے باز رکھا۔

ابھی ابھی برادری کے سرکردہ سرپنچ بزرگ بڑی مشکلوں سے غفار بھائی کو صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تھے۔ چاچی بانوری خاموشی سے اسٹیل کے گلاس اکٹھا کر رہی تھیں جس میں 25 والے ٹینک کے ساشے سے ان لوگوں کی تواضع کی گئی تھی۔ کلثوم بائی کمرے سے ورانڈے میں منتقل ہو چکی تھیں اور برابر کی بالکونی میں لٹکتی اپنی بھاوج کی ہمدردی حاصل کر رہی تھیں۔ ان کے دل میں بیٹے سے زیادہ اپنے خاندانی طلائی زیورات کی فکر تھی۔

گھر میں ایک نامعلوم سا سناٹا پھیل چکا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کسی شریف باریش عزت دار باپ کی پگڑی کو دنیا میں اچھال کر کوئی بیٹی فرار ہو گئی ہو۔

ملگجے بلب کی زرد روشنی میں ہیولا بنے غفار بھائی اپنے دماغ کی آخری حد تک پہنچی ذہانت سے اس صورت حال سے نمٹنے کا مشورہ کھنگال رہے تھے اور......اور گھر میں شام غریباں اتر آئی تھی۔ دوسرے کمرے میں موجود چاچی بانوری بڑے اعتماد سے فون پر بات کر رہی تھیں ہر چند چلتی ٹرین کی پر شور آواز سے بات ذرا مشکل سے ہو رہی تھی مگر لہروں کے زور پر ان تک پہنچنے والی زکریا کی پر جوش آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ مشکور ہو رہا تھا۔ قربان جا رہا تھا۔

''آئی لو یو۔ مائی چاچی بانوری۔ آپ کا دیا مشورہ......آپ کا دیا حوصلہ......آپ کی وجہ سے میں اور زلیخا......کامیاب ہو سکے ہیں۔''

''ایسے ہی حوصلہ کر زکریا۔ بس چند سال صبر جب چار سال بعد تیرا باپ اس حقیقت کو قبول کر ہی لے گا تو میں اطلاع کر دوں گی پھر تیری بیوی اور معصوم بچوں کو دیکھ کر بھائی غفار کچھ نہ کر سکیں گے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس چند سال......اپنا اور اپنی بیوی کا خیال رکھنا۔ اچھا اللہ حافظ۔

فون آف کر کے چاچی بانوری نے گہرے سانس لیے۔

آج انہوں نے اپنے دو پرانے قرض چکتا کیے تھے۔ ایک زکریا جیسے بیٹے کو اس کا شرعی حق دلا کر اور دوسرا اپنی بیوہ بہن کی دوسری بیٹی کو سہاگن بنا کر۔ جو کل نہ صرف زکریا کی اولاد بلکہ اس کی تمام جائیداد کی قانونی وارث بننے والی تھی۔ جو کام میں نہ کر سکی وہ میری بھانجی اس گھر میں راج کر کے کرے گی۔

شاباش زکریا......اب فکر مت کر اور ہاں......!
جب تک تُو لوٹ کے نہیں آ جاتا میں ہوں نا!
تیرے ماں باپ کی دیکھ بھال کرنے والی!
تیری چاچی بانوری......!

☆☆☆

بابا کی رانی

فراز قیوم

ایک باپ کی اپنی بیٹی سے محبت کی داستان، جو آپ کی آنکھیں بھی نم کر دے گی

میرا نام فراز قیوم ہے۔ پنجاب پولیس میں ملازم ہوں۔ میری شادی تقریباً چار برس قبل میری پھوپو کی بیٹی سے ہوئی۔ میرا ماشاء اللہ ایک بہت خوبصورت اور شرارتی بیٹا ہے جس کا نام محمد حاشر ہے۔ میں اپنے والدین کے زیر سایہ بہت اچھی اور خوش گوار زندگی گزار رہا ہوں۔ 4 اپریل 2016ء بہار کی ایک مہکتی شام تھی جو میری زندگی کی خوب صورت ترین اور حسین شام تھی۔ اس وقت کنٹونمنٹ جنرل اسپتال راولپنڈی میں اپنے تمام اہل خانہ کے ساتھ موجود تھا اور اللہ پاک کے فضل سے ہم اپنے گھر آنے والے نئے مہمان کے منتظر تھے۔

میں لیبر روم سے کچھ فاصلے پر بے چینی کی کیفیت میں ٹہل رہا تھا اور اللہ پاک کے حضور ایک ہی دعا مسلسل دہرائے جا رہا تھا کہ اللہ پاک مجھ بندہ ناچیز پر اپنا خاص فضل کرنا اور مجھے خیر خیریت سے اپنی خاص رحمت یا نعمت سے نوازنا۔ میں اپنے لیے اللہ پاک سے اس کی خاص رحمت ''بیٹی'' کا شدت سے طلب گار تھا۔

تقریباً 6 بجے کے قریب مجھ دور سے تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی میری بڑی سالی اور خالہ نظر آئیں جن کا رخ میری طرف تھا۔ میرا دل اور تیز دھڑکنے لگا۔ یا اللہ پاک خیر کرنا۔ اسی دوران میرے پاس میرا چھوٹا بھائی اویس اور سالا دانیال بھی کھڑے تھے جو میری طرح کسی بہت اچھی خبر کے منتظر تھے۔ میں آنکھیں بند کیے درود پاک کا ورد کر رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں خوشی سے چیختی ہوئی آوازیں پڑی۔

''مبارک ہو اللہ پاک نے حاشر کو کھیلنے کے لیے بہت پیاری سی گڑیا عطا کی ہے۔'' تب مجھے ایسا لگا کہ اس روئے زمین پر مجھ سے خوش نصیب کوئی شخص نہیں ہوسکتا کہ اللہ پاک نے بندہ گناہ گار کی خواہش پوری کر دی۔ مجھے اپنی رحمت سے نواز دیا۔

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے میں اللہ پاک کے حضور سجدہ شکر بجا لایا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے اور میں برآمدے میں کھڑی اپنی امی جان سے لپٹ کر رو پڑا۔ اردگرد موجود لوگ شاید یہ سمجھ کے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ اس باپ کو اپنی ''بیٹی'' کی پیدائش کی خوشی نہیں لیکن یہ تو میں جانتا تھا کہ میں اس سے پہلے کبھی اتنا خوش نہیں ہوا اور آج تو زندگی کی سب سے بڑی خوشی عطا کر دی مجھے میرے رب نے۔

خوشی کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ میں سب سے مبارک وصول کر کے ایک کونے میں فرش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنی خوشی کو کیسے مناؤں۔ کس طرح اپنے رب کا شکر ادا کروں۔ بس ایک انتظار اور تھا کہ جلد از جلد اپنی زندگی کی سب سے پیاری دوست اپنی بیوی سے ملوں اور اس کو مبارک دوں اس سے مبارک لوں جس نے اللہ پاک کے فضل سے مجھے میری زندگی کا سب سے بڑا تحفہ دیا۔ چند منٹوں میں ہی میری بیٹی کی آمد کی خبر پورے خاندان میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ہر طرف سے مبارک باد کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد میری پیاری میری رانی میری بانہوں میں تھی۔ گلابی کمبل میں لپٹی وہ ننھی پری لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی رانی کو اٹھایا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔ میں نے اپنی بیٹی کو چوما اور ایک بار پھر اللہ پاک کا شکر ادا کیا۔ پھر میں نے اپنی بیٹی کے کانوں میں کلمات اذان ادا کیے اور اسے اس دنیا کی سب سے عظیم دعوت دے کر اس دنیا میں خوش آمدید کہا۔ پھر میرے والد صاحب نے اپنی پوتی کو گھٹی دی اور صحت تندرستی اور اچھے نصیبوں کی ڈھیروں دعائیں دیں۔

میری بیٹی بہت خوب صورت تھی اور میری بڑی سالی حد سے بڑھ کر اس کی تعریف کر رہی تھی اور وہی لمحہ تھا جب میری بیٹی کو پہلی بار کسی کی نظر لگ گئی۔ نظر تو پیار بھری تھی لیکن میری پیاری بیٹی برداشت نہ کر سکی اور ایک چھوٹے سے حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس کے ناف پر لگا ہوا کلپ ڈھیلا ہو گیا اور بہت زیادہ بلیڈنگ شروع ہو گئی۔ ہم نرسنگ اسٹاف کی مبینہ غفلت کی وجہ سے کسی بڑے حادثے کا شکار ہوتے بال بال بچے اور ڈاکٹر کی بروقت کوشش نے ہماری خوشیوں کو نظر لگنے سے بچا لیا اور ہم سب نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے اللہ پاک کا شکر ادا کیا۔

وہ رات ہم نے اسپتال میں گزاری اور صبح



معمول کے چیک اپ کے بعد گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ سب سے زیادہ خوشی میری بیوی کو ہوئی جس کو بیٹیوں سے بہت لگاؤ تھا اور آج اسے اس کی سب سے اچھی سہیلی اس کی بیٹی کی صورت میں مل گئی تھی۔ ہم دونوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک نام سوچ رکھا تھا لیکن ہمیں اپنی بڑی پھوپو کی خواہش کے احترام میں اپنی اس خواہش کی قربانی دینی پڑی جو 30 سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اولاد جیسی نعمت سے محروم تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ میں نام رکھوں گی گڑیا اس لیے ان کی خواہش کا احترام ہمارے لیے کسی فرض کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہم اسپتال سے واپسی پر سیدھا اپنی پھوپو کے گھر گئے جن کی بالائی منزل پر ہم رہتے تھے۔ میری پھوپو نے دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ ساتھ میری بیٹی کو''طیبہ فراز'' جیسا خوب صورت نام دیا۔ جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے لیے ایک یاد بن گیا۔

ہمارے گھر میں جشن کا سماں تھا۔ تقریباً سب قریبی رشتہ دار طیبہ فراز کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہمارے گھر پر جمع ہو چکے تھے۔ طیبہ فراز کے چچا اور پھوپو نے مل کر خوب کمرہ سجایا اور طیبہ فراز کو گھر میں خوش آمدید کہا۔ میری بیٹی کا اس کے شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ اس کا بستر سرخ گلابوں سے مہک رہا تھا۔ ہر چہرے ہر رشتے کی خوشی دیدنی تھی۔ جن میں طیبہ فراز کی دادو، دادا، چچا، پھوپو، خالہ، ماموں سب کے سب قابل ذکر تھے۔ طیبہ فراز کی آمد کے بعد گھر میں جیسے رونق لگ گئی تھی۔ ہر چیز پہلے سے زیادہ نکھری اور خوب صورت لگ رہی تھی اور ہمیں بھی ہماری زندگی مزید خوب صورت لگ رہی تھی۔ خاندان بھر کے لوگوں کی مٹھائی سے تواضع کی گئی۔

اگلے دن میں اپنی ڈیوٹی پر آیا اور اپنے تمام ساتھیوں کو مٹھائی کھلائی سب نے ڈھیروں مبارکیں اور دعائیں دیں۔ اسی دوران میرے ایک ساتھی نے بڑا عجیب سا سوال کر ڈالا جس کا میں اسے جواب چاہنے کے باوجود نہ دے سکا کیونکہ وہ عمر میں کچھ بڑا تھا اور بہت بڑا جاہل بلکہ میں تو کم علم اور شعور والا کہوں گا۔ اس نے بڑی حیرت اور طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''حوالدار صاحب! آپ کی بیٹی ہوئی ہے اور آپ مٹھائی تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم لوگ تو بیٹے کے ہونے پر مٹھائی کھلاتے ہیں۔ بیٹی کے ہونے پر کون مٹھائی کھلاتا ہے۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں اسے کیا کہتا جیسے بیٹی جیسی عظیم رحمت کے بارے میں کچھ علم ہی نہ ہو۔ طیبہ فراز کا بڑا بھائی محمد حاشر اپنی بہنا سے بہت لاڈ کرتا تھا اور اکثر لاڈ لاڈ میں اپنی بہنا کو ہلکا پھلکا تھپڑ لگا جاتا تھا۔ کہتا تھا طیبہ فراز میری ڈول ہے۔

طیبہ فراز تقریباً سارا دن سوتی رہتی تھی۔ سب گھر والوں اور رشتہ داروں کو گلہ رہتا کہ جب دیکھو سو رہی ہوتی ہے۔ پتا نہیں کب ہم اسے جاگتا دیکھیں گے تو میں کہتا۔

''اگر میری بیٹی سے ملاقات کرنی ہے تو پہلے آپ کو ٹائم لینا پڑے گا رات 11 سے صبح 7 تک میری بیٹی جاگتی ہے اور کھیلتی ہے۔ میری بھی اپنی بیٹی سے باضابطہ ملاقات روزانہ صبح ڈیوٹی پر جاتے وقت ہوتی ہے۔''

دن گزرتے گئے اور خوشیاں بڑھتی گئیں۔ ماشاء اللہ میری بیٹی 1 ماہ کی ہو گئی۔ وہ سب سے خوب باتیں کرتی۔ اس سے بات کرو تو کبھی مسکراتی اور کبھی غصے سے ماتھے پر شکنیں ڈال لیتی۔ امی کہتی تھیں کہ طیبہ فراز بہت غصے والی ہوگی۔

پھر نہ جانے وقت نے کیوں کروٹ لے لی۔ خوشیاں آہستہ آہستہ ہماری چوکھٹ سے پیچھے ہٹنے لگی اور بے رحم ہوائیں چلنے لگیں ہر طرف جیسے خزاں کی رت آ گئی ہر سو درد ہی درد بکھرنے لگا۔

ایک دن میں ڈیوٹی سے گھر لوٹا تو پتا لگا طیبہ فراز کل رات سے بہت رو رہی ہے شاید پیٹ میں درد ہے۔ دادی اور نانی نے سب دیسی ٹوٹکے آزمائے لیکن رونا بند نہیں کیا شاید درد میں زیادہ شدت تھی، پھر صبح گھر والے ایک مقامی ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے بھی بظاہر اطمینان کا اظہار کیا کہ پیٹ کا درد تو نہیں ہے۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی لیکن اس کے باوجود وہ چپ نہیں کر رہی تھی۔

پھر شام 6 بجے کے قریب ہم اپنی بیٹی کو چائلڈ اسپیشلسٹ پروفیسر طاہر چوہدری کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر آگئے جو کہ ہمارے فیملی چلڈرن ڈاکٹر ہیں۔ وہ بچوں کے لیے ڈاکٹر کم اور فرشتے زیادہ ہیں۔ خدا پاک انہیں ڈھیروں ترقیاں اور کامیابیاں عطا کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے طیبہ فراز کے مکمل چیک اپ کے بعد بتایا کہ اس کے بائیں کان میں تھوڑا انفیکشن ہے۔ انہوں نے دوا لکھ دی اور چلتے چلتے کہا کہ اگر رات کو دوبارہ روئے تو فوراً بچی کو ریلوے اسپتال لے جا کر داخل کروا دیں اور ابھی اس کے دو بلڈ ٹیسٹ لازمی کروا کے صبح رپورٹس مجھے چیک کروائیں۔ ہم نے ہیلتھ ویز لیبارٹری سے ٹیسٹ کروائے۔ گھر پہنچ کر طیبہ کو دوا دی اور اللہ پاک کے فضل سے طیبہ فراز تقریباً 16 گھنٹے رونے کے بعد پرسکون سو گئی اور ہم نے اللہ پاک کا شکر ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر کو لاکھوں دعائیں دیں۔

رات تقریباً 3 بجے مجھے امی جان نے اٹھایا کہ جلدی اٹھو طیبہ فراز پھر کافی دیر سے رو رہی ہے اور کافی تیز بخار بھی ہو رہا تھا۔ ہم نے وقت ضائع کیے بغیر طیبہ فراز کو ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر ریلوے اسپتال راولپنڈی لے گئے اور ڈاکٹر صاحب کا حوالہ دیا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے طیبہ فراز کا چیک اپ کیا جسے کافی تیز بخار تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "اسے تو بخار کی وجہ سے جھٹکے بھی لگ رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے فوری طور پر طیبہ فراز کو ایڈمٹ کر کے ڈاکٹر طاہر صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے طیبہ کی میڈیسن شروع کر دی۔

اس دن 3 مئی تھی اور میری یعنی "طیبہ فراز" کے بابا جانی کی سالگرہ تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ آج شام ایک چھوٹا سا کیک لا کر اپنی بیٹی کے ہاتھوں اپنی سالگرہ کا کیک کاٹوں گا لیکن وقت نے تو ہر چیز الٹ کر رکھ دی اور ہم اسپتال میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے۔

صبح ڈاکٹر طاہر صاحب نے خود آ کر طیبہ فراز کا تفصیلی چیک اپ کیا اور اپنی سینئر ڈاکٹر سے مشورہ کر کے طیبہ فراز کی بیماری جانچنے کے لیے اس کا ٹیسٹ (ریڑھ کی ہڈی سے پانی لینے کا) کروانے کا کہا کیونکہ ڈاکٹرز کو شبہ تھا کہ طیبہ فراز کو گردن توڑ بخار کی شکایت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات سن کر مجھے تو شاک سا لگا کہ اتنی چھوٹی سی بچی کی ریڑھ کی ہڈی سے کیسے پانی لیں گے۔ میرا دل نے کہا کہ انکار کر دوں لیکن ڈاکٹر صاحب کے مشورہ اور اپنی باجی سے تفصیلی مشورہ کرنے کے بعد میں نے دل پر پتھر رکھ کر حامی بھر لی۔ پھر ڈاکٹر نے مجھ سے تحریری اجازت لے کر تقریباً آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد میری طیبہ فراز کی ریڑھ کی ہڈی سے پانی کا نمونہ حاصل کیا جو میں ہیلتھ ویز راولپنڈی کی سب سے اچھی لیبارٹری میں ٹیسٹ کروانے کے لیے دے آیا۔ جس کی رپورٹ 3 دن بعد بروز جمعہ کو ملنی تھی اور ہم نے تین دن اسپتال میں گزار کر رپورٹس کا انتظار اور اللہ پاک سے بہتری کی دعا کی تھی۔ میری بیٹی میری طیبہ فراز اس دن کومے میں چلی گئی اور کچھ ڈاکٹر نے تکلیف کم کرنے کے لیے سکون کے انجکشن بھی اس کی میڈیسن میں شامل کر دیے تاکہ وہ زیادہ وقت سوئی رہے اور تکلیف کا احساس کم ہو اور جھٹکے بھی نہ لگیں جو میری طیبہ فراز کو مسلسل لگ رہے تھے اور ڈاکٹرز کے لیے پریشانی کا باعث بن رہے تھے۔

اسپتال میں 4 نامور پروفیسر چائلڈ اسپیشلسٹ میری بیٹی کے علاج میں مصروف تھے اور میری طیبہ فراز ہر دکھ ہر علاج سے بے خبر بے ہوش بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ طیبہ فراز کی ماں آج مسلسل تیسرے دن اس کے سرہانے بیٹھی اپنی بیٹی کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو تھی۔ اس کے دل کا حال اور درد تو کوئی ماں ہی جان سکتی تھی۔ میں بھی اپنے محکمہ سے چھٹی لے کر اپنی بیٹی کے پاس اسپتال میں موجود تھا۔ تیسرے دن جب اللہ اللہ کر کے طیبہ کی (Lp) ٹیسٹ کی رپورٹس آئیں تو ڈاکٹر صاحب نے مبارک باد دی کہ ماشاء اللہ رپورٹس بالکل ٹھیک آئی ہیں۔ ہم یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئے اور اللہ پاک کا شکر ادا کیا لیکن ڈاکٹرز طیبہ کی رپورٹس آنے کے بعد مزید پریشان ہو گئے کہ اگر بچی

کو گردن توڑ بخار نہیں ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے۔ پھر ڈاکٹرز نے آخری آپشن کے طور پر طیبہ فراز کا C.T اسکین کروانے کا کہا۔ جس سے طیبہ فراز کی بیماری کی کوئی صورت حال واضح ہو سکے اور باقاعدہ علاج شروع ہو سکے۔ ہم سب چند لمحوں کی خوشی کے بعد پھر سے افسردہ ہو گئے کہ اللہ پاک رحم کرے طیبہ فراز کس امتحان سے گزر رہی ہے۔ اللہ پاک طیبہ فراز کو صحت و تندرستی عطا کر۔

طیبہ فراز کو اسپتال میں تین دن ہو چکے تھے اور طیبہ فراز کے سب چاہنے والے اس سے پیار کرنے والے اپنا گھر بار، کام کاج نوکریاں بھول کر ہر وقت طیبہ فراز کے پاس اس کی عیادت کے لیے موجود رہتے تھے۔ طیبہ کے دادا، دادی، نانو اور چھوٹی دادو تو ہر وقت اسپتال رہتے۔ صبح آتے اور رات گئے تک طیبہ کے پاس اس کی صحت کے لیے دعا گو رہتے۔ طیبہ کے چچا، ماموں خالہ، پھوپو، چھوٹے چھوٹے کزنز بھی اسپتال میں طیبہ کی عیادت میں مصروف تھے۔ ہم شام کو طیبہ فراز کا C.T اسکین کروا کے آئے اور رات 8 بجے رپورٹس ملنی تھیں۔

شام کو چھوٹا بھائی جب رپورٹس لے کر آیا تو ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے رپورٹس پڑھ کر کوئی جواب نہ دیا اور بس اتنا کہا کہ صبح ڈاکٹر صاحب سے میٹنگ کر کے آپ کو رپورٹس کی تفصیل بتائیں گے۔ ہم سب کی بے چینی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ہم نے دعاؤں میں رات گزاری اور اپنی طیبہ فراز کے لیے بہت فکر مند تھے۔ اللہ اللہ کر کے رات گزری اور صبح ڈاکٹر صاحب آئے اور سب سے پہلے آ کر طیبہ کی رپورٹس چیک کی اور کافی دیر چپ رہے پھر مجھے بلایا اور کہا۔

''بیٹا آپ کی بیٹی کی رپورٹ ٹھیک نہیں آئی۔ طیبہ فراز کو ''برین ہیمرج'' ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے دماغ کے سب سے اندرونی اور نازک ترین حصے بہت بری طرح متاثر ہو چکے ہیں۔ بہت زیادہ بلڈنگ کی وجہ سے خون دماغ کے اندر جم گیا اور خون کی سپلائی منقطع ہو چکی ہے جس کی وجہ سے طیبہ فراز کومہ میں ہے۔''

میں جوں جوں ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن رہا تھا ویسے ویسے زمین میں دھنستا جا رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت مجھ سے کوئی بہت بڑا امتحان لینا چاہتی ہے اور میری بیٹی مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ پھر ڈاکٹر کی میٹنگ ہوئی طیبہ فراز کا دوبارہ تفصیلی معائنہ ہوا مجھے پھر بلایا ڈاکٹرز نے اور طیبہ فراز کی صورتحال سے مزید آگاہ کیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ ''آپ مجھے کھل کر بتائیں کہ میری طیبہ فراز ٹھیک تو ہو جائے گی نہ زیادہ پریشانی والی بات تو نہیں۔ آپ جو چاہیں کریں جتنا مرضی مہنگا علاج ہو میں جیسے بھی ہوا کرواؤں گا اگر کوئی سرجری کرنی پڑے تو وہ بھی کریں بس میری طیبہ فراز آنکھیں کھولے۔ ہم سے باتیں کرے، ہنسے، روئے، کھیلے واپس اپنے گھر جائے۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''بیٹا بات یہ ہے کہ ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں اور بہت زیادہ پرامید تو نہیں ہیں لیکن اللہ پاک کی ذات بہت رحمان و رحیم اور بے نیاز ہے انشاء اللہ ضرور ہماری مدد کرے گا لیکن بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ریکوری بہت مشکل نظر آ رہی ہے کیونکہ میری 22 سالہ سروس میں اس نوعیت کا یہ پہلا کیس ہے۔ ہمیں اس مرض کی وجہ پتا لگانی ہے کہ اتنی معصوم بچی کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہونے کی کیا وجہ بنی۔ ایسا مسئلہ تو آج تک کسی بڑی عمر کے مریض کے ساتھ نہیں ہوا یہ مسئلہ ہمارے سب کے لیے بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔ اب ہم اس کی وجہ دریافت کرنے کے لیے طیبہ فراز کے کچھ مزید بلڈ ٹیسٹ کروائیں گے بہت حساس نوعیت کے جس سے شاید کوئی وجہ اور بچے کے علاج کی طرف بہتر پیش رفت ہو سکے۔ باقی آپ اللہ پاک سے امید رکھیں مایوسی گناہ ہے۔''

میں تو ڈاکٹر کی باتیں سن کے ایسے ہو گیا جیسے کسی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہو۔ میں اچانک سے خالی ہاتھ ہو گیا ہوں۔ میں اس وقت پہلی بار اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ میرے وجود میں طاقت ختم ہو چکی تھی۔ میں بے جان جسم لے کر اسپتال کے لان میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور اتنا رویا کہ شاید مجھے خود

نہیں سمجھ آئی کہ میں کیسے اتار دیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ بلک بلک کے اونچا اونچا روؤں کوئی ہو میرے پاس میرا اپنا جس سے اپنا دکھ درد بانٹوں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کروں۔ میں اتنی بڑی اور بری خبر کو اپنی دوست اپنی بیوی کے ساتھ کھل کر شیئر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ صدمہ برداشت کر پائے گی یا نہیں اور اپنے پرامید ماں باپ کو یہ شاک نہیں دینا چاہتا تھا۔ پھر میں نے دل پر پتھر رکھ کر اپنی بڑی بہن کو فون کر کے اسے اپنے دل کا حال سنایا۔ انہوں نے مجھے بچوں کو بہلانے جیسی تسلیاں دیں وہ بھی جانتی تھیں کہ ایک باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔

میں نے اپنے سب سے پیارے دوست وسیم کو اپنے اس درد کا ساتھی بنایا اس کے بعد باقی دو دوستوں چنگیز اور فہیم کو اپنے درد کی داستان سنائی تو سب جیسے سکتے میں آ گئے اور میرا دوست وسیم اسی شام اپنی بیوی کے ساتھ اور چنگیز اگلی صبح میرے درد بانٹنے میرے پاس آ پہنچے اور اللہ پاک کی ذات پر بھروسا رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ شام تک میں نے اپنے تمام گھر والوں کو اپنی بیٹی کی بیماری کے بارے میں بتایا تو سب کی حالت بہت غیر ہو گئی جو سنتا آنسو بہاتا۔ میری طیبہ فراز کے لیے دعائیں اور نیک خواہشات کا اظہار کرنے لگا۔ میری ضعیف نانی اماں اپنی بیماری اور کمزوری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے راتوں رات بہت مشکل سے سفر کر کے فیصل آباد سے پنڈی آ پہنچی مجھے تسلی دینے کے لیے میں نے اپنی بیٹی کی اس بیماری کو اپنی بیوی کے ساتھ کھل کے شیئر نہیں کیا بس توڑ موڑ کے یہ بتایا کہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہم اور ٹیسٹ کروا رہے ہیں انشاء جلد طیبہ فراز ٹھیک ہو جائے گی اور وہ ماں بھی ہماری باتوں میں آ کے تسلی کیے رب سے آس لگائے بیٹھی رہی۔

میرے چھوٹے بھائی اور بڑی بہن مسلسل اس بات پر بضد تھے کہ ہمیں طیبہ فراز کا Second Opinion لینا چاہیے۔ شاید کوئی بہتر حل سامنے آ جائے۔ اس بات کے پیش نظر میرے بھائی نے سی ایم ایچ راولپنڈی کے معروف نیورو سرجن بریگیڈیئر جنید مشتاق اور سعودیہ عرب میں مقیم ہمارے ایک عزیز کے توسط سے ہم نے رپورٹس وہاں کے ایک نیورو سرجن اور چائلڈ اسپیشلسٹ کو چیک کروائی۔ دونوں ڈاکٹرز نے ایک ہی بات کی کہ Oh my God. It is an Accident. یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ اتنی چھوٹی صرف ایک ماہ کی بچی کے ساتھ یہ حادثہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بھی یہی بات دہرائی کہ ہم نے ہزاروں مریض دیکھے آپریشن کیے لیکن اس نوعیت کا آج تک کوئی کیس سامنے نہیں آیا اور بہت افسوس کے ساتھ کہ اس کا علاج ممکن نہیں مگر اللہ پاک چاہیں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اگر بچی کسی معجزے سے ٹھیک ہو بھی جائے گی تو عمر بھر کی سی معذوری کے ساتھ جینا پڑے گا، بچی کو بھی اور اس کے ماں باپ کو بھی۔''

ڈاکٹرز کی رائے کے بعد تو رہی سہی امید بھی ختم ہو چکی تھی۔ پورے کا پورا خاندان بے چین اور پریشان تھا۔ میں ایک بات بتاتا چلوں کہ اللہ پاک کے فضل سے ہم خاندان والوں میں بہت زیادہ اتفاق اور محبت ہے۔ خاص کر کسی کی تکلیف کے لمحوں میں، میری طیبہ فراز جتنے دن اسپتال رہی تقریباً ہر وقت اسپتال میں پندرہ بیس لوگ موجود ہوتے تھے اور رش لگے رہنے کی وجہ سے کئی مرتبہ اسپتال کے اسٹاف سے جھگڑا بھی ہوا کہ رش کم کریں۔

پھر اگلے دن ہم اسپتال کے ایک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایمبولینس میں طیبہ فراز کے مزید بلڈ ٹیسٹ کروانے سی ایم ایچ راولپنڈی کی لیبارٹری آئے اور طیبہ فراز جس کے جسم کا شاید خون بھی خشک ہو گیا تھا بمشکل دو سرنجوں میں دو دو قطرے خون کے سیمپل کے طور پر حاصل کر کے معائنہ کے لیے دے کر آئے۔ جس کی رپورٹ تین دن بعد ملنی تھی۔ واپسی پر میں اور میری بیوی اپنی بیٹی کو گود میں لیے اس کی تندرستی اور مستقبل کی باتیں کرتے آئے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ آج ہم اپنی بے ہوش بیٹی کے ساتھ اس کی زندگی کا آخری سفر کر رہے ہیں وہ بھی ایمبولینس میں۔

ہم تقریباً گیارہ بجے واپس اسپتال پہنچے تو بڑی ڈاکٹر پروفیسر اسماء شبیر نے طیبہ فراز کا چیک اپ کیا اور تشویش کا اظہار کرتے ہوئے جونیئر ڈاکٹر سے کہا کہ

بچی کا بلڈ پریشر چیک کرو۔ مجھے بچی کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ جب ڈاکٹر نے طیبہ فراز کا بی پی چیک کیا تو بہت ہائی آیا۔ تو پروفیسر صاحبہ نے فوری طور پر طیبہ فراز کو وارڈ سے آئی سی یو میں شفٹ کرنے کا حکم دیا۔ جس سے ہماری پریشانیوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا کیونکہ آئی سی یو میں ایک دن پہلے ایک دو سالہ بچے کی بوجہ کینسر ڈیتھ ہوگئی تھی اور اب طیبہ فراز اسی بیڈ پر تھی۔ اسی اثناء میں اسپتال کی انچارج پروفیسر سمیعہ نصراللہ صاحبہ، طیبہ کے چیک اپ کے لیے آئیں اور کافی دیر تک معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے طیبہ فراز کو فوراً آکسیجن لگانے کا کہا۔ تو ڈاکٹر نے فوری حرکت میں آتے ہوئے طیبہ کو نلکیاں لگانا شروع کر دیں جس کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا کہ ننھی سی جان نے نہ جانے اور کن کن امتحانوں سے گزرنا ہے۔

طیبہ فراز کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ اسپتال میں تیمارداروں کا رش لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر بھی اپنی بھرپور توجہ طیبہ فراز پر مرکوز کیے ہوئے تھے۔ میں نے پروفیسر سمیعہ صاحبہ سے طیبہ کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ”بیٹا بچی کی کنڈیشن اچھی نہیں بجائے بہتری کی طرف آنے کے مسلسل صحت بگڑتی جا رہی ہے۔ آپ کی بچی کے لیے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں انشاءاللہ، اللہ پاک بہتر کرے گا۔“

اس کے بعد میری بیٹی مسلسل 30 گھنٹے آکسیجن پر رہی اور طبیعت مزید خرابی کی طرف جا رہی تھی کہ اگلی شام تقریباً 7 بجے کے قریب ڈیوٹی ڈاکٹر ساجدہ نے طیبہ کا روٹین کا چیک اپ کیا اور کافی دیر طیبہ فراز کے پاس کھڑی رہیں اور واپس جاتے ہوئے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ میرا دل بہت عجیب سی کھٹک محسوس کرنے لگا۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ ڈاکٹر کے ساتھ چل پڑا اور میرے پیچھے میرے چھوٹے ماموں اور خالہ بھی چل پڑیں۔

ریسیپشن پر پہنچ کر ڈاکٹر نے جو الفاظ کہے میں ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”آپ بچی کے باپ ہیں ذرا حوصلے سے میری بات سنیں کیونکہ اب آپ نے ہی خود کو اور اپنی بیوی کو سہارا دینا ہے۔“ ڈاکٹر کی ایسی باتیں میرا حوصلہ پست کر رہی تھیں کہ اچانک ڈاکٹر نے کہا۔

”آپ کی بیٹی کی سانسیں ختم ہو چکی ہیں اب وہ خود سے اپنا سانس لینے کی صلاحیت کھو چکی ہے یعنی کہ اس کے اپنے سانس ختم ہو گئے ہیں۔“

میں ڈاکٹر کی بات سنتے ہی دیوار کے ساتھ جا لگا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر رہا ہے اور میرا دل بھی کام کرنا چھوڑ رہا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا کہ ”اگر آپ اجازت دیں تو ہم بچی کو وینٹی لیٹر پر رکھیں کیونکہ سانسیں ختم ہونے کے بعد بھی دل کچھ دیر تک زندہ رہتا ہے اور جب تک دل زندہ رہتا ہے ہم مریض کو بچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں لیکن ہمارے پاس مشین ایک ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے ایک دوسری بچی کو لگائی ہے۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے اور اخلاقی طور پر ہم اس بچی کو مشین سے الگ نہیں کر سکتے، ہم آپ کی بچی کو مینوئل مشین کے ساتھ وینٹی لیٹر کریں گے جو بالکل آٹومیٹک مشین والا کام کرتی ہے۔ ہماری ڈاکٹر خود اس مشین کو آپریٹ کریں گی۔“

میں نے کہا کہ ”ٹھیک ہے جو آپ سے ہو سکتا ہے آپ کریں میں اپنی بیٹی کے لیے علاج کی آخری حد تک جاؤں گا۔“

دوسری طرف سب میری واپسی کا انتظار کر رہے تھے کہ ڈاکٹر پتا نہیں فراز کو کیا کہہ رہی ہے میں نے واپس آ کر جب طیبہ فراز کے بارے میں بتایا تو جیسے صفِ ماتم بچھ گئی۔ اسپتال میں موجود ہر بندہ رونے لگا اور رو رو کر اپنے اللہ کے حضور طیبہ فراز کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگا۔ میرا تین سال کا معصوم بیٹا محمد حاشر بھی وہیں موجود تھا۔ وہ سب کو دیکھ کر پریشان ہو گیا اور سب سے باری باری پوچھنے لگا کہ آپ سب کیوں رو رہے ہیں۔ ہم محمد حاشر کو کیا بتاتے کیا سمجھاتے کہ تمہاری بہن تمہاری ڈولی چند گھنٹوں کی مہمان رہ گئی ہے۔

میں بے جان قدموں کے ساتھ آئی سی یو میں اپنی بیٹی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میری بیوی سب کو پریشان دیکھ کر بہت زیادہ پریشان ہو گئی اور پوچھنے

لگی۔ ''کیا ہوا سب کیوں رو رہے ہیں۔ طیبہ فراز ٹھیک ہے ناں ڈاکٹر نے کیا کہا۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں کہا، انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی طیبہ فراز۔'' میں نے زیادہ تفصیل بتانے سے گریز کیا تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو لیکن چند منٹوں بعد جب ڈاکٹر نے آ کر طیبہ فراز کے حلق میں سانس والی نالی ڈال کر پھیپھڑوں کے ساتھ منسلک کر کے میری بیٹی کو مصنوعی سانس دینا شروع کیے تو ہر ایک شخص کا دل کانپ اٹھا اور اس سارے عمل کو دیکھ کر میری بیوی آدھی پاگل سی ہو گئی کہ یہ کیا کر دیا طیبہ فراز کو۔ آپ کچھ بتاتے کیوں نہیں۔

میں چپ رہا کیا بتاتا اسے کہ جس بیٹی کی پیدائش پر تم نے سجدہ شکر ادا کیا جس کی پرورش کے سہانے خواب دیکھے جس کو تم پچھلے ایک ماہ سے خیالوں میں سنوار رہی ہو جسے تم مستقبل میں سرخ جوڑے میں دلہن بنانے کے سپنے دل میں سجائے بیٹھی ہو وہ بیٹی جو تمہاری سب سے اچھی سہیلی بنتی جو ہمارا سہارا ہوتی تمہاری وہ بیٹی صرف چند منٹوں یا گھنٹوں کی مہمان رہ گئی ہے جسے بہت جلد ہمارے خواب توڑ کر ہم سے بہت دور چلے جانا تھا۔

میں نے اسے کچھ نہ بتایا بس تسلی دی لیکن وہ پاگل ماں تھی اس کے دل کو کہاں سکون آتا وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ ''پلیز ڈاکٹر طاہر کو بلائیں وہ بہت اچھے ہیں آپ انہیں خود کال کریں ناکہ وہ اسپتال آ جائیں اور طیبہ فراز کو دیکھیں۔ وہ آئیں گے تو طیبہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پلیز آپ ڈاکٹر طاہر کو کال کریں۔ ہم سب اور ڈاکٹر اسے بہت تسلی دیتے رہے لیکن وہ مسلسل دو گھنٹے یہی بات رو رو کر دہراتی رہی۔

اس دوران ایک جونیئر ڈاکٹر نوشین مسلسل میری بیٹی کو وینٹی لیٹر کر رہی تھی اور مسلسل چار گھنٹے تک اس نے ہاتھوں سے وینٹی لیٹر کو پمپ کیا اور اپنے فرائض بخوبی سر انجام دیئے۔ اللہ پاک اسے جزائے خیر عطا کرے۔ پھر ڈاکٹر ساجدہ کے کال کرنے پر رات تقریباً دس بجے ڈاکٹر طاہر صاحب بھی اسپتال آ گئے اور طیبہ فراز کا چیک اپ کیا جو وینٹی لیٹر آپریٹ کیا اور تقریباً ایک گھنٹہ طیبہ فراز کے پاس بیٹھ کر اس کی ماں کو تسلی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا جس سے اس کو کسی حد تک تسلی ہوئی۔ رات گیارہ بجے طیبہ فراز کو مینوئل مشین سے آٹو میٹک مشین پر منتقل کر دیا گیا۔ میری بیوی بھی کافی حد تک مطمئن اور سکون میں تھی اسے ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے ایک امید بندھ گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلایا اور کہا۔ ''بیٹا یہ ماں ہے اور ماؤں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔ ہمارے بس میں جو تھا وہ ہم نے کیا لیکن شاید رب کو یہی منظور ہے آپ حوصلے اور صبر سے کام لینا، اللہ پاک کے گھر دیر ہو سکتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔ وہ کسی وقت بھی اپنا خاص فضل کر سکتا ہے اور اگر اللہ پاک کی ذات آپ کو کسی امتحان میں ڈالے تو اس کا شکوہ یا ناشکری نہیں کرنی۔

پھر میں نے بارہ بجے کے بعد بمشکل سب گھر والوں کو اسپتال سے رخصت کیا۔ کوئی جانے کو تیار ہی نہیں تھا۔ سب بہت پریشان تھے اور نہ چاہتے ہوئے سب صبح جلدی آنے کا وعدہ کر کے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ اس وقت اسپتال میں طیبہ فراز کی دادی اور نانی اس کے پاس زبردستی رک گئیں جب کہ رات کو طیبہ فراز کو ایک سفید خون کی بوتل لگنی تھی وہ لا کے دینے کے لیے علی چاچو اور اویس چاچو بھی اسپتال میں رکے تھے جو رات کو تین بجے جا کر اپنی بھتیجی کے لیے سفید خون کی بوتل لائے جو طیبہ کو لگی۔

رات کو تقریباً سوا دو بجے ہم دونوں اپنی بیٹی کے پاس بیٹھے اس کی صحت یابی کے لیے دعا کر رہے تھے اور باہر بیٹھی طیبہ فراز کی دادی اماں اور نانی اماں مسلسل ذکر الٰہی میں مشغول تھیں۔

میری بیوی جو کافی حد تک مطمئن تھی کہنے لگی۔ ''آپ طیبہ فراز کی ایک تصویر بنا کر رکھ لیں تاکہ جب یہ بڑی ہو تو ہم اس کو یہ تصویر دکھا کر کہا کریں گے کہ دیکھو تم نے بچپن میں اپنے بابا جانی اور ماما جانی کو کتنا تنگ کیا اور سب گھر والوں کو پریشان کیا تھا۔'' اس دوران میں اپنی پیاری رانی کو پیار بھی کر رہا تھا جو مصنوعی سانسوں کے ساتھ ہمارے

سامنے لیٹی ہوئی تھی کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ طیبہ فراز کے پاؤں یخ ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ میں جلدی سے اٹھا اور ڈاکٹر کو بلا لایا اس نے چیک اپ کے بعد مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور باہر جا کر کہا کہ ''اب آپ ذہنی طور پر تیار رہیں کیونکہ بچی کی دل کی دھڑکن ختم ہونا شروع ہوگئی ہے کسی بھی وقت آپ کو بری خبر کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔'' ڈاکٹر کی بات سنتے ہی میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور وہیں بت بنا کھڑا رہا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں واپس آئی سی یو میں آیا جہاں اس کی ماں مطمئن بیٹھی تھی۔ میری بیوی پھر سے کہنے لگی۔

''آپ طیبہ فراز کی اس حالت میں تصویر بنائیں ناں، جب یہ بڑی ہو گی تو میں خوب خبر لوں گی اس کی۔ اس کی باتیں سن کے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا، میں کیسے سمجھاتا اس پر امید ماں کو کہ تم کیا خواب دیکھ رہی ہو۔ تمہاری یہ ننھی پری کسی بھی وقت تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جانے والی ہے۔ اب تو صرف یہ مہمان ہے۔ میں ایک بے بس انسان کی طرح کبھی اپنی بیٹی کو دیکھتا اور کبھی اس کی ماں کو جو کسی معجزے کی منتظر تھی۔

اچانک میری بیٹی نے جو مسلسل نو دن سے کومے کی حالت میں تھی جس نے نو دن سے نہ آنکھ کھولی تھی نہ ہاتھ پاؤں ہلائے تھے ایک دم سے اپنا بایاں ہاتھ آہستہ سے اوپر اٹھایا اور اٹھا کے اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ہم دونوں تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ ہماری پیاری رانی اپنی زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس دوران اس نے اپنی پلکوں کو ذرا سی جنبش دی۔ میرا دل چاہا کہ خوشی سے شور مچانا شروع کر دوں۔ سب کو اطلاع دوں جو گھروں میں طیبہ کے لیے دعا گو تھے کہ ہماری پیاری طیبہ فراز نے نو دن بعد پہلی بار حرکت کی اپنا ہاتھ اٹھایا اور پلکیں جھپکائی ہیں لیکن اس بات کا تو ہمیں علم ہی نہ تھا کہ یہ حرکت تو میری بیٹی نے اپنے ماما بابا کے لیے کی تھی۔ ہمیں تو اس بات کا احساس بعد میں ہوا کہ وہ معصوم پری تو اپنے بابا کو الوداع کر رہی تھی۔ ہاتھ اٹھایا تھا اپنے ماما بابا کو آخری سلام کیا تھا اور پلکوں کو جنبش دے کر اپنے ماما اور بابا جانی کو اللہ حافظ کہا تھا۔ وہ میری پیاری طیبہ فراز کی آخری حرکت تھی اور ہم سمجھ رہے تھے کہ ہماری بیٹی ہمارے پاس واپس آنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن ہم بے خبر تھے کہ وہ آنے کی نہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

پھر تقریباً چار بجے میں نے اپنی طیبہ فراز کو ہاتھ لگایا تو اس کا جسم آدھے سے زیادہ یکلخت ٹھنڈا ہو گیا تھا اور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے آ کر چیک کیا اور باہر چلی گئیں اس دوران میری بیوی نے کہا کہ ''ہم طیبہ کو کمبل اوڑھا دیتے ہیں اتنی ٹھنڈی ہو رہی ہے اس کو سردی لگ رہی ہو گی۔'' میں جو حالات سے واقف تھا کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں نے کہا۔ ''میں ڈاکٹر سے پوچھ کے آتا ہوں اگر وہ کہتے ہیں تو ہم طیبہ فراز کو کمبل میں لپیٹ دیتے ہیں۔''

میں جلدی سے ڈاکٹر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک بیڈ پر میری امی جان اور میری پھوپو (ساس) بیٹھے بیٹھے سو گئی تھیں میں جب ڈاکٹر کے پاس گیا تو وہ کسی کو کال کر کے چلڈرن وارڈ میں بلا رہی تھیں۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر ڈاکٹر سے پوچھنا چاہا کہ ''ڈاکٹر صاحبہ طیبہ فراز ٹھیک تو ہے ناں؟''

ڈاکٹر نے میری طرف غور سے دیکھا۔ شاید اس میں کچھ کہنے کی ہی ہمت اور ٹھیک سے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس نے کہا کہ ''سوری! آپ کی بیٹی کی دل کی دھڑکن بھی ختم ہو چکی ہے۔''

''Tayyaba Faraz is no More.''

میں تو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے میرا بھی سانس رک جائے گا یوں محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر نے میرا کلیجہ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا ہو۔

چند لمحوں بعد جب ہوش آیا تو ایک بڑی پریشانی بن گئی کہ ای سی جی کرنے والے بندے

کے آنے سے پہلے کسی طرح اپنی بیوی کو کسی بہانے سے بلا کر باہر لے آؤں کیونکہ وہ ماں ہے اور اپنی بیٹی کی موت کی خبر کیسے سنے گی اور اس کی ڈیتھ سلپ کس طرح نکلتے دیکھے گی۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ جب اندر آیا تو خدا پاک کی قدرت اور فضل دیکھ کر بے اختیار اپنے رب کا شکر بجا لایا۔ کیونکہ اس وقت پتا نہیں نہ جانے کیسے اور کیوں میری بیوی دیوار سے ٹیک لگائے چند منٹوں کے لیے نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ اس دوران میں نے باہر لان میں بیٹھے اپنے چھوٹے بھائی کو کال کر کے بلایا اور طیبہ فراز کے بارے میں بتایا اور وہ بھی چند لمحوں کے لیے ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے امی جی اور پھوپو کو اٹھا کر طیبہ فراز کے دنیا سے چلے جانے کا بتایا۔ اس دوران ڈاکٹر نے ای سی جی کر کے میری طیبہ فراز کی ڈیتھ سلپ میرے حوالے کر دی۔ امی اور پھوپو بھی روتی ہوئی اندر آ گئیں جس کی وجہ سے میری بیوی اپنی زندگی کی طویل ترین تقریباً چار منٹ کی نیند کر کے جاگ چکی تھی لیکن یہ چار منٹ کی نیند اسے بہت مہنگی پڑ گئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے میری بیٹی کے جسم کے ساتھ کلپ لگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کلپ اتار رہی تھی اور طیبہ فراز کے جسم کے ساتھ لگے آلات اتار اور نکال کر سائیڈ پر رکھ رہی تھی وہ پہلے تو کچھ سمجھی نہیں پھر ذرا ہوش آنے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اپنی طیبہ فراز کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بے اختیار چومنے لگی۔ میں نے سب کو چپ کرایا کہ اسپتال میں کوئی نہیں روئے گا، اسی اثناء میں اردگرد کے مریض بھی اکٹھے ہو گئے اور تعزیت کرنے لگے۔ چھوٹے بھائی نے اس دوران گھر والوں کو فون کر کے مجھ پر گزرنے والی قیامت کا بتا دیا تھا۔ میں تھوڑی دیر بیٹی کے پاس بیٹھا بیوی کو تسلی دیتا رہا اور پھر اسپتال کی ضروری کارروائی مکمل کی، میرا دوسرا بھائی علی اور سالا دانیال بھی اس دوران اسپتال پہنچ چکے تھے جہاں میں اسپتال کے ننگے فرش پر بیٹھا کسی اپنے کے سہارے کا منتظر تھا تو میرے بھائی نے آ کر مجھے اٹھایا اور سینے سے لگا کر حوصلہ دینے لگا اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔

آہ! دن بدھ کا اور 11 مئی تھی۔ سب کچھ بالکل ویسا تھا جب دن سوموار کا اور 4 اپریل تھی۔ وہی ٹیکسی تھی جس کی فرنٹ سیٹ پر میں اپنی شہزادی طیبہ فراز کو لیے بیٹھا تھا جب کہ میری بیوی، امی اور پھوپو پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں اور ہم گھر کی طرف جا رہے تھے۔ فرق صرف ایک تھا۔ تب آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے کیونکہ میری بیٹی دنیا میں آئی تھی اور آج آنکھوں میں غم کے آنسو تھے کیونکہ آج میری بیٹی دنیا سے جا رہی تھی۔ سب کچھ بالکل ویسا تھا اس دن بھی ہم گھر کے باہر گاڑی سے اترے تھے اور تمام گھر والے ہمارے منتظر تھے اور آج بھی تمام گھر والے ہمارے منتظر تھے۔ اس دن بھی میری گود میں میری بیٹی تھی اور آج بھی میری گود میں میری بیٹی تھی۔ اس دن بھی میری بیٹی کے شایانِ شان اس کا استقبال کیا گیا تھا اور آج بھی اس کے استقبال کی تیاریاں مکمل تھیں۔ سب اس کے منتظر تھے اس دن بھی طیبہ فراز کا بستر اس کے چاچو نے سرخ پھولوں سے سجایا ہوا تھا اور آج بھی میری بیٹی کا بستر سرخ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ بس......! فرق تھا تو صرف اور صرف ایک ہی تھا کہ اس دن میری بیٹی کی سانسیں چل رہی تھیں اور آج میری بیٹی کی سانسیں تھمی ہوئی تھیں اس دن طیبہ کے دنیا میں آنے کا جشن منایا جا رہا تھا اور آج صرف 37 ہی دن بعد میری بیٹی کے اس دنیا سے چلے جانے کی وجہ سے صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ہر شخص غم میں نڈھال تھا۔ بڑے حادثے کے ایک ننھی پری کی جان لے گیا جس کلی کو کھلنا تھا جس نے مہکنا تھا وہ کلی کھلے بنا ہی مرجھا چکی تھی۔

میری پیاری طیبہ فراز دلہن تو بن کے جا رہی تھی اپنے بابا کے ہاتھوں رخصت ہو رہی تھی لیکن وہ پگلی سرخ نہیں سفید جوڑے میں تھی۔

☆☆☆

قمبر، شہدادکوٹ سے نوین سچ بیانی



ہائے اُس زود پشیماں کا...

مور شاہد حسین

اُس شخص کی داستان، جو بے حسی کی چادر اوڑھ کر اپنی ہی نسل کو فنا کر گیا تھا

''دیکھو ذکیہ اگر اس بار بھی مجھے بیٹا میرا اوارث نہیں دیا تو میں دوسری شادی کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔'' ساون کا لہجہ کافی حد تک سخت تھا۔

''یہ میرے اختیار میں تو نہیں ہے یہ سب تو میرے مالک کی رضا ہے۔'' ذکیہ نے پرنم آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' وہ ذکیہ کو یوں کہہ رہا تھا جیسے وہ اپنی تقدیر کی خود مالک ہو اور پھر ساون اپنی بیوی ذکیہ کو حقارت بھری نظروں سے گھور کر گھر سے باہر نکل گیا۔

''میرے مالک بے شک تُو غفور الرحیم ہے۔ مایوسی سے مجھے اپنی پناہ میں رکھنا۔'' ذکیہ نے نگاہیں فلک کی جانب اٹھا کر کہا۔ وہ کافی دیر تک اسی حالت میں رہی خیالوں اور سوچوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ وہ مختلف سوچوں کی کشمکش میں تھی آخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک بہت بڑا اور خطرناک فیصلہ کر لیا۔

ذکیہ اور ساون کی شادی کے چند ماہ بعد ہی ذکیہ کی طبیعت خراب رہنے لگی اسے انکشاف ہوا کے خدا نے اسے اپنی خاص رحمت سے نوازا ہے۔ وہ ماں بننے والی ہے یہ احساس ہوتے ہی اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ تب ساون بھی اس کا خیال رکھنے لگا مگر اسے یہ خوشی زیادہ دن راس نہ آئی جب ننھی پری نے گھر کے آنگن کو رونق بخشی۔ ذکیہ پھولے نہیں سما رہی تھی مگر ساون بیٹی کی پیدائش پر بالکل خوش نہیں ہوا شاید اسے بیٹا چاہیے تھا۔ یوں ذکیہ کی زندگی کی حقیقی خوشیاں بھی غیر معمولی ثابت ہوئیں۔

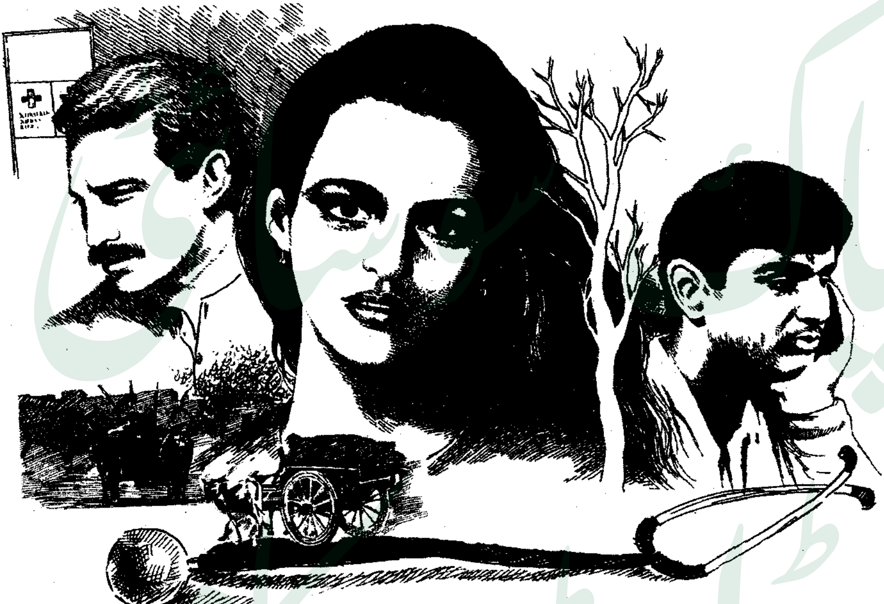
ذکیہ نے ماروی کی پیدائش کے ڈیڑھ سال بعد شہانہ کو جنم دے کر خود کو ساون کی نظروں میں گرا دیا یوں آئے روز ساون کی بے رخی طول پکڑتی چلی گئی۔ اسے جب موقع ملتا وہ اس پر تشدد کرتا ہر طرح کا ظلم کرتا۔ وہ بھی خاموشی سے برداشت کرتی رہتی۔ وہ تشدد کا نشانہ بنتی رہی اسے ایک ایک دن صدیوں کے برابر محسوس ہوتا تھا۔ یوں ہی اس کی تڑپتی سسکتی زندگی گزرتی رہی۔

ذکیہ ایک پھر حمل سے ہوگئی اور ایک مردہ بیٹی کو جنم دیا۔ ساون نے اس پر بھی کسی دکھ یا غم کا اظہار نہیں کیا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ساون اور بھی

بگڑتا چلا گیا۔ بات بات پر ذکیہ سے لڑتا اس پر بے جا سختیاں کرنے لگا اور اسے گھر سے باہر جانے بھی نہیں دیتا۔ جس کی وجہ سے ذکیہ کا دل ہر وقت آنسوؤں کے بوجھ سے بھرا رہتا۔ یوں دن بدن اس کی صحت گر رہی تھی۔ شوہر کی بے رخی پر اسے دلی افسوس ہوا اور اداسی اس پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ وہ ہر وقت خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگ جاتی اسے اپنی زندگی میں ویرانی ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک عذاب ناک زندگی گزار رہی تھی۔

بیمار رہی۔ اس کی جان کے لالے پڑ گئے وہ بیماری کی وجہ سے انتہائی کمزور ہوگئی اور چند ہی روز اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ رو رو کر ذکیہ کی آنکھوں کے آنسو ختم ہو گئے اس کی حالت عجیب سی ہوگئی وہ چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی اسے اپنے اردگرد کے ماحول سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے درد کے تاثرات میں مایوسی بھی جھلک رہی تھی۔ اس کے دل پر بے پناہ صدمہ گزرا لیکن ساون نے اس کے دکھ وغم میں دو لفظ ہمدردی کے نہیں بولے۔ جانے وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا



ذکیہ اپنی معصوم بچیوں کے ساتھ گھٹ گھٹ کر سہی ہوئی زندگی گزار رہی تھی۔ زندگی کبھی رکتی نہیں اس میں زندہ رہنے کا حوصلہ باقی تھا۔ وہ زندہ تھی صرف اپنی بچیوں کی خاطر۔

☆......☆

ایک روز شہانہ سخت بیمار ہوئی ذکیہ اس کا علاج کروانا چاہتی تھی مگر اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ مجبور ہو کر اس نے پڑوسن سے ادھار پیسے لیے اور ساون کو بتائے بغیر شہانہ کو شہر علاج کے لیے لے گئی۔ مناسب علاج اور خوراک نہ ملنے کی وجہ سے شہانہ کئی روز تک

اسے کوئی پروا تھی نہ فکر۔

ذکیہ کے مصائب میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ساون جتنی دیر گھر سے باہر رہتا وہ سکون میں رہتی تھی مگر اس کے گھر آتے ہی ذکیہ کا چین وسکون غارت ہو جاتا۔ وہ گالیاں، کوسنے، مار پیٹ شروع کر دیتا۔ ذرا سی بات پر طوفان کھڑا کر دینا اس کا معمول بن گیا۔ وہ ذکیہ کو بے دردی سے مارتا وہ بھی خاموشی سے پٹتی رہتی ہر گزرتے دن اس کی زندگی عذاب سے عذاب تر ہوتی چلی گئی۔ وہ دن میں ہزار بار مرتی اور زندہ ہوتی۔ بس وہ صبر کا دامن

ہاتھ میں تھامے زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی۔ خدا نے شاید اسے امتحانوں کے لیے چن لیا تھا مگر وہ بھی باحوصلہ عورت تھی۔ اس نے کبھی حوصلہ ہارا نہ تقدیر سے شکوہ کیا۔

شب و روز گزرتے رہے۔ ذکیہ ایک بار پھر حمل سے تھی مگر خوشی کے بجائے اس کی آنکھوں کی ویرانی بڑھنے لگی۔

''اگر اس بار بھی بیٹا نہیں ہوا تو وہ کیا کرے گی اس پر جانے کیا بیتے گی۔'' یہ سوچ کر اس کو سلگنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تفکر کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور غم کے تاثرات پھیل جاتے تھے۔ اسے دکھوں اور غموں نے نڈھال کر دیا تھا مگر اس نے ہزاروں غم اٹھانے کے باوجود بھی تقدیر سے شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی مایوس ہوئی اسے اپنے رب پر پورا بھروسہ تھا۔ اس نے اپنے رب کی یاد کو کبھی اپنے دل و دماغ سے اوجھل ہونے نہیں دیا۔

☆......☆

وہ ایک عام سا دن تھا۔ جب ذکیہ اور ساون ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ساون نے کہا اگر اس بار بھی بیٹا نہیں دیا تو تمہارے حق میں کچھ بہتر نہیں ہوگا۔ اس کا لہجہ زہر کی کڑواہٹ لیے ہوئے تھا۔ ذکیہ کانپ کر رہ گئی پھر قدرے سہمی ہوئی خوفزدہ انداز میں بولی۔

''میں کوئی تقدیر کی مالک تو نہیں ہوں کہ اپنی تقدیر خود لکھوں۔''

''تم سے شادی کر کے میں نے نحوست اپنالی ہے۔'' ساون شادی والے دن کو کوسنے لگا۔

''میرا قصور کیا ہے۔'' ذکیہ انتہائی خوفزدہ ہو کر بولی۔ ساون کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ذکیہ کے بال پکڑ کر اس کا سر دیوار پر دے مارے۔ غصے کے عالم میں اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ جانے اس وقت اس کو ذکیہ پر کیسے رحم آیا۔ بس وہ شعلہ برساتی نگاہوں سے اسے گھور کر گھر سے باہر نکل گیا۔ ذکیہ نے طویل کشمکش میں یہ ہی فیصلہ کیا کہ وہ کل پہلی ہی فرصت میں شہر جا کر اپنا چیک اپ کروائے گی۔ اگر اسے بیٹا ہونے کی نوید نہیں ملی تو وہ اپنی بیٹی ماروی سمیت زہر کھا کر زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔

☆......☆

اگلے دن حسب معمول وہ صبح سویرے اٹھی ساون کو ناشتا کروا کر کام پر بھیج دیا پھر وہ دائی نصیباں کے ساتھ شہر جانے کو تیار ہوئی۔ گاؤں سے شہر تک انہوں نے رکشے کا سہارا لیا۔ اتفاق سے وہ بھی انہیں جلد مل گیا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا یہ ذکیہ کی تقدید کی خرابی تھی کہ خدا جانے ساون کو کہاں سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اسے بغیر بتائے اس کی غیر موجودگی میں شہر گئی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی وہ غصے میں بھرا گھر کی جانب آیا دیکھا تو واقعی ذکیہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ ماروی دائی نصیباں کی پوتیوں کے ساتھ کچے صحن میں کھیلنے میں محو تھی۔ ساون نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جی بھر کے معصوم ماروی کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا اور دائی نصیباں کی پوتیوں کو بے رخی سے جھڑک دیا۔ تو وہ بھاگم بھاگ دوڑتی ہوئی چلی گئیں۔

دوسری طرف ذکیہ ہاسپٹل پہنچ چکی تھی الٹرا ساؤنڈ کے بعد نرس نے اسے بیٹا ہونے کی نوید سنائی تو اسے یوں لگا جیسے اس کے جسم میں نئی روح نے جنم لیا ہو۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر کی جانب دیکھا اس کے اوپر نیلے امبر کا مہربان سایہ تھا۔ وہ خوشی میں ڈوبی ہوئی دل ہی دل میں سجدہ الٰہی میں گر گئی۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر یکایک تازگی بکھرتی چلی گئی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی خوشی کے مارے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ محلے بھر میں مٹھا بانٹنے کے لیے اس نے لڈو خریدے۔ اس کی حسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ تصور کی دنیا میں خود کو بہت سے لوگوں کے درمیان محسوس کر رہی تھی۔ ہر طرف سے سلامتی اور مبارک باد کی آوازیں اس کے

کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ عجیب سرشاری کے عالم میں تھی۔ اس کے چہرے پر خوشیاں رقص کررہی تھیں۔ وہ خوشی سے نہال بے تابانہ گھر کی جانب چلی آرہی تھی۔ واپسی پر اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اردگرد کے تمام درخت بلکہ ہر چیز اس کی واپسی کی منتظر تھی۔ چاروں طرف سے مبارک باد کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ خدا نے اس کی خواہش پوری کردی تھی۔ اسے سرشاری کے عالم میں یوں لگ رہا تھا جیسے تمام راستہ مسکراہٹوں سے مہک رہا ہو وہ اسی سرشاری میں گھر آرہی تھی مگر وہ اس بات سے بالکل لاعلم تھی کہ کچھ دیر بعد اس پر کون سی قیامت گزرنے والی ہے۔

ذکیہ اپنے گھر کے داخلی دروازے سے کیا اندر داخل ہوئی گویا اس پوگالیوں کوسنوں کا طوفان آگیا۔ ساون اسے دیکھتے ہی غصے سے بھڑک اٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں۔

''آج میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔ بے حیا بے غیرت عورت میری موجودگی میں میری عزت کا جنازہ نکالتی پھرتی ہے۔ بے غیرت عیش کرنے گئی تھی۔ منحوس آج تجھے غرق کردوں گا۔ ساون نے خوں خوار لہجے میں کہا اور ذکیہ کو مارنے کے لیے جھپٹ پڑا اس وقت شاید اس کے دماغ کی کوئی رگ بہک گئی تھی کہ وہ انسان سے شیطان بن گیا۔

ساون اپنی بیوی کو مارتے وقت ذرا نہیں سوچ رہا تھا کہ کس بے دردی سے مار رہا ہے۔ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ اسے کہاں اور کتنی چوٹ لگ رہی ہے۔ ذکیہ کی کربناک اور دل دوز چیخیں آسمان کا سینہ چیر رہی تھیں وہ واویلا کرتی رہی اس کی چیخیں سن کر پڑوس کی کچھ عورتیں ان کے گھر جمع ہوگئی تھیں مگر ساون کا سخت رویہ دیکھ کر دور کھڑی تماشا دیکھتی رہیں۔ جب اس کی درد بھری آواز دائی نصیباں نے سنی تو وہ دوڑتی ہوئی چلی آئی۔

''بیٹا اس قدر بے دردی سے نہ مارو۔ بے چاری مرجائے گی۔'' دائی نصیباں نے آگے بڑھ کر ذکیہ کو بچانے کی ناکام کوشش کی۔

''مرجائے تو بہتر ہے۔ اس بلا سے چھٹکارا تو مل جائے گا۔ آج میں اس بے غیرت کا کام تمام کردوں گا۔'' وہ آگ بگولہ ہوگیا۔

''ایسا نہ کہو بیٹا یہ تمہاری بیوی ہی نہیں تمہارے ہونے والے بیٹے کی ماں بھی ہے۔'' دائی نصیباں کی بات سن کر ساون کو جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔

''تم اتنے شکی کیوں ہو بغیر سوچے سمجھے بے چاری پر بے غیرتی کا الزام لگا دیا۔'' پھر دائی نصیباں کسی مشین کی طرح اسٹارٹ ہوئی اور اسے ساری حقیقت سے آگاہ کیا۔ دائی نصیباں کی بات کے اختتام پر ساون نے اپنا سر تھام لیا اور روہانسی آواز میں کہا۔

''ہائے اللہ...... یہ مجھ سے کیا ہوگیا۔ مجھے معاف کردینا۔'' اور پھر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں زمین پر بے سدھ پڑی ذکیہ کی جانب مڑا۔ وہ شدت تکلیف سے تڑپ تڑپ کر ساکت ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

دوسرے لمحے ساون اپنی بیوی ذکیہ سے پاگلوں کی طرح لپٹ گیا۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ جب تک وہ سمجھا تب تک دیر ہوچکی تھی۔ ذکیہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا چکا تھا اور اس کی روح فنا ہوچکی تھی۔

''ساون کو یوں لگا جیسے کسی تیز دھار خنجر سے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہیں۔ وہ شدت غم سے روتا رہا مسلسل روئے جارہا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہوگئی تھی۔ اس کا ایک ایک لمحہ اذیت ناک کیفیت میں گزر رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی ماروی کو سینے سے لگا کر خوب رو رہا تھا آج وہ بے بسی سے اپنے آنسوں اندر ہی اتارتا رہا۔ مگر اپنی ہی شکی طبیعت اور بے حسی کے باعث نا صرف اس نے اپنی بیوی کو کھو دیا تھا بلکہ بیٹے کو بھی دنیا میں آنے سے پہلے ہی اندھیری قبر میں اتار دیا تھا۔

☆☆☆

حیدرآباد سے دسویں سچ بیانی

جنون

شاہ زیب

محبت کی خاطر بہن کو زہر دینے والی دوشیزہ کی داستانِ حیرت

یہ کافی عرصہ قبل کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ہمارے پڑوس میں ایک بیوہ اور ان کی چار بیٹیاں رہا کرتی تھیں۔ بیوہ کو ہم سب محلے والے زرینہ خالہ کہتے تھے اور ان کی بیٹیوں کے نام الماس، سیما، سلمٰی اور ناہید تھے۔ الماس خالہ کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور خالہ کے پہلے شوہر کی اولاد تھی۔ جب کہ سیما، سلمٰی اور ناہید خالہ کے دوسرے شوہر کی اولاد تھیں لیکن سگے اور سوتیلے رشتے میں بندھے ہونے کے باوجود چاروں بہنوں کا ایک دوسرے کے لیے پیار مثالی تھا۔ یہ خالہ کی اچھی تربیت کا نتیجہ تھا کہ بہنوں کے درمیان جتنا بھی بڑا جھگڑا ہوتا وہ کبھی بھی سگے سوتیلے کا طعنہ ایک دوسرے کو نہ دیا کرتی تھیں۔

زرینہ خالہ جب دوسری بار بیوہ ہوئیں تو وہ ہمارے پڑوس میں اپنے میکے میں آ کر رہنے لگی تھیں۔ گھر میں اور کوئی تو تھا نہیں بس خالہ کی بوڑھی ماں تھیں، جو دل کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ خالہ کی آمدنی کا ذریعہ محلے کی ایک دکان کا کرایہ تھی۔ جو زرینہ خالہ کے شوہر کی ملکیت تھی۔ اس کے علاوہ وہ گھروں میں بحیثیت ماسی کے کام کرتی تھیں۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو خالہ کو اجرت ملا کرتی تھی۔ اس کے بھروسے وہ اپنی اور بچیوں کی گھریلو ضروریات پوری کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح سے ان کے گھر کا چولہا جلتا رہتا تھا۔

دن یوں ہی گزرتے گئے اور زرینہ خالہ کی بیٹیوں نے معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ماں کے کندھوں سے اپنے سر لے لیا اور اس طرح واجبی سی تعلیم حاصل کرنے کے بعد الماس، سیما گارمنٹ فیکٹری میں کام کرنے لگیں جب کہ سلمٰی نے قریبی پرائیوٹ کلینک میں نرسنگ کا شعبہ اپنے لیے چنا اور نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد نرس بن گئی۔ سب سے چھوٹی لڑکی ناہید جو اسکول میں دسویں کی طالبہ تھی۔ بے حد حساس تھی۔ الماس، سیما، سلمٰی ایک ہی بس میں ایک ساتھ جایا کرتی تھیں کیونکہ گارمنٹ فیکٹری اور کلینک ایک ہی روٹ پر تھا۔ اسی لیے علیحدہ آنے جانے کی انہیں کوئی دقت نہ تھی۔

ایک روز صبح تینوں کی آنکھ دیر سے کھلی اور تینوں بغیر ناشتا کیے جلدی سے تیار ہو کر گھر سے نکلیں اور بس اسٹاپ پر آ گئیں۔ اتفاق سے وہاں آنٹی زبیدہ پہلے سے موجود تھیں۔ زبیدہ آنٹی اسی محلے میں رہتی تھیں اور وہ ان کی فیکٹری میں سپروائزر تھیں۔ لہٰذا ان چاروں نے اکٹھے فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ الماس، سیما اور سلمٰی برقعہ اوڑھتی تھیں۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ روز کی طرح واجد بھی بس اسٹاپ پر ان کا منتظر تھا۔ وہ گارمنٹ فیکٹری کے برابر والی لیب میں کام کرتا تھا۔ جس میں دوائیں وغیرہ بنتی تھیں۔ لہٰذا اکثر یہ سب ایک ہی بس میں سوار ہو کر جاتے تھے۔ واجد کو سلمٰی اچھی لگتی تھی اور وہ اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا مگر زبیدہ آنٹی کی وجہ سے بات نہ کر سکتا تھا۔ تاہم غیر محسوس طریقے

سے دونوں نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو دیکھنا سیما کو ناگوار گزرتا تھا۔ اس کو اپنی بیوہ ماں کی نیک نامی پیاری تھی اور اپنے مرحوم والد کی عزت کا بھی خیال رہتا تھا۔ جب کہ سلمٰی ان سب اندیشوں سے بے نیاز بس راہ محبت کی مسافر ہونا چاہتی تھی۔ وہ واجد کو اپنی زندگی کا ہمسفر بنانا چاہتی تھی۔ سیما نے کئی بار دیکھا کہ سلمٰی، واجد کے قریب کھڑے ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ تب وہ اس کو روکتی کہ تم ادھر کیوں جا کر کھڑی ہوتی ہو۔ میرے قریب کھڑی رہا کرو۔ واجد نے دیکھا کہ دل کا احوال کہنے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تو اس نے زبیدہ آنٹی کو اپنا ہم راز بنالیا۔ یوں زبیدہ آنٹی ان دونوں کے بیچ پل کا کام سرانجام دینے لگیں۔

ایک دن زبیدہ آنٹی نے واجد سے رقعہ لے کر سلمٰی کو دیا تو سیما نے دیکھ لیا۔ اس نے رقعہ جھپٹ لیا اور پڑھ کر پھاڑ دیا۔ پھر وہ آنٹی زبیدہ سے کہنے لگی۔

''آنٹی میں آپ کی عزت اس لیے کرتی تھی کہ آپ بزرگ ہیں مگر اب آپ اس عزت کے لائق نہیں رہی ہیں۔ آپ جیسی عورتوں کی وجہ سے کئی معصوم زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ خدا کے لیے اب یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا۔'' اس دن کے بعد آنٹی زبیدہ دوسری بس میں جانے لگیں۔ گھر آ کر دونوں بہنوں میں شدید لڑائی ہوگئی۔ الماس دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے میں لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اونچی اونچی آواز میں برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ سلمٰی بہت غصے میں تھی۔ وہ بڑی بہن پر چیخ رہی تھی کہ تم کو کیا حق پہنچتا ہے۔ میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا۔ میں جوان ہوں، خوب صورت ہوں اور مجھ کو حق ہے کہ اپنے لیے جیون ساتھی تلاش کروں۔ ہماری غربت میں کون ہمارا رشتہ لینے آئے گا۔ ہم کو خود ہی اپنے لیے شریک زندگی ڈھونڈنے ہوں گے۔ ورنہ ہم عمر بھر کے لیے کنواری رہ جائیں گے۔''

سیما نے جواب دیا کہ رشتے عزت سے آتے ہیں، سرراہ بس اسٹاپ پر نہیں ڈھونڈے جاتے۔ تم خود تو بدنامی کی آگ میں جل کر تباہ ہوگی ہی ساتھ میرا مستقبل بھی تباہ کرو گی۔''

''تم غلط سمجھتی ہو۔ تم میرے پیار سے جلتی ہو۔ تم خوب صورت نہیں ہو اس لیے تم کو کوئی چاہنے والا ملا ہی نہیں۔''

جواب میں سیما نے چھوٹی بہن کو تھپڑ مار دیا اور بولی۔

''بدتمیز، گستاخ تم انتہائی گھٹیا ذہن کی مالک ہو۔ میں تم کو تمہارے بھلے کے لیے روکتی ہوں۔'' اور سلمٰی چلا رہی تھی کہ ''تم اپنا بھلا سنبھال کے رکھو۔ مجھے کسی کی نصیحت کی ضرورت نہیں۔''



زرینہ خالہ جو اتنی دیر سے اپنا سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ اب انہوں نے مداخلت کی تاکہ دونوں کا جھگڑا ختم ہو۔ وہ بولیں۔

''تم دونوں نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے، کیا یہ ہی شریفوں کا طریقہ ہے اور سلمٰی تم بھول رہی ہو کہ واجد ایک خوش حال گھرانے کا تعلیم یافتہ لڑکا ہے۔ جب کہ ہمارے گھر میں تو کھانے کے لالے پڑے ہیں۔ ہم جہیز اور شادی کا خرچہ کہاں سے لائیں گے۔ واجد کے والدین کبھی تمہارا رشتہ لے کر نہ آئیں گے۔ وہ تمہیں قبول ہی نہ کریں گے۔ اس لیے اس سے شادی کا خیال دل سے نکال دو۔'' ماں کی باتیں سن کر سلمٰی رونے لگی اور الماس، سیما کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔

اس جھگڑے کے بعد بہنوں کے درمیان نفرت پروان چڑھنے لگی۔ سلمٰی کے دل میں سیما کے لیے نفرت اور واجد کے لیے پیار بڑھتا گیا۔ سلمٰی اکثر و بیشتر واجد کے ساتھ موبائل فون پر لمبی باتیں کیا کرتی تھی۔ sms اور طویل دورانیے کی موبائل گفتگو راتوں میں بھی ہونے لگی۔ لیٹ نائٹ پیکجز نے تو سلمٰی کا کام اور آسان کر دیا تھا۔ اب وہ دل کھول کر واجد سے ہم کلام ہوتی تھی۔ دونوں اکثر شام کے وقت میں پارکوں میں اپنی محبتوں کے عہد کیا کرتے تھے۔

ایک شام سلمٰی کو پارک میں گفتگو کے دوران وقت کا احساس ہی نہ ہوا کہ رات کے آٹھ بج گئے۔ سلمٰی کو ڈھونڈتے ہوئے سیما پارک میں پہنچ گئی اور واجد اور سلمٰی کو دیکھتے ہی سیخ پا ہوگئی۔ واجد کو کھری کھری باتیں سنانے کے بعد سیما نے سلمٰی کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گھر آ گئی۔ گھر پہنچتے ہی سلمٰی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ رو رو کر سارا محلہ سر پر اٹھا لیا۔ ماں اور بہنوں سے کسی طور بات نہ بنی تو سب نے مل کر سلمٰی کو کمرے میں بند کر دیا۔ زرینہ خالہ کمرے کے باہر پڑی چوکی پر ڈھے گئیں۔ الماس نے انہیں ٹھنڈا پانی دیا تو اسے پی کر ان کے حواس بحال ہوئے۔

بہنوں نے سلمٰی پر بہت پابندیاں لگائیں۔ بہت روکنا چاہا اس کا موبائل فون لے لیا گیا مگر بے سود۔ جس راہ پر سلمٰی کے قدم اٹھ چکے تھے۔ اب لوٹ کر آنا ممکن ہی نہ تھا۔ خالہ زرینہ عمر رسیدہ تھیں۔ وہ ان حالات سے کافی پریشان تھیں۔

اس روز بھی دونوں بہنوں میں جھگڑا ہوا وجہ واجد ہی تھا۔ جس پر خالہ کی طبیعت بگڑ گئی۔ گھر میں رہنے کی وجہ سے بیرونی معاملات کا پتا نہ رہتا تھا۔ تاہم سیما کے منہ سے چھوٹی بیٹی کے بارے میں سنگین الزامات سنتیں تو ان کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ اس روز بھی ایسی ہی باتیں سن کر وہ لیٹ گئیں۔ دل میں شدید درد ہوا ماں کی یہ حالت دیکھی تو سب بہنیں گھبرا گئیں۔ الماس، سیما نے گارمنٹس فیکٹری سے چھٹی لے لی۔ الماس نے سلمٰی سے چھٹی کرنے کو کہا کہ آج چھٹی کرتے ہیں۔ کام پر نہ جاؤ اماں کا خیال رکھو۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔ سلمٰی کی عجب مجبوری تھی۔ اسے گھر سے باہر جانا ہی تھا۔ کہنے لگی۔ ''مجھے آج سہیلی کی بہن کی سالگرہ میں جانا ہے۔ میں چھٹی نہیں کر سکتی تم کر لو میں نہیں رک سکتی۔'' ماں کو خیال آیا کہ اس بات پر دونوں لڑ نہ پڑیں۔ تب ہی بولیں۔

''سلمٰی بیٹی تم چلی جاؤ میری طبیعت زیادہ خراب نہیں ہے۔'' ماں کا اتنا کہنا تھا کہ سلمٰی جلدی سے تیار ہو کر گھر سے نکل گئی اور باقی بہنیں اس کا منہ تکتی رہ گئیں۔

سلمٰی گھر سے نکل کر بس اسٹاپ آ گئی۔ جہاں سے وہ واجد کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لمبی سیر کو نکل گئی۔ جب سلمٰی تھکی ماندی گھر لوٹی تو گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا تو کیا اماں نے واقعی اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اس کو تو گمان بھی نہ تھا مگر دل اک مرض ہی ایسا ہوتا ہے۔ پل کی دیر نہیں لگتی اور دل کا دورہ شدید ہو تو آدمی کو اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

عورتوں اور مردوں کا مجمع دیکھ کر وہ پریشان ہو کر گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ ماں کی میت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی سیما سے لپٹ گئی۔ محلے کی عورتیں دونوں بہنوں کو دلاسا دینے لگیں۔ بیٹی مت رو جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ ہم تم کیا کر سکتے ہیں۔ موت پر کسی کا بس نہیں۔

ماں کی وفات کا صدمہ بڑا بھاری تھا کیونکہ اسی کا سہارا تھا۔ اب چاروں بہنیں اکیلی رہ گئیں۔ چاروں بہنوں کو سہارا دینے اور زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے زرینہ خالہ کی بڑی بہن جمیلہ خالہ ان کے گھر سرپرست بن کر رہنے لگیں۔

چند دن گھر پر رہنے کے بعد بہنوں نے پھر سے کام پر جانا شروع کر دیا کیونکہ پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی تھا۔ سیما بہت افسردہ تھی۔ ساتھ میں الماس اور ناہید بھی بہت غمگین تھیں۔ سب بہنوں پر سے ماں کی چھاؤں نہ رہی تھی لیکن خالہ کی صورت میں نگہبان مل گئی تھیں۔ جس سے وہ اپنا دکھ سکھ بانٹا کرتی تھیں مگر سلمٰی نے زیادہ آزادی محسوس کی تھی اور روز ہی کام کا بہانہ بنا کر وہ واجد کے ساتھ جانے لگی۔ اس

دوران الماس کا ایک مہذب گھرانے سے رشتہ آیا اور جمیلہ خالہ نے اس کی شادی کر دی۔ شادی پر ہونے والا سارا خرچہ خالہ نے ہی اٹھایا تھا۔ الماس کی شادی کے بعد جمیلہ خالہ ناہید کو لے کر اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ کیونکہ زرینہ خالہ کے گھر کا ماحول کافی خراب ہونے لگا تھا۔ آئے روز دونوں بہنوں کے درمیان کشمکش بڑھنے لگی تھی۔ خالہ اور ناہید کے جانے کے بعد سیما اور سلمٰی گھر میں اکیلی رہ گئیں۔ پہلے تو سیما نے سلمٰی کو آرام سے سمجھایا مگر وہ نہ مانی تو بڑی بہن نے اسے سختی شروع کر دی۔ اس نے واجد کو روکا اور کلینک جا کر کہہ دیا کہ اس کی بہن بہانے بہانے سے چھٹیاں کرتی ہے۔ اس کو چھٹیاں نہ دی جائیں۔ اس بات سے سلمٰی اپنی بہن کی سخت دشمن ہو گئی۔ سیما ہر قدم پر بہن کی نگرانی کرتی۔ وہ لمحہ لمحہ اس کے ساتھ رہنے لگی۔ کئی بار بہنوں میں بڑی تلخ تکرار بھی ہوئی مگر سیما نے ہار نہ مانی کیونکہ وہ زمانے کا مزاج جانتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ان پر انگلیاں اٹھائے۔ جب سلمٰی نے دیکھا کہ سیما کی سختیاں حد سے بڑھ رہی ہیں تو وہ اس سے چھٹکارا پانے کی فکر میں پڑ گئی۔ ایک روز اس کو واجد کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا کیونکہ سیما کو سخت بخار تھا اور وہ فیکٹری نہ جا سکی تھی۔ جب وہ واجد کے پاس پہنچی تو وہ کوئی دوا لیے کھڑا تھا۔ اس نے سلمٰی کو بتایا کہ اس شیشی میں زہر ہے۔ لیب سے نمونہ لیا ہے۔ نئی دوا بنائی ہے اور کسی جانور پر تجربہ کرنا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے دوا الماری میں رکھی اور اپنے نگراں سے چھٹی لینے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی سلمٰی نے الماری سے دوا کی شیشی اٹھا کر پرس میں ڈال لی۔ لیب میں سلمٰی اندر دوسری بار ہی آئی تھی۔ واجد کے ساتھ سیر و تفریح کے بعد شام کو جب وہ گھر پہنچی تو سیما بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ سلمٰی نے سیما کو لیب سے لائی ہوئی دوا کے چند قطرے پانی میں ڈال کر پلا دیے اور کہنے لگی۔

''میں ڈاکٹر سے دوا لے آئی ہوں اٹھو اور پی لو۔'' یوں اس نے بہن کو زہر پلا دیا۔ دوا پیتے ہی سیما کو نیند آنے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا اور گلا بند ہونے لگا۔ زہر کا اثر شروع ہو گیا۔ سیما کی حالت غیر ہوتی گئی۔

''سلمٰی میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ تم ڈاکٹر کو لے آؤ۔'' سیما نے گلا پکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا باجی میں ابھی ڈاکٹر کو لے آتی ہوں۔'' یہ کہتے ہی سلمٰی نے گھر سے باہر نکلتے ہی واجد کو فون کیا کہ اگر میرے گھر کے قریب کے کلینک تک آ سکتے ہو تو ابھی آ جاؤ۔'' وہ بولا۔

''بس میں راستے میں ہوں۔ تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گا۔'' اس کو خبر نہ تھی سلمٰی کیا کر چکی ہے۔ سلمٰی دوبارہ گھر آئی تو سیما مر چکی تھی۔ وہ گھبرا گئی مگر واجد کے خیال سے اس کو تسلی ہوئی۔ واجد کا فون آیا وہ دوڑی ہوئی بس اسٹاپ گئی اور واجد کو بتایا کہ باجی فوت ہو گئی ہیں۔ کیا کہہ رہی ہو۔ واجد نے چونک کر کہا۔ ساتھ ہی ساتھ سلمٰی نے واجد کو تمام صورتحال بیان کر دی۔

''سلمٰی تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم پاگل تو نہیں ہو تم اپنی بہن کو قتل کر آئی ہو۔ اب کتنے آرام سے یہ سب مجھ کو بتا رہی ہو۔''

''واجد تم اس کو قتل مت کہو یہ بس ایک تجربہ تھا اور یہ تجربہ میں نے تمہارے پیار کو پانے کے لیے کیا ہے۔ جو کامیاب رہا چلو اب مجھے زیادہ رد و نہیں مجھے جانا ہے۔''

''سلمٰی تم جو چاہے کہو تم قاتلہ ہو۔ میں تمہارے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ تم ایک سنگدل عورت ہو۔ جو اپنی بہن کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتی ہے وہ بھلا کسی اور کے ساتھ کیا نہیں کر سکتی مجھ کو معاف رکھو۔ آج سے میرا تمہارا واسطہ ختم۔''

یہ کہتے ہی وہ چلا گیا۔ قتل چھپتا نہیں وہ جب گھر آئی تو کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ سیما کو مردہ دیکھ کر رک گئیں۔ انہوں نے نہلانے والی کو بلایا۔ جس نے میت دیکھ کر کہا مجھے شک ہے اسے زہر دیا گیا ہے۔

اس بات کی بھنک باہر لوگوں کو ہو گئی جو سیما کے مرنے پر جمع ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے پولیس کو فون کر دیا۔ لیڈی پولیس اندر آ گئی اور وہ لوگ سیما کی میت کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے گئے۔ محلے والوں کو شک تھا کہ شاید ڈاکٹر نے کوئی غلط دوا دے دی۔ غالباً غلطی کی وجہ سے موت ہوئی ہے مگر پتا چلا ڈاکٹر اس روز آیا ہی نہیں تھا۔ سلمٰی یوں ہی کلینک تک جا کر لوٹ آئی تھی۔

بہر حال جب سلمٰی سے پوچھ گچھ ہوئی تو اسے اصل راز اگلنا پڑا۔ واجد کی گرفتاری کے لیے چھاپے پڑے لیکن وہ روپوش ہو گیا اور سلمٰی کو پولیس لے گئی۔ بہن کے قتل کے جرم میں اس کو عمر قید کی سزا ہو گئی مگر جیل میں ہی اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ قید پوری کرنے سے قبل ہی وہ جیل میں فوت ہو گئی۔ سچ ہے جو جیسا کرے گا ویسا ہی بھرے گا۔

......☆☆☆......

ذرا سی دیر میں

شاہدہ ذاکر

اُس رکشہ ڈرائیور کی کہانی، جسے تھوڑی سی دیر کی ملاقات ساری زندگی کا ساتھ دے گئی تھی

زندگی تلخ و شیریں یادوں سے عبارت ہے۔ کچھ چیزوں کو تو ہم فوراً بھول جاتے ہیں لیکن کچھ واقعات ہمیشہ کے لیے ہماری یادوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آج میں آپ کو جو واقعہ سنانے جا رہا ہوں۔ آپ کو تو شاید یہ اتنا اہم نہ لگے لیکن اس نے میری زندگی کو نہ صرف یکسر تبدیل کر دیا بلکہ اسے خوشیوں اور بہار رنگوں سے بھی بھر دیا۔

ٹھہریے کہانی سنانے سے پہلے میں آپ سے اپنا تعارف کروا دوں۔ مثل مشہور ہے کہ غریب اولاد کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ یوں جب میں نے اس عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی تو مجھ سے پہلے چار بہنیں اور تین بھائی والدین کی محبت کے حصہ دار بن چکے تھے۔ میری آمد گھر میں معمول کے مطابق لی گئی کیونکہ تمام بہن بھائی تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد گھر میں ایک نئے مہمان کے اضافے کے عادی تھے۔ چھوٹا سا تین کمروں پر مشتمل گھر جس میں دو کمرے رہائش کے لیے استعمال ہوتے تھے اور تیسرے میں روزمرہ کے استعمال کا سامان رکھ کر والد صاحب نے اسے جنرل اسٹور کی شکل دے دی تھی اور یہ ہی وہ واحد ذریعہ روزگار تھا جو دس افراد کے کنبے کی کفالت کر رہا تھا۔ ہماری والدہ کی محنت اور کفالت شعاری سے زندگی کی گاڑی رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ یوں میں بڑے بہن بھائیوں کی اترن پہنتے پہنتے اور ان ہی کے ہاتھوں پلتے ہوئے اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گیا۔ ہمارے والدین کی شدید خواہش تھی کہ ان کے بچے تعلیم حاصل کر کے زندگی میں ترقی اور کامیابیاں حاصل کریں۔

بڑی دو بہنیں میٹرک کے بعد گھر میں بیٹھی تھیں۔ والدہ ان کے رشتوں کے لیے نہایت فکر مند تھیں لیکن غربت میں بغیر جہیز کے بیٹیاں بیاہنا بھی ایک مشکل امر ہے کیونکہ آج کے مادہ پرستی کے دور میں تو اپنے بھی مفاد کے بغیر نہیں ملتے۔ بہرحال یوں ہی شب و روز کا چکر چلتا رہا اور میں میٹرک میں پہنچ گیا اتنے عرصے میں والدہ اپنی سرتوڑ کوششوں سے ان کے ہاتھ پیلے کر چکی تھیں۔ سلائی کڑھائی اور ٹیوشن وغیرہ سے معمولی سا جہیز بنا کر سادگی سے ہم پلہ خاندانوں میں ان کو رخصت کر دیا گیا۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا شروع ہی سے بے حد شوق تھا۔ والدین چونکہ تنگ دستی کی وجہ سے تعلیمی اخراجات پورے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کالج میں داخلہ لیتے ہی میں نے ٹیوشن

پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دن کو کالج، شام کو ٹیوشن اور رات کو اپنی پڑھائی نے زندگی بہت مشکل کر دی تھی لیکن ایک روشن مستقبل کی آس تمام تھکاوٹ سمیٹ لیتی۔ اس دوران بڑے بھائی بھی معمولی تعلیم حاصل کر کے چھوٹی موٹی ملازمتوں سے وابستہ ہو چکے تھے۔ دو سال جیسے تیسے گزر گئے اور میں نے اچھے نمبروں سے انٹر کا امتحان پاس کر کے بی کام میں داخلہ لے لیا۔ ان ہی دنوں اتفاق سے ہماری والدہ کی ایک کمیٹی کھل گئی۔ جس سے میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ رکشہ لے لیا۔ اب کالج سے واپسی پر گھر آ کر میں کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر رات گئے تک رکشے میں مسافروں کو ان کی منزل مقصود تک پہنچاتا۔ اس سے آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا اور زندگی میں کچھ سہولت محسوس ہونے لگی۔

میرا روزانہ بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا اور نت نئے تجربات ہوتے۔ ایک دن میرے رکشے میں ایک عمر رسیدہ جوڑا سوار ہوا۔ دیکھنے میں متوسط طبقے کے افراد لگتے تھے۔ ان کے ساتھ دو بڑے اور ایک چھوٹا بیگ تھا۔ میں نے ان کو پندرہ بیس منٹ میں ان کی منزل پر پہنچا دیا۔ وہ اپنے گھر پر نہیں بلکہ گلی کے آغاز پر اترے اور کرایہ ادا کر کے خاموشی سے اپنا سامان لے کر روانہ ہو گئے۔ شام ہونے والی تھی اور مجھے شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ کھانا میں ہمیشہ گھر آ کر کھاتا تھا لہٰذا میں وہاں سے قریبی مارکیٹ چلا گیا اور ایک ٹھیلے سے برگر لے کر رکشے میں بیٹھ کر کھانے لگا۔ فارغ ہو کر میں نے سوچا کہ ایک دو سواریاں اور اٹھا لوں۔ اچانک میری نظر سامنے شیشے پر پڑی اور مجھے پچھلی سیٹ پر ایک چھوٹا سا بیگ دکھائی دیا۔ مجھے فوراً اسی جوڑے کا خیال آیا کیونکہ ان کے بعد میرے پاس ابھی تک کوئی سواری نہیں آئی تھی۔ پہلے تو خیال آیا کہ اسے کھول کر دیکھوں لیکن پھر ضمیر نے ملامت کی اور اسے واپس کرنے کا سوچا۔ میں ان کا گھر نہیں جانتا تھا بلکہ میں تو ان کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے وہاں



جا کر کوشش کرنے کی ٹھانی کیونکہ یہ ہی میرے والدین کی تربیت تھی۔ بے شک ہم نے تمام عمر غربت میں گزاری لیکن انہوں نے کبھی ہمیں حرام کا لقمہ نہیں کھلایا اور ہمیشہ رزق حلال کے حصول کی تلقین کی۔

جب میں اس گلی تک پہنچا تو ہلکا اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے پہلا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک نوعمر لڑکا نکلا۔ اسے میں نے ان مسافروں کا حلیہ بتایا لیکن اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اسی طرح میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے لوگوں سے ان کے بارے میں استفسار کرتا رہا لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آٹھ، نو کاوشوں کے بعد ایک فیملی نے انہیں اپنے ہمسائے کے طور پر شناخت کر لیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں ان کے دروازے پر پہنچ گیا۔

دستک دینے پر وہی بزرگوار تشریف لائے۔ پریشانی سے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے سلام کر کے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو ایک دم ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ خوشی سے کپکپاتی آواز میں انہوں نے سلام کا جواب دیا اور مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ میں ان کی ہمراہی میں ایک نہایت سادگی اور نفاست سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ چند لمحوں بعد ان کی شریک حیات بھی آ گئیں۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پا کر میرا بے حد شکریہ ادا کیا۔ ایک ہفتے کے بعد ان کی بیٹی کی شادی تھی۔ اسی سلسلے میں شاپنگ کر کے وہ گھر لوٹ رہے تھے۔ اس بیگ میں ان کی بیٹی کے زیورات اور دوسری قیمتی اشیاء تھیں۔ یہ ان کی عمر بھر کی جمع پونجی تھی۔ جب گھر آ کر انہیں اس کی گمشدگی کا علم ہوا تو ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نقصان کے بعد انہیں باعزت طریقے سے بیٹی کی رخصتی ناممکن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ میرے اس قدر احسان مند اور شکر گزار ہو رہے تھے کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ فوراً ہی چائے کا انتظام ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا بیگ کھول کر اپنا سامان چیک کر لیں تو انہوں نے کہا۔

''بیٹا اگر تمہاری نیت میں کھوٹ ہوتا تو تم اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ تم ہمارے لئے رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے ہو۔'' انہوں نے مجھے کچھ رقم بطور انعام دینا چاہی لیکن میں نے شکریے سے واپس کر دی۔ انہوں نے پر زور اصرار سے شادی میں شرکت کی دعوت دی جو مجھے قبول کرنی پڑی۔

مجھے بھی یہ سادہ، مخلص اور بے ریا فیملی بہت پسند آئی۔ مقررہ تاریخ کو میں ایک خوب صورت سوٹ بطور تحفہ لے کر ایک سجے سجائے روشنیوں سے چمکتے ہوئے شادی ہال میں پہنچ گیا۔ بارات کی آمد کے فوراً بعد نکاح ہوا۔ بعد ازاں تمام مہمانوں کی نہایت اعلیٰ قسم کے کھانوں سے تواضع کی گئی۔ یوں رات گئے یہ تقریب اختتام کو پہنچی اور انہوں نے دکھی دل، برستی آنکھوں اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اپنی لاڈلی کو اس کے نئے گھر روانہ کیا۔ میری شرکت اور تحفے کا انہوں نے شکریہ ادا کیا اور آئندہ ملتے رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ اب میرے وہ دو انجان مسافر میرے چچا جان اور چچی جان بن چکے تھے۔

شب و روز کی مصروفیات میں وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ ایک دن مجھے اس ایریا کی سواری مل گئی تو میں ان کے پاس جا پہنچا۔ انہوں نے میرا بہت پرتپاک استقبال کیا۔ اکلوتی بیٹی کا فرض ادا کر کے وہ مطمئن تو تھے لیکن انتہائی اور یاسیت کا شکار تھے۔ اس دن ان سے تفصیلی بات چیت ہوئی کیونکہ مجھے رات کے کھانے کے بعد ہی واپسی کی اجازت ملی۔ ان کے خلوص اور اپنائیت نے میرا دل موہ لیا۔ اب تک میرے دو بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور گھر میں ساس بہو کی روایتی چپقلش کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب میں گاہے بہ گاہے ان سے ملنے جاتا رہتا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ (مریم) ان کی بیٹی کے سسرال والے نہایت لالچی اور تنگ نظر لوگ تھے۔ مریم سے صبح سے شام تک نوکر کی طرح کام لیا جاتا لیکن محبت اور ستائش کا ایک لفظ بھی بولنا گناہ تھا بلکہ ساس تو نکتہ چینی اور طعنہ زنی کو اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چچا جان نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دیا تھا کیونکہ وہ تو کوٹھی اور کار کے خواہشمند تھے۔

میرے والد صاحب بیمار تو کافی عرصہ سے تھے لیکن ایک رات جو سوئے تو اگلی صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ایسی اچانک موت نے دنوں حواس گم کیے رکھے کیونکہ والدین کا خلا دنیا میں کوئی پر نہیں کر سکتا۔ پھر امتحان شروع ہو گئے تو چند ماہ چچا جان کی طرف جانا نہ ہو سکا۔ کچھ عرصہ بعد ملاقات ہوئی تو علم ہوا کہ مریم آج کل ان کے پاس ہے۔ اگرچہ وہ شروع سے ہی کم گو اور اپنی ذات میں مگن رہنے والی لڑکی تھی لیکن اب اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں واضح طور پر نظر آتی تھیں۔ میری اس سے ملاقات صرف سلام دعا اور چائے پانی لانے تک محدود تھی۔ اب جب کہ وہ ماں کے رتبے پر فائز ہونے والی تھی تو اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اس وقت اسے علاج، آرام اور اچھی خوراک کی ضرورت تھی لیکن اسے ایسی کوئی رعایت نہ مل رہی تھی۔ حسب سابق دن رات کام میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ان کے خیال میں صرف وقت اور پیسے کا زیاں تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر بقول ان کے صرف مشورے دے کر گھروں میں مسائل پیدا کرتے ہیں۔ جب اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو چچا جان اسے ساس کی اجازت سے اپنے پاس لے آئے۔ انہوں نے بھی پلٹ کر خبر نہ لی کیونکہ اب ذمہ داری نبھانے اور خرچہ کرنے کا وقت تھا۔

دسمبر کی ایک سرد شام کو مریم نے ایک گول مٹول پیاری سی گڑیا کو جنم دیا۔ اس کے والدین بہت خوش تھے۔ فوراً سسرال بھی اطلاع کر دی گئی لیکن کوئی دیکھنے تک نہ آیا کیونکہ وہ صرف پوتے کے خواہشمند تھے۔ ان کے مطابق ان کے خاندان میں پہلا بچہ ہمیشہ بیٹا ہوتا ہے لیکن یہ تو خدا کی مرضی ہے کہ وہ انسان کو نعمت سے نوازے یا رحمت سے۔ جب دو تین ماہ تک انہوں نے کوئی رابطہ نہ کیا تو بیٹی کے گھر کو قائم رکھنے کے لیے چچا جان نے مجبوراً خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا لیکن وہاں پر کسی نے ان سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ بیٹی کی پیدائش ان کے خیال میں ایک جرم تھا۔ جس کی سزا وہ مریم کو دے رہے تھے۔ ان کا داماد بھی اپنے والدین کا ہمنوا تھا۔ آخر ڈھکے چھپے لفظوں میں انہوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اگر وہ اپنا گھر مریم کے نام کر دیں تب ہی وہ سسرال واپس جا سکتی ہے۔

چچا جان یہ مطالبہ سن کر دنگ رہ گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ گھر اور ان کی پینشن ہی ان کے زندگی گزارنے کا ذریعہ تھا۔ گھر کا آدھا حصہ انہوں نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ انہوں نے رشتہ داروں سے مشورہ کیا تو سب کا یہ کہنا تھا کہ اگر وہ یہ قربانی دے بھی دیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ آئندہ کوئی مطالبہ نہیں کریں گے اور ان کی بیٹی کا گھر بسا رہے گا۔ مریم بھی یہ سن کر بہت دکھی ہوئی اس کا کہنا تھا کہ وہ نوکری کر کے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پال لے گی لیکن ایسے لالچی لوگوں میں واپس نہیں جائے گی۔ جب ان کا مطالبہ ماننے میں پس و پیش کی گئی تو ان کی طرف سے طلاق نامہ موصول ہو گیا۔ جسے دیکھ کر ماں باپ تو دل تھام کر رہ گئے لیکن مریم تو ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہو گئی۔

وقت جیسا بھی ہو گزر جاتا ہے اور دھیرے دھیرے انسان کو صبر بھی آ جاتا ہے۔ میں اب اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک اچھی فرم میں ملازمت کر رہا تھا اور والدہ میرے سر پر سہرا دیکھنے کی خواہشمند تھیں جب کہ میں کچھ عرصہ ٹھہر کر اپنی مالی حیثیت مستحکم کر کے ازدواجی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ والدہ نے بہنوں کے ساتھ مل کر لڑکیاں دیکھنے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ مریم حسن صورت اور سیرت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ تھی۔ لہٰذا جب اس کی بیٹی سال بھر کی ہو گئی تو اسے والدہ کے پاس چھوڑ کر اس نے ایک مشہور اسکول میں ملازمت شروع کر دی۔ میں گاہے بگاہے ان سے ملنے کو جاتا رہتا۔ لالہ رخ (مریم کی بیٹی) جو کہ اب پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی مجھے دیکھ کر لپک کر میرے پاس آتی اور میں بھی ہمیشہ اس کے لیے چاکلیٹ یا غبارے لے کر جاتا۔

ایک دن مریم نے فون کر کے مجھے فوری طور پر بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو چچا جان بے ہوش پڑے تھے۔ دونوں خواتین کا پریشانی سے برا حال تھا میں انہیں لے کر فوراً ہسپتال پہنچا۔ ایمرجنسی میں فوری طبی امداد

ملنے سے وہ ہوش میں آ گئے لیکن دو تین دن میں ان کے تمام ٹیسٹ ہو کر جب رپورٹ آئی تو یہ سن کر ان کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا کہ ان کا برین ٹیومر آخری اسٹیج پر تھا اور وہ اسے عمر کا تقاضا سمجھ رہے تھے۔ مریم اور چچی جان کا تو غم سے برا حال ہو گیا بہر حال ان کا علاج شروع ہوا جو صرف تکلیف کو وقتی طور پر کم کرنے کے لیے تھا۔

ایک دن ان سے ملاقات کو گیا تو مجھے دیکھ کر وہ آبدیدہ ہو گئے۔ بیماری نے ان کا زندگی پر سے بھروسہ ختم کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی تنہائی اور ناکام ازدواجی زندگی کی وجہ سے بہت دلگرفتہ تھے اور اپنی زندگی میں اسے محفوظ ہاتھوں میں سونپنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا۔

”بیٹا! میں تمہیں صرف بیٹا کہتا ہی نہیں بلکہ سمجھتا بھی ہوں۔ میں بہت شرمندگی سے تم سے مدد کا خواستگار ہوں۔ اگر تمہاری نظر میں کوئی ایسا لڑکا ہے جو فوری طور پر مریم کا ہاتھ تھام لے تو مجھے بتاؤ۔“ میں نے ان کو تسلی دی اور اس سلسلے میں ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ جب میں نے گھر آ کر غور کیا تو کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو فوراً شادی پر تیار ہو کیونکہ وہ یہ فرض اپنی زندگی میں پورا کرنا چاہتے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا میں اس خاندان کے اخلاق، مروت، خلوص اور شرافت، سلیقہ مند اور باکردار لڑکی تھی تو پھر وہ شخص میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ جب کہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک کسی کو اس نظر سے دیکھا بھی نہیں تھا اور والدہ بھی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھیں۔ اس خیال نے میری سوچوں کا رخ بدل دیا۔ یہ رشتہ نہ صرف ان کی پریشانیوں کا حل تھا بلکہ میرے لیے بھی ایک پرسکون، خوشیوں سے بھری اور مستحکم ازدواجی زندگی کا ضامن تھا۔ جب میں نے والدہ سے ذکر کیا تو شروع میں تو انہوں نے طلاق اور ایک بچی کی موجودگی کے سبب سختی سے انکار کیا لیکن میں نے اپنی والدہ سے درخواست کی کہ صرف ایک مرتبہ وہ ان سے ملاقات کر لیں پھر ان کا جو بھی فیصلہ ہو گا میں ہنسی خوشی قبول کر لوں گا۔

جب میری والدہ ان سے ملیں تو ان کے رکھ رکھاؤ، اخلاق اور شرافت سے بے حد متاثر ہوئیں۔ ویسے بھی وہ پہلے اپنی مرضی سے بہوئیں لا کر پچھتا رہی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ پھر اجنبی لوگوں کو آزمانے سے یہ جانے پہچانے لوگ لاکھ گنا بہتر ہیں اور پھر میری خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اجازت دے دی۔

اگلے جمعے کو سادگی سے مریم اور میں ایک بندھن میں بندھ گئے۔ چچا جان کی حالت کے باعث خاموشی سے یہ فرض ادا کیا گیا۔ بارات بھی چند افراد پر مشتمل تھی اور انہوں نے بھی صرف اپنے قریبی عزیزوں کو مدعو کیا۔ اپنی بیٹی کو اس کے گھر روانہ کر کے پرسکون ہو کر مریم کے والد نے ایک ہفتے کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ماں بیٹی دونوں غم سے نڈھال تھیں۔ وقت سے بڑا مرہم کوئی نہیں لہٰذا رفتہ رفتہ یہ زخم بھی مندمل ہوتا گیا۔ گزرتے ماہ و سال نے اس غم کو دھندلا دیا۔

میں نے اپنے لیے ایک خوب صورت گھر لیا جسے مریم نے اپنے سلیقے اور محنت سے دنیا میں میرے لیے جنت بنا دیا۔ اپنے حسن اخلاق اور معاملہ فہمی سے اس نے میری والدہ اور بہن بھائیوں کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ ہم نے اصرار کر کے چچی جان کو بھی اپنے پاس بلا لیا یوں زندگی کے آخری پانچ سال انہوں نے ہمارے ساتھ گزارے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا لیکن لالہ (مریم کی پہلی بیٹی) کا مقام میرے دل میں آج بھی وہی ہے جو پہلے دن تھا۔ میں نے اس کو ہمیشہ اپنا پہلا بچہ مانا اور سب سے زیادہ محبت اور اہمیت دی۔ گھر میں بھی لالہ سب بچوں کی پسندیدہ بڑی آپی ہے۔ بچوں کے پیار اور یگانگت کا یہ عالم ہے کہ کوئی اجنبی کبھی یہ فرق محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ یوں ایک چھوٹی سی رکشے میں ملاقات میری پوری زندگی پر محیط ہو گئی۔ آپ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہمارے گھر پر اس کی نظر کرم رہے اور ہماری خوشیاں سدا سلامت رہیں۔ (آمین)

☆☆☆

گجرات سے بارہویں سچ بیانی

نجات

افتخار افی

خدا کے قہر کا شکار ہونے والے اُن نوجوانوں کی داستان جو گینگ ریپ میں ملوث تھے

سینٹرل جیل میں سزائے موت کے مجرموں کے لیے بنائی گئی خصوصی بیرک کے برآمدے میں جلنے والی ٹیوب لائٹ کی روشنی سلاخوں سے چھن کر اندر آرہی تھی جس کی وجہ سے چھ بائے آٹھ فٹ کی نیچی چھت والی بیرک میں ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

بیرک کے لمبے برآمدے میں رات کے پہرے پر معمور سنتری مٹر گشت کرتا ہوا جب سلاخوں والے دروازے کے سامنے سے گزرتا تو اس کے بوٹوں کی مخصوص آواز ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی کی جھیل میں کنکر پھینکنے کے مترادف زیروبم کی لہریں پیدا کر دیتی۔ اور پھر اس کے آگے بڑھ جانے کے ساتھ ہی



بوٹوں کی کھٹ کھٹ معدوم ہوتے ہوئے بتدریج فضا میں ایک بار پھر پہلے کی طرح خاموشی چھا جاتی۔ اس چھوٹے سے پنجرے نما قید خانے میں آج خلاف معمول پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

تہرے قتل کے مجرم ظہیر کو موت کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی، جو ہر گزرتے لمحے اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی طرف سے صدر مملکت کو بھیجی گئی رحم کی اپیل بھی مسترد ہو چکی تھی۔ اسی لیے آج اس کی موت کے فائنل ریڈ آڈر جاری ہو چکے تھے، اب وہ محض چند دنوں کا مہمان تھا۔

اس تنگ و تاریک بیرک میں وہ ایک ہمایوں نامی قیدی کے ساتھ پابند سلاسل تھا۔

اس وقت وہ دونوں پسینے میں نہائے اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

سیلن زدہ بیرک کی نمی والی بھاری ہوا میں آکسیجن کی مقدار کافی کم تھی، جس کی وجہ سے سانس کو ذرا کھینچ کر لینا پڑ رہا تھا، شاید اسی مشقت کی وجہ سے ان کا پسینہ خشک ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''یار نرالہ انصاف ہے، ایک تو تمہاری بہن کے ساتھ حیوانیت اور درندگی کی انتہا کرنے کے بعد اسے موت کی نیند سلا دیا گیا، اور پھر اسی غم میں ماں باپ بھی چل بسے۔ مگر اندھے اور بہرے قانون کے کان پر جوں تک نہیں رینگی، مگر جب تم نے پانچ درندوں میں سے تین کو سرعام عبرت کا نشان بنا دیا تو، یہی اندھا قانون سپر جیٹ کی رفتار سے حرکت میں آ گیا۔ اور اب قانون ہاتھ میں لینے کا لنگڑا عذر بنا کر الٹا تم پر سزائے موت مسلط کر رہے ہیں۔''

ہمایوں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا، تو اس کی بھاری آواز کی بازگشت چاروں طرف پھیلے ہوئے سناٹے کو چیر گئی۔

ظہیر اس کی بات سن کر چند ثانیے اس کی طرف دیکھتا رہا، اور پھر سلاخوں کی دوسری طرف خلا میں کچھ کھوجنے لگا۔

ہمایوں خود بھی دوہرے قتل کا مجرم تھا، جس نے اپنی بیوی کو اس کے آشنا کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا، اور طیش کے عالم میں دونوں کو وہیں سے ابدی سفر کے لیے روانہ کر دیا تھا، اور اب خود ان کے پیچھے جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔

''جب ہمارا مرنا طے ہو چکا ہے تو اس طرح بے بسی کی موت کیوں مرا جائے، کیوں نہ جدوجہد کی جائے اگر مرنا ہی مقدر ٹھہرا ہے تو حسرت تو نہ رہے کہ کوشش نہیں کی۔''

ہمایوں نے اٹھ کر اس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔

''میں بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا ہوں، ابھی دو درندے آزاد گھوم رہے ہیں، اگر میں انہیں انجام تک نہ پہنچا سکا تو مجھے مرنے کے بعد بھی سکون نصیب نہیں ہوگا۔'' ظہیر نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

شاید موت کے خوف نے ان دونوں کے ذہن کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا، ورنہ اتنے کڑے پہرے میں ایسا سوچنا بھی محال تھا۔

''بتاؤ اگر تمہارے ذہن میں کوئی قابل عمل پلان ہے تو۔'' ظہیر نے کہا تو ہمایوں اپنے دماغ میں موجود منصوبہ سرگوشی کے انداز میں اس کے کان میں انڈیلنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں نے فرار کی حکمت عملی ترتیب دے ڈالی اور پھر منصوبے کے تحت ہمایوں پیٹ پکڑ کر دوہرا ہوتا چلا گیا، اور اس کی بلند ہوتی ہوئی کراہیں، بیرک سے باہر تک جانے لگیں۔ برآمدے میں گشت کرتا ہوا سپاہی بھی اس کی کراہیں سن کر سلاخوں کے پاس آ کھڑا ہوا، ہمایوں کی حالت دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اس نے جلدی سے اپنے پاس موجود واکی ٹاکی پر میڈیکل کے عملے کو اطلاع دی، اور پھر تیزی سے لاک کھول کر اندر آ گیا۔

یہ ان دونوں کے منصوبے کے عین مطابق ہوا تھا، مریل سا سنتری ہمایوں کے ایک ہی مکے سے منہ کے بل جا گرا۔

دونوں تیزی سے باہر نکلے اور مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے مین گیٹ کی طرف دوڑنے لگے۔

ابھی وہ سکیورٹی کے پہلے حصار سے بھی باہر نہیں نکل پائے تھے کہ جیل، الارم کی آواز سے گونج اٹھی۔

کچھ ہی دیر میں سکیورٹی نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

☆☆☆

''میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں، تم نے جس طرح مجھ ناچیز پر اعتماد کیا اس کے لیے میں تمہارا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔''

زرق نے انتہائی تشکرانہ انداز میں سامنے بیٹھی ہوئی گلناز سے مخاطب ہو کر کہا تو گلناز جو سہمی ہوئی ہرنی کی طرح ریسٹورنٹ میں چاروں طرف وحشت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

زرق کی بات سن کر اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

''میں صرف تمہاری محبت کے بھروسے پر زندگی میں پہلی بار کالج سے اس طرح نکلی ہوں، تم سمجھ سکتے ہو جو لڑکی کبھی اپنے پڑوسیوں کے گھر بھی نہ گئی ہو، اسے اس طرح کا رسک لینے میں کتنی مشکل ہوئی ہو گی۔ پچھلے تین سال سے ہم سوشل میڈیا کے ذریعے ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے تم ایک بھروسے مند انسان لگے ہو، امید ہے ہماری زندگی کا سفر خوشگوار رہے گا۔

گل ناز نے اپنے جذبات کی ترجمانی کی تو زرق عاجزی سے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے سامنے جھکتا چلا گیا۔

''تم نے مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے بے دام خرید لیا ہے، میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

ویسے تمہاری جھجک اپنی جگہ پر ٹھیک ہی ہے، آج کل قابل بھروسہ انسان کا ملنا محال ہوا ہے، انسانیت اور حیوانیت بظاہر ہم قافیہ الفاظ ہیں، مگر اصل میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حیوانوں کی پہچان ہی ان کی درندگی ہوتی ہے، ان پر نظر پڑتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان سے سوائے نقصان کے کچھ اور توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔

مگر انسانیت کے لبادے میں چھپے ہوئے درندوں کو آپ انڈر اسٹیمیٹ نہیں کر سکتے۔

یہ دنیا کا واحد درندہ ہے جو اپنے شکار پر حملہ کرنے کے لیے اس وقت تک انتظار کرتا ہے جب تک شکار خود اس پر عقیدت کی حد تک نہ ریجھ جائے۔

زرق بے تکان بولے جا رہا تھا، جبکہ گل ناز خوشی سے پاگل ہو رہی تھی کہ اس کا انتخاب کتنے حساس اور خوبصورت دل کا مالک ہے، وہ آج تک زرق کے ملنے کی ضد کو ٹالتی آئی تھی۔

مگر آج پہلی ملاقات میں ہی اس کے سارے وسوسے کافور ہو گئے تھے، وہ اگلے اتوار تنہائی میں ملنے کا وعدہ کر کے اٹھ آئی۔

زرق کے رگ و پے میں اگلی ملاقات کا سوچ کر ہی سنسنی دوڑ رہی تھی۔

میسنے بڑے چھپے رستم ہو تم تو، ہم تو تمہیں سادھو ہی سمجھتے رہے، لیکن تم نے تو ہم سب کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔'' طارق نے زرق کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو زرق جو اپنے خیالوں میں گم تھا، اسے دیکھ کر ایسے تڑپا جیسے اس کی کرسی میں کرنٹ آ گیا ہو۔

''آرام سے بیٹھو زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہاری پیچھے والی ٹیبل پر موجود تھا۔ اور تمہاری فلسفیانہ باتیں سن رہا تھا۔

ویسے تم نے ہاتھ بہت اونچا مارا ہے۔'' طارق نے ایک آنکھ کا کونہ دباتے ہوئے خباثت بھری مسکراہٹ سے کہا۔

''تم غلط سوچ رہے ہو، ہمارے درمیان بہت مقدس رشتہ ہے، اور گلناز ایک انتہائی باعزت گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔''

زرق نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''آج تک تم ہمارے ساتھ جتنی پارٹیاں انجوائے کر چکے ہو وہ سب لڑکیاں بھی عزت دار گھرانوں کا غرور تھیں۔ میں نے پلے گروپ کو میسج کر دیا ہے سب آتے ہی ہوں گے۔''

طارق نے طنزیہ انداز میں جواب دیا تو اس کے لہجے میں قرض کے ساتھ سود بھی واپس لینے کا عزم موجود تھا۔

''ی ی یہ کیا کر دیا تم نے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ وہ ابھی وہاں سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ریسٹورنٹ کے انٹرس سے داخل ہوتے ہوئے پلے گروپ کے مزید تین ممبروں کو دیکھ کر اسے خود کا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

اس پورے گروپ کا تعلق ایسی فیملیوں سے تھا، جنہیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی دولت کے انبار کہاں کہاں پر ہیں۔

ان سب کا پسندیدہ مشغلہ ہی یہی تھا، کہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنی محبت کے دام میں پھانس کر ان کی عزت سے کھیلتے اور پھر اپنے گھناؤنے فعل کی ویڈیو سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کرنے کی دھمکی دے کو محبت کی ڈسی ہوئی لڑکیوں کے منہ پر تالا لگا دیتے تھے۔

زرق خود بھی اس گروپ کا ممبر تھا، مگر گلناز کے معاملے میں وہ تھوڑا سریس ہو گیا تھا، اسے سمجھ نہیں آرہی تھی، کہ اپنے شیطان صفت دوستوں کو کیسے سمجھائے۔

''یار کمال کر دیا تم نے کیا مست چیز ڈھونڈی ہے۔'' اسلم نے اپنے سمارٹ فون پر گل ناز کی تصویر کو زوم کرتے ہوئے کہا۔

''زیادہ حیران مت ہو، کچھ دیر پہلے ہی طارق نے اس مہہ جبیں کی تصویر بنا کر ہم سب کو بھیجی ہے۔''

عاصم نے بے غیرتی سے ہنستے ہوئے اس کی حیرانگی دور کی، وہ اس گروپ کا سرغنہ بھی تھا۔

''یار تم لوگ سمجھ کیوں نہیں رہے ہو، گل ناز اس لائن کی لڑکی نہیں ہے۔''

زرق نے روہانسی آواز میں صفائی دی۔

''اوئے کا کا تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ ہمارے دام میں آئی کوئی بھی لڑکی اس لائن کی نہیں ہوتی، مگر دیکھ لو آج تک کوئی مسئلہ نہیں بنا، اب زیادہ ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

سرکاری سانڈ کی طرح پھیلے ہوئے عاصم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''مگر......''

''اگر مگر اپنے پاس ہی رکھو اور سیدھی طرح ہمیں اپنا حصہ وصول کرنے دو۔ نہیں تو تم اپنی فیملی سمیت کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔''

عاصم نے زرق کی بات سنے بنا ہی غراتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو اس کے سرد لہجے میں آخری حد تک جانے کا پیغام موجود تھا۔

زرق بری طرح ہونٹ کاٹ رہا تھا، اسے فرار کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی، اس کا ذہن ماؤف ہونے کی حد تک کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔

☆......☆

شہر کے مضافات میں، مین روڈ سے ہٹ کر بنے ہوئے فارم ہاؤس کی پرشکوہ عمارت اس کے باسیوں کے قسمت یاور ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھی جبکہ عمارت بھی اسی تکبر میں کسی الہڑ مٹیار کی طرح سینہ تانے کھڑی تھی۔

فارم ہاؤس کے اردگرد تاحد نگاہ پھیلی ہوئی خریف کی فصل پکنے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔

ان کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی سیاہ تارکول کی سڑک پر ایک کالے اور پیلے رنگ کی ٹیکسی سبک رفتاری سے چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ فارم ہاؤس کی طرف جانے والی ذیلی سڑک پر مڑ گئی، اور پھر گیٹ کے سامنے آ کر رک گئی۔

ٹیکسی کا دروازہ کھلا تو اندر سے گلناز برآمد ہوئی، عالیشان عمارت کی طرف دیکھ کر اس کے چہرے پر مرعوبیت کے آثار ابھر آئے، اگلے ہی لمحے اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کیا اور آگے بڑھ کر ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔

آج ایک بار پھر حوا کی بیٹی شکار کے لیے گھات میں بیٹھے درندوں کے غول میں آ پھنسی تھی۔

وہ بیچاری تو قسمت کو بھی دوش نہیں دے سکتی تھی، کیونکہ تین سال تک زرق کو پرکھنے کے بعد آج وہ خود اپنے پیروں پر چل کو بھیڑیوں کے بھٹ میں

داخل ہو رہی تھی۔

☆......☆

ظہیر کی آنکھ جیل میں موجود ہسپتال کے آئی سی یو میں کھلی تھی، اسے بیڈ کے ساتھ اس انداز سے کلمپ کیا گیا تھا، کہ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیا تو اسے قریب ہی دوسرے بیڈ پر ہمایوں نظر آ گیا، اس کی حالت بھی کافی پتلی نظر آ رہی تھی۔

بیڈ کے دوسری طرف ایک ڈاکٹر کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا، اخبار اس کے چہرے کے سامنے ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ظہیر کی نظریں غیر ارادی طور پر اخبار پر پڑیں تو سامنے موجود سرخی دیکھ کر اسکی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

شہر کے معروف بزنس مین کے اکلوتے بیٹے زرق نے ایم۔این۔اے اسفند خان کے بیٹے اور اپنے جگری دوست عاصم اور اپنی بہن کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا اور بعد ازاں خود کو بھی گولی مار کو خودکشی کر لی۔

''ڈاکٹر صاحب کیا آپ اس خبر کی تفصیل پڑھ کر سنا سکتے ہیں۔'' ظہیر نے کراہتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''پلیز ڈاکٹر صاحب آپ اسے میری آخری خواہش سمجھ لیں۔''

ظہیر نے ایک بار پھر انکساری سے التجا کی تو ڈاکٹر خبر پڑھ کر سنانے لگا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ پلے گروپ بیچنے والے عاصم نے اپنے ہی دوست زرق کی بہن کو اپنے جال میں پھانس لیا تھا، آگ جب اپنے گھر تک آ گئی تو اس سے برداشت نہ ہو سکا ، ڈاکٹر جیسے جیسے تفصیل پڑھتا جا رہا تھا ، وہ خود پر سکون کی بارش محسوس کر رہا تھا۔

وہ دونوں درندے بھی رزق خاک ہو چکے تھے، جنہوں نے اس کی معصوم بہن کو بھنبھوڑا تھا۔

اب وہ خود کو پھانسی گھاٹ تک جانے کے لیے فٹ محسوس کر رہا تھا۔

مگر اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک سوال ابھی تک کسی کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا، کہ کیا حوا کی معصوم بیٹیاں کبھی اتنی باشعور بھی ہو سکیں گی کہ انسانیت کے لبادے میں چھپے ان درندوں کو پہچان سکیں۔

☆☆☆

ڈیرہ غازی خان سے تیرہویں سچ بیانی

ہارے بھی تو بازی مات نہیں



ایم یعقوب احمرانی

محبت کی شطرنج میں، متاع کی بازی ہارنے والی دوشیزہ کی داستان

میرا نام کوثر ہے اور میں لاہور سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں امیر ترین گھر میں پیدا ہوئی۔ بہت ہی نازونخروں سے پلی بڑھی۔ وقت ناسور زخموں کو بھی بھر دیتا ہے مگر عزت آبرو پر لگے بدنامی کے داغ کبھی نہیں دھلتے۔ میں میٹرک کے ایگزامز دے کر رزلٹ کا ویٹ کررہی تھی۔ میرا ماموں زاد جو کراچی میں اسٹڈی کررہا تھا وہ آیا گھر میں جشن کا سماں تھا اس کا نام سمیر تھا۔ بہت ہی خوب صورت تھا۔ میرا ہم عمر تھا۔ پورے تین سال بعد آیا تھا۔ ہماری بھی چاچو ایک ہی بڑے گھر میں اکھٹے رہتے اور ماموں کراچی میں رہتے تھے۔ جب سمیر آیا تو میرے لیے بہت خوب صورت گفٹ لایا۔ کاش سمیر کے آنے سے پہلے میں مرجاتی۔ دور رہنے والے اکثر دنیا میں اپنے ہوتے ہیں کبھی کسی نے غیروں کا شکوہ نہیں کیا۔ اپنے ہی ہوتے ہیں جو کبھی ایک پل بھی اپنا نہیں سمجھتے۔ سمیر کی ہر ایک بات میرے دل میں گھر کرلیتی تین سال پہلے کچھ تھا مگر آج نیا سمیر بن کر آیا تھا جو دل کے کسی کونے میں بس چکا تھا۔ میں اکثر پیار سے چھیڑتی اور سمیر بھی لڑنے لگتا۔ جب سمیر کے ہاتھ میرے جسم سے لگتے تو ایسا لگتا جیسے کسی نے بھڑکتی آگ پر پانی پھینکا ہو اور لڑتے لڑتے باہم قریب آجاتے تو سانسوں کی جنگ ہوجاتی اور ایسا نشہ طاری ہوتا کہ میری آنکھیں بند ہوجاتیں اور سمیر چلا جاتا۔ میں نے دل کے ہر کونے میں سمیر کی تصویر سجا رکھی تھی مگر دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت نہ ہوتی گھر میں سبھی کیا سوچیں گے۔ میرے دل میں بے پناہ محبت تھی۔ دل کرتا سمیر سے محبت پیار کا سلسلہ قیامت تک کم نہ ہو اور نہ ہی کبھی ختم ہو۔ میری ہر روز سمیر سے بات ہوتی۔ جب وہ باہر سے آتا تو میں سنور سج کر دروازے پر کھڑی ہوجاتی۔ سب سے پہلے مجھے سمیر دیکھے تو میرا سنگھار پورا ہوگا۔ سمیر بھی دل ہی دل میں میرے لیے محبت رکھتا تھا مگر اتنی نہیں جتنا میں کرتی تھی۔ رات کو سبھی الگ الگ کمروں میں سو جاتے اور میں سمیر سے دل کی باتیں کہنا چاہتی تھی۔ اس لیے رات کو اٹھ کر امی ابو سے چوری سمیر کو میسج کرتی اور وہ گھوڑے بیچ کر سوجاتا اسے خبر نہ ہوتی پل پل کوئی اس کی محبت میں ساری رات کروٹیں بدلتا ہے مگر سمیر......!

میں کچھ دنوں سے سمیر کو بدلا بدلا محسوس کررہی



تھی۔ آخر ایک دن پوچھ ہی لیا۔

''سمیر تم اتنے سہمے کیوں رہتے ہو۔'' تو سمیر بولا۔

''میں کسی سے پیار کرنے لگا ہوں اور وہ ہر وقت میرے پاس رہتی ہے۔ اظہار کرنے سے ڈر لگتا ہے کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اس لیے......''

''وہ کون ہے؟ جسے تم چاہتے ہو پلیز مجھے بتاؤ۔'' میں لڑنے لگی تھی۔ اس وقت ہم کمرے میں علیحدہ تھے۔ باقی ہر کوئی اپنے کاموں میں بزی تھا۔ دل کی دھڑکن بہت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ نجانے اب سمیر کس کا مقدر تھا۔ ایک لفظ میں زندگی موت کا فیصلہ ہونا تھا۔ سمیر نے کہا۔

''کوثر میں آپ سے پیار کرنے لگا ہوں آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی ہو۔'' میں خوشی سے سمیر کی بانہوں کی اسیر ہو گئی۔ ایسی خوش نصیبی میری میں نے جسے چاہا اس نے بھی مجھے چاہا اگر پتا ہوتا یہ خوشی یہ پیار چند پل کا مہمان ہوتا ہے تو خدا کی قسم کبھی کسی کو چاہنے کی غلطی نہ کرتی اور نہ بدنام زندگی گزارنی پڑتی۔ جی تو چاہتا ہے خودکشی کر لوں مگر حرام موت کس کام کی۔ پھر ہم رات کو ڈھیر سارا پیار کرتے اور یوں پوری رات ایک ہی بیڈ پر گزر جاتی اور یوں ہماری محبت پروان چڑھتی رہی۔ ایک دن میں نے سمیر کی محبت میں مدہوش ہوئے سمیر کے سینے پر سر رکھا ہوا تھا اور سمیر میرے بالوں میں انگلیاں سرسرا رہا تھا۔ محبت کا جنون آج عروج پر تھا۔ معمول کے مطابق ہم ایک ساتھ تھے۔ اور وہ ہو گیا جو کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں عزت سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور سمیر نے کہا میں آج ہی ماما سے بات کرتا ہوں کہ ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں سمیر کی تسلی پر تھوڑی ریلیکس ہوئی۔ صبح اذان ہوتے ہی سمیر اپنے کمرے میں چلا گیا میں بھی اس وقت محبت کے نشے میں مدہوش تھی کہ سمجھ نہ سکی غلط ہے یا پھر صحیح۔ خیر دو دن بعد سب معمول سے چلتا رہا تیسرے دن سمیر نے کہا۔

''مجھے اب واپس کراچی جانا ہے۔''

''تو میں کیسے روک سکتی ہوں پر میرے بارے میں کیا سوچا ہے تمہاری امی نے۔''

''کوثر دیکھو گھر والوں کو انگیری کر رہا ہوں۔ ہو جائیں گے۔'' سمیر نے انجان بنتے ہوئے بولا۔

اب کیا ہوسکتا تھا میں تو ہارے جواری کی طرح محبت کی بازی میں ہار چکی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد سمیر چلا گیا کراچی اور میں سوچوں کے سمندر میں ڈوبنے لگی اب کیا ہوتا ہے۔ ہر دن مجھ پر قیامت سے کم نہ تھا۔ میری ایک سہیلی تھی جسے ہر بات کا علم تھا۔ وہ مجھے ہر بار سمجھاتی مگر اس وقت میرے پلے کچھ نہ پڑتا تھا مگر اب سمجھ آ گئی تھی۔ میری سہیلی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ میں ہر روز کال کرتی سمیر کو تھوڑی دیر بات کرتا پھر جب میں پوچھنے لگتی تو کہتا میری جان تم فکر نہ کرو سب اچھا ہوگا۔ میں نے ارادہ کرلیا اب میں خود سمیر کے پاس جا کر ہی پوچھوں گی۔ میں نے بھی کراچی جانے کا بہانہ بنالیا کہ ماموں لوگوں سے ملنے جانا ہے اور میں چلی آئی میری آمد کا سمیر سن کر پریشان ہوگیا۔ جب مجھے ایئر پورٹ پر لینے کے لیے آیا تو کہا۔

''کوثر! تمہیں ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔ سب کیا محسوس کریں گے۔''

''تم پریشان نہ ہو سب خوش ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''پہلے تم یہ بتاؤ اب کہاں تک انگیری ہوئے ماموں اور ممانی جان۔''

''یار ان کو راضی کر رہا ہوں اور میں کچھ دن اور ہیں وہ مان جائیں گے۔'' اتنے میں ہم سمیر کے گھر آ گئے۔ سب مجھے دیکھ کر خوش ہوئے مگر ممانی جان تھوڑی عجیب سی لگیں۔ میں پورے سات سال بعد آئی تھی۔

''اب بہت بڑی ہوگئی ہو۔'' ممانی نے کہا میں چونک گئی سوال ایسے لہجے میں کہا تھا جیسے کوئی اپنے دشمن کو سامنے سے وار کرتا ہے۔ خیر اندازہ ہوگیا کہ ممانی کو سب پتا ہے ہماری پریم کتھا کا۔ ماموں جو بے خبر تھے وہ تو خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا کہ ایک دن ماموں نے کہا۔

''کوثر بیٹا جلدی سے ریڈی ہو جاؤ شاپنگ کے لیے چلتے ہیں۔''

''ماموں جان کس لیے؟''

''واپسی پر بتاؤں گا اب چلو نا۔''

شاپنگ کرلی واپسی پر آرہے تھے کہ میں نے پوچھا۔

''ماموں اب تو بتائیں کس خوشی میں شاپنگ کرائی۔''

''بیٹا کل تمہاری ممانی نے بڑی پارٹی ارینج کی ہے اور مزے کی بات ہے اس پارٹی میں تمہاری ممانی کی بھانجی سے بیٹے سمیر کی منگنی کی رسم ہے۔''

ماموں کی یہ بات سنسنی خیز دھماکے کی طرح میرے دل و دماغ پر لگی جس سے میرا وجود سن ہوگیا۔ اس وقت ہم گاڑی میں تھے۔ مجھ پر سکتا طاری ہوگیا۔ یہ سب اتنی جلدی کیسے وہ بھی کسی اور کے ساتھ میرے دل و جسم سے کھیل کر اب منگنی کسی اور کے ساتھ یہ نہیں ہوسکتا۔ میں کچھ بھی نہ بول سکی اور شام کو میرج ہال میں پارٹی ارینج تھی۔ عصر کے وقت سمیر ملا اس کی گریبان پکڑ کر پوچھا۔

''بولو سمیر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ یہ کیا ڈرامہ ہے۔''

''جیسا کہ تم نے سنا ہے ویسا ہی ہے۔ میری امی تمہیں پسند نہیں کرتی ہیں۔''

''اور تم سمیر بولو۔''

''کوثر میں نے تم کو ضرورت کے لیے کچھ دن پسند کیا تھا۔ میری اصل پسند تو میری بچپن کی پسند خالہ کی بیٹی حنا ہے۔ زندگی انجوائے کرنے کا نام ہے۔ کوثر پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا او کے مجھے بہت کام کرنے ہیں تم فریش ہو کر ہال آنے کی تیاری کرو۔'' وہ مجھے اگنور کر کے چلا گیا جیسے ہمارے درمیان کبھی کچھ نہ ہوا ہو۔ میں اسی وقت جناح انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر آئی ٹکٹ بک کروائی لاہور کے لیے اور ادھر میری سبھی فیملی روانہ ہو چکی تھی کراچی کے لیے۔ ادھر منگنی کی تیاریاں تو ادھر میں بے ہوش ہوگئی۔ دل گہرے صدمے کا شکار تھا۔ جسم تو پہلے ہی سے ناساز تھا۔ مجھے ایئر پورٹ کے عملے نے ہسپتال داخل کرایا اور رات کے کسی پہر میرے گھر والے بھی

آ گئے۔ سب ہی پریشان تھے۔ ہر فرد حقیقت سے بے خبر تھا اور میں شرمندگی بے بسی سے کسی سے آنکھ نہ ملا سکتی تھی۔ کس منہ سے اپنی ٹوٹی عزت کا رونا روتی خاموشی زبان پر چھائی رہی اشکوں کی ندیاں پھوٹ پڑیں۔ میں نے کسی کو اپنا دکھڑا نہیں سنایا۔ اکثر روتی رہتی یا پھر نیند کی میڈیسن کھا کر سو جاتی۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا سب ختم ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا ابھی موت آئے اور میں مر جاؤں۔ مجھ پر ماہ گزرنے لگے تو میں نے سہیلی کی مدد سے لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کیا اور ابارشن کرا لیا۔

کسی کو بھی پتا نہ چلا ہر کسی کو پتا تھا کہ پہلے سے بیمار ہے۔ میری زندگی ایک پل میں آگ کا ڈھیر بن گئی۔ صرف دھواں ہی دھواں تھا۔ دامن ویران ماتم کدہ زندگی جس کا مجھے کوئی شوق نہ تھا۔ اب مجھے جینا اچھا نہ لگتا دل حسرت خواب سب مسمار ہو چکے تھے۔ ادھر سمیر کی منگنی اور شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ خدا بھی بدلہ اسی دنیا میں دیتا ہے۔ کسی کا ادھار نہیں رکھتا۔ چند ماہ ہی گزرے تھے کہ میرے بھائی سے کوئی لڑکی روز رات کو فون کرتی اور ساری رات باتیں کرتے۔ ایک دن میں نے بھائی کو قسم دی کہ بتاؤ نا کون ہے۔ اس نے کہا بتا دوں گا۔ اور وہ دن بھی آ گیا ایک خبر میرے دل کے زخموں کا مرہم بنی سمیر کی منگنی اور شادی کی تاریخ ٹوٹ گئی۔ حنا کسی اور کو سمیر سے زیادہ چاہنے لگی تھی۔

چند دنوں کے بعد میرے بھائی نے بتایا کہ میں اور حنا ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں اور منگنی شادی اس لیے ٹوٹ گئی۔ حنا نے خود گھر والوں کو منگنی شادی توڑنے پر مجبور کیا اور دھمکی دی کہ اگر یہ نہ کیا گیا تو میں بھاگ کر کوٹ میرج کر لوں گی۔ حنا ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ حنا کی ماں نے اپنی بہن کے بیٹے سمیر سے زبردستی منگنی کروائی اور کچھ دنوں بعد میرے بھائی کی حنا کے ساتھ شادی ہو گئی اور سمیر کا دل بھی ٹوٹ گیا اور جینے کی آس بھی ختم ہو گئی۔ میرے ساتھ تو دھوکا کیا تھا میرے دل سے میرے جسم سے اور میری زندگی سے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سمیر نے ایک رات کال کی اور بری طرح رو رہا تھا اور کہا۔

غزل

بند کھڑکی کو کھولتی ہے ہوا
داغ دل کے ٹٹولتی ہے ہوا
شام ہوتے ہی میرے آنگن میں
تیرے لہجے میں بولتی ہے ہوا
خشک پتے مرے شکستہ خواب
جن کو قدموں سے رولتی ہے ہوا
کچھ کہی ان کہی کہانی سی
ہر دریچے سے بولتی ہے ہوا
چھیڑتی ہے محبتوں کے گیت
موتی آنکھوں میں رولتی ہے ہوا
بھیگے موسم میں کوئی آیا جمالؔ
زلف شانوں پہ کھولتی ہے ہوا

شاعر: سمیع جمال، حیدر آباد

"کوثر مجھے معاف کر دو میں نے انجانے میں تم سے بہت برا سلوک کیا اور میرے کیے کی سزا کئی گنا زیادہ ملی ہے کاش حنا سے تمہارے لیے رشتہ ختم کر دیتا تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا آج ہو رہا ہے۔"

میں تو عادی ہو چکی تھی درد سہنے کی مگر پتا اسی کو چلتا ہے جس کے دل پر گزرتی ہے۔ مجھے سمیر کی کہی بات یاد آ گئی۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے سمیر سے کہا کہ سمیر ٹیک اِٹ ایزی۔ اب تم بھی انجوائے کرو اپنی زندگی۔" اور کال کاٹ دی۔

......☆☆☆......

ظلم کا بدلہ

ثانیہ عزیز

فیوڈل سسٹم کا شاخسانہ، اِک عبرت اثر تحریر

''میں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اور جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے ماں، باپ کو اکثر لڑتے جھگڑتے ہی دیکھا تھا اور ہر جھگڑے کا سبب غربت ہی تھی کیونکہ ہمارے گھر میں ایک وقت چولہا جلتا تھا تو دو وقت فاقے ہوتے تھے۔ میرے والد مستقل طور پر چارپائی سے لگے پڑے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس کی وجہ سے امی اور ابا کے درمیان کھٹ پٹ جاری رہتی تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی قسمت کو کوستے رہتے تھے اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو بھی (نعوذ باللہ) گالیاں دیتے تھے اور شکوے کرتے رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ غربت بھی ہمیں دی ہے اور دکھ درد بھی ہمارے نصیب میں ہیں۔

ابتدائی عمر میں ہی میں ایک ایسے شخص کے ہتھے چڑھ گیا جو کہ ایک سرکس میں کام کرتا تھا۔ وہ بڑا مہربان شخص تھا اور اس نے مجھے ہر قسم کے جسمانی کراتب میں ماہر بنا دیا تھا۔ سات آٹھ سال میں اس کے ساتھ رہا تھا اور اس عرصے میں ہم نے نگر نگر کی سیر کی تھی۔ کبھی ایک شہر میں تو کبھی دوسرے شہر میں کبھی اس گاؤں تو کبھی اس قصبے۔

پندرہ سال کی عمر میں ایک نقب زن کے ہاتھ لگ گیا۔ بلکہ کچھ غلطیوں کی وجہ سے میں اپنے سرکس والے ساتھی سے بچھڑ گیا تھا اور یوں نقب زن کے ساتھ رہنے لگا۔

میں شروع ہی سے بڑا چالاک اور تیز طرار تھا اور ہر بات بڑی جلدی سیکھ جاتا تھا۔ اس لیے نقب زنی اور چوری کے کاموں میں بھی بڑی جلدی ماہر بن گیا اور اس کے ساتھ ساتھ جیب کاٹنے کا فن بھی سیکھ گیا۔ اب میں ایک کامیاب چور اور نقب زن تھا۔ بڑی آسانی سے دیواروں اور مکانوں کی چھتوں پر چڑھ جاتا تھا اور روشن دانوں کے ذریعے بند کمروں میں کود جاتا تھا۔

ایک دفعہ جب میرے ساتھ تین مزید چور تھے۔ ہم نے ایک مکان میں نقب لگائی تو مالک کو پتا چل گیا۔ اس نے شور مچا دیا۔ میں اور ایک دوسرا ساتھی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ہمارے دیگر دو ساتھیوں کو لوگوں نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں نے ہمارے نام پتے بھی پولیس کو بتا دیئے اور یوں ہم بھی پکڑے گئے۔ سزا پوری کر کے جب میں باہر آیا تو میں نے اپنے آپ سے پکا وعدہ کر لیا کہ آئندہ اکیلا ہی کام کروں گا اور کسی دوسرے کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ اپنی جرائم کی زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ میں پکڑا گیا تھا۔

میرے استاد نے مجھے ایک بات شروع ہی سے بتا دی تھی۔ انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بیٹا! چوری بے شک جہاں جی چاہے کرتے رہو لیکن کسی انسان کا قتل بھول کر بھی نہ کرنا، کیونکہ چھوٹے موٹے جرائم کی تفتیش اتنی تندہی سے پولیس نہیں کرتی لیکن قتل کرنے والا اول تو پولیس سے نہیں بچتا اور اگر بچ بھی جائے تو اس کی ساری زندگی ذلیل وخوار ہوتے گزرتی ہے۔''



میری شادی بھی میرے استاد نے ہی کرائی تھی۔ میری بیوی ایک نیک اور سلیقہ شعار عورت تھی۔ اسے جب پتا چلا کہ میں چوری چکاری کا کام کرتا ہوں تو اس نے کسی کو بتانے کی بجائے مجھے محبت سے اس راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ پہلے تو میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مجھے صفیہ کی صورت میں اپنی رحمت سے نوازا تو مجھے خود ہی اپنے پیشے سے نفرت سی ہوگئی۔ میں جب بھی صفیہ کو دیکھتا اور اپنے کام کو یاد کرتا تو مجھے خود سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی اور میرے ذہن میں مختلف سوالات اور خدشات پیدا ہونے لگتے کہ کل کو جب صفیہ کو اس بات کا پتا چلے گا کہ اس کا باپ ایک چور ہے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ اس خیال نے میرے دل و دماغ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے ہر برے کام سے توبہ کرلی اور محنت مزدوری کرنے لگا اور ایک دوسرے گاؤں میں مکان لے کر وہیں رہنے لگے۔

صفیہ کو ہم نے مناسب سی تعلیم بھی دلوائی تھی اور جب وہ جوان ہوئی تو ایک اچھی سی جگہ دیکھ کر اس کی شادی بھی کردی۔ میرا داماد ایک ڈاکٹر تھا اور اس کا نام شرافت علی تھا۔ وہ قریبی گاؤں نور پور کا رہنے والا تھا اور اس کے ماں باپ مرچکے تھے۔ وہ اپنے ایک رشتے کے چچا کے پاس رہتا تھا لیکن شادی کے بعد اس نے اپنا الگ مکان بنوا لیا۔ جس گاؤں میں شرافت رہتا تھا وہاں کا چوہدری ایک ظالم اور سفاک آدمی تھا۔ اس کا نام چوہدری سراج دین تھا اور اکثر بلکہ ہر چوہدری اور زمیندار کی طرح اس کے بھی بہت سے پالتو کارندے تھے جو کہ اس کے حکم اور اشاروں پر گاؤں کے غریب لوگوں کو تنگ کیا کرتے تھے۔

چوہدری سراج دین بظاہر ایک شریف اور ہمدرد شخص تھا لیکن اصل میں وہ ایک سفاک اور کمینہ آدمی تھا۔ اس کے کارندوں میں ایک جبرو نامی شخص بھی تھا۔ جبرو، چوہدری کے سبھی کارندوں کا لیڈر اور چوہدری کا پسندیدہ غنڈہ تھا۔ بعض اوقات جب کوئی کام چوہدری کی مرضی کے خلاف ہوتا تو وہ جبرو کو اشارہ کرتا اور جبرو اس کام کو چوہدری کی مرضی کے مطابق کردیتا تھا۔ یوں چوہدری سانپ بھی مار لیتا اور لاٹھی بھی بچا لیتا۔ یعنی اس معاملے میں چوہدری کا نام تک نہ آتا تھا۔ بعض اوقات جب کوئی شخص چوہدری کے سامنے جبرو کی شکایت کرتا تو چوہدری لوگوں کو دکھانے کے لیے جبرو کی مار پیٹ بھی کرتا تھا۔

ایک دفعہ جب لوکل باڈیز کے انتخابات کا اعلان ہوا اور امیدواروں نے انتخابی مہم شروع کر دی اس قصبے میں کل تین امیدوار تھے۔ پہلا جبرو تھا اور وہ چوہدری کے حکم سے الیکشن لڑ رہا تھا۔ دوسرا شخص ایک زمیندار تھا اور وہ ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ چوہدری سراج نے زر اور زمین سے اس کو بھی خرید لیا اور وہ جبار حسین عرف جبرو کے مقابلے سے دست بردار ہو گیا۔ تیسرا امیدوار میرا داماد شرافت علی تھا۔ وہ اپنے قصبے کا ایک مقبول اور ہر دلعزیز شخص تھا اور جبار عرف جبرو کے مقابلے میں اس کی جیت یقینی تھی۔ اسی وجہ سے چوہدری سراج دین نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ یعنی شرافت، چوہدری کی بات سنے۔ جب شرافت چوہدری کی بات سننے اس کی حویلی پہنچا تو چوہدری نے صاف اور واضح لفظوں میں اسے حکم دیا کہ وہ جبار جبرو کے سامنے مقابلے سے دست بردار ہو جائے۔ شرافت نے چوہدری سراج دین کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو چوہدری نے اسے بھی زر دولت کے لالچ دیے اور کہا کہ وہ اس مقابلے سے دست بردار ہو جائے لیکن جب شرافت کسی طرح بھی مقابلے سے دست بردار ہونے کو تیار نہ ہوا تو چوہدری اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا۔

انتخابات سے چند روز قبل ایک شام جب شرافت اپنے کلینک سے تھوڑی دیر پہلے گھر پہنچا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی کھانا کھا رہے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور اچھا خاصا اندھیرا چھا چکا تھا۔ شرافت کھانا چھوڑ کر دروازہ کھولنے گیا اور جب اس نے دروازہ کھولا تو پانچ چھے آدمی جنھوں نے سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور چہرہ چھپائے ہوئے تھے، فوراً اندر داخل ہو گئے۔ شرافت کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ ڈاکو تھے اور انہیں لوٹنے کے لیے آئے تھے۔ اس لیے اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو بھائی! ہمارے پاس تو کوئی اتنی دولت جائیداد نہیں ہے جسے لوٹنے کے لیے آئے ہیں۔ بہرکیف جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ آپ لے جا سکتے ہیں۔“

ڈاکوؤں نے اس کی بات ان سنی کر دی اور اسے دھکیلتے ہوئے ایک کمرے کے اندر لے گئے۔ ایک ڈاکو اسلحے کی نوک پر صفیہ کو بھی اس کمرے میں لے آیا جس میں شرافت موجود تھا۔ پھر ڈاکوؤں نے شرافت کو ناچنے کا حکم دیا۔ شرافت یہ حکم سن کر کانپ گیا اور اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ وہ ڈاکوؤں کے روپ میں اس کے ذاتی دشمن تھے اور اس خیال کے آتے ہی اسے چوہدری سراج دین کی دی ہوئی دھمکیاں یاد آ گئیں۔ اس نے ڈاکوؤں کی منت سماجت کی کہ وہ سب کچھ لے لیں کہ ایسی تذلیل نہ کریں لیکن ڈاکوؤں کو غصہ آ گیا اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر شرافت کی قمیص کو جھٹکا دے کر پھاڑ دیا اور پھر ناچنے کا حکم دیا۔

”بصورت دیگر تمہاری بیوی کو ناچنا پڑے گا اگر تم نہ ناچے تو۔“

یہ سن کر شرافت کو شدید غصہ آ گیا لیکن وہ مجبور تھا۔ اس نے اپنی بیوی صفیہ کی طرف دیکھا جو کہ ڈاکوؤں کے درمیان کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ مجبور ہو کر اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ پھر اچانک ڈاکوؤں میں سے ایک بے غیرتی سے بولا۔

”ایسے کچھ لطف نہیں آ رہا ڈانس کا۔“ شرافت ان کی بے غیرتی سمجھ گیا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مر جائے گا مگر یہ بے حیائی نہیں ہونے دے گا۔ چنانچہ وہ ڈاکوؤں سے بھڑ گیا لیکن وہ ایک تھا اور ڈاکو چھ کی تعداد میں تھے۔ ڈاکوؤں نے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ صفیہ اپنے مجازی خدا کو اس حالت میں نہ دیکھ سکی اور اس کی جانب دوڑی۔ اس وقت وہ پانچ ماہ کی حاملہ تھی۔ ڈاکوؤں میں سے ایک کی زبردست لات اس کے پیٹ میں لگی اور وہ وہیں درد سے دہری ہوتی گئی۔ پھر ڈاکوؤں نے گھر میں موجود تمام نقدی اور زیورات اٹھائے اور چلے گئے۔ شرافت کو جب ہوش آیا تو اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور بیوی کی جانب دوڑا لیکن وہ مر گئی تھی۔ بیوی کے کفن دفن سے فارغ ہو کر شرافت نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور ہمارے پاس آ گیا۔ میں نے اس سے بہت پوچھا کہ صفیہ کی اچانک موت اور وہ علاقہ چھوڑنے کی کیا وجوہات تھیں؟“ لیکن اس نے مجھے کوئی بات نہ بتائی۔ آخر اس کی خودکشی کے بعد ایک ڈائری سے مجھے ان تمام واقعات کا علم ہوا تو میرے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چوہدری اور جبرو کو تڑپا تڑپا کر ماروں لیکن مجھے کوئی رستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر میں پاگل ہو گیا تھا اور پھر میں نے اپنی توبہ توڑنے کا ارادہ کر لیا تھا کیونکہ اسی طرح میں جبرو اور چوہدری کو سزا دے سکتا تھا۔

میں نے کوشش کر کے چوہدری کی حویلی میں نوکری حاصل کر لی اور پھر جب مجھے زیورات اور نقدی وغیرہ کا پتا چل گیا تو ایک رات میں نے چوہدری کی حویلی سے تمام زیورات اور نقدی چوری کر لی۔ اس وقت میں جبرو کی ایک استعمال شدہ اور چوری کیے ہوئے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ چوہدری کی تمام رقم اور زیورات میں نے جا کر جبرو کے گھر کے اسٹور میں رکھ دیے۔ جب فجر کی اذانیں سنائی دینے لگیں تو میں جبرو کے گھر

سے نکل کر کھڑا ہو گیا اور گلی میں دو آدمیوں کو آتے دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں آدمی میرے پیچھے دوڑے لیکن میں انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا۔

یوں چوہدری سراج دین اور جبرو کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔ کیونکہ پولیس نے تفتیش کر کے جبرو کے اسٹور روم سے تمام زیورات اور نقدی برآمد کر لی تھی۔ چوہدری نے جب اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چوری شدہ زیورات اور نقدی جبرو کے پاس سے برآمد ہوئی ہے تو اس کو جبرو پر شدید غصہ آیا تھا اور اس نے اپنی چھڑی سے جبرو کی پٹائی بھی کی تھی۔ جبرو نے بہت قسمیں کھائیں لیکن چوہدری کو یقین نہ آیا۔

دوسرے دن چوہدری نے جبرو کی بہن کو اٹھوا لیا۔ اس وقت جبرو حوالات میں بند تھا۔ اس نے بھی یہ خبر سن لی تھی۔ دوسرے دن وہ پولیس کو رشوت دے کر حوالات سے بھاگ گیا۔ چوہدری کی حویلی اس کی دیکھی بھالی تھی۔ اس وقت اس کے ساتھ تین مزید ساتھی بھی تھے۔ جبرو سیدھا چوہدری کی بیٹیوں کے کمرے کی طرف گیا اور اس کی چھوٹی بیٹی کو اٹھا لیا۔ لڑکی کی چیخوں سے تمام حویلی والے جاگ اٹھے اور انہوں نے دیکھا کہ جبرو چوہدری کی بیٹی کو اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ چوہدری بھی فوراً آ گیا اور جبرو سے کہا کہ ”وہ اس کی بیٹی کو چھوڑ دے۔“

جبرو نے کہا۔ ”جب میری بہن میرے پاس پہنچ گئی تب تمہاری بیٹی تمہارے پاس آ جائے گی۔“

چوہدری نے کہا۔ ”ٹھہرو! تمہاری بہن صحیح سلامت موجود ہے۔ اسے لے جاؤ۔“ جب جبرو نے اپنی بہن کو دیکھا اور اپنا اطمینان کر لیا تو چوہدری کو دھمکی دی اور کہا۔ ”اگر میرے گھر والوں کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تیری بیٹیوں کو اٹھا لے جاؤں گا۔“

☆......☆

جبرو تھوڑے ہی عرصے میں بڑا مشہور ڈاکو بن گیا اور پورے ضلع کی پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ اس نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور ڈاکے ڈالے۔ آخر ایک دفعہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ چوہدری سراج دین کو پتا چلا تو وہ دوڑا دوڑا تھانے پہنچا اور رشوت دے کر پولیس کو اپنا منصوبہ بتایا۔ اس وقت جبرو کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر حکومت کی طرف سے پانچ لاکھ روپے کا انعام مقرر تھا۔ چنانچہ پولیس نے چوہدری سراج دین سے بھاری رشوت لے لی اور منصوبے کے مطابق اسے یعنی جبرو کو جنگل میں لے جایا گیا۔ اس وقت چوہدری سراج دین بھی پولیس کے ساتھ تھا۔ جنگل میں لے جا کر جبرو کے پیروں میں بیڑی ڈال دی گئی اور اسے بھاگنے کا حکم دیا گیا۔ جبرو بھلا اس وقت کہاں بھاگ سکتا تھا۔ اس پر پہلی گولی چوہدری سراج دین نے چلائی تھی۔ پھر تو پولیس بھی شروع ہو گئی۔ پوری چھ گولیاں کھا کر وہ زمین پر گرا تھا۔ پولیس نے اس کی بیڑی کھول دی اور گھسیٹتے ہوئے تھانے لے آئے۔ پولیس مقابلے میں شریک پولیس والوں کو ترقی دی گئی اور انعامی رقم کے علاوہ تعریفی اسناد سے بھی نوازا گیا۔

جبرو کی ہلاکت کے بعد چوہدری نے اس کی دونوں بہنوں کو اٹھوا لیا اور اپنے ڈیرے پر لے آیا۔ وہ غریب بلاوجہ بے عزت ہوئے۔ جبرو کے ماں باپ نے پولیس کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہی لیکن بھلا کبھی ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ پھر پولیس بھی تو چوہدری کی نمک خوار تھی۔ وہ بھلا کیسے چوہدری کے خلاف ایف آئی آر درج کرتی۔ جبرو کے ماں باپ نے لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر وہ علاقہ چھوڑ دیا۔

☆......☆

چوہدری کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔ پورا گاؤں دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ بارات میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامل تھے۔ سب سے آگے والی کار میں چوہدری اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر دولہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر چوہدری سراج دین اور اس کے دو رشتے دار تھے۔ مین روڈ پر ایک ٹریلر اور بس کو اوورٹیک کرتے ہوئے کار ایک ٹرک سے ٹکرائی اور قلابازیاں کھاتی ہوئی نیچے کھڈ میں جا گری۔ بس کے مسافروں کا کہنا تھا کہ ٹرک اور کار کے درمیان ابھی کم از کم دس پندرہ گز کا فاصلہ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کار کو کسی نے اٹھا کر کھڈ میں پھینک دیا تھا۔ ٹرک کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

بارات میں شامل لوگ دوڑ دوڑ کر چوہدری کی کار کے پاس پہنچے لیکن کار میں آگ لگ چکی تھی اور اس کی شدت ہوا کی وجہ سے بڑی تیز تھی۔ لوگوں نے بہت کوشش کی لیکن جلتی ہوئی کار میں سے کسی کو نہ نکال سکے۔ چوہدری اور اس کا بیٹا، ڈرائیور اور دونوں ساتھیوں سمیت جل کر خاک ہو گئے۔ علاقے کے لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک ظالم اور فرعون صفت چوہدری سے جان چھوٹی لیکن سب سے زیادہ خوشی شاید مجھے ہوئی تھی میری بیٹی اور داماد پر ظلم و ستم کرنے والے اتنی بھیانک موت مرے۔ شاید یہ غریبوں کی بددعاؤں کا اثر تھا۔

☆☆☆......

میاں چنوں سے پندرہویں سچ بیانی

تمہارے ہاتھ میں رہتے تو...

ایم حنیف عاصم بلوچ

محبت کی ایک ایسی دربدر داستان، جس کے کردار آج بھی زندہ ہیں

میری اس سانولی سلونی حسینہ سے پہلی ملاقات اپنی منہ بولی بہن آسیہ کی تیمارداری کے دوران ہوئی تھی۔ آسیہ شہر سے دور کے ایک گاؤں سے بازار میں شاپنگ کے لیے آئی تھی۔ ماں اسے خصوصی طور پر من مرضی کی شاپنگ کے لیے ساتھ لائی تھی مگر بدقسمتی سے شہر کا ایک مصروف روڈ کراس کرتے ہوئے وہ ایک تیز رفتار گاڑی کی زد میں آگئی تھی اور گاڑی زن سے اس کے وجود کو ٹکر مارتی ہوئی نو دو گیارہ ہوگئی تھی۔ ماں تو چند قدم آگے ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھی لیکن آسیہ خود کو نہ بچا سکی تھی اور اسے نچلے دھڑ پر شدید چوٹیں لگی تھیں اور دائیں بازو پر بھی گہرے زخم آئے تھے۔ چند ایک ہمدرد لوگوں نے ماں بیٹی کو سرکاری اسپتال پہنچا دیا تھا۔ لیکن زخموں سے زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے آسیہ کی زندگی خطرے میں پڑ چکی تھی اور بقول ڈاکٹرز کے اسے اس خطرے سے بچانے کے لیے فوری دو عدد خون کی بوتلیں چاہیے تھیں تاکہ اسے بروقت طبی امداد دے کر بچایا جاسکے۔ آسیہ تو ایمرجنسی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی تھی لیکن ماں بے چاری رو رو کر اسپتال میں موجود لوگوں اور آنے جانے والوں سے بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے خون دینے کی فریاد کی تھی۔

میں اپنے ایک دوست خالد کو ملنے اسپتال پہنچا تھا جو بطور ڈسپنسر یہاں پر تعینات تھا اور اس کی ڈیوٹی ایمرجنسی وارڈ میں تھی۔ آسیہ کو اسپتال لانے کے دوران ہی میں بھی وہاں پہنچا تھا۔ ماں بے چاری دو چار لوگوں سے مایوس ہو کر میری طرف بڑھی تھی اور میری منت کرتے ہوئے زاروقطار رونے لگی تھی۔ بیٹی کی یہ حالت اور ماں کو اس طرح روتے ہوئے دیکھ کر میرا انسانی جذبہ بھڑک اٹھا تھا اور میں نے یہ یک وقت دو بوتلیں خون کی عطیہ کردی تھیں اور اللہ نے میری یہ معمولی سی نیکی قبول کرتے ہوئے آسیہ کو موت کے منہ سے بچالیا تھا۔

میں دوسرے دن جب آسیہ کا پتا کرنے پہنچا تھا تو وہ کسی حد تک ہوش میں آچکی تھی اور پھر میرا یہ معمولی سا احسان اس ماں بیٹی اوران کے خاندان نے اس قدر سر پر لیا تھا کہ مجھ پر جی جان سے اپنے خلوص و دعاؤں کے پھول نچھاور کردیے تھے۔ وہ لوگ اتنے ملنسار اور پُرخلوص تھے کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ پھر دونوں طرف سے اس خلوص کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ ماں نے مجھے بیٹا اور آسیہ نے سگے بھائی جیسا درجہ دے دیا۔ وہ دیہاتی لوگ اتنے مخلص سادہ اور احسان ماننے والے نکلے تھے کہ مجھے ان سے مل کر دلی خوشی محسوس ہونے لگی تھی اور آسیہ سے ملنے والے بہن



جیسے پاک رشتے میں میری اپنی بھی ایک کمزوری تھی کہ میری اپنی کوئی سگی بہن نہیں تھی اور میرے بچپن کی یہ حسرت آسیہ کے روپ میں برآئی تھی۔

آسیہ کی تیمارداری کے لیے گاؤں سے آنے والے لوگوں میں فوزیہ بھی شامل تھی جو اس کی جان سے زیادہ عزیز سہیلی اور قریبی پڑوسن بھی تھی۔ پہلے دن جب فوزیہ نے آسیہ کو زخمی حالت میں بیڈ پر پڑا دیکھا تھا تو اس وقت تک اس کے آنسو بالکل بھی نہیں تھمے تھے جب تک کہ ڈاکٹرز نے آسیہ کو موت کے خطرے سے باہر ہونے کی خوش خبری نہیں سنائی تھی۔ تب کہیں جا کر اسے کچھ تسلی ہوئی تھی ورنہ اس کی حالت سے یہ لگتا تھا کہ خدانخواستہ آسیہ کو کچھ ہونے سے پہلے ہی فوزیہ مر جائے گی۔ بھرے بھرے جسم، نکلتے قد اور پرکشش چہرے والی اس لڑکی میں صنف مخالف کے لیے بڑی کشش تھی۔ اس کی جھیل

جیسی آنکھوں میں ایک ایسی مقناطیسی طاقت تھی کہ اسے دیکھنے والا شخص خود بخود اس سے متاثر ہو جاتا تھا۔ کم پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بھی رکھ رکھاؤ میں ایک خاص طریقہ سلیقہ تھا۔ باتوں اور لب و لہجے میں اتنی مٹھاس..... اوقات بھی بدلتے رہتے تھے لیکن وہ مسلسل کئی دنوں سے ڈٹی ہوئی تھی۔ جیسے کہ وہ سہیلی کے عشق میں سونا اور آرام کرنا بالکل ہی بھول گئی ہو۔

ماں جی نے بارہا اصرار کیا تھا کہ وہ کم سے کم ایک دو دن کے لیے ہی گھر کا چکر لگا آئے یا آرام کر لے لیکن وہ ماننے میں ہی نہیں آرہی تھی اور ماں جی اور دیگر اصرار کرنے والوں کو اتنے خلوص سے ٹالتی تھی کہ وہ لوگ خود ہی خاموش ہو جاتے تھے۔ سہیلی کی طرف سے اطمینان ہوا تو اس کا فطری بانکپن اور لبوں پر رہنے والی رسیلی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی اور آسیہ بھی اسے مسلسل اپنے پاس پا کر بہت خوش نظر آتی تھی۔ پانچ سات دن تو وہ مجھ سے شرمائی شرمائی سی رہی تھی۔ ہولے ہولے واقفیت بڑھی، اعتماد ہوا تو کھل مل سی گئی۔ مسکراتی یا ہنستی تو گالوں میں ڈمپل پڑ جاتے جو اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتے تھے۔ باادب تھی اور بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ باتوں کے دوران جب کبھی میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھتی تو سحر زدہ کر دیتی اور میں رعب حسن کے نیچے دب سا جاتا۔ ساتھ والا کوئی تیماردار تھک جاتا یا سو جاتا تو ہم دونوں مختلف موضوعات پر کھل کر باتیں کرتے رہتے۔ خالہ کی وجہ سے ہمیں یہاں خصوصی سہولیات میسر تھیں۔ اب جب کبھی آسیہ سو رہی ہوتی تو کبھی کبھی ہم اسپتال کے لان میں تھوڑی بہت چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔

وہ آہستہ آہستہ میرے دل پر قابض ہونے لگی تھی اور میں سخت کوشش کے باوجود بھی اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ محبت کیا ہوتی ہے شاید پہلی بار اس کا تجربہ ہونے لگا تھا۔ ایک خوف بھی تھا کہ انجانے میں کہیں مجھ سے کوئی غلط حرکت نہ ہو جائے اور اپنی ذات کو سب کی نظروں میں مخجل نہ کر بیٹھوں۔ دل میں ذرہ بھر میل نہ تھی کیونکہ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا اور خاص کر وہ تو میری بہن کی جان سے پیاری سہیلی تھی اور مجھے ہر حال میں بہن کے عظیم رشتے کی لاج رکھنی تھی۔ محتاط تھا مگر پھر بھی اسے دیکھ کر سامنے پا کر دل بے قابو سا ہو جاتا تھا۔

آسیہ اور اس کے خاندان کی نظروں میں، میں شرافت کا پیکر تھا اور یہ منہ بولے رشتے مجھ پر ہر وقت مان رکھے ہوئے تھے اور اس دن سے تو مجھے اس پر ترس ہی نہیں آیا بلکہ مجھے اس سے دلی ہمدردی بھی ہو گئی تھی۔ جب ماں جی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ بن ماں کی بچی ہے۔ اس کی ماں تین سال پہلے اس کے چھوٹے بھائی اور آخری بچے کو یعنی پاؤں سے معذور بیٹے کو جنم دیتے ہوئے وفات پا گئی تھی۔ وہ کل تین بہن بھائی تھے۔ اس کا باپ غریب اور ضعیف العمر ساٹھ سال کا تھا جب کہ ماں صرف چالیس سال کی عمر میں ہی مر گئی تھی۔ وہ سب سے بڑی اولاد تھی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اس پر بہت بڑا بوجھ آ پڑا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اب وہ اپنی چھوٹی بہن اور معذور بھائی کی ماں بن بیٹھی تھی۔ بوڑھے باپ کی خدمت اور بہن بھائی کی پرورش اب اس کے نازک کاندھوں پر تھی۔ اندر سے بہت دکھی تھی پر دوسروں کے دکھ بانٹنا اس کی فطرت میں فرض کی طرح شامل تھا۔ ماں جی کے سخت اصرار و تکرار پر ایک دن رات کے لیے گاؤں میں گئی تھی تو وہ دن اور رات گزارنا مجھے کسی بہت بلند پہاڑ کو سر کرنے کے مترادف ہو گیا تھا۔

آسیہ نے میری بے چینی کو بھانپ لیا تھا۔ بڑی سیانی اور ذہین لڑکی تھی۔ رات گئے جب ماں جی ساتھ والے خالی بیڈ پر سو رہی تھی تو اس نے مجھ سے پوچھ لیا تھا۔ ”بھیا آج آپ کچھ اداس اداس سے لگ رہے ہیں۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟“

”نہیں تو۔“ میں چونک اٹھا تھا۔

اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا تھا۔ ”بہن سے چھپا رہے ہو اعتماد نہیں ہے کیا؟“

”گڑیا وہم ہو رہا ہے تمہیں بھر میں اپنی پیاری بہن سے کیوں چھپاؤں گا۔“ میں نے شفقت سے اسے مطمئن کرنا چاہا تھا۔

”بھیا! میں مریض بنی بیڈ پر ضرور پڑی ہوں پر اتنی بھی بے خبر نہیں ہوں۔ میں سمجھ چکی ہوں کہ آپ بہت باحیا اور نیک انسان ہیں لیکن میرا یقین ہے کہ آپ آج خود کو اکیلا محسوس کر رہے ہو اور بھیا میں خود بھی اسے بہت

مس کر رہی ہوں جسے شاید آپ بھی مس کر رہے ہو۔ بہن ہوں ناں اس لیے بھائی کی اداسی کو محسوس کر رہی ہوں۔''

''گڑیا کیا کہہ رہی ہو؟'' میں سمجھ کر بھی انجان بننے کی کوشش میں تھا۔

''بھائی جان! میری قسم اٹھا کر کہو کیا آپ فوزیہ کی کمی محسوس نہیں کر رہے ہو۔'' اس نے گہری اور ٹٹو لنے والی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا اور اس معصوم سے میں مزید جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

''شاید تم سچ کہہ رہی ہو گڑیا! اس کے ہوتے ہوئے بہت رونق رہتی تھی۔'' میں نے مختصر سا سچ کہہ دیا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتے ہو۔ وہ جادوگرنی ہے ہی ایسی سب کو اپنا بنا لیتی ہے۔ بھیا میں دو چار دن سے محسوس کر رہی ہوں کہ جب آپ بھی یہاں نہیں ہوتے ہیں تو وہ بھی اداس اداس سی لگنے لگتی ہے۔ آپ بھی تو اس سے کم نہیں ہو کوئی بھی لڑکی آپ کی خوب صورت شخصیت اور مردانہ وجاہت سے متاثر ہو سکتی ہے۔'' وہ فخریہ بولی تھی۔

''بھائی ہوں ناں اس لیے تمہیں بہت خوب صورت نظر آتا ہوں۔ ورنہ اتنا تو نہیں ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''بھیا اگر میں کہوں کہ میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے تو مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی میری اس سچ بیانی کو نہیں جھٹلا پائے گا۔'' وہ بڑے مان سے بولی تھی اور میں صرف مسکرا کے رہ گیا تھا۔

''بھیا وہ بہت حساس اور دکھی لڑکی ہے۔ ایک ذرا خلوص پر جان دینے والی سچی اور کھری میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے کبھی سختی سے نہ پیش آنا، خلوص کا جواب خلوص سے دینا۔ آپ اس کی زندگی کے پہلے نوجوان ہیں جس سے وہ پتھر دل متاثر نظر آتی ہے۔ ورنہ وہ گاؤں کے مردوں میں ہلاکو خان مشہور ہے۔ خوش اخلاق ضرور ہے مگر عزت وغیرت کے معاملے میں کٹ مرنے والی ہے۔'' آسیہ نے اپنی سہیلی کے بارے برملا اظہار کرتے ہوئے میری ذات کے بارے میں متاثر ہونے کا واضح اشارہ کیا تھا۔

دوسری شام میں اسپتال گیا تو وہ آسیہ کے سرہانے بیٹھے اسے سیب کاٹ کر کھلا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک بہار سی آگئی تھی۔ اس نے ایک سیب الگ سے کاٹ کر میری طرف بڑھایا تھا۔ ماں جی شاید باہر تھیں اس لیے وہ اکیلی ہی آسیہ کے پاس موجود تھی۔

''بھئی اپنی سہیلی کو کھلاؤ ناں اور خود بھی کھاؤ میں کوئی مہمان یا مریض تھوڑی ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اتنے دنوں سے تو اس مریضہ کو ہی کھلا رہی ہوں۔ اب تو یہ خاصی موٹی بھی ہو چکی ہے اور مہمان کا منہ کوئی زیادہ تو سوہنا نہیں ہوتا۔ آپ بھی تو خاص مہمان ہو ناں۔'' اس نے مجھے سیب کھانے پر اصرار کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''بھئی آپ دونوں آپس میں مت تکرار کرو میں انصاف کر دیتی ہوں آپ دونوں ہی مل کر کھالو۔'' آسیہ نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

''ہاں بہنا یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے ایک حصہ اسے دیتے سیب کا باقی کا حصہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

آج صبح ڈاکٹرز نے خوش خبری سنائی تھی آسیہ دو تین دن بعد اسپتال سے اپنے گھر جا سکتی ہے۔ زخم اور ہڈیاں وغیرہ پچانوے فیصد تک ٹھیک ہو چکی تھیں اور باقی کا علاج وہ گھر میں جا کر جاری رکھ سکتی تھی۔ ماں جی گھر گئی ہوئی تھی اور آسیہ کا چھوٹا بھائی اسپتال میں موجود تھا۔ فوزیہ تو حسب روایت یہاں پر رہ رہی تھی۔ عشاء کے بعد وہ میرے ساتھ باہر گراسی گراؤنڈ میں چلی آئی تھی۔ مجھے جہاں آسیہ کے صحت یاب ہونے پر بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ دل میں ایک اداسی بھی در آئی تھی۔ یہ جو چند دنوں میں، میں کچھ رشتوں سے ایک خاص ناتا جوڑ بیٹھا تھا ان سے بچھڑنے کا دکھ ابھی سے محسوس ہونے لگا تھا۔ تقدیر نے حادثاتی طور پر مجھے جن بے حد مخلص لوگوں سے ملوا دیا تھا ان سے دوری کا دکھ دل پر بہت بھاری ہونے لگا تھا۔

ہم دونوں ہی پتھر کے بنچ پر چپک کر بیٹھ گئے تھے۔ شاید دوسری طرف بھی یہی معاملہ تھا۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتا تھا لیکن وضع داری اور حیا آڑے آ رہی تھی۔ پھر ایک ڈر سا بھی تھا کہ کہیں اس کی نظروں میں اپنا

بنا بنایا مقام ہی نہ کھو بیٹھوں۔
''بابو جی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا۔
''ہاں طبیعت تو چنگی بھلی ہے پھر چپ کیوں ہیں۔'' اس نے غور سے میری طرف دیکھا تھا۔
''اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو؟'' میں نے بھی اسی انداز سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔
''پھر کوئی بات تو سناؤ ناں۔'' میں نے اصرار کیا تھا۔ ''ایک بات پوچھوں جی, آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟'' اس نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر جھجکتے ہوئے کہا تھا۔
''پوچھو میں بھلا کیوں ناراض ہوں گا۔''
''ہمارے گاؤں میں تائی نوراں کہتی ہے کہ شہری لوگ بہت چالاک اور بے وفا ہوتے ہیں۔ دیہاتی لوگوں کو الو بنا کر مطلب نکال لیتے ہیں اور پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیا کرتے ہیں۔'' اس نے انتہائی معصومیت سے کہا اور جاننا چاہا تھا۔
''تقریباً بیس دنوں سے تم بھی یہیں رہ رہی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے۔ شہر کے لوگ واقعی ایسے ہوتے ہیں؟'' میں نے اسی سے جاننا چاہا تھا۔
''بظاہر تو ایسا نہیں لگتا جی, ہمارا پہلا اتفاق ہے جی یہاں رہنے کا کچھ زیادہ نہیں جانتے ہیں جی۔ پتا نہیں تائی نوراں ایسا کیوں کہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں جی کہ وہ بڑی سیانی عورت ہے۔ اس کی باتوں میں سچائی ہوتی ہے۔'' اس نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔
''میں تمہیں کیسا لگتا ہوں فوزیہ میں بھی تو ایک شہری ہوں'' میں نے ڈائریکٹ پوچھ لیا تھا۔
''آپ...... آپ تو بڑے اچھے بندے ہو جی۔ ماں جی, آسیہ اور اس کے تمام خاندان والے آپ کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔''
''اور شاید تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟ تمہیں تائی نوراں کی باتوں پر میری ذات سے زیادہ یقین لگتا ہے۔'' میرے جملے میں شاید دکھ سمٹ آیا تھا اور شاید وہ اس بات پر تیار نہیں تھی۔ وہ چند لمحے گنگ سی ہو گئی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا نہیں بالکل بھی نہیں۔
''بابو جی۔ میری بات کا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں آپ کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔ میرے دل میں تو آپ کا بڑا مقام ہے۔ آپ کے خلوص نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ بہت جی دار اور مخلص انسان ہو جی پتا نہیں کیوں میری زبان سے تائی نوراں کی بات نکل گئی۔ آپ کو دکھ ہوا تو معاف کر دو جی آپ نے میری سہیلی کی زندگی بچائی ہم سب کی بنا مطلب اور لین دین کے اتنے دنوں سے خدمت کر رہے ہو۔ یہ احسان تو میں مر کے بھی نہیں بھول سکوں گی۔ آپ معاف کر دو جی غلطی ہو گئی جی۔'' وہ روہانسی ہو گئی اور اس کے چہرے پر یکدم اداسی چھا گئی تھی۔
''فوزیہ تم بہت اچھی ہو میرے دل میں تمہاری بڑی قدر ہے۔ میں ذرا بھی ناراض نہیں ہوں۔ تم کس بات کی معافی مانگ رہی ہو۔ اتنے دنوں سے تم لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہوں ناں شاید بچھڑنے کے دکھ سے پریشان سا ہو گیا ہوں تم لوگ بہت یاد آؤ گے۔ تم لوگوں کے ساتھ گزرے ہوئے یہ دن میں زندگی بھر بھی نہیں بھلا سکوں گا۔'' میں نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔
''بابو جی ہم دیہاتی لوگ بڑے سیدھے صاف گو اور نمک حلال ہوتے ہیں اور ہم غریب لوگ خلوص اور خدمت کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتے ہیں۔ کیا آپ ہم سے نبھا سکیں گے۔'' وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں بہت کچھ کہنا اور سمجھنا چاہ رہی تھی۔
''فوزیہ میں بھی منافق نہیں ہوں۔ مجھے بھی تم لوگوں سے صرف اور صرف سچا خلوص اور محبت چاہیے۔ میں بھی کوئی اتنا امیر یا بڑا بندہ نہیں ہوں اور بغیر کسی لگی لپٹی کے سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہاری ذات نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں خاص کر تمہیں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔ زندگی میں پہلی بار میرے دل میں کسی نے اتنا اثر چھوڑا ہے۔ سچ میں تمہاری جدائی سے ابھی سے ہی بہت پریشان ہو رہا ہوں۔ پتا نہیں تم لوگوں کے گاؤں چلے جانے کے بعد میرے دل پر کیا بیتے گی۔'' میرے دل کی بات بالآخر زباں پر آ ہی گئی تھی اور میں نے نظریں جھکا لیں تھیں۔ وہ بھی خاموش ہو کر انگلیاں مروڑنے لگی۔
''فوزیہ اگر میری کوئی بھی بات بری لگی ہو تو میں تم سے معافی چاہوں گا۔'' میں نے پھر سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ

پھر بھی خاموش رہی تھی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی۔

''فوزیہ کیا بہت ناراض ہوگئی؟'' میں نے پھر سے اسے مخاطب کیا تو اس نے سنجیدہ سی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر جانچنے کی کوشش کی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے تھے۔

''بابو جی سوچ لو میں آپ کے کہنے کا مقصد سمجھ رہی ہوں لیکن اتنا یاد رکھنا کہ شاید آپ کو تو مجھ جیسی بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی لیکن فوزیہ کو شاید آپ جیسا کوئی نہ ملے۔ بابو جی! میرے دل میں بھی کئی دنوں سے یہ جنگ جسے محبت کہتے ہیں بڑی شدت سے چل رہی ہے۔ بابو جی! اگر آپ مجھ سے یہ سب سچ کہہ رہے ہیں تو پھر میرے اندر کی اس محبت بھری جنگ کو بے وفائی کی آگ میں نہ جھونک دینا۔ ورنہ فوزیہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔ میں غریب ہوں پر وفا نبھانے میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔ بابو جی میں آپ کی ایک ذرا سی نفرت سے بھی مر جاؤں گی۔ بابو جی! پلیز......'' وہ باقاعدہ سسکنے لگی تھی اور میں یہ دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔

''فوزیہ! زندگی دینے والے کی قسم! اب تو تمہاری محبت ہی میری زندگی اور ہر خوشی ہوگی۔ میں قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ حالات جیسے بھی ہوں گے مشکلیں جتنی بھی آئیں گی۔ خواہ مجھے ساری دنیا کو ہی چھوڑنا پڑا میں جان کی بازی لگا کر بھی تمہارا ساتھ نبھاؤں گا۔ تمہاری ہر خواہش کے آگے سر جھکاؤں گا۔ خدا کرے کہ تم سے بیوفائی کرنے کی سوچ سے پہلے ہی مر جاؤں۔'' میں سخت جذباتی ہوگیا اور اس کے اقرار محبت نے میری نس نس میں نئی زندگی بھر دی تھی۔

''بابو جی! اب یہ مرنے ورنے کی باتیں نہ کریں نہیں تو میں آپ سے بھی پہلے مر جاؤں گی۔ اب میری زندگی میری عزت، میرا بھرم آپ کے ہاتھ میں ہے اور مجھے آپ پر یقین ہے کہ آپ میری لاج رکھو گے۔'' میں نے دائیں بائیں دیکھا ماحول صاف تھا تو میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے تھے۔

ہم وارڈ میں آسیہ کے پاس آئے تو ہماری دنیا ہی بدل چکی تھی۔ وہ ساری رات ہی ہم نے ایک دوسرے کو دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے گزار دی تھی۔ دو دن بعد ڈاکٹروں نے آسیہ کو چھٹی دے دی تھی اور انہوں نے گھر واپسی کے لیے سامان باندھ لیا تھا۔ آسیہ اور ماں جی وغیرہ بہت خوش تھیں ہم دونوں بھی بظاہر بہت خوش نظر آرہے تھے لیکن جدائی کے تصور نے دل میں آگ جلا رکھی تھی اور ہم ایک دوسرے سے نظریں چرائے ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

آسیہ، ماں جی اور آسیہ کا والد ملک چاچا مجھے گاؤں اپنے ساتھ گھر لے جانے پر سخت مصر تھے۔ ماں جی اور ملک چاچا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بیٹے اگر تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے تو ہم سخت ناراض اور دکھی ہوں گے اور آسیہ تو باقاعدہ میرے ساتھ نہ جانے پر رونے لگی تھی۔ فوزیہ کی آنکھوں میں بھی ایک التجا تھی اور میں بھی یہ ہی چاہتا تھا لیکن فی الحال میں کچھ دن کے بعد ان کے ہاں جانا چاہتا تھا کیونکہ میں اپنی بہن کے گھر پہلی دفعہ خالی ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔ یہ میرے ضمیر کو گوارہ نہیں تھا کہ میں بہن کے گھر خالی ہاتھ جاؤں۔ لہٰذا میں نے انتہائی معذرت کے ساتھ چند دن بعد آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ پھر جب میں ان لوگوں کو ان کی منزل کی طرف جانے والی بس پر بٹھا کر واپس لوٹا تو میرا سب کچھ ہی جانے والوں کے پاس رہ گیا تھا۔ میں نے خود کو مصروف رکھنے کی سخت کوشش کی تھی اور بچھڑنے والوں کی درد بھری یادوں سے پیچھا چھڑانے کی سخت جدوجہد میں مصروف رہنے لگا لیکن وہ بھولنے کی بجائے مجھے اور زیادہ یاد آنے لگے۔ ادب اور مطالعے کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ ان دنوں میگزین وغیرہ بڑے شوق سے پڑھتا تھا اور ان رسائل میں کہانیاں بھی لکھ رہا تھا لیکن اب نہ تو لکھنے میں دل لگ رہا تھا نہ ہی پڑھنے میں ذہن تھا کہ پیاروں کی یادوں سے ہی نہیں ہٹتا تھا۔ یار دوست میرے اچانک ہی سیریس پن اور خاموشی پر تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے اور میری اداسی کی وجہ جاننے پر مصر تھے لیکن میں اس راز کو صرف خود تک سنبھالے ہوئے تھے۔ البتہ خالد کو کسی حد تک میری اداسی کا علم تھا لیکن وہ میرا راز دار دوست تھا۔ بہر حال میں گاؤں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ وہاں جانے سے ایک دن پہلے میرے نام آسیہ کا خط آ گیا جس کی تحریر کچھ یوں تھی۔

''میرے جان سے پیارے بھائی قاسم خان! اللہ

تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سلامت تاحیات رکھے۔ بھائی جان! اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں تقریباً روبصحت ہوں اور اب اپنے قدموں پر کسی حد تک چلنے پھرنے بھی لگی ہوں اور یہ سب آپ کی دعاؤں اور محنت کا صلہ ہے جو میں پھر سے زندگی کی طرف لوٹ رہی ہوں۔ بھیا ہم سب ہی آپ کے لیے بے حد اداس ہو رہے ہیں۔ ہر وقت ہی آپ کی یادوں میں مصروف رہتے ہیں، پلیز میرا خط ملتے ہی فوراً سے پہلے ہمارے پاس آجایئے ورنہ میں سچ کہہ رہی ہوں اگر آپ ایک دو دن میں نہ آئے تو میں کھانا پینا سونا سب کچھ چھوڑ دوں گی پھر مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرنا اور ہاں یاد رہے کہ میرے ساتھ ساتھ کوئی اور بھی ایسا کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ بھیا بڑے چھپے رستم نکلے ہو، میری جان سے پیاری سہیلی کا دل چرالیا اور ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔ اس کے باوجود بھی ہم آپ پر ناراض ہونے کی بجائے بہت خوش ہیں۔ خدا آپ کی جوڑی ہمیشہ سلامتی رکھے۔ بہن کی دعائیں سدا ہی آپ کے ساتھ ہیں۔ بس اب جلدی سے آجایئے ورنہ وہ ہماری مشترکہ دل میں رہنے والی کہیں بیمار ہی نہ پڑ جائے۔''

آپ کی بہن آسیہ

خط پڑھ کر دل کو بے حد سکون ملا تھا۔ فوزیہ نے اپنی جان سے پیاری سہیلی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا تھا ورنہ مجھے تو آسیہ سے ایسا کچھ کہتے سخت شرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں دوسرے دن جب دوپہر کو آسیہ کے گھر پہنچا تو مجھے گھر میں پاکر اس خاندان کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا۔ ان لوگوں نے یوں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے میں ان کا کوئی بہت ہی مدت بعد بچھڑا عزیز ترین گھر آگیا ہوں۔ انہوں نے اپنے اڑوس پڑوس اور گاؤں بھر میں میری اتنی تعریفیں کر رکھی تھیں کہ ان کے گاؤں کا ہر ملنے والا شخص مجھے بہت عزت دے رہا تھا گویا کہ میں اس پورے گاؤں کا ہیرو بن گیا تھا۔ یہ سادہ لوح لوگ میری آسیہ کے ساتھ ذرا سی مہربانی کو بہت بڑی قربانی قرار دے رہے تھے اور میرے لیے اپنے خلوص پیار و محبت کا دامن وا کر دیا تھا۔ بزرگ لوگ مجھے ڈھیروں دعائیں دے رہے تھے اور نوجوان طبقہ مجھے عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فوزیہ مجھے دیکھ کر خوشی سے باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ آسیہ کا خاندان تو باقاعدہ عید کی سی خوشیاں منانے لگا تھا۔ شاید میرے سگے والدین اور بہن بھائی بھی مجھ سے اتنی عقیدت ومحبت نہیں کر سکتے تھے جس کا مظاہرہ مجھے آسیہ کے گھر میں نظر آرہا تھا۔

فرصت ملتے ہی فوزیہ میرے قریب آئی تو شکوہ کر ڈالا۔ ''بابو جی شکر ہے آپ کو بھی ہم سے ملنے کا بالآخر خیال آہی گیا۔ ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ آپ ہمیں بھول گئے۔'' اس کی جادو بھری آنکھوں میں ہزاروں شکوے مچل رہے تھے۔

''پگلی نہ ہو تو! یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہیں بھول کر زندہ رہ سکوں۔ ایک لمحہ بھی تم سب کو نہیں بھول سکا ہوں۔ کچھ ضروری کام تھے اس لیے دیر ہوگئی۔ اب تو تمہارے بغیر بس دنیا کی ہر چیز سونی سونی لگنے لگی ہے۔ یقین رکھو میں تمہارے بغیر کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکوں گا۔'' میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

''میں ان چند دنوں میں ہی باؤلی سی ہو کے رہ گئی ہوں بابو جی، تم نے کیا جادو کر دیا ہے؟'' وہ بے تکلفی سے پوچھنے لگی۔

جو چار پانچ دنوں میں ہی ہم نے محبت میں صدیوں کا سفر طے کر ڈالا تھا۔ میری واپسی پر جہاں آسیہ اور اس کا خاندان بے حد اداس ہو رہا تھا فوزیہ کی تو جان ہی نکلی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے مجھے واپس تو لوٹنا ہی تھا۔ ہم نے پھر نئے سرے سے محبت کے عہد وپیماں باندھے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں اٹھائیں اور نہ چاہنے کے باوجود بھی پھر سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے بچھڑ گئے۔

وقت گزرتا رہا اور ہماری محبت دن بہ دن پروان چڑھتی رہی اور چھ سات ماہ کبھی ملنے کبھی بچھڑنے میں گزر گئے۔ ایک دن آسیہ نے ماں جی سے کہہ دیا کہ وہ میرا اور فوزیہ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رشتہ جوڑنے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ ماں جی اور ملک چاچا یہ سن کر بہت ہی خوش ہوئے۔ ماں جی کا خیال تھا کہ فوزیہ کے لیے مجھ سے بڑھ کر کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا اور اس ماں بیٹی نے دل میں ہمیں ہمیشہ کے لیے جوڑنے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا اور آسیہ نے جب مجھے یہ اہم ترین خبر سنائی تو میں نے بے خود ہو کر اسے ڈھیروں پیار کر ڈالا تھا۔ وہ واقعی ایک عظیم

بہن ہونے کا حق ادا کر رہی تھی۔

ادھر ہم انسان تو اپنی مرضی کی تدابیر میں مصروف تھے لیکن تقدیر کی ہونی اپنی انہونی پر تلی بیٹھی تھی اور تقدیر کے آگے کس انسان کی مجال کہ اپنی من مانی کر سکے۔ تقدیر اٹھتی ہے اور اپنے کیے پر مجبور انسانوں کا تماشا دیکھتی ہے اور پھر انسان بے بسی پر ہنستی مسکراتی تماشا دیکھتی رہتی ہے اور انسان جو خود کو بڑا پھنے خان اور بااختیار سمجھتا ہے تقدیر کے آگے کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ تدبیر سوچتی رہ جاتی ہے اور تقدیر کر گزرتی ہے اور پھر ہر محبت کرنے والے کی طرح تقدیر ہم سے بھی انہونی کرنے پر تل گئی تھی۔ آسیہ کا خط آیا تھا اور مختصر لکھا تھا کہ وہ سخت پریشان ہے اور میں جلد از جلد اس کے پاس پہنچوں۔

وہ رات میں نے انتہائی بے چینی میں گزاری تھی اور دوسری صبح دوپہر کو آسیہ کے پاس جا پہنچا تھا۔ اتفاق سے اس وقت آسیہ اپنی ایک سات سالہ بہن کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی۔ وہ میرے گلے لگ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔ میں پہلے ہی پریشان تھا اور آسیہ کو اس طرح زارو قطار روتے دیکھ کر مزید پریشان ہوا تھا۔

''گڑیا کیا ہوا آخر اس طرح رو کیوں رہی ہو، کچھ تو بتاؤ ناں ورنہ میں بھی رو دوں گا۔'' میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''بھیا کیسے اور کس منہ سے بتاؤں کہ تقدیر نے ہماری ساری خوشیوں اور خواہشوں پر بہت بڑا ڈاکا ڈال دیا ہے۔ ہائے ربا! یہ تو نے کیا کر دیا۔ آخر کس گناہ کی سزا دے رہے ہو، میرے بھائی بہن کو۔'' وہ سسکتے ہوئے دہائی دینے لگی تھی۔

''آسیہ! پلیز میری کچھ تو بتاؤ ناں آخر ہوا کیا ہے؟'' میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے استفسار کیا۔

''وہ بھیا...... بھیا فوزیہ...... فوزیہ کے ابا نے کسی سے پوچھے اور مشورہ کیے بغیر فوزیہ کا رشتہ اپنے ایک رشتے دار بڈھے بابے سے طے کر دیا ہے جو پہلے بھی ایک بیوی رکھتا ہے۔''

آسیہ نے سسکتے ہوئے بتایا تو میں چکرا کر چارپائی پر ڈھے سا گیا تھا اور کچھ دیر تک اس انتہائی ناقابل قبول اور بدترین خبر پر پاگل ہو کے رہ گیا تھا۔ پھر جب آسیہ کو پھر سے زارو قطار روتے دیکھا تو خود پر نہ جانے کس طرح قابو پا لیا تھا۔

''آسیہ یہ سب کچھ اس طرح اچانک کس طرح ہو گیا؟'' میں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے آسیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بھیا آپ کو معلوم ہے ناکہ فوزیہ کا والد ضعیف العمر اور بیمار سا رہتا ہے اور غریب بھی ہے۔ اسے کچھ عرصہ سے فوزیہ کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی کیونکہ ماں نہ ہونے اور بیٹی کے جوان ہونے پر باپ کی حیثیت سے وہ بڑا فکرمند رہتا تھا اور سب سے بڑی فکر اسے اپنی غربت کی تھی۔ اس کے رشتے داروں میں ایک خاصا امیر وزمیندار رشتے دار جس کی پہلی بیوی سے ابھی تک اولاد نہیں ہے وہ دوسری شادی کے لیے اس پر دباؤ ڈال رہا تھا لیکن فوزیہ کے ابا نے اسے ہمارے سامنے ہی سختی سے انکار کر دیا تھا۔ ماں جی آپ کے رشتے کی بات کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھیں کہ پرسوں وہ رشتے دار برادری کے کئی اور بڑوں کو لے کر فوزیہ کے ابے کے پاس آ گیا اور یوں وہ برادری کا دباؤ برداشت نہ کر سکا اور فوزیہ سے کم سے کم بھی تیس سال بڑے رشتے دار کو جو پہلے سے ہی شادی شدہ اپنا داماد چن لیا ہے اور ہمیں بھی اس وقت پتا چلا جب وہ یہ بات پکی کر چکا تھا۔ فوزیہ بے چاری بھی میرے ساتھ کھیتوں میں گئی ہوئی تھی اور جس شام ہمیں یہ منحوس ترین خبر ملی ابے اور ماں جی اسے بہت ہی سمجھانے کی کوشش کی ہے پر وہ کہتا ہے کہ میں برادری کو زبان دے چکا ہوں۔ میں مر تو سکتا ہوں پر زبان سے نہیں مکر سکتا اور اگر فوزیہ نے اس رشتے سے انکار کیا تو وہ سرعام زہر کھا کر مر جائے گا۔ بھیا یہ کیسا ظلم ہو گیا ہے۔ فوزیہ کے بھی رشتے دار مرد بمع والد کے اسے جانور سمجھ کر کیوں اس کی زندگی تباہ کر رہے ہیں۔ کسی کو بھی تو اس بے چاری اور بن ماں کی بچی پر رحم نہ آ رہا ہے۔ بھیا یہ کیسی ناانصافی ہے کہ کسی کی زندگی کا اس طرح فیصلہ کر دیا جائے۔'' آسیہ پھر سسکنے لگ گئی تھی۔ میں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے بڑے حوصلے سے اسے چپ کرایا۔

''بھیا فوزیہ کی شدید خواہش ہے اور اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں ایک بار اسے آپ سے ملوا دوں۔ بھیا تمہیں میرا واسطہ ہے انکار نہ کرنا۔

ورنہ وہ واقعی خودکشی کرلے گی۔'' آسیہ انتہائی عاجزی سے کہنے لگی۔

اب ملنے میں کیا حرج تھا اور میں بھی اسے آخری بار ملنا اور دیکھنا چاہتا تھا۔ بھلا اس میں اس مظلوم و بے بس کا کیا قصور تھا اور پھر محبت صرف محبوب سے شادی کرنے کا نام تھوڑی ہے، محبت تو محبت ہے۔ اسے جسموں کے ملاپ تک محدود کرنے والے لوگ انتہائی گناہ گار اور محبت کے معنی سے لاعلم ہیں۔ فوزیہ کا ابا سمجھتا ہوگا کہ اس کی بیٹی دولت مند گھرانے میں سکھی رہے گی اور کل کو غربت کی چکی سے نکل کر خود بھی امیر بن جائے گی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ دولت ہی صرف اچھے مستقبل اور زندگی کی سچی خوشیوں کا سہارا نہیں ہوتی۔ اچھی زندگی کے لیے دل کے سکون اور اچھے جیون ساتھی کا ہونا سب سے اہم اور ضروری ہوتا ہے۔

''آسیہ میری بہن میں خود بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں اور اسے آخری بار جی بھر کر دیکھنا بھی چاہتا ہوں تم اسے بلا لاؤ، ہوسکتا ہے کہ آج میں زیادہ دیر یہاں نہ رک سکوں۔'' میں نے انتہائی حوصلے اور سنجیدگی سے کہا تھا اور کمرے میں جا بیٹھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی فوزیہ میرے سامنے موجود تھی۔ اس کا اجڑا اجڑا اور ویران چہرہ دیکھ کر میرے دل میں شدید درد اٹھا تھا۔ بکھرے بکھرے بال سونی سونی آنکھیں انتہائی کمزور اور تھکی تھکی سی یہ لڑکی مجھے صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کو مجھے دیکھا اور اچانک ہی میرے قدموں میں سر رکھ دیا تھا۔

''بابو جی...... بابو جی...... مجھے معاف کردو۔ میں آپ کی مجرم ہوں میں آپ کی محبت کی گناہ گار ہوں بابو جی...... بابو جی خدا کے واسطے مجھے معاف کردینا۔ میں آپ سے کوئی وعدہ بھی وفا نہ کرسکی ہوں۔ باپ کی عزت باپ کی لاج میری محبت پر حاوی ہوگئی ہے۔ بابو جی مجھے باپ کی عزت رکھنی ہے۔ مجھے بیٹی کا مان رکھنا ہے۔ میں باپ کے لیے طعنہ نہیں بننا چاہتی ہوں۔ ورنہ وہ ضعیف اور کمزور انسان وقت سے پہلے ہی مر جائے گا اور میری چھوٹی بہن اور معذور بھائی دربدر ہو کر خوار ہو جائیں گے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ میرے قدموں میں بیٹھی تڑپ رہی تھی۔

مجھے اس کی مجبوریوں کا احساس اور اس کی باتیں سن کر الٹا مجھے اس پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ باحیا اور غیرت مند بیٹی تھی۔ ماں باپ کی عزت پر قربان ہونے والی، ماں کے دودھ کا حق ادا کرنے والی وفا پرست بیٹی۔ میری سچی محبت اور انسانیت کا تقاضا تھا کہ میں اسے اس سانحے کو سہنے کا حوصلہ بخشتا اس کی سچے دل سے ہمت افزائی کرتا اور اس کا حقیقی فرض نبھانے میں اس کی مدد کرتا۔ مجھے اس کے کردار پر مان تھا۔ میں نے محتاط انداز سے اسے اپنے قدموں سے اٹھا کر سامنے بٹھالیا تھا۔

''فوزیہ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ نہ ہی مجھ سے بے وفائی یا کوئی زیادتی کی ہے۔ پھر کیوں معافی مانگ رہی ہو اگر تم ایسا کچھ سمجھتی ہو تو میں تمہاری محبت کی قسم کھا کر تمہیں یقین دلاتا ہوں میرے دل میں تمہارے لیے ذرا بھی رنجش نہیں ہے بلکہ تم نے باپ کی بات مان کر میرے دل میں پہلے سے بھی زیادہ مقام بنالیا ہے اور مجھے تمہاری ذات پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔ تمہاری فرمانبرداری نے تو مجھے تمہاری ذات سے اور بھی متاثر کردیا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے تم جیسی باوفا، غیرت مند اور فرمانبردار لڑکی کی محبت نصیب ہوئی ہے۔ فوزیہ مجھے قسم ہے پیدا کرنے والے کی میں ہر مشکل میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ مرتے دم تک تمہاری وفا اور محبت پر مجھے مان رہے گا۔ تم میرے لیے ذرا بھی غم نہ کرنا بلکہ باپ کی عزت اور قسمت میں لکھے جانے والے شوہر کی تابعداری کرنا، ہم انسان ہی نہیں اللہ اور اس کا رسول بھی تم سے راضی رہے گا اور اللہ تمہیں تمہاری نیکیوں کا اجر دے گا۔ خدارا مجھے بھول کر اپنے گھر کا خیال رکھنا۔ میں ہمیشہ ہی تم سے راضی رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے کہے پر صدق دل سے عمل کرنے کی کوشش کروگی۔'' پھر ہم نے آخری بار ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھا تھا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ چومے تھے اور بچھڑ گئے تھے۔

☆......☆

یہ شہر، یہ گلیاں، یہ محلے، یہ گھر، یہ لوگ سب کچھ ہی پہلے جیسا تھا لیکن صرف میں اب وہ پہلے والا نہیں رہ گیا تھا۔ میرا جسم میری صورت میرا لاشہ وہی تھا لیکن میرا اندر

اب خالی خالی سا اجڑا اجڑا سا ہو گیا تھا۔ دن گزرنے لگے اور میں دن بہ دن اداس ہوتا گیا۔ میں بہت کوشش کرتا کہ کسی نہ کسی طرح فوزیہ کو بھول جاؤں مگر وہ ظالم تو سانسوں کی طرح میری نس نس میں شامل ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں دو ماہ گزر گئے اور پھر ایک دن اچانک ہی تقدیر کو مجھ پر قدرے رحم آ گیا۔

میرا کالج کا ایک سابق کلاس فیلو اور دوست خاور جو تین سالوں سے دبئی میں ایک اچھے روزگار پر تھا وہ ایک ویزا لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے آفر کی تو میں نے اس کے ساتھ دبئی جانے کی فوراً ہامی بھر لی۔ یہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا بہترین پیکیج کا ویزا تھا اور تنخواہ بھی بہت معقول تھی چونکہ ان دنوں میرے پاس وقت گزارنے اور فوزیہ کی یادوں سے دور رہنے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا سو میں نے اسی بہانے خود کو مصروف رکھنے کے لیے دبئی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ آسیہ اور ماں جی کے ساتھ ساتھ گھر والوں کو بھی میرا اتنا دور پردیس میں جانا گوارہ نہیں تھا لیکن میں نے اچھے مستقبل کا بہانہ کرتے ہوئے انہیں کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ آسیہ میرے اندرونی دکھ سے واقف تھی۔ اس لیے وہ خاموش ہو گئی تھی۔ والدین کو میری شادی کی فکر تھی میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی کا رشتہ ڈھونڈ کر طے کر لیں میں دو سال بعد چھٹی پر آ کر شادی کر لوں گا۔

میں دبئی آیا تو مصروف ہو گیا اور پھر دو سالوں بعد آنے کی بجائے تیسرے سال چھٹی پر وطن آیا تو والدین ایک جگہ میرے رشتے کی بات طے کر چکے تھے۔ میرے آتے ہی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔ میں جس کے لیے وطن چھوڑ کر پردیس گیا تھا وہ آج بھی مجھے پہلے کی طرح ہی یاد تھی۔ وہ مجھے ایک لمحہ بھی نہیں بھولی تھی ہر لمحہ ہی میری یادوں میں موجود رہی تھی۔

میں نے شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی اپنے وطن واپس آنے اور شادی کی تاریخ کا آسیہ کو خط لکھ دیا تھا اور شادی میں شرکت کی بھی اپیل کی تھی۔ میں چاہنے کے باوجود بھی گاؤں نہ جا سکا تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ میرے دل سے فوزیہ سے ملنے کی حسرت ہر لمحہ رہتی تھی۔ شادی جوں جوں قریب آ رہی تھی مصروفیت بڑھنے لگی تھی۔

ایک دن ضروری خریداری کے سلسلے میں اپنے ایک بہت پرانے واقف کار کے جنرل اسٹور کی دکان پر پہنچا تھا۔ ابھی دن کے تقریباً نو بجے تھے اور بازار میں اکا دکا دکانیں ہی کھلی تھیں۔ جنرل اسٹور کا مالک ایک شوخ طبیعت کا مالک تھا اور بڑا چلتا پرزہ بھی تھا۔ بہر حال میری وہ بڑی عزت کرتا تھا۔ اس لیے میں پرفیوم وغیرہ کی زیادہ شاپنگ اسی کے اسٹور سے کیا کرتا تھا۔ بازار میں بالکل بھی رش نہیں تھا۔ میں جنرل اسٹور میں پہنچا تو اسٹور کا مالک سائیڈ میں لگے پردے کے پیچھے بیٹھی کسی خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور ادھر سے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے آگے بڑھا تھا۔ ''آؤ آؤ قاسم بھائی، بڑی مدت بعد دیدار کروا رہے ہو، سنا تھا دبئی چلے گئے تھے؟'' اس نے دعا سلام کے بعد پوچھا۔

''جی بھائی صاحب! ابھی چند دن پہلے ہی لوٹا ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا تھا۔ وہ پھر سے پہلے سے بیٹھی ہوئی لیڈی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''اچھا تو پھر ٹھیک فوزی پہلے کی طرح اپنے وعدے سے مکر نہ جانا ٹھیک رات نو بجے میں فلاں جگہ پر تمہارا انتظار کروں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دو تین سو سو والے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے تھے جو کہ اس خاتون نے لے کر رکھ لیے تھے۔ وہ خاتون پردے سے باہر آئی تو چادر سنبھالنے کے چکر میں اس کا نقاب اس کے منہ سے اتر گیا تھا اور پھر مجھے دیکھ کر اس کا نقاب اوڑھنے کے لیے اٹھنے والا ہاتھ ہوا میں ہی لہرا کر رہ گیا تھا اور میں اپنی جگہ شاکڈ ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ خاتون فوزیہ تھی وہ فوزیہ جسے میں کروڑوں کے مجمع میں ایک لمحے میں پہچان سکتا تھا۔ ہم دونوں میں یہ عمل شاید آدھے منٹ کا رہا ہو گا اسے نقاب اوڑھنا بھول گیا تھا اور وہ ڈگمگاتے قدموں سے اسٹور سے باہر نکل گئی تھی۔ جب کہ میں بھی بنا سوچے سمجھے اس کے پیچھے ہی چل پڑا تھا۔

''فوزیہ...... فوزیہ! ذرا ایک منٹ رکو تو۔'' میں ارد گرد کے ماحول کی پروا کیے بغیر اسے پکار اٹھا تھا اور اس کے برابر چلنے لگا تھا۔

''شاید آپ کو کوئی سخت غلط فہمی ہوئی ہے میں کوئی فوزیہ وغیرہ نہیں ہوں نہ ہی میں آپ کو پہچانتی ہوں۔ پلیز

میرا اس طرح پیچھا نہ کریں۔ میرا نہیں تو اپنا ہی کچھ خیال کریں مسٹر۔" اس نے انتہائی سخت لہجے میں کہتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھا دیئے تھے اور میں نے سخت غم کی اذیت میں اپنے قدم روک لیے تھے۔

فوزیہ کی اس بے مروتی اور ناقابل یقین عمل نے مجھے ایک لمحے سے پہلے بکھیر کر رکھ دیا تھا اور میں ڈگمگاتے قدموں سے سر جھکائے پھر جنرل اسٹور میں داخل ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دفن ہو جاؤں۔ اسٹور والے نے بتیسی نکال دی تھی۔

"قاسم بھائی تم تو ہم سے بھی بڑے چھپے رستم نکلے۔ پر یار یہ چیز ہی بڑی نرالی ہے۔ بہت مشکل سے کسی کے ہاتھ آتی ہے اور وہ بھی ترسا ترسا کر پر تم تو یار پہلے کبھی ایسے نہ تھے۔" وہ شیطانی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولا تھا۔

"بالکل بھی نہیں بھائی دراصل مجھے اس کی شکل میں دور کی رشتے دار کی شدید غلط فہمی ہو گئی تھی اور میں نے سوچا کہ شاید اس نے مجھے پہچانا نہیں اس لیے اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ پر وہ واقعی وہ نہیں تھی جو میں سمجھا تھا۔" میں نے انتہائی درد بھرے لہجے میں جواب دیا تھ۔

"پر یار یہ تھی کون؟" میں نے بظاہر اب مسکراتے ہوئے جاننا چاہا تھا۔

"یار بڑی ظالم اور خوب صورت شے ہے۔ سنا ہے خاوند فوت ہو گیا ہے اور دو بچوں کی ماں بھی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے کسی دیہات سے یہاں آبسی ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے کوئی جائیداد یا ذرائع آمدن بھی نہیں ہے۔ شاید اس لیے پیٹ بھرنے کو اس کام پر لگ گئی ہے۔ بس یار یہ سب فراڈ کی کہانیاں ہوتی ہیں یہ سب رام کہانی تو کمانے کا ایک بہانہ ہوتی ہے۔ ورنہ ایسی عورتیں صرف دولت کمانے اور عیاشی کرنے کے لیے ایسا کرتی ہیں۔ اب بتاؤ یار کیا خدمت کروں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے انتہائی بے دلی سے ایک دو چیزوں کی خریداری کی اور جنرل اسٹور سے سیدھا گھر آ گیا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔

"اس کا کردار اس قدر شرمناک بن جائے گا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا نہ ہی میرا ضمیر گوارہ کر رہا اور جو اس نے مجھے پہچاننے تک سے انکار کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ خود میری آنکھوں نے دیکھا اور سنا تھا۔ ناقابل یقین حد تک یہ سچ تھا لیکن مجھے پھر بھی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ کاش یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے سے پہلے مجھے موت آ گئی ہوتی۔ اے اللہ کیا یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا۔ میرے دل سے آہ نکلی۔

وہ رات میں کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزار دی تھی اور صبح ہوتے ہی میں جنرل اسٹور والے کے بتائے ہوئے اس کے پتے پر چل پڑا تھا۔ جس محلے کا اس نے نام بتایا تھا وہاں میرا ایک خاص جاننے والا رہتا تھا۔ میں سیدھا اس کے گھر پہنچا۔ وہ شریف اور قابل بھروسا آدمی تھا۔ وہ مجھے بڑا والہانہ انداز میں ملا اور بیٹھک میں بٹھا کر بڑی آؤ بھگت کی تھی پھر اس نے مجھ سے وجہ آمد پوچھی تو میں نے اسے اعتماد میں لے کر فوزیہ کی رہائش کے بارے میں پوچھا۔

"ہاں یار ایک خوب صورت سی خاتون چند ماہ پہلے محلے کے فلاں مکان میں کرائے دار کی حیثیت سے آئی تو ہے۔ شاید کسی دیہات کی رہنے والی ہے۔ میں مالک مکان سے ابھی پتا کر کے بتاتا ہوں۔" اس نے مجھے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار تم صرف مجھے اس کی جائے رہائش کی نشاندہی کر دو اگلا کام میں خود ہی کر لوں گا۔" میں نے تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تو اس نے کچھ فاصلے پر محلے کے ایک بوسیدہ سے مکان کی طرف نشاندہی کر دی تھی۔ میں نے اس خستہ حال مکان کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا اور انتظار میں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلا تو ایک میلے کچیلے سوٹ میں فوزیہ میرے سامنے تھی۔ اس نے شدید حیران و پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازے کو کنڈی لگا دی تھی۔ یہ صرف دو کمروں پر مشتمل انتہائی خستہ حال چار دیواری تھی جس کی وضع قطع سے صاف پتا چل رہا تھا کہ مدتوں سے اس کا رنگ و روغن اور تعمیر و ترقی پر کوئی توجہ نہ دی گئی تھی۔ میں فوزیہ کی پیروی کرتے ہوئے

ایک کمرے میں داخل ہوا جس میں ایک پرانی چار پائی پر چند برتن صاف ستھرے دھلے پڑے تھے اور ایک مٹی کے تیل کا چولہا بھی ساتھ رکھا تھا۔ چار پائی کے دوسری طرف دو پرانی سی کرسیاں پڑی تھیں۔ یہ کمرہ شاید بطور کچن استعمال ہوتا تھا۔

''معاف کرنا میرے پاس آپ کو بٹھانے کے لیے اس سے اچھی کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ دوسرے کمرے میں بچے ابھی سو رہے ہیں۔ ہمارے وہاں بیٹھنے سے وہ ڈسٹرب ہوں گے۔ اس لیے اس جگہ گزارہ کرنا ہوگا۔'' اس نے انتہائی سنجیدہ اور درد بھرے لہجے میں کہا۔

وہ میلے کچیلے اور انتہائی بوسیدہ لباس میں بھی شہزادی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کی سوجن بتا رہی تھی کہ وہ کئی راتوں سے سو نہیں سکی ہے۔ میرے ضبط کے بندھن آخری حد تک ٹوٹنے کو تھے لیکن انتہائی جبر سے ضبط کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔

''شکر ہے کہ تم نے آج پہچان تو لیا ورنہ تو مجھے سخت ڈر تھا کہ کہیں دروازے سے ہی نہ دھتکار دو۔'' میں زخمی لہجے میں بولا۔

''پہچان تو میں کل بھی گئی تھی لیکن مجھے آپ کی عزت کا خیال تھا اس لیے سخت انجان اور بے مروت بن گئی تھی۔ کیونکہ میری بدنامی کی ذلت میں آپ کی نیک نامی بھی داغدار ہو جاتی اور یہ مجھے کسی صورت بھی گوارہ نہ تھا۔'' اس نے انتہائی زخمی مسکراہٹ سے جواب دیا تھا۔

''چائے پیو گے؟'' اس نے سلور کی کیتلی چولہے پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تمہارے ہاتھ سے زہر بھی بڑے شوق سے پی لوں گا۔ میں آج بھی وہی قاسم ہوں۔'' میں نے سخت رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''مگر میں اب وہ پہلے والی نیک اور پاک صاف فوزیہ نہیں ہوں خان صاحب، اب تو میں تمہاری شریف اور عزت دار دنیا میں بدنامی و رسوائی کا ایک بہت بڑا داغ ہوں۔ معاشرے کا بہت بڑا ناسور اور گناہ۔ اب تو میری چائے بھی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ مجھے یقین کامل تھا کہ آپ ضرور مجھے ڈھونڈو گے اور ڈھونڈ بھی لو گے۔ اس لیے شاید مجھے آپ کے آنے کا انتظار تھا۔'' اس کے ایک ایک لفظ میں زہریلے نشتر مجھے زندہ درگور کرنے پر تیار لگتے تھے۔

اس نے ایک پیالی میں چائے میری طرف بڑھائی تھی اور دوسری پیالی خود اٹھالی تھی۔

''قاسم خان صاحب! میں جانتی ہوں کہ آپ کس کھوج میں یہاں پہنچے ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے ذہن میں کیسے کیسے جواب طلب سوال سر اٹھا رہے ہیں اور آپ یہ سب جاننے کے لیے کتنے بے تاب ہیں۔ یہی جاننے اور پوچھنے آئے ہو ناں کہ وہ فوزیہ جو ایک انتہائی باحیا، عزت پر مر مٹنے والی اور سیدھی سادھی گھریلو لڑکی تھی۔ آج اتنی بے حیا، بے غیرت اور طوائف کی طرح زمانہ ساز کیسے ہوگئی؟ خان صاحب اگر آپ کی جگہ کوئی بھی اور مرد مجھ سے یہ پوچھتا یا میرے در پر آتا تو میں اسے کبھی بھی شاید کچھ نہ بتاتی نہ ہی اس کے لیے اس گھر کا دروازہ کھولتی لیکن میں جانتی ہوں ہزاروں میں چند ایک مردوں کی طرح آپ میں بھی کچھ نہ کچھ انسانیت اور عورت ذات کا احترام ہے اور آپ کے ہر سوال کا جواب اس لیے بھی دینا چاہوں گی کہ آپ کے توسط سے میں نے ان لاکھوں بظاہر غیرت مند اور عقل فل مگر عقل کے اندھوں بظاہر باضمیر مگر اندر سے بے ضمیر، اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر اندر سے کورے کاغذ کی طرح، بظاہر رحم دل مگر انتہائی پتھر اور بے انتہا ظالم بظاہر انسان مگر فطرتاً خونی درندوں سے بھی بڑھ کر مردوں سے کئی سوالات بھی پوچھنے ہیں اور یہ کام بھی میں آپ جیسے ایک مرد سے ہی لینا چاہتی ہوں کیونکہ یہ نام نہاد عورتوں کی عزتوں کے رکھوالے مگر عورت ذات کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے مرد مجھ جیسی کمزور ذات کی عورت کو کبھی بھی سچا جواب نہیں دیں گے نہ ہی میرے سوالوں کا جواب دینے کی ان میں جرأت ہے۔ کیونکہ وہ عورت ذات کو اپنی زر خرید رعایا اور لونڈی سمجھتے ہیں اور خود کو عورت ذات کا پیدائشی اور وراثتی حاکم کہتے ہیں۔ سب سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہوں گی تاکہ آپ کے دل میں میری ذات کے بارے میں کوئی ابہام یا کوئی شک نہ رہ جائے۔ میری باتوں پر یقین کرنا نہ کرنا آپ کا فعل ہوگا۔'' اس نے چائے ختم کی اور پیالی ایک طرف رکھ کر میری طرف متوجہ

ہوگئی اور میں مکمل سنجیدگی سے ہمہ تن گوش تھا۔

''خان صاحب! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری شادی ایک پینسٹھ ستر سالہ شادی شدہ بے اولاد بوڑھے سے کر دی گئی تھی جو دولت مند بھی تھا۔ شادی تو ہوگئی مگر میرے بوڑھے شوہر کے بھائیوں کو میرے بطن سے اولاد کا ہونا قطعاً بھی گوارہ نہ تھا۔ کیونکہ ان کی نظریں میرے شوہر کی جائیداد پر لگی ہوئی تھیں اور وہ کسی صورت بھی اس وراثتی دولت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ میرے شوہر کی ضد کے سامنے بظاہر تو وقتی طور پر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن وہ ہماری تباہی و بربادی کا بہت بڑا منصوبہ بنا چکے تھے اور پھر اپنے طے شدہ منصوبے کے تحت میرے شوہر کو ڈاکوؤں کے روپ میں قتل کروا دیا گیا اور میرا قتل بھی طے شدہ تھا لیکن زندگی ابھی ہونے کی وجہ سے میں بچ گئی تھی کیونکہ عین ڈاکے کے بہانے قتل کرنے والوں نے میری بجائے میری سوکن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ مجھے اس رات پیٹ میں شدید تکلیف تھی اور میں باتھ روم میں تھی جب تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ میں باتھ روم میں ہی چھپی بیٹھی رہی۔ بہت سے لوگوں کے اکٹھے ہونے تک میں باتھ روم میں ہی رہی اور یہ کام انہوں نے اس وقت کیا تھا جب میں تقریباً آٹھ ماہ کی حاملہ تھی۔ میں نے شدی کے دو تین ماہ بعد ہی ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا پہلے تو اشارے کنایئے سے عمر رسیدہ شوہر کو سمجھانے اور بتانے کی کوشش کی تھی لیکن جب اس نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی تو میں نے کھل کر اس کو ان خطرات سے آگاہ کیا تھا اور اس نے میری باتوں کو سمجھنے اور آنے جانے والے خطرات کو جاننے کی بجائے الٹا سختی سے مجھے جھڑکتے ہوئے آئندہ ذرا بھی کچھ نہ کہنے کی تنبیہ کی تھی۔ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم بے وقوف اور حاسد عورت ہو تم جیسی عورتیں صرف اور صرف پاؤں کی جوتیاں ہوتی ہیں اور پاؤں کی جوتی کو ہم لوگ سر پر کبھی نہیں بٹھاتے۔ اسے اپنے بھائیوں پر اعتماد تھا اور وہ اپنی جگہ سچ بھی کہہ رہا تھا کیونکہ میں دیکھ اور بھگت رہی تھی بلکہ میرے ساتھ ساتھ اس خاندان میں ساری عورتیں ہی بھگت رہی تھیں کیونکہ انہیں اس خاندان میں واقعی پاؤں کی جوتی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ ہم اس خاندان کے مردوں کی بے اختیار رعایا اور من مرضی کے سلوک کی مستحق تھیں۔ میری ایک دیورانی کے ساتھ تو جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوتا تھا۔ یہ کٹر اجڈ جاہل اور عورت ذات کے معاملے میں انتہائی ظالم لوگ تھے۔ ان سب کی خوب صورت سے خوب صورت اور ان کی عمروں سے چھوٹی من پسند بیویاں گھر میں موجود تھیں لیکن یہ لوگ پھر بھی اپنی بیٹیوں اور پوتیوں کے برابر کی نوجوان لڑکیوں کو ڈیرے پر اپنی عیاشیوں کے لیے لاتے رہتے تھے۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ جب میرے شوہر اور سوکن کو قتل کر دیا گیا اور میں زندگی باقی ہونے کی وجہ سے بچ گئی اور پولیس سے ملی بھگت اور رشوت دے کر وہ لوگ اس قتل کی واردات سے صاف بچ نکلے تو میری ٹوہ میں رہنے لگے تھے۔ اس گھر میں موجود چھوٹی بڑی سب خواتین کو یقین کامل تھا کہ اگر میں کچھ عرصہ تک مزید اس گھر میں رہی تو مجھے بھی کسی نہ کسی بہانے قتل کر دیا جائے گا اور مجھے تو صاف یقین تھا ہی مگر مجھے ذرا بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں خود کو کیسے بچاؤں۔ میری چھوٹی دیورانی نے مجھے یہاں سے فرار ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ میری بہت ہمدرد عورت تھی لیکن یہاں سے آسانی سے فرار ہونا اور کہیں دوسری جگہ جائے پناہ حاصل کرنا بہت مشکل نظر آرہا تھا اور پھر ایک دن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے یہ موقع مل ہی گیا۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے جنازے و آخری دیدار کے لیے دیوروں کو مجھے میکہ بھیجنا مجبوری بن گئی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے شکنجے سے بھاگ کر کہیں بھی نہیں جا سکتی ہوں۔ میں میکے پہنچی اور والد کے دفن کے دوسرے دن آسیہ اور ماں جی سے اپنی زندگی بچانے کی بھیک مانگی اور انہوں نے ملک چاچا کو سارے حالات بتا کر میری مدد کرنے کی التجا کی تو ملک چاچا میری مدد کرنے کو راضی ہو گئے۔ اس شرط پر کہ زندگی بھر اس معاملے میں ان کا کبھی ذکر نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ میرے سسرال کی طاقت اور بدمعاشیوں سے خوب واقف تھے اور اکیلے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ملک چاچا نے گاؤں کے ایک انتہائی بااعتماد نوجوان کے ذمے مجھے شہر میں پہنچانے کا ذمہ لگایا

جس کی ایک سگی خالہ حال ہی میں یہاں شہر میں رہائش پذیر ہوئی تھی اور اس کا خاوند پولیس میں چھوٹا تھانیدار تھا۔ وہ نوجوان ملک چاچا کے توسط سے مجھے رات کے اندھیرے میں میکے سے شہر میں لے آیا اور خالہ کے گھر چھوڑ کر صبح سویرے ہی واپس گاؤں لوٹ گیا۔ ملک چاچا اور آسیہ نے اپنی جمع پونجی سے دو ہزار مجھے جیب خرچ کے لیے بھی دیئے تھے۔ میں یہ بتانا بھول گئی ہوں کہ میری شادی کے چند ماہ بعد ہی میری ایک دور کی خالہ میری چھوٹی بہن کو بطور لے پالک بیٹی اپنے ساتھ لے گئی اور ابے نے بھی اسے اپنے اوپر بوجھ تصور کرتے ہوئے بڑی خوشی سی سے خالہ کو بخش دیا تھا۔ البتہ میرا معصوم اور معذور بھائی ابے کے پاس ہی تھا جس کی حفاظت ابے سے زیادہ آسیہ اور ماں جی کیا کرتی تھیں۔ گاؤں سے فرار ہوتے وقت میں وہ پاؤں سے معذور بھائی بھی ساتھ لیتی آئی تھی۔ چند دن تک تو میں سخت ڈری چھپی رہی، پھر یہاں شہر والی خالہ اور خالو نے مجھے سمجھایا اور حوصلہ دیا کہ اب وہ دشمن لوگ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ بلکہ وہ میرے اس فرار سے مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ بغیر مجھے قتل کیے ہی ان کی جان چھوٹی پھر بیٹے کی ولادت تک میں یہاں والی خالہ کے گھر رہی اور ان کے گھر میں ملازموں کی حیثیت سے وقت گزارتی رہی اور پھر ان کے ایک جوان بیٹے کی وجہ سے جو ہر قیمت پر میرے جسم کا طالب تھا یہ گھر بھی چھوڑ دیا اور اس گھر میں بطور کرائے دار آ گئی۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کوئی ذرائع آمدن نہ تھے اور بھیک مانگنا مجھے گوارہ نہ تھا۔ دو تین گھروں میں بطور گھریلو ملازمہ کے کام کرنے کی کوشش کی کیونکہ میرے ساتھ دو اور بھی معصوم زندگیاں وابستہ تھیں اور وہ دونوں معصوم بچے ابھی میرا ساتھ دینے اور اپنا پیٹ پالنے کے قابل نہیں تھے۔ بدنصیبی در بدنصیبی کہ میں جس گھر میں بھی کام کاج کے لیے گئی وہاں کے مرد حضرات مجھے روٹی دینے کے بہانے میری جوانی کے شدید طلب گار ثابت ہوئے اور میں اپنی عزت بچاتے ہوئے سخت ناکام ہوئی تھک ہار کر میں نے ایک اپنی جیسی غریب واقف کار عورت کی وساطت سے شہر کی مختلف میناری اور کڑھائی سلائی والے کپڑوں کی دکانوں سے تھوڑے تھوڑے معاوضے پر کام لینا شروع کر دیا۔ ان دکانوں کے مالک بھی چونکہ مرد حضرات ہی ہیں۔ وہ میری جوانی اور حسن کو دیکھ کر کام تو دے دیتے ہیں لیکن ان کی اولین اور شدید خواہش رہتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی قیمت پر میری جوانی وصول کر سکیں۔ یہ کام میں نے ابھی ایک ماہ پہلے ہی شروع کیا ہے۔ چونکہ کام وصولی کی وجہ سے میرا واسطہ بازار کی مختلف دکانوں سے رہتا ہے اس لیے ہر دوسرا دکاندار مرد مجھے بدچلن عورت سمجھتا ہے۔ حالانکہ آج تک کوئی بھی مرد مجھے چھونے تک کی جرأت نہیں کر سکا ہے۔ مجھے کام دینے کے بہانے یہ لوگ رات کو دکانوں یا گھر کی بیٹھکوں میں بلانے کی کوشش کرتے ہیں اور میں مجبوراً جھوٹے وعدے کر کے انہیں ٹالتی رہتی ہوں۔''

''خان صاحب یہ تو تھی میری مختصری کہانی۔''

وہ اپنی داستان سنا رہی تھی اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ کہانی سنا چکی تو ایک کپ چائے کا اور مجھے بنا کر دیا۔

''ہاں تو خان صاحب چونکہ آپ لکھاری بھی ہیں، میں آپ کے توسط سے چند ایک سوالات معاشرے کے ان مردوں سے پوچھنا چاہتی ہوں جو عورت کو پاؤں کی جوتی، محکوم اور بے زبان رعایا گھر کا پالتو جانور اور عقل و دماغ سے عاری صرف اور صرف اپنی عیاشی کا ذریعہ اپنی نفسانی خواہشات کا بے دام غلام سمجھتے ہیں۔ کیا ایسے مردوں کی جنم دینے والی ایک عورت نہیں تھی کیا بچپن میں انہیں دودھ پلانے والی عورت نہیں تھی۔''

فوزیہ کی ویران آنکھوں میں اور بھی کئی سوالات تھے لیکن میرے پاس فی الوقت اسے مطمئن کرنے کے لیے ایک بھی جواب نہیں تھا۔ ہاں کچھ دنوں بعد میں نے اتنا ضرور فرض ادا کیا تھا کہ اس کے لیے ایک مستقل چار دیواری اور عزت سے روزی روٹی کا بندوبست کر دیا تھا اور یہ سب کرنے میں میرے ضمیر سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی پاک و بابرکت ذات نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا لیکن ایک عورت کی حیثیت سے اس کے سوالات آج بھی اپنی جگہ جواب طلب ہیں۔

☆☆☆

ناول

کاوش صدیقی

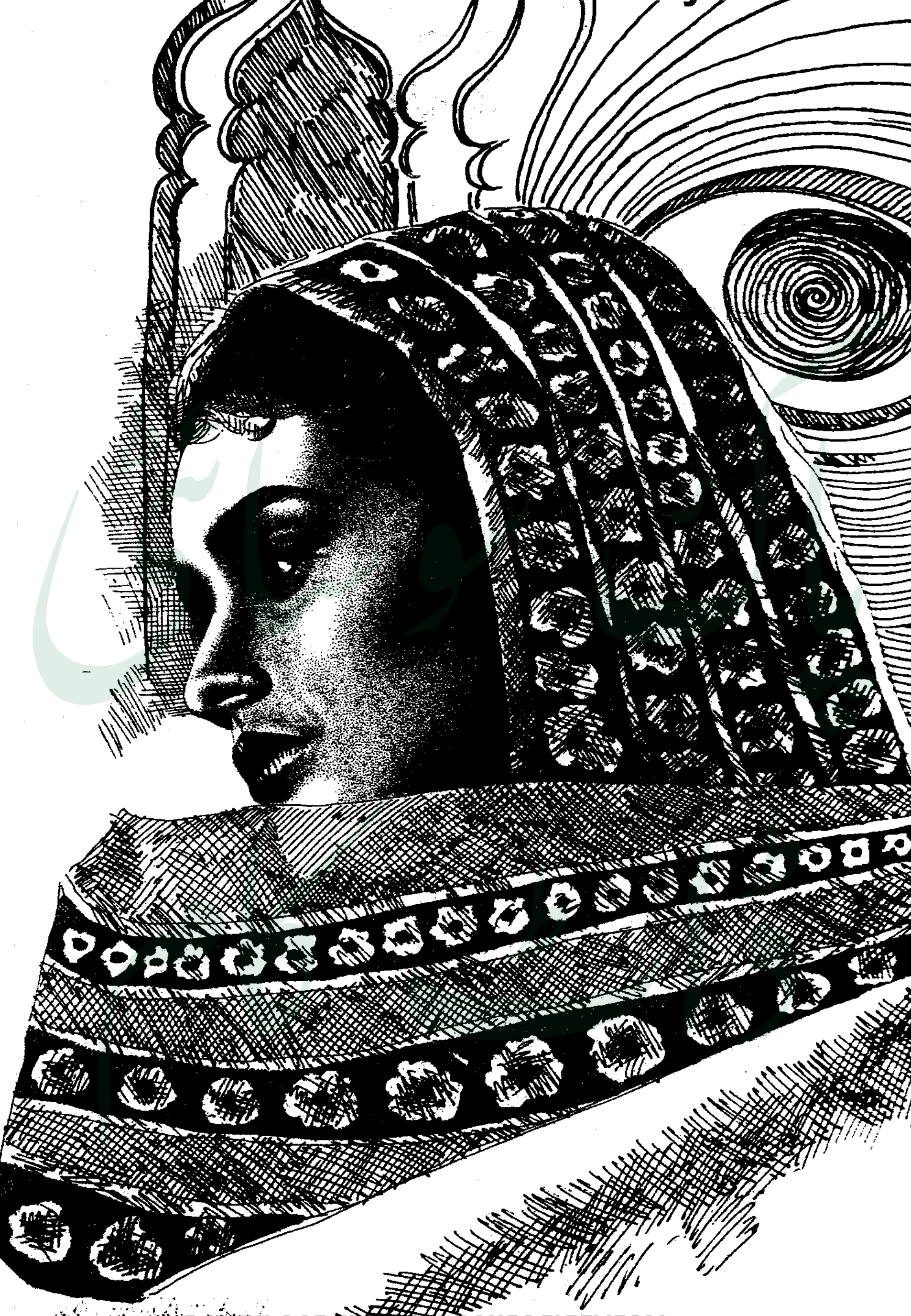
خانقاہ

قسط نمبر: 07

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مرد درویش کی داستان، عجب تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

شاہ ہارون گیلانی بہت مطمئن تھے۔ بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ وہ اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میڈیا ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے سب سے بڑے نیوز چینل کے ساتھ ڈیل کی تھی۔ مگر دیگر چینل بھی یہی کچھ کر رہے تھے۔





حالانکہ انہوں نے کسی دیگر چینل سے کوئی بات نہیں کی تھی۔لیکن ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، کے مصداق اب سارے چینل ایک ہی راگ الاپ رہے تھے۔ مستقبل کا وزیراعظم۔شاہ ہارون گیلانی۔

انہیں صبح دارالحکومت جانا تھا۔وہاں میٹنگ تھی۔ پارٹی سربراہ اور وزیراعظم نے یہ ہنگامی میٹنگ طلب کی تھی۔ان سے فون پر صرف اتنا ہی کہا گیا تھا کہ وہ فوراً پہنچیں۔بہت ضروری میٹنگ ہے۔

مگر اس سے قبل ہی انہیں اس میٹنگ کا ایجنڈا معلوم ہو گیا تھا۔انہیں منیجر طارق نے ایک لفافہ دیا تھا۔سربمہر لفافہ۔جس میں سے ایک پرچہ ملا تھا۔جس پر لکھا تھا۔''میٹنگ صرف آپ کے لئے بلائی جا رہی ہے۔تیاری کر کے آیئے گا۔۔۔آپ کا خیر خواہ۔۔''

اس سے قبل بھی بعض مراحل پر انہیں اس قسم کے پرچے ملے تھے۔مگر ان کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ ان کا یہ خیر خواہ کون تھا۔جو اجنبی ہونے کے باوجود ان کے ساتھ تھا۔

انہوں نے احمد اورنگ زیب کو بتایا۔''میں صبح دارالحکومت جا رہا ہوں۔وہاں کوئی کانفیڈینشل میٹنگ ہے۔''

''یہ بڑے شاہ جی کی شہادت کے بعد پہلی میٹنگ ہے۔''احمد اورنگ زیب نے بڑے احترام سے کہا۔''غالباً اس کا پس منظر میڈیا کا حالیہ رویہ ہے۔۔۔!''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔!''انہوں نے مسکرا کے کہا۔''مجھے تمہاری یہی سمجھداری پسند ہے۔زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔۔۔''

''یہ سب کی آپ تربیت اور توجہ کا نتیجہ ہے۔!''احمد اورنگ زیب نے شکر گزار لہجے میں کہا۔''سب آپ ہی سے سمجھا ہے۔!''

''صبح جلدی نکلنا ہے۔میٹنگ کا آغاز ٹھیک نو بجے ہو گا۔''انہوں نے بریفنگ دی۔''اظہر صدیقی سے کہنا کہ مجھے اس کے چینل کا نمائندہ کچ کر لے اور صرف ایک ہی سوال پوچھے۔مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے۔۔؟''

''جی ٹھیک ہے۔۔!''مستعد اور ذہین احمد اورنگ زیب مسکرایا۔

شاہ ہارون گیلانی بھی مسکرائے۔''تم بہت فطین ہو۔۔۔!''

احمد اورنگ زیب نے جھک کے انکے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔''آپ کے قدموں کے طفیل ہی ہوں۔جو کچھ بھی ہوں۔!''

☆☆☆

وہ ایوان وزیراعظم کے بجائے دارالحکومت پارٹی کے سربراہ کی وسیع وعریض کوٹھی پر پہنچے تھے۔انہیں یہیں بلایا گیا تھا۔جیسے ہی وہ گاڑی سے اترے۔کئی رپورٹرز نے انہیں گھیر لیا۔وہ ان سے مختلف سوالات پوچھ رہے تھے۔انہوں نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔میں تو سیدھا اپنے بھائی کی شہادت کے بعد یہاں آ رہا ہوں۔اب میٹنگ کے بعد ہی کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہوں گا۔''

''سر میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔!''اچانک ایک نمائندے نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔انہیں دور ہی سے مائک پر لگا ہوا لوگو نظر آ گیا۔''

''ہاں پوچھیے۔۔!''انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر آپ کو اس غم کی فضا میں، اچانک کیوں طلب کیا گیا ہے۔؟''اس نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''مجھے طلب کیا گیا ہے۔؟''اچانک شاہ ہارون گیلانی کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔چہرے کے تاثرات بدل گئے۔اس سوال کو سنتے ہی سارے رپورٹرز اچانک چپ ہو گئے۔کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ شاہ ہارون گیلانی جیسی طاقت ور سیاسی شخصیت اور اتنے اہم وزیر کو طلب کیا جا سکتا ہے کہ جیسے الفاظ کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

''کس نے کہا ہے آپ سے۔؟''ان کی گرجدار آواز جیسے سارے میں گونج گئی۔

''ہمیں اطلاع ملی تو یہ سوال پوچھ لیا۔اگر ناگوار گزر رہا ہے تو میں اپنا یہ سوال واپس لیتا ہوں۔''نمائندے نے گھبرا کے کہا۔اور مائیک نیچے کر دیا۔

ہارون گیلانی کچھ نہ بولے اور اندر کی جانب چلے گئے۔

پارٹی سربراہ اور وزیراعظم یہ لائیو کوریج دیکھ رہے تھے۔ ''یہ کیا کیا اس نے۔؟''

''کیا ہوا۔؟'' وزیراعظم نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے؟ ساری بازی الٹ کے رکھ دی اس نے۔'' پارٹی سربراہ نے غصے کے عالم میں کہا۔

وزیراعظم نے سوال کیا۔ ''آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔؟''

''ابھی دیکھ لینا۔!'' وہ بری طرح تلملا رہا تھا۔

چند ہی لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ اور شاہ ہارون گیلانی اندر داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور اعصاب انتہائی کشیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ میری بے عزتی کیوں کی جا رہی ہے۔؟'' ان کا لہجہ بے حد سخت تھا مگر انداز دھیما۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔ اور سردار حیات اللہ اندر داخل ہوا۔ ''میں بھی تو یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔؟''

''آپ بیٹھیں تو سہی، شکوے شکایتیں بھی ہو جائیں گی۔!'' وزیراعظم نے کشیدہ ماحول کو سنبھالا دینے کی اپنی سی بھرپور کوشش کی۔

''میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے طلب کس نے کیا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

''ہم نے تمہیں بلایا ہے۔ شاہ ہارون گیلانی۔'' پارٹی سربراہ نے کہا۔ ''گفتگو بیٹھ کر، تسلی سے، اطمینان سے بھی ہو سکتی ہے۔!''

''کیا آپ لوگوں کو میری اس بے عزتی کے بعد مجھ سے کوئی توقع رکھنی ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی زہر آلود لہجے میں بولے۔

''کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ جب یہ میٹنگ انتہائی کانفیڈنشل تھی تو میڈیا یہاں کیا کر رہا تھا؟ اور پھر اس کو یہ بریفنگ کس نے دی؟۔ آپ جانتے ہیں کہ اس سے میرے امیج کو کتنا نقصان پہنچے گا۔ میرے ووٹرز کیا سوچیں گے۔ ہمارے شاہ جی ہمارے ناخدا کو طلب کیا گیا ہے۔ ایک مجرم کی طرح۔ ایک ایسے شخص کو کہ جس نے پارٹی کے لئے اپنا خون دیا۔ روپیہ پیسہ، تعلقات، وقت دیا۔ بے لوث، بے طلب آدمی کی اتنی بے عزتی۔!'' شاہ ہارون گیلانی بولنے پر آئے تو لگاتار بولتے چلے گئے۔

''پتا نہیں۔۔۔ یہ منحوس میڈیا ہر جگہ سائے کی طرح کیوں پہنچ جاتا ہے۔!'' وزیراعظم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''رہنے دیجئے یہ بے تکی باتیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے ناگواری سے کہا۔ ''میڈیا کو پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے منہ میں سوال ڈالے جاتے ہیں۔''

''اور اگر یہی بات میں تم سے کہوں۔؟'' پارٹی سربراہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم جو کچھ کر رہے ہو اس کا کیا مطلب لیا جائے۔ کھلی بغاوت۔؟''

''میری کوئی ایک بات، ایک سوال، کوئی ایک ایسی بریفنگ بتا دیں، جس میں کسی پارٹی فیصلے سے انحراف کیا گیا ہو۔ کوئی ایسے معاملہ کی جس سے میرا کوئی قصور ثابت ہو۔ یہ تو میڈیا کے معاملات ہیں کہ جس زاویئے سے وہ چاہیں اپنے تجزیئے کریں۔ اس میں میرا کیا قصور۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ہمیں بیٹھ کر، ٹھنڈے دل سے بات کرنی چاہیے۔!'' پارٹی سربراہ نے صلح جو انداز اختیار کر لیا۔

''اس کے بعد بھی۔؟'' ہارون گیلانی ٹی وی کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''دیکھئے وہاں کیا چل رہا ہے۔؟''

پارٹی سربراہ نے چونک کر کہا۔ ''یہ کیا۔۔۔؟''

تازہ ترین خبر کا ٹکر چل رہا تھا۔ ''شاہ ہارون گیلانی کی اچانک طلبی۔ پارٹی سربراہ اور وزیراعظم میں سے کسی نے ان

کے استقبال کے لئے باہر آنا پسند نہیں کیا۔ کیا پارٹی ہارون گیلانی سے چھٹکارہ پانا چاہتی ہے۔؟''

''بہت خوب۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''یہ جملے کس صحافی کی جرأت ہے کہ اپنی مرضی سے اپنے قیاس سے لگائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے راستے جدا کر لینا ہوں گے۔'' شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''یہ کون کر رہا ہے۔؟''

''میں اب یہاں نہیں رکنا چاہتا۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔

''ایک منٹ شاہ ہارون گیلانی۔'' پارٹی سربراہ نے انہیں ٹوکا۔ ''یہ کوئی بہت بڑی سازش ہو رہی ہے ہمارے خلاف۔ ہمیں مل کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔!''

''یہ سب آپ کی کمزور شخصیت کا شاخسانہ ہے۔!'' اچانک سردار حیات اللہ نے مداخلت کی۔ ''آپ نے پارٹی ڈسپلن کا بیڑہ غرق کر دیا۔ ہر سیٹ پر آپ ہی کا کوئی زرخرید بیٹھا ہوا ہے۔ جس کو نہ کسی کی خدمات کا احساس اور نہ ہی کسی کے جذبات کا۔ آپ نے صرف اپنے مفادات کی خاطر پارٹی کا سارا امیج تباہ کر دیا۔''

''یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے صدمے کے عالم میں کہا۔ ''بجائے اس کے کہ تم لوگ اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم لوگ تو خود ہی غیر بنتے جا رہے ہو۔!''

''آپ نے ساری زندگی صرف اپنی منوائی۔ آپ صرف اپنا راج چاہتے ہیں۔ ان لوگوں سے کام لینا چاہتے ہیں جو صریحاً خوشامدی ہیں۔ جن کی سب سے بڑی قابلیت خوشامد ہے۔ آپ کی خوشامد!''

''یا اللہ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟'' سربراہ نے بے بسی سے کہا۔

''یہ سب آپ کے غلط فیصلوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔!'' سردار حیات اللہ نے کہا۔ ''میں نے پچھلے ماہ تیس کروڑ دیئے تھے پارٹی فنڈز میں، وزیر اعظم کو مرسڈیز بینز کا گفٹ دیا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا۔ میرے ہی سب ٹینڈر منسوخ ہو گئے۔ میرٹ پر۔!'' سردار حیات اللہ نے دانت کچکچائے۔ ''جس وقت پارٹی کو فنڈ کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت میرٹ کہاں چلا جاتا ہے۔؟''

''تم نے یہ کیا کیا۔؟'' پارٹی سربراہ نے غصے سے پوچھا۔ ''حیات اللہ کا ٹینڈر کیوں نہیں پاس ہوا۔؟''

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔!'' وزیر اعظم نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر پھر تھوک نگل کر رہ گیا۔

''میں بتاتا ہوں۔!'' سردار حیات اللہ نے کہا۔ ''ٹینڈر ریحان والوں کا پاس ہوا۔ کیونکہ وہ ان کا سسرالی رشتے دار ہے۔ واہ خرچ ہم کریں۔ اور منافع کمائیں دوسرے۔ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ میں بھر پایا تم لوگوں سے۔ کیا دیا ہے تم لوگوں نے مجھے۔ الٹا میری جان کو عذاب بن کر چمٹ گئے ہو۔!''

''حفظ مراتب بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔!'' وزیر اعظم نے قدرے سنبھل کر کہا۔

''مجھے حفظ مراتب نہ سکھاؤ۔'' سردار حیات نے طنز کیا۔ ''حفظ مراتب کا لحاظ رکھا جاتا تو پھر تم آج بھی کسی معمولی وزارت سے زیادہ کے حق دار نہیں تھے۔ یہ تو انہوں نے تمہارے اوپر مہربانی کی ہے۔ کتنے ہی اہل لوگوں کو نظر انداز کر کے۔۔۔!''

اچانک ہی پارٹی سربراہ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے چونک کر دیکھا پھر فون اٹھا کر قریب کر لیا۔

''سر لوگ سخت ناراض ہو رہے ہیں۔ فون پر فون آ رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟''

''کیا ہو رہا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے حیرت سے پوچھا۔

''سر لوگ سخت غصے میں ہیں۔ یہ آپ لوگوں نے سر ہارون گیلانی کے ساتھ کیا سلوک کرنا شروع کر دیا ہے۔ ذرا ٹی وی پر دیکھئے خبریں چل رہی ہیں کہ آپ لوگ شاہ ہارون گیلانی کو شوکاز ایشو کر رہے ہیں۔ ڈسپلن کی خلاف ورزی پر۔ سر آپ کو اندازہ نہیں کہ لوگ پارٹی سے برگشتہ ہو جائیں گے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ فوراً یہ اعلان کرو کہ شاہ ہارون گیلانی سے کوئی اختلافات نہیں۔ یہ میٹنگ صرف ضمنی الیکشن کے حوالے سے بلائی گئی ہے۔!''

''سر اس کا الٹا اثر ہوگا۔!''

''تو پھر کیا کروں۔؟''

''سر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جس خبر کی تردید کی جائے لوگ اس کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی اور طریقہ ڈھونڈیئے۔''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔۔۔!'' اس نے فون بند کر دیا۔

''کون تھا۔۔!'' وزیر اعظم نے پوچھا۔

''ستار تھا۔!'' پارٹی سربراہ نے بتایا۔ ستار پارٹی کا مرکزی سیکریٹری اطلاعات تھا۔ ''کہہ رہا تھا کہ میڈیا کی ان خبروں سے اشتعال پھیل رہا ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے۔؟''

''میری سن لو۔!'' سردار حیات اللہ نے مداخلت کی۔ ''میں خبر دے رہا ہوں، فی الحال سارا معاملہ دب جائے گا۔''

''کیا خبر۔۔۔؟''

''میں سردار حیات اللہ پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کرتا ہوں۔'' سردار حیات اللہ نے جیسے دھماکا کیا۔

''کیا فضول بات ہے سردار صاحب۔ ناراض کوئی ایسے ہوتے ہیں۔!'' وزیر اعظم نے اس کا باز و تھام لیا۔

''میں ناراض نہیں ہوں۔!'' سردار حیات اللہ نے اپنا باز و چھڑایا۔ ''ناراض تو ان سے ہوتے ہیں جن سے کوئی رشتہ، کوئی تعلق رکھنا ہو۔ مجھے اب آپ لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔!''

''شاہ ہارون گیلانی آپ ہی سمجھائیں ان کو۔!'' وزیر اعظم نے امداد طلب انداز میں انہیں دیکھا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں۔ سردار حیات اللہ کو اگر کوئی شکایت ہے تو پھر ان کی ناراضگی بجا ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے بڑی نرمی سے اپنا آپ بچا لیا۔

سردار حیات اللہ ان لوگوں کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ ڈیڑھ فرلانگ بعد ہی جیسے وہ پورچ میں پہنچا۔ اچانک جیسے چاروں طرف سے چینلز کے درجنوں نمائندے ابل پڑے۔ انہوں نے چاروں طرف سے سردار حیات اللہ کو گھیر لیا۔ اور میٹنگ کے حوالے سے سوالات کرنے لگے۔ سردار حیات اللہ نے کہا۔ ''اگر آپ لوگ خاموش رہیں تو میں کوئی بات کروں۔!''

اچانک جیسے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

سردار حیات اللہ نے کہا۔ ''میں پارٹی سے علیحدگی اختیار کر رہا ہوں۔!''

یہ بہت بڑی بریکنگ نیوز تھی۔ سارے میڈیا میں ہلچل مچ گئی۔ صحافیوں نے تابڑ توڑ سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ سردار حیات اللہ بغیر کوئی جواب دیئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک کسی نے چیخ کر پوچھا۔ ''ارے صرف اتنا ہی بتا دیجئے کہ ہارون گیلانی کے متعلق کیا فیصلہ ہوا ہے۔ کیا وہ بھی علیحدگی اختیار کر لیں گے۔؟''

''یہ ان کا مسئلہ ہے۔ وہ آنے ہی والے ہیں ان کا انتظار کر لیں۔!'' یہ کہہ کر سردار حیات اللہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اندر جیسے فضا ایک دم سوگوار ہو گئی۔ پارٹی سربراہ، وزیر اعظم ہکا بکا ٹی وی اسکرین دیکھتے رہے۔ جس پر بریکنگ نیوز چلنے لگی تھی۔ ''سردار حیات اللہ نے وزیر اعظم اور پارٹی سربراہ سے اختلافات کے بعد پارٹی چھوڑنے کا اعلان کر دیا ہے۔ شاہ ہارون گیلانی بھی جلد ہی کوئی اہم فیصلے کا اعلان کرنے والے ہیں۔''

''شاہ ہارون گیلانی یہ کیا ہو رہا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے بے بسی سے کہا۔

''بات اچھی تو نہیں ہے۔ لیکن سچ ہے۔'' شاہ ہارون گیلانی نے نرمی سے کہا۔ ''آپ اپنی پارٹی کے اوپر گرفت کھو

رہے ہیں۔اوراس بات کو ماننے کے لئے بھی تیار نہیں۔!''

''میں۔۔۔میں۔۔کیا کروں۔؟'' پارٹی سربراہ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔وہ انجائنا کا مریض تھا۔ایک حد سے زیادہ دباؤ اس کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلا۔اور پارٹی سربراہ کو دیا۔اس نے ممنون نگاہوں سے دیکھا۔شاہ ہارون گیلانی نے شیشی اٹھائی اور درد کم کرنے والی گولی نکال کر اس کو دی۔پارٹی سربراہ نے فوراً ہی گولی زبان کے نیچے رکھ لی۔چند منٹ خاموشی چھائی رہی۔پارٹی سربراہ نے دو چار گھونٹ پانی کے لئے۔پھر شاہ ہارون گیلانی کی طرف دیکھا۔پھر وزیراعظم کی طرف۔

''تم نے کیا کیا تھا۔؟''

''میں کیا کروں۔؟'' وزیراعظم نے کہا۔''سردار حیات اللہ ہرٹینڈر، ہر ٹھیکے کو اپنی ہی ملکیت سمجھتے ہیں۔مجھے کئی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔پارٹی کو دوسرے لوگ بھی فنانس کرتے ہیں۔ان کے مفادات بھی ہیں۔ذرا سال بھر کے معاملات دیکھ لیں۔سردار حیات اللہ اور ان کی نامزد فرم کو ہی ہر چیز ملتی رہی ہے۔پھر دیگر وزراء ہیں، وزرائے مملکت ہیں، دیگر پارٹیوں کے لوگ ہیں۔آخر کیا کیا کروں۔؟'' وزیراعظم نے بے بسی سے کہا۔

''سب کو ہی یہ کرسی اچھی لگتی ہے۔مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔اس کی قوت، اس کی کشش ہی ایسی نیاری ہے کہ ہر شخص اس کے لئے جو بھی کرے وہ تھوڑا ہے۔مگر حلف اٹھانے کے بعد ہی یہ کرسی، موت کی کرسی لگنے لگتی ہے۔ذمہ داری سے بڑا آزار کوئی نہیں ہوتا۔!'' انہوں نے کنکھیوں سے ہارون گیلانی کی طرف دیکھا۔مگر ان کے چہرے پر قطعاً کوئی تاثر نہ تھا۔بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ انہوں نے ایک لفظ بھی سنا نہیں۔

''لیکن اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی ذریعہ بھی تو ڈھونڈو۔'' پارٹی سربراہ نے کہا۔

''کیسے۔۔۔؟'' وزیراعظم نے بے تابی سے پوچھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر پارٹی سربراہ کو مخاطب کیا۔''میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ چند دن آرام کیجئے۔اپنی صحت کا خیال رکھیں۔جہاں تک حالات کا تعلق ہے۔تو ہمارے جہاندیدہ، سمجھدار، وزیراعظم سارے معاملات سنبھال لیں گے۔''

''یہ اکیلے کیا خاک کرے گا۔؟'' پارٹی سربراہ نے ناگواری سے کہا۔''تقریر کرنا اور ہے۔سیاسی جوڑ توڑ کرنا اور بات ہے۔بندہ گڑ نہ دے۔گڑ جیسی بات تو کرے۔یہ تو گڑ مانگنے والوں کو مار بھگانے کا کام ہی کر سکتا ہے۔''

شاہ ہارون گیلانی کو اس ساری صورتحال میں پہلی بار اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کے لئے اپنے اوپر بڑا جبر کرنا پڑا۔

اچانک وزیراعظم نے رف پیڈ اپنی طرف کھینچا اور اس پر تیزی سے کچھ لکھ کر پیڈ پارٹی سربراہ کے سامنے رکھ دیا۔اور خود تیزی کے ساتھ ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ بند کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆☆☆☆

میں اور قدیر خادم حسین کے علاقے کو دیکھنے نکل گئے۔یہ تجویز قدیر ہی کی تھی۔''یار ذرا علاقہ گھومتے پھرتے ہیں۔دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔پھر ہرے بھرے کھیت فلموں میں دیکھے ہیں۔یا بھی دورانِ سفر۔اب آئے ہیں تو ان کو بھی دیکھ لیں۔ذرا ٹیوب ویل کا ٹھنڈا پانی پی لیں۔''

''چلو۔۔۔!'' میں نے کہا۔اور یوں ہم لوگ گھر سے باہر نکل آئے۔خادم حسین نے ہمارا ساتھ دینے کی پیش کش کی لیکن میں نے منع کر دیا۔وہ محبت سے بھرا تھا۔اور تکلفات کی وجہ سے ہم لوگ آپس میں کھل کے باتیں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ہم لوگ گھومتے پھرتے کھیتوں کے دائیں جانب آموں کے باغ میں نکل آئے۔وہاں کسی کی بڑی سے چارپائی پڑی تھی۔پاس ہی حقہ دھرا تھا۔شائد کوئی ادھر اُدھر، آس پاس ہی ہوگا۔

''چلو یار بیٹھیں ۔۔۔!'' قدیر جا کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''یار زندگی میں کتنا کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے۔'' قدیر نے کہا۔

''ہاں۔۔۔!'' میں نے بھی اس کی تائید کی۔ ''یہ زندگی کی پیچیدہ حقیقتیں، لوگوں کی کیفیات، دیہی زندگی کے سادگی آمیز کردار ہمیں شہر میں دیکھنے کو کہاں ملتے۔ شہر کے مسائل الگ ہیں۔ دیہات کے علیحدہ۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ استحصالی ٹولے کا نام بدل جاتا ہے۔ چہرہ بدل جاتا ہے۔ طریقۂ واردات بدل جاتا ہے۔ لیکن بنیادی مقصد ایک ہی رہتا ہے کہ کس طرح صرف اپنے ہی مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ اور کس طرح لوگوں کے اندر سے احساس کی آخری رمق بھی چھین لی جائے۔۔۔!''

''سچ کہتے ہو۔۔۔!'' قدیر نے ایک گہری سانس لی۔ ''یار ہمارے ہاں کب یہ سسٹم بدلے گا؟''

''مسئلہ سسٹم کا نہیں ہے۔!'' میں نے کہا۔ ''مسئلہ سسٹم کو چلانے والوں کا ہے۔ ورنہ قوانین موجود ہیں۔ ضابطے موجود ہیں۔ اگر کوئی چیز نہیں ہے تو صرف سچی نیت اور اخلاص نہیں ہے۔ اور جب تک یہ مفاد پرست گدھ ہماری ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ ہم مجبور ہیں۔!''

''اس بیماری کا علاج؟'' قدیر نے ہنس کر کہا۔ ''ایک مزید تجربہ۔ ایک اور برا۔ یہی ہے ہماری قسمت؟''

''نوجوانوں کی بیداری، شعور کو بیدار کرنا، اپنے حقوق اور فرائض کا تعین کرنا۔ اور ووٹر کو اس بات کا احساس دلانا کہ اگر وہ غلط آدمی کو، بے کردار کو، بے ضمیر کو، ذات، برداری یا کسی بھی لالچ کے باعث ووٹ دیتا ہے۔ تو وہ اپنے امیدوار کے تمام گناہوں، غلطیوں میں برابر کا حصے دار بھی ہوگا۔ اور دنیا اور آخرت میں عذابِ الٰہی کا سزاوار بھی ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''تم بہت بدل گئے ہو تنزیل۔۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ تنزیل جو بچپن سے میرے ساتھ تھا۔ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ یہ تو کوئی نیا سا، معتبر، معتبر سا تنزیل ہے۔ جس کی ہر بات میں ایک تجزیہ، ایک دلیل، ایک ذہانت ہوتی ہے۔ دوسروں کو متاثر کرنے والی۔ چھا جانے والی۔۔۔!'' قدیر کے لہجے میں پیار بھری ستائش تھی۔

''ہاں۔۔۔! میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بدل گیا ہوں۔!'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لفظ خود بخود نجانے کیسے ترتیب پا لیتے ہیں۔ منتشر سوچ یکسو ہو گئی ہے۔!''

''کتاب لکھنے کی کیفیت نے تمہیں گہرائی اور گیرائی دونوں عطا کر دی۔!'' قدیر نے کہا۔

''کتاب لکھنے کی کیفیت۔۔۔!'' مجھے قدیر کا جملہ اچھا لگا۔ ''واقعی زندگی مختلف کیفیات ہی سے تو عبارت ہے، کامیابی، ناکامی، محبت، حاصل کرنا، کھو دینا، رسائی اور کربِ نارسائی ہر ایک اپنی کیفیات کے حوالے سے ہی تو زندگی کے جواز مرتب کرتے ہیں'' میں نے کہا۔ ''مجھے کتاب نے نہیں قادری سرکار نے بدل دیا ہے۔ وہ کمال سی شخصیت ہیں۔ بغیر کسی بوجھ کے، بغیر کسی ضد کے، اچانک ذات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اٹوٹ انگ۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ بہت دھیرج زندگی کی ایسی باتوں کی، ایسے معاملات، ایسے رخ کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ کہ جس کی طرف دھیان بھی نہیں جاتا ہے۔ مگر سب سے اہم رخ ہی وہی ہوتا ہے۔''

قدیر کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آموں کے درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے اس رخ کی جانب متوجہ تھا۔ جو قادری سرکار نے دیکھ لیا تھا۔ اور جس سے میں، اس کے بچپن کا دوست لاعلم تھا۔

''کوئی بات ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر گھما کے میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بے تاثر تھیں۔ اجنبی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو چھوا۔ وہ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ جب نفس کی حرارت باہر نکلنا شروع ہوتی ہے تو پھر بدن ٹھنڈا ہونا شروع ہوتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے عمل تبخیر سے مٹی کے گھڑوں کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ مائی کے پتلے کے بھیتر سے جب لوبھ، لالچ، طمع، حرص کی

آگ نکلتی ہے تو پھر اس کا برتن ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔سکون پانے لگتا ہے اور اس میں نور، محبت، کشش کے رنگین کے دھارے جذب ہونے لگتے ہیں۔اور مٹی کا آدمی اپنی جگہ پڑے پڑے سونا بن جاتا ہے۔مقناطیس بن جاتا ہے۔دیر بس ایک پارس بندے کے لمس کی ہوتی ہے۔

''کیا کوئی کسی پر اس طرح بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔؟''میں نے سوچا۔

''پی ہو۔۔۔پی ہو۔۔۔!''دور کسی پرندے نے اثبات کا اعلان کیا۔

ہر مخلوق اپنے خالق کو پہچانتی ہے۔روزِ ازل سے،پیدائش کے پہلے لمحے سے جبلت کا شعور کے ساتھ ہی۔سوائے انسان کے۔۔!

اس کو راہ راست پر لانے کے لئے تخلیق کار نے کیسے کیسے تانے بانے بُنے۔کتنے پیار،نکھار،اعتبار کے معاملات۔مگر یہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتا ہے۔اکڑے جاتا ہے۔مگر وہ خالق۔وہ مالک کتنے بھروسے سے اس کا انتظار کرتا ہے۔مگر۔۔!''اس مگر کے ساتھ خوف،اندیشے،ناکامی کے ناگ لپٹے ہوئے پھنکاریں مار رہے ہوتے ہیں۔

''خلیفہ جی۔۔۔!''اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔میں نے دیکھا نیما قصائی مجھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں چائے کے دو پیالے تھے۔اس کے دونوں بیٹے الیکشن کی پرچیاں بنانے میں جتے ہوئے تھے۔

''ارے تم۔۔۔!''

''ہاں جی۔۔۔!''وہ مسکرایا۔''پیچھے ہی میرا گھر ہے۔آپ کو یہاں بیٹھے،باتیں کرتا دیکھا تو سوچا ہمارے خلیفہ جی تو شہری ہیں۔چائے کو دل چاہ رہا ہوگا۔اس لئے بنا لایا۔مگر گڑ کی ہے۔آپ تو شکر والی پیتے ہونگے۔!''اس نے دونوں پیالے باری باری ہمیں تھماتے ہوئے کہا۔

''اس وقت تو واقعی چائے کی طلب ہورہی تھی۔!''قدیر نے ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔چائے سے بڑی سوندھی سی مہک اٹھ رہی تھی۔مٹھاس قدرے زیادہ تھی مگر ذائقہ تھا۔

''یہ سب فطرت سے کتنا قریب ہے۔!''قدیر نے اردگرد کا جائزہ لیا۔فضا میں مٹی کی مہک اور کہیں دور چکی چلنے کی آواز گھلی تلی تھی۔

''سادگی فطرت ہے اور ہماری اصل کا حصہ۔اس لئے جہاں مل جائے ہمیں اپنا لیتی ہے۔!''میں نے کہا۔

''جیسے محبت۔۔!''قدیر نے کہا۔''ہر انسان کی فطرت میں محبت کا عنصر ہے۔وہ اندر سے محبت سے بھرا ہوتا ہے۔فقط خول توڑنے والا کوئی اخلاص والا چاہئے ہوتا ہے۔!''

''محبت کی طلب تو ازل سے ہے،جب ہی تمہاری کتاب''سندیسے جو کھو گئے''اتنی تیزی سے بکی،ہر آدمی اپنی تفہیم چاہتا ہے۔کئی لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس کی تقریب رونمائی کروائیں۔تمہارا کیا خیال ہے۔؟''قدیر نے پوچھا۔

''جیسا مناسب سمجھ کرلو۔!''میں نے جواب دیا اور پوچھا۔''ویسے تقریب رونمائی ضروری ہے کیا۔؟''

''سچ پوچھو تو یہ کتاب کی پبلسٹی کا ہی ایک ذریعہ ہے۔بعض کتابیں اہم ہوتی ہیں۔ان کی طرف توجہ دلانا ضروری ہوتا ہے۔بعض کتابوں کو بکوانے کے لئے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔اخبارات کوریج دے دیتے ہیں۔اور بعض کتابیں سچ مچ اس قابل ہوتی ہیں کہ انہیں سراہا جائے۔سو یہ مختلف خیالات ہیں بزم آرائی کے۔!''قدیر ہنسا۔

اسی وقت میرے موبائل پر بیل ہوئی۔''ہیلو۔۔۔اسلام علیکم۔۔۔!''میں نے کہا۔دوسری طرف مومی تھی۔''کیسی ہو۔؟''

''میں ٹھیک ہوں۔لیکن آپ کب آئیں گے۔میں بہت اداس ہوگئی ہوں۔!''مومی کی روہانسی آواز آئی۔

''ابھی الیکشن تک تو آنا مشکل ہے۔''میں نے کہا اور پوچھا۔''اماں کیسی ہیں۔؟''

''اب میں فون کررہی ہوں تو سب کا خیال آرہا ہے۔!''وہ غصے سے بولی۔''خود سے فون نہیں کیا جاتا۔؟''

''اچھا معاف کر دو۔!'' میں نے کہا۔ ''تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں فون کا کتنا چور ہوں۔!'' میں نے معذرت کی۔

''اماں ٹھیک ہیں۔ تھوڑا بلڈ پریشر زیادہ تھا۔ مگر اب ٹھیک ہے۔ نرگس تو ان کی خوب خدمت کر رہی ہیں۔ سچ بہت اچھی ہیں۔ اتنی پیاری سی۔!'' مومی نے اچانک پٹڑی بدل لی۔

''چلو میری طرف سے اماں کو سلام کہنا اور نرگس کو بھی۔'' میں نے کہا۔ اس نے بھی سلام کر کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''چلو گھر چلیں۔!'' میں نے کہا۔ ''خادم حسین انتظار کر رہا ہوگا۔''

''چلو۔۔۔!'' قدیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے گھر آ گئے۔ راستے میں کئی لوگ ملے، سب نے بڑے تپاک سے سلام دعا کی۔

جب گھر پہنچے تو وہاں دو تین خواتین اور ایک بیس بائیس سال کی لڑکی بڑے کمرے میں موجود تھیں۔ لڑکی رُو رہی تھی۔ جبکہ کشور اس کو پانی پلا رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت ہاتھ نچا نچا کر کسی غیر موجود شخص کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ سب بیک وقت خاموش ہو گئیں۔

ہمیں دیکھ کر کشور ہماری طرف آئی۔ اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ہم لوگ کمرے میں داخل ہو گئے۔

''خیریت تو ہے نا۔۔؟'' میں نے کشور سے پوچھا۔

''ہاں جی۔۔۔!'' کشور نے جواب دیا۔ ''تانی شہر سے آئی ہے۔ تو باجی سے ملنے کے لئے آ گئی۔ ان کی بچپن کی سہیلی ہے۔ ایک اس کی ماں ہے۔ ایک خالہ اور ایک پڑوسن ہماری۔!'' کشور ہمیں جواب دیکر باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں ہی باہر سے آنے والی آوازوں کا شور تھم گیا۔ چند منٹوں کے بعد کشور نے کمرے میں جھانکا اور پوچھا ''آپ لوگوں کو بھوک لگ رہی ہے تو کھانا لگاؤں۔؟''

''بھوک تو نہیں لگ رہی۔ اس لئے کھانا ہم سب ساتھ ہی کھائیں گے۔ البتہ اگر چائے مل جائے تو اچھا ہے۔!'' میں نے کہا۔

''اچھا ابھی لاتی ہوں۔!'' کشور کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہم لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔۔۔!'' میں نے گفتگو کے دوران ہی کہا۔ کسی نے ٹرے ہمارے درمیان رکھی۔ سیاہی مائل گہری کتھی رنگ کی ٹرے کو دو بے حد خوبصورت لانبی انگلیوں والے ہاتھ تھامے تھے۔ یہ کشور تو نہیں تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ کشور کی بڑی بہن تھی۔ تاج ور۔ ''آپ۔۔۔؟''

''جی کشور ذرا تانی کو چھوڑنے گئی ہے اس لئے چائے میں لے آئی۔!''

''مجھے آواز دے لیتیں۔!'' میں نے کہا۔

''اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔!'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''اس کی آواز میں بڑی نغمگی تھی۔ ''کیا خادم حسین نہیں ہیں۔'' اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ ''میں بھائی کے لئے بھی چائے لائی تھی۔''

''وہ تو موجود نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو اس بھائی کے ساتھ چائے پی سکتی ہیں۔!'' قدیر نے مسکرا کے کہا۔

''کیوں نہیں۔۔۔!'' وہ مسکرائی اور ایک مونڈھے کو گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ بہت صبیح، بہت ملائم تھا۔ بالکل تازہ تازہ سا، اخروٹی بال جو کنپٹیوں پر کس کر، کھینچ کر باندھے گئے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت سے بہت مناسبت رکھتے تھے۔ ستواں ناک میں کالی ڈوری کے ساتھ بندھا ہوا ننھا سا سرخ موتی، پیازی ہونٹوں پر باریک باریک سی افقی لکیریں۔ اس کے حسن میں ایک عجیب سا بانکپن تھا۔ تازگی اور سادگی کا۔

''تانی کیوں رو رہی تھی؟۔'' میں نے پوچھا۔

''اس کے شوہر نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔'' تاجور نے بتایا۔

''لیکن کیوں۔۔۔؟'' قدیر نے سوال کیا۔

''شائد محبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''کیا مطلب۔۔؟'' قدیر نے پوچھا۔ ''میاں بیوی میں اختلاف کی وجہ عدم محبت ہے۔؟''

''معلوم نہیں۔۔!'' وہ آہستہ سے بولی اور اپنا کپ اٹھا کر گھونٹ لیا۔ اس کی سپید انگلیوں میں فاختئی رنگ کا کپ بہت اچھا لگا۔ وہ آہستہ سے بولی ''دو سال پہلے یہاں ایک رورل ہیلتھ سنٹر بن رہا تھا۔ اس کا کوئی بندہ تھا۔ اس کی تانی سے سلام دعا ہو گئی، پھر اس نے رشتہ مانگ لیا اور یوں تانی بیاہ کر شہر چلی گئی۔ مگر شادی کے چند ہی ہفتوں کے بعد تانی جاہل، اجڈ اور گنوار ثابت ہو گئی۔ اولاد ہوئی تو وہ بھی لڑکی اور مری ہوئی۔ یوں رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔ اور اس بار تو اس نے کاغذ دیکر بھیج ہی دیا۔!''

کمرے میں محبت کے اس دردناک انجام سے فضا جیسے سوگوار ہو گئی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر قدیر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال کروں؟۔''

''پوچھئے۔۔۔!''

''یہ گاؤں کی لڑکیاں شہری لڑکوں کی محبت میں کیوں گرفتار ہو جاتی ہیں۔؟''

''یہ محبت ہوتی ہی نہیں۔۔!'' تاجور نے جواب دیا۔ ''یہ سحرزدگی اور حیرانی کی ایک واردات ہوتی ہے۔!''

''کیا۔۔؟'' تاجور کی بات ایسی تھی کہ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ''کیا مطلب ہے اس بات کا۔؟''

''اب آپ لوگ برا نہ مانئے گا۔!'' تاجور نے دھیمے سے کہا۔ پھر چند لمحے کے وقفے کے بعد گویا ہوئی۔

''گاؤں کی فضا ٹھہری ہوئی، سادہ ہوتی ہے۔ دوٹوک گفتگو، ہاں اور نہیں۔ کے واضح اشاروں کے ساتھ۔ براہ راست۔ جب شہری لڑکے اپنے خوبصورت کپڑوں میں، گاؤں کے تروتازہ چہرے دیکھتے ہیں، سادگی دیکھتے ہیں تو اس سادگی کو چالاکی سے حاصل کرنے کے لئے باتوں کے وہ طوطا مینا اڑاتے ہیں کہ ساری فضا رنگین ہو جاتی ہے۔ اُپلوں کی بو، تعریف کے رنگوں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اور گاؤں کی سادہ لڑکی ان کی اس تیز رفتار پیش رفت پر ایک سحرزدگی کے عالم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ گاؤں کی عورت پر ذمہ داریاں، فرائض اتنے لاد دیئے جاتے ہیں کہ تعریف اور ستائش کی چھاؤں کہیں زندگی میں ہوتی ہی نہیں۔ وہ اس طاقت ور مقناطیسی جال میں پھنس جاتی ہیں۔ تعریف کے جادوگر لفظوں کے طلسم سے ایسا سحرزدہ کر دیتے ہیں کہ مارے حیرت کے ان کی سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ اور اسی عالم میں وہ اپنی مروجہ حدوں سے باہر نکل جاتی ہیں۔ مگر جب ایک دوسرے کے ذہنی تضادات، معاشرتی حقائق سامنے آتے ہیں تو پھر دونوں ہی اس حقیقت کا سامنا نہیں کر پاتے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔!''

میں حیران سا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ کتنی گہری نگاہ اور سوچ تھی اس کی۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے عام لڑکیوں سے مختلف لگی۔ میں اور قدیر اس کی باتوں میں گم تھے۔

''شائد آپ کو میری بات پسند نہیں آئی۔!'' تاجور نے کہا۔

''یہ بات نہیں۔۔! ہم تو آپ کے تجزیئے پر حیران ہیں۔''

''کیوں۔۔۔ کیا میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی؟۔'' تاجور نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی بے ساختگی میں ایک معصومیت تھی۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔!'' قدیر نے کہا۔ ''بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ بظاہر آپ اتنی سادہ سی، کم عمر سی ہیں۔ لیکن آپ کا تجزیہ یہاں کے سماجی، اور نفسیاتی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔''

''میں نے نفسیات میں ماسٹر کیا ہے۔!'' تاجور مسکرائی۔ ''اور میری عمر چوبیس سال ہے۔ میں شہر میں رہی ہوں۔ ہوسٹل میں پڑھائی کے دوران بہت دیکھا، بہت سیکھا۔ تعلیم سے آپ سیکھ بھی سکتے ہیں اور سکھا بھی سکتے ہیں۔ تعلیم مکمل کر

کے واپس آئی تو بھائی کے ساتھ اسکول میں بچوں کو پڑھانے لگی۔!'' اس نے نہایت اطمینان سے اپنا پس منظر بیان کیا۔

''ایک ذاتی سوال پوچھوں۔؟ اگر آپ برا نہ منائیں۔'' قدیر نے پوچھا۔

''پوچھیئے۔۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔ سوال تو حقائق کو سمجھنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔!'' وہ بڑی رسانیت سے بولی۔ تاجور میں ہر پل حیران کرنے کی صلاحیت تھی۔

''آپ نے کبھی محبت کی۔۔۔؟''

''محبت۔۔۔!'' وہ کسمسا کر رہ گئی۔ ''میں پیاسی نہیں ہوں۔!''

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''مجھے بہت محبت ملی، اعتبار ملا۔ میری ہر آرزو بابا نے، بھائی نے اپنے وسائل میں رہ کر پوری کی، ہمارے ہاں محبت نہیں ہوتی۔ بس پیاس بجھانے کی خواہشیں ہوتی ہیں۔ ماننے اور منوانے کی خواہش، اپنا آپ ظاہر کرنے اور ستائش کی آرزو، اگر یہ سب گھر میں مل جائے تو پھر پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ محبت اور مروت میں فرق ہی نہیں کر پاتے۔ وہ مروت کو محبت کا نام دے کر نبھائے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایک دن انہیں احساس ہوتا ہے کہ ارے یہ شخصیت جو مجھے اب ملی ہے۔ یہ مجھ کو مکمل کر دے گی۔ میں اب تک جس کے ساتھ رہا تھا۔ وہ تو ایک سایہ تھا۔ دھوکا تھا۔ صحرا میں نخلستان کا سراب۔۔۔!''

''لیکن پھر بھی محبت تو ہے نا۔۔۔!'' قدیر نے کہا۔

''میں محبت سے کب انکار کرتی ہوں۔ محبت تو وہ ہوتی ہے۔ جو سیراب کر دے۔ جس کے بعد تسکین کا احساس ہو۔ جس میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہو۔ جس میں آپ مر جائیں اور اُف نہ کریں۔''

''آپ کے یہ خیالات، یہ افکار بہت منزہ، بہت قابل قدر ہیں۔!'' قدیر نے کہا اور پوچھا۔ ''کس مصنف کو آپ نے سب سے زیادہ پڑھا ہے۔ کس کے اثر کو زیادہ قبول کیا ہے۔؟''

''حجتہ الاسلام ابو محمد غزالی، علامہ جوزی اور مرشد کریم قادری سرکار نے میری تربیت کی ہے۔!'' تاجور نے بہت عقیدت، بہت محبت سے جواب دیا۔ ''جب میں رسائل غزالی پڑھتی تھی۔ یا علامہ جوزی کو، یا پھر ابن رُشد کو، تو جہاں جہاں سمجھ نہیں پاتی تھی وہ مقامات قادری سرکار اتنے پیار سے سمجھا دیتے کہ سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا تھا۔''

''قادری سرکار۔؟'' قدیر نے استفہامیہ انداز میں اس کو دیکھا۔

''ہمارے مرشد، جن کے یہ خلیفہ جی ہیں۔!'' تاجور نے بڑی عقیدت سے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔

''سرکار خواتین سے ملتے ہیں۔؟'' قدیر نے سوال پوچھا۔

''خواتین سے نہیں ملتے۔!'' تاجور مسکرائی۔ ''وہ ماں سے، بہن سے، بیٹی سے ملتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ پیر کا کنبہ ساری دنیا ہوتی ہے۔ اور اس دنیا کی ساری آبادی خاتون امانت دار کے بغیر ممکن نہیں۔ عورت تو انبیاء کی گزرگاہ ہے۔ اس کا احترام، اس کا اکرام واجب ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت مردوں سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ بھلی عورت ہی ایک بھلی نسل کو پروان چڑھا سکتی ہے۔!''

''بہت عمدہ۔۔۔!'' قدیر نے بے ساختہ تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''ایک وہ ہیں جو کہ خواتین کو اپنا چینل تک دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے کس قدر تضاد آمیز معاملات ہیں۔!''

''کوئی تضاد نہیں۔۔۔!'' میں نے ان کی گفتگو میں مداخلت کی۔ ''فرق صرف نکتۂ نظر کا ہے۔ ایک بار یہ سوچ لیں کہ عورت اپنی بیوگی کا سارا وقت، اپنی طلاق کے بعد تنہائی کا زمانہ کس وقار سے گذارتی ہے۔ وقتِ مرگ تک کوئی اس کے کردار پر انگلی اٹھانے والا نہیں ہوتا۔ لیکن صرف خیال پر مواخذہ، صرف تصور پر قدغن، یہ نہ صرف فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ بلکہ اسلامی فلسفے کی روح کے بھی خلاف ہے۔ بھروسہ اور اعتماد، ان ہی ستونوں پر انسانی معاشرت کی عمارت قائم

ہوتی ہے۔ ورنہ جتنی آسانیاں گناہ کی مردوں کو حاصل ہیں۔ جتنے مواقع مرد کے پاس ہوتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی خواتین کو نہیں ملتا۔ وہ تو سارا دن ماں کی، ٹیچرز، شوہر کی، ساس نندوں کی نگرانی میں رہتی ہیں۔ جتنی کھوجنے والی نظریں خاتون کی حرکات پر متحرک ہوتی ہیں۔ مرد تو ان کا سامنا ہی نہیں کرتے۔!''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں خلیفہ جی۔۔۔!'' تاجور نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر کھٹکا ہوا اور کشور اندر آ گئی۔''ارے آپ لوگوں نے چائے پی بھی لی۔!'' وہ بولی۔''لایئے میں برتن اٹھاؤں۔!'' اس نے کپ لے کر ٹرے میں رکھے۔''چلیں باجی کھانے کی تیاری کریں۔''

تاجور نے اثبات میں سر ہلایا اور ہمیں سلام کر کے رخصت ہو گئی۔ تاجور کے پیچھے پیچھے کشور بھی برتن اٹھائے چلی گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد قدیر نے کہا۔''یار ہم شہر والے کچھ غلط تو نہیں سوچتے ہیں۔؟''

''کیا۔۔۔؟'' میں نے اس کو غور سے دیکھا۔

''یہی کہ گاؤں والے جاہل ہوتے ہیں۔ بے وقوف ہوتے ہیں۔ کسی بات کو گہرائی سے نہیں سمجھتے۔!'' قدیر نے سر کھجایا اور میری طرف دیکھا۔

''شائد۔۔۔!'' میں نے جواب دیا۔''بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے لیکن اگر تعلق رکھا جائے، خیالات کو ایک دوسرے سے بانٹا جائے تو پھر اس خلیج کو نا صرف یہ کہ دور کیا جا سکے گا۔ بلکہ دیہاتی اور شہری کی جو تفریق ہم نے از خود کر رکھی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔!''

''صحیح کہتے ہو۔!'' قدیر نے کہا۔

اسی وقت خادم حسین تین چار افراد کے ہمراہ اندر آ گیا۔ وہ سب بہت پُر جوش ہو رہے تھے۔

''کیا خبر ہے۔؟'' میں نے ان کے تمتماتے ہوئے چہرے دیکھ کر خادم حسین سے سوال کیا۔''بہت پُر جوش ہو رہے ہیں آپ سب، کیا کوئی اہم واقعہ ہو گیا ہے۔؟''

''بالکل۔۔۔!'' شریف حلوائی نے کہا۔''مخالف اُمیدوار علی مراد نے بندہ بھیجا ہے۔ وہ جی دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ اپنے خادم حسین کے حق میں۔!''

''اچھا۔۔؟'' میں نے کہا۔

''یہ تو زبردست خبر ہے۔!'' قدیر بھی پُر جوش ہو گیا۔''خادم حسین یہ ہماری بہت اہم کامیابی ہے۔!''

''لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ علی مراد میرے حق میں کیوں دستبردار ہوا۔ اصولاً تو اس کو عبداللہ شاہ گیلانی کے حق میں دست بردار ہونا چاہیے تھا۔ وہ سب سے طاقت ور، اور دولت مند، بااثر امیدوار ہیں۔!'' خادم نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ اس کا یہ نکتہ ایسا تھا کہ سب ہی سوچ میں پڑ گئے۔ اچانک جیسے خاموشی سی چھا گئی۔

تب ہی اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اور میں نے کہا۔''علی مراد دست بردار ہونے کی وجہ تمہارے اپنے سوالوں میں موجود ہے۔''

''کیا۔۔؟'' وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''تم نے کہا کہ علی مراد کو عبداللہ شاہ گیلانی کے حق میں دستبردار ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہی سب سے طاقت ور اور دولت مند امیدوار ہیں۔ اب سنو!۔ علی مراد اگر ان کے حق میں دست بردار ہوتا تو اس پر ہر صورت دو الزام لگ جاتے۔ پہلا یہ کہ وہ پیسے لیکر ان کے حق میں بیٹھ گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ان سے ڈر گیا ہے۔ یوں اگر وہ جنرل الیکشن میں دوبارہ کھڑا بھی ہونا چاہتا تو اس کی ساکھ کو ختم ہو جانا تھا۔ جبکہ تمہارے حق میں دست بردار ہونے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس پر نہ تو خوف زدہ ہونے کا الزام لگے گا۔ اور نہ ہی پیسے لیکر بیٹھنے کا۔ بلکہ اگر تم جیت بھی گئے تو دلی طور پر اس کے احسان مند ہو گے۔!''

''بالکل ٹھیک۔۔ بالکل ٹھیک۔۔۔ خلیفہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا ہی ہونا تھا۔!'' وہ لوگ میرے تجزیئے سے متفق ہو کر

بیک وقت بولنا شروع ہو گئے۔
''لیکن۔۔۔!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کیا۔ وہ سب خاموش ہو گئے۔ ''لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس دست برداری کا فائدہ خادم حسین کو ہو گا یا پھر عبداللہ شاہ گیلانی کو۔۔؟'' میں نے سوال کیا۔
''خلیفہ جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔!'' اللہ دتہ نے کہا۔ ''واقعی یہ بات تو سوچنے کی ہے۔!''
میں نے ان کے پُر سوچ چہروں پر نگاہ ڈالی۔ وہ سب لمحے بھر میں اداس ہو گئے۔ سچے اور سادے لوگ۔
''لیکن۔۔۔!'' میں نے انہیں صورت حال کے دوسرے پہلو کی جانب متوجہ کیا۔ ''لیکن ہم اس سے ایک فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ فائدہ ہے اخلاقی برتری کا۔ ہم سب اس پہلو کو اجاگر کرتے ہیں کہ، کیونکہ جیتنا خادم حسین کو ہی ہے۔ اس لئے یہ ہارنے کی شرمندگی سے بچنے کے لئے خود ہی الیکشن سے دست بردار ہو گیا۔!''
''زبردست۔۔!'' حافظ سلمان نے کہا۔ ''بہت اچھی حکمت عملی مرتب کی ہے اپنے خلیفہ جی نے۔!''
''لیکن اس دست برداری کو فوراً میڈیا تک پہنچ جانا چاہیے۔!'' قدیر نے کہا۔ ''اس بات کو جلد سے جلد پھیلانا بہت ضروری ہے۔!''
''لیکن کس طریقے سے۔!'' ساری نگاہیں قدیر کی جانب سوالیہ ہو گئیں۔
''کیا علی مراد سے ٹیلی فون پر رابطہ ممکن ہے۔؟'' قدیر نے پوچھا۔
''ہاں اس کا ایک بندہ میری بیٹھک میں موجود ہے۔!'' رفیق الدین نمبردار نے کہا۔
''ٹھیک ہے تو اس کو بلوائیں۔'' قدیر نے کہا۔
نمبردار نے ایک آدمی کو فوراً ہی دوڑایا۔ قدیر نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ قدیر نے باہر آ کے مجھ سے کہا۔ ''یار یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کو فوراً پریس تک پہنچانا ضروری ہے۔ ایک تو مجھے علی مراد کی کوئی تصویر چاہیے۔ دوسرے یہ کہ میں ابھی احمد عبدالحیٔ سے رابطہ کر کے اس کو یہ بات بتاتا ہوں۔ اور اس کو کانفرنس لائن پر لیکر علی مراد سے اس کی بھی بات کروا دوں گا۔ اور تصویر بھی فوراً بھیج دوں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔؟''
''منصوبہ تو بہت عمدہ ہے!'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے علی مراد سے بات بھی تو کرنا چاہیے۔!''
''ٹھیک ہے۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''پہلے میں ذرا احمد عبدالحیٔ سے بات کر لوں۔!'' وہ اپنے موبائل پر احمد عبدالحیٔ کے نمبر پش کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں رابطہ بحال ہو گیا۔ ''ہیلو اسلام علیکم کیسے ہیں آپ؟''
''کیا حال ہے بھئی قدیر کہاں ہو؟'' احمد عبدالحیٔ کی پُرجوش آواز سنائی دی۔
''میں ضمنی الیکشن کے سلسلے میں تنزیل کے ساتھ آیا ہوا ہوں۔!'' قدیر نے بتایا۔
''اچھا۔۔! وہاں تو زبردست معرکہ چل رہا ہو گا۔!'' احمد عبدالحیٔ نے کہا۔ ''لیکن تم لوگ وہاں کیا کر رہے ہو۔؟''
''ایک خبر دینی تھی بلکہ اس کو فوراً ہی ٹیلی کاسٹ کروانا ہے۔!''
''کوئی معرکہ سر کر لیا کیا۔؟'' احمد عبدالحیٔ نے پوچھا۔
''معرکہ ہی سمجھئے۔!'' قدیر ہنسا۔ ''خادم حسین کے مقابلے میں علی مراد نے الیکشن سے دست برداری کا اعلان کر دیا ہے۔''
''یہ تو زبردست نیوز ہے۔ لیکن یہ تو اس کی طرف سے اعلان ہونا چاہیے۔!'' احمد عبدالحیٔ نے کہا۔ ''ورنہ پھر خبر افواہ بن جاتی ہے۔!''
''یہاں کیمرے وغیرہ تو نہیں پہنچ سکتے۔ میں اس کو کانفرنس لائن پر دوران گفتگو ہی لے لونگا۔ آپ اس سے سوال جواب کر لیجئے گا۔ تصویر آپ کو بھیج رہا ہوں۔!'' قدیر نے اپنی بات وضاحت سے بیان کی۔
''ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے کے اندر مجھے رابطے میں لے لو۔!'' احمد عبدالحیٔ نے کہا۔ ''میں اس کو پروگرام میں آج ہی شامل کر لونگا۔''

''میں تھوڑی دیر میں ہی فون کرتا ہوں۔ وہ آپ سے ڈائریکٹ ہو جائے گا۔!'' قدیر نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اتنی دیر میں ایک آدمی کمرے سے باہر نکل کر ہماری طرف آیا۔ ''آپ کو نمبردار صاحب بلا رہے ہیں!'' اس نے کہا۔

ہم دونوں کمرے میں آ گئے۔ وہاں علی مراد کا بندہ آیا ہوا تھا۔ ہم نے اس سے سلام دعا کی، خادم حسین نے تعارف کرایا۔

''یہ ہمارے قادری سرکار کے خلیفہ ہیں۔ خانقاہ سے تشریف لائے ہیں۔ اور یہ علی مراد کے منشی جی ہیں علی مراد کا پیغام لائے ہیں۔!''

''میں تو جی سرکار کا خادم ہوں۔ سارے علاقے میں خلیفہ جی کی آمد کی خبر پھیلی ہوئی ہے۔ سرکار کا بچہ انتخاب لڑ رہا ہے تو پھر کوئی اور کیسے جیت سکتا ہے جی۔ دنیا والوں سے تو لڑا جا سکتا ہے جی، اللہ والوں سے کون لڑ سکتا ہے جی۔!'' منشی کو ہر بات میں جی کہنے کی عادت تھی۔

''ہمارے علی مراد جی تو سرکار جی سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے پیغام دیا ہے کہ وہ خادم حسین کے حق میں بغیر کسی لالچ، کسی مطلب، دستبردار ہو رہے ہیں۔''

''یہ تو جی ان کی محبت ہے۔!'' غلام حسین نے مسکرا کے کہا۔ ''اللہ والوں سے محبت کا صلہ تو اللہ ہی دے سکتا ہے۔ ہم تو صرف خدمت ہی کر سکتے ہیں۔ دعا کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علی مراد کو من مانگی مرادیں دیں۔!''

''بس ہمارے مراد جی کو دعاؤں کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔!''

''کیا آپ ان سے ہمارا رابطہ کروا سکتے ہیں۔'' قدیر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں جی۔۔۔!'' منشی نے کہا۔ اور جیب سے موبائل نکال کر نمبر دبانے لگا۔ چند ہی لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ ''جی حضور میں منشی بات کر رہا ہوں۔ میں خادم حسین کے ڈیرے پر ہی ہوں جی۔ خلیفہ جی آپ سے سلام دعا کرنا چاہتے ہیں۔!''

اتنی دیر میں قدیر اپنے موبائل پر تیار ہو چکا تھا۔ ''میں خود علی مراد جی کو فون کرتا ہوں۔!'' قدیر نے فون پر کانفرنس لائن آن کر لی تھی۔ اس نے لائن ہولڈ کر کے علی مراد کے نمبر پش کیے۔ فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔

''السلام علیکم!'' قدیر نے کہا۔ ''ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

''نہیں جی شکریئے کا کیا ہے۔ خادم حسین بھی ہمارا ہی بچہ ہے۔ اب اپنے بچوں کی جی رعایت تو دینا ہی پڑتی ہے۔!'' علی مراد کا انداز بڑا رحم کرنے والا تھا۔

''اس کے لئے بھی شکریہ۔ ہمارے ایک صحافی دوست آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔!'' قدیر نے کہا۔

احمد عبدالحئی نے اس سے کوئی پانچ سات منٹ گفتگو کی، اس کے بعد قدیر نے خدا حافظ کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دوران سب خاموشی سے قدیر کی طرف دیکھتے رہے۔ قدیر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بات ہو گئی ہے۔ علی مراد صاحب کا ہماری طرف سے شکریہ بھی ادا کر دینا اور کہنا کہ ہم لوگ بہت یاد رکھیں گے۔ ان کے اس تعاون کو۔ بلکہ یہ سارا علاقہ ہی ان کی عزت پہلے سے بڑھ کر کرے گا۔!''

''اچھا جی اجازت۔۔!'' منشی بڑا جہاندیدہ تھا۔ سمجھ گیا کہ ہم اس کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ وہ اٹھا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

منشی کے جاتے ہی سب لوگ اچانک ہی بولنا شروع ہو گئے۔ قدیر نے تیزی سے میسج ٹائپ کیا اور احمد عبدالحئی کو روانہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے علی مراد کا ایک پوسٹر منگوایا۔ اور علی مراد کی تصویر اپنے موبائل سے کھینچ کر وہ بھی احمد عبدالحئی کو بھیج دی۔ پھر اپنی گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''ذرا یار ٹی وی تو آن کرو۔!''

خادم حسین سے پہلے کسی نے لپک کر ٹیلی ویژن کو آن کر دیا۔ اور ریموٹ قدیر کو تھما دیا۔ قدیر نے نیوز چینل کو ٹیون کیا اور سب سکرین کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کوئی تجزیاتی پروگرام چل رہا تھا۔ خبروں کے ٹکر چل رہے تھے۔ اچانک تازہ ترین کے فلیش کے بعد ٹکر چلنے لگا۔ ''ضمنی الیکشن کے اہم امیدوار علی مراد عوامی نمائندے خادم حسین کے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔ ٹکر پڑھتے

ہی پورا کمرہ مبارکباد اور سلامت باد سے گونج اٹھا۔ کئی لوگوں نے تو اٹھ کر خادم حسین کو کمر سے پکڑ کر اونچا اٹھا لیا۔

''زندہ باد۔ ہمارا خادم زندہ باد۔ آوے گا بھئی آوے گا۔ جیتے گا بھئی جیتے گا۔ حسین کا خادم جیتے گا۔۔۔ قوم کا خادم جیتے گا۔''

کمرہ پُرجوش آوازوں اور گرمجوش جذبات سے جیسے بھر گیا۔ حنیف صحرائی کمرے میں داخل ہوئے ''بھئی کمال کر دیا یہ کس نے میڈیا کو خبر پہنچائی۔!''

''اپنے قدیر بھائی نے۔!'' کسی نے کہا۔

''خدا کی قسم مزہ آ گیا۔ اب علی مراد کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر کہیں وہ پھر نہ جائے۔!'' حنیف صحرائی نے تشویش ظاہر کی۔

''آپ فکر نہ کریں۔ بڑا پکا بندوبست کیا ہے۔ ذرا ہی دیر میں بریکنگ نیوز دیکھئے گا'' قدیر نے اپنے فون پر کوئی پیغام پڑھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت بریکنگ نیوز کے مخصوص ردھم نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

نیوز کاسٹر اسکرین پر نمودار ہوا۔ ''ہم اپنے ناظرین کے لئے ضمنی الیکشن کے حوالے سے اہم نیوز پیش کر رہے ہیں۔ علی مراد عوامی نمائندے خادم حسین کے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی فلش بیک سے علی مراد کی تصویر اسکرین پر ابھری۔ یہ وہی تصویر تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے قدیر نے اپنے فون سے کھینچ کر بھیجی تھی۔ ساتھ ہی سوال جواب ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔

''آپ نے عوامی نمائندے خادم حسین کے حق میں دستبرداری کا فیصلہ کیوں کیا۔؟''

''اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ خادم حسین واقعتاً عوامی نمائندے ہیں اور ان کو آگے آنا چاہیے۔''

''یہ کیا اس کے لئے انہوں نے کچھ کہا تھا۔؟''

''نہیں اس معاملے میں ان سے کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''آپ اپنے ووٹرز کو کیا پیغام دینا چاہیں گے۔؟''

''میں ان سے یہی کہوں گا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کریں، اور خادم حسین کو ووٹ دیں۔ کامیاب کریں۔ کیونکہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم حقیقی عوامی نمائندے ہی اسمبلیوں میں بھیجیں۔ جو ہمارے عوام، ہمارے مفادات کے نگران ہوں نا کہ اپنے ذاتی مفادات کے۔''

''دیکھا خادم حسین دعائیں کیسے کیسے رنگ لاتی ہیں۔ تمہیں اتنے بڑے نیوز چینل پر کوریج مل گئی ہے کہ اب تمہیں واقعی، کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔'' حنیف صحرائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سرکار کی دعاؤں نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔!''

''یہ سب مرشد کی نظر کرم کا نتیجہ ہے۔ اللہ کا بڑا فضل ہے ہمارے مرشد۔'' غلام حسین نے جھوم کر کہا۔

اچانک گلی میں شور ہونے لگا۔ پھر کئی لوگوں کے نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ ''جیت گیا بھئی جیت گیا خادم حسین جیت گیا۔''

''دیکھو لڑکوں نے تمہاری کامیابی کا جلوس بھی نکال لیا ہے۔!'' ماسٹر فدا حسین نے کہا۔ ''اب تو منہ میٹھا کراؤ۔!''

''لو جی منہ میٹھا کرو۔!'' شریف حلوائی اسی وقت لڈوؤں کا تھال لیکر اندر داخل ہوا۔ میں نے تو ٹی وی پر دیکھا، خدا کا شکر ہے کہ لائٹ آئی ہوئی تھی تمہاری بھاوج کہنے لگی، چلو جلدی چل کر مبارکباد دے آئیں۔'' شریف حلوائی نے بتاتے ہوئے تھال میرے آگے کیا۔ ''خلیفہ جی بسم اللہ کیجئے۔!''

میں نے ایک لڈو اٹھا لیا۔ قدیر نے بھی لڈو اٹھا لیا۔ اسی وقت قدیر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ قدیر نے فون ریسیو کیا۔

''یہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔!'' دوسری طرف سے علی مراد کی غصے بھری آواز اُبھری۔ قدیر نے اسپیکر آن کر دیا۔ سب فون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ علی مراد کہہ رہا تھا۔

تصوف اور محبت کی اِس پراسرار دنیا کے حیرت ناک واقعات' اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

شعلہ ساماں تحریریں

[redacted]

خالی ہاتھ



افتخار چوہدری

اُس خبیث نوجوان کی عبرت سامانی، جس نے زن اور زر کے لیے اپنے ماں جائے کو کاٹ ڈالا تھا

دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی دھندلی اور لمبی رات نے اپنے سیاہ پر پھیلا کر ہر چیز کو گہرے اندھیرے میں لپیٹا ہوا تھا، اس گہرے اندھیرے کے سامنے سٹریٹ لائٹس بھی بے بس نظر آرہی تھیں، وہ اردگرد کا ماحول تو کیا روشن کرتیں بمشکل اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے محض ٹمٹما رہی تھیں۔

دن کے وقت مصروف ترین رہنے والی سڑکیں بھی اس وقت ویران اور اوس میں بھیگی ہوئی تھیں، جبکہ ان سڑکوں کے اطراف میں موجود کچی آبادیوں سے لگژری بنگلوں تک کے مکین گرم لحافوں میں گھسے میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔

ایسے میں شہر کے درمیان میں موجود شالیمار فلیٹس کی پندرہ منزلہ عمارت بھی دھند اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تاریکی کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔

اس کی سکیورٹی لائٹس اور کیمروں کو بھی دھند نے تقریباً ناکارہ کر دیا تھا، اس جدید اور منفرد ڈیزائن کی حامل عمارت کی سکیورٹی ایک تھری سٹار سکیورٹی فورس نامی نجی ادارے کے سپرد تھی۔

یہ ادارہ اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر شہر کا سب سے مشہور ادارہ سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت بھی عمارت کے مرکزی گیٹ سے ملحقہ سکیورٹی روم میں، اسی کمپنی کے تین مسلح سکیورٹی گارڈز ڈیوٹی پر موجود تھے۔ جو سردی سے بچنے کے لیے ہیٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے دو گارڈز تو باقاعدہ اونگھ رہے تھے، جبکہ تیسرا اپنے انڈرائیڈ سیل فون پر کسی سے چیٹنگ کرنے میں مصروف تھا۔

کمرے میں ہیٹر جلنے کی وجہ سے شیشے کے دروازے پر موئسچر کی دھندسی چھائی ہوئی تھی، سکیورٹی کے حوالے سے یہ عمارت کافی محفوظ سمجھی جاتی تھی، جگہ جگہ سکیورٹی کیمروں کے علاوہ عمارت سے ایک خاص فاصلے پر پندرہ فٹ اونچی دیوار اور پھر اس دیوار پر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں، جبکہ مین گیٹ پر ہر وقت مسلح گارڈز موجود رہتے تھے، گیٹ کی بناوٹ ایسی تھی کہ آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

پچھلے آدھے گھنٹے سے ایک لمبا تڑنگا شخص جو اندھیرے کا حصہ ہی معلوم ہو رہا تھا، گیٹ کے ایک طرف موجود درخت کی اوٹ میں کھڑا اندر کی سن گن لے رہا تھا، وہ بار بار گیٹ کی درزوں میں سے نظر آنے



والے سکیورٹی روم کے دھندلائے ہوئے شیشے سے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، کچھ دیر بعد وہ فیصلہ کن انداز میں درخت کے پیچھے سے نکلا، اور گیٹ کے قریب آن کھڑا ہوا ،اور پھر جالی دار گیٹ کی درزوں کا سہارا لیتے ہوئے بے حد آہستگی سے بنا کوئی آواز پیدا کیے گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا، اور سکیورٹی روم کے سامنے سے جھکے ہوئے انداز میں دوڑتا ہوا گذر گیا اس کے پاؤں میں موجود شوز کا سول ربڑ کا ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بنا رُکے بلڈنگ کے عقب میں آ گیا، یہاں ایک کافی بڑا پارک نما باغیچہ بنا ہوا تھا۔ جس کے دوسری طرف جالی کے کیبن میں گیس کا میٹر لگا ہوا تھا، وہ چوکنے انداز میں اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کیبن کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ کیبن کے دروازے پر دو مختلف قسم کے تالے لگے ہوئے تھے۔

اس لمبے تڑنگے شخص نے اپنی کمر پر موجود بیگ اتار کر کھولا تو اس میں کئی قسم کے اوزار موجود تھے اس نے ایک کٹر اٹھایا اور میٹر کے گرد موجود تاروں کا جنگلا کاٹنے لگا، کچھ ہی دیر میں وہ اتنی جالی کاٹنے میں کامیاب ہو گیا کہ کٹی ہوئی جالی میں سے ہاتھ اندر گزار کر گیس کے میٹر اور گیس لائن میں لگے ہوئے والو کو آسانی سے چھوا جا سکتا تھا۔ والو کھولنے اور بند کرنے کے لیے اس پر ویل یا ہینڈل موجود نہیں تھا۔ اس نے کٹر کو واپس بیگ میں رکھ کر ایک سکریو رینچ نکال لیا اور اس کی مدد سے والو کو بند کر دیا اور پھر چند لمحے توقف کرنے کے بعد والو کو دوبارہ کھول دیا، اسے اس سارے کام میں چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنے اوزاروں والا بیگ سنبھالا اور چوکنے انداز میں واپس ہو لیا، سکیورٹی روم کے دروازے کے سامنے سے وہ ایک بار پھر جھک کر گزرا اور آہستگی سے گیٹ کی کنڈی کھولتے ہوئے باہر نکل کر تاریکی کا حصہ بن گیا۔

☆......☆

سکیورٹی روم میں موجود گارڈ کی نظریں سیل فون کی سکرین پر جمی ہوئی تھیں، ٹیکسٹ میسج پڑھنے کے بعد اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی، پھر اس سے

پہلے کہ وہ reply کرتا اس کے سامنے سٹینڈ پر رکھا ہوا ہیٹر خود بخود بند ہو گیا، تو وہ حیرت سے ہیٹر کی طرف دیکھنے لگا وہ کئی سال سے یہاں ڈیوٹی کر رہا تھا، مگر آج تک اس عمارت میں کبھی غیر اعلانیہ گیس کی لوڈ شیڈنگ نہیں ہوئی تھی کیونکہ یہاں کا کنکشن قریب سے گزرتی ہوئی ملک کی مین گیس لائن سے لیا گیا تھا۔ اگر کبھی کچھ دیر کے لیے بھی گیس کی سپلائی بند ہونا ہوتی تو انہیں ایڈوانس میں ہی شیڈول مل جایا کرتا تھا۔

اس نے ایک طرف دیوار پر موجود نوٹس بورڈ کی طرف دیکھا تو وہاں پر کسی قسم کا کوئی نوٹس موجود نہیں تھا۔

''ہونہہ۔'' یہ پاکستان ہے بھائی یہاں بغیر شیڈول کے کچھ بھی ہو سکتا ہے، اس نے ہنکارا بھر کر خود کلامی کی اور ہیٹر کا والو بند کرنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسی لمحے ہیٹر میں سے گیس نکلنے کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی اور اس کے ساتھ ہی کچی گیس کی ناگوار بدبو کمرے میں پھیلنے لگی۔

''اوہ اتنی جلدی آ بھی گئی۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، اور والو بند کرنے کی بجائے، قریب ہی رکھی ہوئی ماچس اٹھا کر ایک بار پھر ہیٹر کو جلا لیا، اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے، دوبارہ اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا، اُسی لمحے اسے محسوس ہوا جیسے دروازے کے سامنے سے کوئی گزرا ہو، وہ چند لمحے دھندلے شیشے سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، اور پھر دیوار لگی ہوئی ایل ای ڈی سکرینوں کی طرف دیکھنے لگا جن پر سی سی ٹی کیمروں کے مختلف ویو نظر آ رہے تھے، مگر دھند گہری ہونے کی وجہ سے، کوئی بھی منظر کلئیر نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ سیل فون کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا، اور اپنی گن اٹھا کر سکیورٹی روم سے باہر نکل آیا، ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا، کہیں کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا، وہ اطراف کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد واپس سکیورٹی روم کی طرف مڑنے لگا، تو اس کی نظر گیٹ کی کھلی ہوئی کنڈی پر پڑی، تو وہ ٹھٹھک کر رک گیا، وہ چند ثانیے کھلی ہوئی کنڈی کی طرف دیکھتا رہا، آخری بار اس نے خود گیٹ بند کیا تھا، اس کے بعد اب تک کوئی شخص نہ تو اندر آیا تھا، اور نہ ہی باہر گیا تھا، پھر یہ کنڈی کس نے کھول دی، یہی سوچتے ہوئے وہ گیٹ کو دھکیلتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا، دھند کی وجہ سے چند میٹر سے آگے کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

شاید میں ہی لگانا بھول گیا ہوں گا، اس نے خود کو تسلی دینے کے لیے خود کلامی کی، مگر یہ خود فریبی اس کے حلق سے اتر نہ سکی۔

واپس اندر آ کر اس نے کنڈی لگانے کے بعد اس بار تالا بھی لگا دیا۔

جب وہ دوبارہ سکیورٹی روم میں داخل ہوا تو اس کے سیل فون پر کافی میسج آ چکے تھے، وہ ایک بار پھر ان کے جواب دینے لگا۔ بظاہر تو وہ مصروف تھا مگر اس کا ذہن بے چینی کی زد میں تھا، وہ کوشش کے باوجود اس بے چینی کا ادراک نہیں کر پا رہا تھا۔

اس کیفیت میں ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی، کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا، تو وہ اچھل کر کرسی سے کھڑا ہو گیا، جیسے اچانک ہی کرسی میں کانٹے نکل آئے ہوں۔

''ویری بیڈ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سیل فون کو وردی کی جیب میں ڈالا اور کرسیوں پر اونگھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''اجمل لیاقت اٹھو جلدی کرو۔'' وہ دونوں ہڑبڑا کر سیدھے ہو گئے۔

کیا ہوا اشرف، لیاقت نے اس نوجوان کو اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں اشرف نے گیس کی سپلائی بند ہو کر دوبارہ بحال ہونے سے لے کر گیٹ کے کھلے ہونے تک کی تمام تفصیل بتا دی۔

''واقعی پہلے کبھی اس طرح گیس کی سپلائی بند نہیں ہوئی۔ اور گیٹ کھولنے والا یہیں کا رہائشی ہو گا، کسی ضروری کام سے باہر گیا ہو گا۔''

اجمل نے ایک بار پھر ٹانگیں پسارتے ہوئے کہا، اور آنکھیں بھی بند کر لیں۔

مگر جن فلیٹس میں ہیٹر جل رہے تھے،

وہاں گیس جانے پر ہیٹر بند ہو گئے ہوں گے اور پھر دوبارہ گیس آنے پر اب تک تو وہاں بھی گیس بھر چکی ہو گی، تین بج رہے ہیں، اس وقت تو سبھی سو رہے ہیں، کسی کو معلوم ہی نہیں ہوا ہو گا کہ گیس جانے کے بعد دوبارہ آ گئی ہے۔

اشرف نے اصل مسئلے کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا، تو آنکھیں بند کر کے دوبارہ ریلیکس ہوتا ہوا اجمل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''اوہ، اوہ بیڑہ غرق، کتنی دیر پہلے گیس بند ہوئی تھی۔'' اس نے پوچھا، تو خوف اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔

''دس منٹ تو ہو ہی گئے ہوں گے۔'' اشرف نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تم دونوں جاؤ اور تمام فلیٹس کے رہائشی لوگوں کو جگا کر خبردار کرو، جس فلیٹ سے جواب نہ ملے تو دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جاؤ، میں اپنے ادارے اور ہنگامی سروس کو بلواتا ہوں، جلدی کرو، ہری اپ۔'' اجمل نے ایک طرف پینل بورڈ پر لگے ہوئے سرخ رنگ کے بٹن کو پریس کرتے ہوئے چیخ کر کہا، اور پھر ٹیبل پر موجود ٹیلی فون کا رسیور جھپٹنے کے انداز میں اٹھا لیا، اس کے بٹن پریس کرتے ہی پندرہ منزلہ عمارت سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔

اگلے چند منٹوں میں ہی امدادی ٹیمیں وہاں پہنچ گئیں، تب تک پوری عمارت میں ہاہاکار مچ چکی تھی، اب تک پندرہ افراد کی موت ہو چکی تھی، جبکہ کئی درجن لوگوں کو تشویش ناک حالت میں ہسپتال منتقل کیا جا چکا تھا، متاثرہ افراد میں عورتوں بچوں سے لے کر ہر عمر کے افراد شامل تھے۔

ہر طرف چیخ و پکار اور اپنے پیاروں کے بچھڑ جانے کے رقت آمیز مناظر نظر آ رہے تھے۔

مختلف میڈیا والے اپنے اپنے انداز میں اس سانحے کی کوریج کر رہے تھے، میڈیا کی غالب اکثریت کا موقف تھا کہ، یہ سانحہ گیس کی بے وقت لوڈشیڈنگ کے باعث رونما ہوا ہے، جبکہ نادرن سوئی گیس کی جانب سے اس رپورٹ کی تردید کی جا رہی تھی۔

اگلے دن کے اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز کی ہیڈ لائن اور بریکنگ نیوز یہی اندوہناک خبر تھی۔

☆......☆

سرشام ہی برسنے والے کہرنے رات آدھی ہونے سے پہلے درجہ حرارت کو منفی ڈگری تک پہنچا دیا تھا، جس کی وجہ سے یخ ہوائیں ہڈیوں میں موجود گودے تک کو گدگدا رہی تھیں۔

صحن میں پھوار کی صورت گرتی ہوئی دھند کو مبشر اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔

کمرے اور صحن کے درمیان نمایاں ٹمپریچر کے فرق کی وجہ سے کھڑکی کے شیشے پر سے پانی کی بوندیں سرکتی ہوئیں چوکھٹ کو بھگو رہی تھیں۔

''نازیہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم اس انداز میں کیوں سوچ رہی ہو، جبکہ تمہیں اس گھر میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔'' مبشر نے کھڑکی کے شیشے پر بہتی ہوئی پانی کی بوندوں کو انگلی سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''میرے بھولے صنم، یہ صاف اور سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی، کہ یہ گھر زمین بنک بیلنس کچھ بھی تمہارے نام نہیں ہے، اور تو اور شہر کے بڑے بازار میں موجود پوری مارکیٹ میں سے ایک بھی دوکان پہ ہمارا حق نہیں ہے، مجھے کچھ نہیں پتہ بس، میں، ہمارا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں۔

نازیہ نے انگیٹھی میں دہکتے ہوئے کوئلوں کو سلاخ سے ایڈجسٹ کرتے ہوئے، جواب دیا۔

دہکتے ہوئے کوئلوں کا عکس اسکے چہرہ پر پڑ رہا تھا، جس کی وجہ سے اس کا حسین چہرہ مزید آتشی گلابی نظر آ رہا تھا۔ ''یار وہ میرا بڑا بھائی ہے، اور تم پچھلے دو سال سے دیکھ رہی ہو، وہ مجھ سے کتنی شدید محبت کرتا ہے، مجھے کوئی کام تک نہیں کرنے دیتا، میں شہزادوں جیسی زندگی گزار رہا ہوں، یہ سب اسی کی بدولت ہے جبکہ اس کے برعکس میں نے ہمیشہ خود غرضی کا مظاہرہ کیا، مگر اس کے ماتھے پر کبھی شکن تک نہیں آئی وہ ہر موقعے پر میرے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنے حق سے دستبردار ہوتا آیا ہے، یہاں تک کے جب میں نے تم

سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیچھے ہٹ گیا۔ جب کے میں جانتا تھا کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔''

اگر وہ چاہتا تو تمہیں حاصل کر سکتا تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، اور پھر ہماری شادی کے بعد وہ نوکری کے بہانے یہ گھر اور گاؤں ہی چھوڑ گیا، حالانکہ اسے سرے سے نوکری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اب دو سال ہونے کو آئے ہیں، وہ عید، شب برات پر ہی گھر لوٹتا ہے، اور کئی سالوں سے دوکانوں اور زمینوں کا مکمل حساب کتاب میرے ہاتھوں میں ہے لاکھوں روپے آتے ہیں مگر اس نے آج تک نہیں پوچھا کہ میں اتنے پیسوں کا کیا کر رہا ہوں۔'' مبشر نے اپنے بڑے بھائی کے حق میں پوری تقریر کر ڈالی۔

''تم چاہے جتنی بھی دلیلیں اور مثالیں دے لو، مگر اس حقیقت کو کبھی نہیں جھٹلا سکتے کے فقراز تمہارا سوتیلا بھائی ہے، اور یہ ساری دولت اسے اپنے باپ کی وراثت سے ملی ہے، سرکاری طور پر سب کچھ اس کے نام پر ہے۔ اس کی یہ دریا دلی تبھی تک ہے جب تک اس کے سر سے نوکری کا بھوت نہیں اتر جاتا یا پھر زیادہ سے زیادہ اس کی شادی تک۔ سوچو پھر اس کے بعد ہمارا کیا ہوگا، نازیہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر مبشر کے ماتھے پر سوچ کی لکیروں کا جال سا تن گیا، جیسے مستقبل میں کنگال ہونے کے خیال نے اس کے ذہن میں بھی جڑ پکڑ لی ہو۔

''کیا سوچ رہے ہو۔'' خاموشی کا دورانیہ طویل ہونے پر نازیہ نے پوچھا۔ مبشر بجائے کوئی جواب دینے کے چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، اور پھر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ پر آبیٹھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ اگر عورت روپ بدلنے پر آئے تو کتنے روپ بدل سکتی ہے۔'' اس نے دہکتے انگاروں پر ہاتھ سینکتے ہوئے سرد اور دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں سمجھی نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' نازیہ نے چونک کر حیرت بھری نظروں سے مبشر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا یہ حیرت زدہ انداز میں انجان بننے کی ایکٹنگ کرنا بھی میرے لیے ایک نئے روپ سے کم نہیں ہے، اگر میں پہلے سے حقیقت سے واقف نہ ہوتا تو، یقیناً تمہاری ان اداؤں کے جال میں ضرور پھنس جاتا۔''

مبشر نے ایک بار پھر سپاٹ لہجے میں جواب دیا، اس کی نظریں انگیٹھی میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''پلیز پہیلیاں نہ بجھواؤ، سیدھی طرح بتاؤ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' نازیہ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''فقراز تمہارے سگے چچا کا بیٹا ہے، وہ تم سے کبھی اپنی چاہت کا اظہار نہ کر سکا، وہ اگر ایک بار بھی اماں سے کہہ دیتا تو تم دونوں کی شادی یقینی تھی، اس سے پہلے کہ اماں کو اس کے دل کی کیفیت معلوم ہوتی، میں نے تم سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا، تو فقراز بنا کچھ کہے میرے حق میں دستبردار ہو گیا، یہ اُس کا بڑا پن تھا، جس کا اظہار وہ ہمیشہ سے میرے ساتھ کرتا آیا ہے، اب چند ماہ پہلے جب تمہیں میری زبانی فقراز کے دل کا حال معلوم ہوا تو تمہارے شیطانی دماغ میں حسد کے سانپ لوٹنے لگے، کہ زمین جائیداد سب اس کے نام ہے۔ اسی لیے تم سیل فون کے ذریعے اس پر ڈورے ڈالنے لگیں۔ تم نے ہر حربہ آزما لیا، مگر اس شریف انسان نے تمہیں لفٹ نہیں کروائی تو اب تم اسے میرے ہاتھوں راستے سے ہٹانا چاہتی ہو، تاکہ اس سے ٹھکرائے جانے کا انتقام بھی لے سکو، اور اس کی دولت تک رسائی بھی ممکن ہو جائے۔'' بات کے اختتام تک اس کا لہجہ زہریلہ ہو چکا تھا۔

تم اتنے گھٹیا ہو سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، مجھ پر بہتان لگانے کے لیے تمہیں کوئی اور بہانہ نہیں سوجھا، غلیظ انسان، کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ میں نے فقراز پر ڈورے ڈالے ہیں، حد ہوگئی ہے بے اعتباری کی، میں اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں رُک سکتی، ابھی ابو کو فون کر کے بلواتی ہوں۔'' نازیہ نے

ایک ایک لفظ پیستے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار ابھرے ہوئے تھے، اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے سیل فون کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، اس سے پہلے کہ وہ فون اٹھاتی مبشر کے الٹے ہاتھ کا ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے نازک رخسار پر پڑا، تو وہ الٹ کر پیچھے جا گری۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی مبشر نے انگیٹھی پر پڑی ہوئی سلاخ اٹھا کر اس کی کنپٹی پر رسید کر دی، تو اٹھنے کی کوشش کرتی ہوئی نازیہ ایک بار پھر پلٹ کر بیڈ پر جا گری، اس بار اس کے گرنے کا انداز غیر فطری تھا، وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''ہونہہ! مجھے دھوکا دینا اتنا آسان نہیں ہے بیگم صاحبہ۔ اس نے طنزیہ ہنکارا بھر کر بڑبڑاتے ہوئے کہا، اور سٹور روم کی طرف چلا گیا، جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رسی کا بنڈل تھا، اگلے چند منٹ میں اس نے نازیہ کی مشقیں کس دیں، اور پھر اس کا چہرہ سیدھا کرتے ہوئے لگاتار کئی تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیے تو اس کے جسم میں حرکت کے آثار نظر آتے دیکھ کر مبشر پیچھے ہٹ گیا۔

کچھ دیر بعد نازیہ کراہتے ہوئے ہوش میں آ گئی، اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے صرف کسمسا کر رہ گئی۔

''پلیز مجھے مت مارو، لگتا ہے تمھیں کوئی شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے، مجھ سے جیسی چاہے قسم لے لو، ایسا کچھ بھی نہیں ہے جیسا تم سوچ رہے ہو، فقراز کو تو میں اپنے بھائی جیسا سمجھتی ہوں۔'' نازیہ نے باقاعدہ روتے ہوئے اپنی صفائی دی۔

''زیادہ اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہارا سیل فون ٹریپ کیا ہوا تھا، تم کسی کو بھی کال، ٹیکسٹ میسج یا ای میل، کرو، یا کوئی تمھیں کرے تو پہلے ڈیٹا میرے سیل فون پر موصول ہوتا ہے، پچھلے کئی ماہ سے تم نے جو کالیں یا میسج کیے ہیں، یا تم نے رسیو کیے ہیں، وہ تمام کے تمام میرے پاس محفوظ ہیں۔''

مبشر نے اپنی جیب سے فون نکالتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا تو اس کی بات سن کر نازیہ کا رنگ فق ہو گیا، اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مبشر اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے، وہ گنگ سی ہو کر رہ گئی۔ جیسے اس کے پاس معافی مانگنے کے الفاظ بھی ختم ہو گئے ہوں، وہ صمٌ بکمٌ کی حقیقی تصویر بن چکی تھی۔

مبشر اسے ریکارڈ شدہ کالیں سنوانے لگا، جس میں وہ فقراز سے محبت کے دعوے کر رہی تھی، جبکہ وہ اسے مختلف انداز سے رشتوں کے تقدس کا خیال رکھنے کی تلقین کر رہا تھا۔ کافی کالیں سنوانے کے بعد مبشر اسے ٹیکسٹ میسج پڑھ کر سنانے لگا۔

''یہ لو سنو ایک اور میسج۔''

مبشر نے ایک اور میسج کو زوم کرتے ہوئے کہا۔

''کاش مجھے پہلے معلوم ہو جاتا کہ تم مجھے چاہتے ہو تو، پھر چاہے جو بھی ہو جاتا، میں تمہاری ہی دلہن بنتی، جب سے مجھے تمہارے جذبات کا علم ہوا ہے، کسی پل چین نہیں آ رہا، خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، ہم اب بھی ایک ہو سکتے ہیں، تم دنیا والوں سے نہ ڈرو، ان کا تو کام ہی باتیں بنانا ہوتا ہے، چند دن میں سب کچھ نارمل ہو جائے گا، مگر منزل پانے کے لیے تمہارا ہمت کرنا پہلی اور آخری شرط ہے۔''

میسج پڑھنے کے ساتھ ساتھ مبشر کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت نکل رہے تھے۔

''یہ صلہ دیا تم نے میری محبت کا، میں نے تمہیں اپنی اوقات سے بڑھ کر چاہا، تمہاری ہر خواہش کو مقدم جانا، پھر کیوں کیا تم نے ایسا۔'' اس نے رندھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''پلیز مجھے معاف کر دو میں تو یہ دولت ہم دونوں کے لیے حاصل کرنا چاہتی تھی، ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں یہ سب کچھ تمہیں بتائے بغیر کر رہی تھی۔'' نازیہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایک نیا پینترا بدلا۔

''تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے، اس لیے تمھیں معافی ملنا ناممکن ہے، میں نے سوچ لیا ہے تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔'' مبشر نے اپنے آنسو پونچھ کو مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ قتل کی بجائے پکنک پر جانے کی بات کر رہا ہو۔

"ق ق ق قتل کرو گے، پر تمھیں کیا فائدہ ہوگا تم بھی سولی چڑھ جاؤ گے۔" نازیہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"پہلے میری پوری بات تو سن لو، پھر بتاؤ مجھے پھانسی ہوگی یا مجھے مظلوم سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔

جب پولیس اور لوگ تم دونوں کی لاش برہنہ اور قابل اعتراض حالت میں دیکھیں گے تو مجھ پر غیرت میں آ کر وقتی اشتعال کے تحت قتل کا مقدمہ بنے گا۔

اور پھر اس کیس کی مدعی ماں ہی ہوگی قتل کے چند دن بعد جب معاملہ تھوڑا ٹھنڈا ہوگا تو ماں کبھی نہیں چاہے گی کہ وہ دوسرے بیٹے کو بھی گنوا دے ،نتیجتاً عدالت میں جب ماں مجھے معاف کرے گی تو بات ختم ہو جائے گی۔

اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں کل ہی اپنی ماں کو خالہ کے یہاں چھوڑ آیا ہوں، کل تم مجھ سے پوچھ رہی تھی نہ کہ اماں کو خالہ کی طرف کیوں چھوڑ آیا ہوں، میرے خیال میں اب تمہیں اچھی طرح سمجھ آ گئی ہو گی۔ صبح دس بجے تک فقراز بھی آ رہا ہے، ابھی تمہارے پاس چند گھنٹوں کی زندگی باقی ہے، اپنے سابقہ گناہوں کی معافی مانگ لو مبشر نے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔ نازیہ اس کا منصوبہ سن کر موت کے خوف سے کپکپانے لگی، مبشر نے جلتے ہوئے کوئلے سے سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لگا کر دھواں نتھنوں کے ذریعے باہر خارج کر دیا، اور پھر گویا ہوا۔

"ویسے ایک بات ماننی پڑے گی کہ ہم دونوں کے دماغ ایک ہی ڈائرکشن میں سوچتے ہیں، اگر تم درمیان میں مجھے دھوکہ نہ دیتیں تو یقیناً ہم دونوں ہی اس دولت کے مالک ہوتے۔ تم اس دنیا میں واحد ہستی ہو جسے میں نے خود سے بڑھ کر چاہا ہے، اور اس چاہت کی وجہ سے ہی میں یہ ساری دولت تمہارے لیے حاصل کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا، مگر تمہارے دھوکے نے سب کچھ چوپٹ کر کے رکھ دیا۔

چلو تمھیں آج بتا ہی دیتا ہوں، کہ تمہاری محبت میں ،میں نے کتنے انسانوں کا قتل کیا ہے۔

میں نے فقراز کو راستے سے ہٹانے کے لیے جتنے بھی منصوبے بنائے، ان سب میں میری کوشش یہی تھی کہ اس کی موت ایک حادثہ لگے، مگر ہر بار قسمت اس کا ساتھ دے جاتی تھی، اور اس کی بجائے کوئی اور قربانی کا بکرا بن جاتا تھا۔

ابھی چند دن پہلے میں نے آخری کوشش کی تھی تمھیں یاد ہوگا، فقراز جس بلڈنگ میں رہتا ہے، وہاں کچی گیس بھر جانے کی وجہ سے پندرہ افراد ہلاک اور کئی درجن متاثر ہوئے تھے، فقراز کو بھی چند دن ہسپتال میں رہنا پڑا تھا وہ مرتے مرتے بچا تھا، مجھے علم تھا کہ وہ رات کو ہیٹر جلا کر سوتا ہے اسی لیے میں نے وہ منصوبہ بنایا تھا، وہ بھی تمہارے اس دیوانے کا، کارنامہ تھا۔"

مبشر کے منہ سے اس کا کارنامہ سن کر نازیہ حیرت سے گنگ ہو گئی، اسے پکا یقین ہو گیا، کہ جو شخص اتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے، وہ اسے بھی ہرگز نہیں چھوڑے گا، یہی سوچ کر اس کا خون خشک ہوئے جا رہا تھا۔ نازیہ جو کچھ دیر پہلے تک مبشر سے اپنی بے وفائی کا ثبوت مانگ رہی تھی، وہ اب بار بار معافی مانگ رہی تھی، منتیں کر رہی تھی۔ مگر مبشر کسی پتھر کی طرح بے حس ہوئے بیٹھا تھا۔

اس پر نازیہ کی آہ وزاری کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا، جبکہ نازیہ اس کے تیور دیکھ کر ڈر رہی تھی، جو شخص پہلے سے کئی افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہو اس کے لیے مزید ایک دو قتل کرنا کون سا مشکل کام تھا۔

ڈور بیل کی آواز سن کر دونوں چونک گئے، مبشر نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو صبح کے دس بج رہے تھے، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور نازیہ کے دوپٹے سے اس کا منہ ایسے باندھ دیا کہ وہ چلا نہ سکے۔

اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بیرونی دروازے پر آ گیا، دروازہ کھولا تو سامنے اس کا سوتیلا بھائی فقراز کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اسے مسکراتا دیکھ کر حسد کی وجہ سے مبشر کا خون کھول اٹھا، بظاہر وہ بھی مسکراتا ہوا، بانہیں کھول کر فقراز کے گلے لگ گیا۔

"بھائی اماں نظر نہیں آ رہی۔" فقراز نے سیٹنگ

روم میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''اماں خالہ کی طرف گئی ہیں۔مبشر نے مختصر سا جواب دیا۔

''آپ کو معلوم تھا کہ میں آرہا ہوں تو مت جانے دیتے،اب میں اتنے عرصے بعد گھر آیا ہوں،اور ماں ہی گھر نہیں ہے ماں کے بغیر گھر خالی خالی سا لگتا ہے۔'' فقراز نے بیگ رکھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

''میں نے منع کیا تھا،مگر وہ کہہ رہی تھیں کہ ایک دو روز میں واپس آجائیں گی۔''

مبشر اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے صوفے کے پیچھے آگیا،اور وہاں چھپا کے رکھا ہوا ڈنڈا اٹھالیا،اور پھر اس سے پہلے کہ فقراز کو مبشر کے ارادے کا علم ہوتا اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

مبشر بے ہوش ہوئے فقراز کو بازوؤں سے گھسیٹتا ہوا اپنے بیڈروم میں لے آیا۔

کسمساتی ہوئی نازیہ کی نظر بے ہوش فقراز پر پڑی تو اس کی حالت مزید پتلی ہوگئی،جبکہ آنکھیں خوف کی وجہ سے آخری حد تک پھیل چکی تھیں۔مبشر نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے دوپٹہ کھول دیا،تو وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

''پلیز مجھے مت مارو،تمھیں تمہاری ماں کی قسم ہے میں وعدہ کرتی ہوں ساری عمر ایک کنیز کی طرح تمہاری خدمت کروں گی،تمہارے سامنے کبھی سر اٹھا کر بھی بات نہیں کروں گی،جو کہو گے،جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گی۔پر مجھے جان سے مت مارنا۔''نازیہ نے روتے ہوئے ایک بار پھر التجا کی اس کا لہجہ بے بسی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

''میں نے بہت سوچا ہے،تمھیں نہ مارنے کے بارے میں،لیکن میں جس قدر تم سے محبت کرتا تھا اب اتنا ہی تم پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے،اور اگر میں تمھیں زندہ چھوڑ بھی دوں،تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم پولیس کے پاس نہیں جاؤ گی۔''مبشر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''پلیز ایک بار مجھ پر اعتبار کرلو،اب مرتے دم تک تمھیں دھوکہ دینے کا سوچوں گی بھی نہیں۔''اس نے سسکتے ہوئے التجا کی۔

''اوکے،میں تمھیں ایک چانس دے کر دیکھ لیتا ہوں،ثابت کرو کہ تم جو کہہ رہی ہو اس پر پورا اتر سکتی ہو۔''مبشر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں،پر دوبارہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی،بتاؤ مجھے تمھیں کیسے یقین دلانا ہوگا۔''زندگی بچنے کا امکان دیکھ کر اس کے لہجے میں کھنک لوٹ آئی،ورنہ کچھ دیر پہلے تک تو خوف کے مارے اس کا رنگ گہرا پیلا ہو چکا تھا۔

''اتنی بڑی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے،مجھے تمہاری مدد چاہیے،اسے اٹھا کر لے جانا میرے بس کی بات نہیں،تم ایسے کرو،کہ پہلے اس کا گلا دبا کر اسے ختم کرو اور پھر اس کا سر بازو اور ٹانگیں کاٹ کر علیحدہ کرو تا کہ میں اسے دو چکروں میں ٹھکانے لگا آؤں۔''مبشر نے غور سے نازیہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے اپنا مطالبہ بتایا۔

،اتنا بھیانک مطالبہ سن کر نازیہ کا رنگ فق ہو گیا،وہ ساکت و جامد ہو کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا،تم ثابت نہیں کرسکتیں کہ تم میرے ساتھ مخلص ہو،تمہاری قابل اعتراض حالت میں لاشیں دیکھ کر لوگ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ میں نے تمھیں کیوں مارا۔''

کوئی جواب نہ پا کر مبشر نے انتہائی سرد لہجے میں کہا،اور جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا،جیسے ابھی اس کا قصہ تمام کردے گا،ابھی اس نے اپنے ہاتھ نازیہ کے گلے پر رکھے ہی تھے کہ وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

''رک جاؤ رک جاؤ مجھے منظور ہے تم جیسا کہہ رہے ہو میں ویسا ہی کرتی ہوں۔''موت کو سامنے دیکھ کر لرزتی کانپتی ہوئی نازیہ زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی،اس کی حالت دیکھ کر مبشر کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''اوکے میں اسے سٹور والے واش روم میں لے جا رہا ہوں،وہ کافی بڑا ہے اور روٹین میں استعمال بھی نہیں ہوتا،وہاں تم اپنا کام اطمینان سے کرسکتی ہو،پھر

میں اسے ٹھکانے لگا آؤں گا۔'' اس نے آگے بڑھ کر نازیہ کے ہاتھ پاؤں کھولتے ہوئے کہا، اور پھر بے ہوش پڑے فقراز کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اسٹور والے واش روم میں لے آیا، وہاں پہنچنے تک فقراز کے کراہنے کی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔

''اسے ہوش آرہا ہے اس سے پہلے کہ یہ ہوش میں آکر کوئی مسئلہ بنائے ختم کرواسے۔''

مبشر نے غراتے ہوئے حکم دیا تو نازیہ فقراز کے سینے پر سوار ہوگئی، اور کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے گلے پر جما دیے۔

سانس رکنے پر وہ ایڑیاں رگڑنے لگا، اسی اثنا میں اس کے جسم کو جھٹکے بھی لگ رہے تھے۔

نازیہ خود کو بچانے کے لیے فقراز کی جان لینے پر مجبور ہو چکی تھی، جب اس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں تو نازیہ نے مڑ کر مبشر کی طرف دیکھا تو چونک گئی وہ اپنے سیل فون سے اس منظر کی ویڈیو بنا رہا تھا۔

''کیا تمہیں اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں ہے جو یہ ویڈیو بنا رہے ہو۔'' نازیہ نے شکایتی انداز میں پوچھا، اس دوران اس کے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔

''اس بے اعتباری کی وجہ بھی تم خود ہو، یہ لو اور اپنا کام مکمل کرو۔'' مبشر نے ایک تیز دار خنجر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، تو وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، اور پھر اس کے ہاتھ سے خنجر لے کر یہ ثابت کرنے میں مصروف ہوگئی کہ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، اپنا کام مکمل کرنے کے دوران نازیہ کو بار بار ابکائیاں اور الٹیاں آتی رہیں۔

واش روم کا فرش خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس کا سر بازو، اور ٹانگیں جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد نازیہ بیسن پر ہاتھ دھو رہی تھی جب ایک بار پھر ڈور بیل بجنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' مبشر نے سیل فون کے ذریعے بنائی ہوئی ویڈیو کو محفوظ کرتے ہوئے کہا، اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھولنے پر وہ حیرت سے ساکت رہ گیا، سامنے ماں کھڑی تھی۔

''آ آ آپ!'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا، اور انہیں اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔

ماں بنا کوئی جواب دیے اندر داخل ہوگئیں، ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار واضح تھے۔

''آپ تو خالہ کے گھر چند دن رہنے گئی تھیں۔'' اس نے سوال کو دوسرے انداز سے پوچھا، بہر حال حیرانگی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''بیٹا پتا نہیں کیوں رات سے میرا دل گھبرائے جا رہا ہے، ایک بے چینی سی ہے جو ہر گزرتے پل بڑھتی جا رہی ہے، بظاہر تو سب کچھ نارمل ہے مگر پتہ نہیں کیوں یہ کیفیت مجھ پر طاری ہوئی جا رہی ہے، اسی لیے میں واپس چلی آئی، کہ شاید اپنے گھر آکر ٹھیک ہو جاؤں۔'' ماں جواب دیتے ہوئے صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

''آپ اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیں، امید ہے ٹھیک ہو جائیں گی، اگر پھر بھی یہی کیفیت رہی تو ڈاکٹر سے دوائی لے آئیں گے۔'' مبشر نے انہیں کمرے میں جانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں یہاں دھوپ میں ہی ٹھیک ہوں، یہ نازیہ کہاں ہے نظر نہیں آرہی۔'' ماں نے اردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

رات دیر تک ہم فلم دیکھتے رہے، ابھی وہ سو رہی ہے، میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں، مبشر نے بہانہ بناتے ہوئے کہا، اور اندر چلا آیا۔

تب تک نازیہ خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھ اور فرش دھو چکی تھی۔

''اماں آگئی ہیں، اب اسے ٹھکانے لگانے کے لیے رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

اماں کی آمد کا سن کر نازیہ بھی چونک گئی۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ تم فقراز کی گمشدگی کو چند دن سے زیادہ کیسے چھپاؤ گے۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں فقراز کو مارنے کے ایسے منصوبے بنایا کرتا تھا، جس سے اس کی موت ایک حادثہ لگے مگر پھر ایک

دن اتفاقاً تمہارے سیل فون پر فقراز کا میسج دیکھ کر میرے اندر شک کا بیج پھوٹ پڑا تو میں نے تمہارے سیل فون کو ہی ٹریپ کروالیا۔ جس سے مجھے تمہاری بے وفائی اور ارادوں کا علم ہوا تو میں غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس بار میں نے تم دونوں کی موت کا منصوبہ بنایا تھا، جو تم دونوں کے ناجائز تعلقات کا شاخسانہ لگے، مگر اب آخری لمحوں میں مجھے لگا کہ میں تمہارے بنا نہیں جی سکوں گا، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا، تم اسٹور روم کو تالا لگا کر اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں ماں کو چائے بنا کر دے آؤں۔''

مبشر نے اسے تفصیل بتائی اور کچن کی طرف بڑھ گیا، جبکہ نازیہ سٹور روم کو تالا لگا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مبشر رات کو بار بار ٹی وی لاؤنج میں جھانک رہا تھا، جہاں جائے نماز پر بیٹھی اس کی ماں نفل پڑھنے میں مشغول تھی، وہ کئی بار انہیں اپنے کمرے میں جانے اور سونے کا کہہ چکا تھا، مگر انہوں نے ہر بار ایک ہی بات کہی تھی۔

''بیٹا تم پریشان مت ہو، مجھے جب نیند آئے گی تو میں سو جاؤں گی، مجھے اپنے اللہ کو یاد کر کے کچھ سکون مل رہا ہے۔''

اسی کشمکش میں رات گزر چکی تھی، مگر اسے لاش ٹھکانے لگانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اس وقت بھی اماں صحن میں دھوپ میں پڑی چارپائی پر لیٹی اونگھ رہی تھیں۔

''تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں، ماں تو سامنے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' مبشر نے صحن میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

''دیکھو مبشر جلد بازی میں کام خراب مت کر بیٹھنا، اس مسئلے کے لیے پرسکون ہو کر سوچنے کی ضرورت ہے، ایسا کرتے ہیں باہر چلتے ہیں کہیں سکون سے بیٹھ کر اس مسئلے کا حل سوچتے ہیں، یہاں تو دماغ ٹھیک سے کام ہی نہیں کر رہا۔'' نازیہ نے تجویز دیتے ہوئے کہا۔ ''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو چلو چلتے ہیں۔'' مبشر نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، اور باہر صحن میں نکل آیا۔

''اماں ہم ذرا شہر تک جارہے ہیں دو تین گھنٹوں تک لوٹ آئیں گے آپ نے کچھ منگوانا ہے تو بتا دیں۔'' اس نے موٹر سائیکل کا پٹرول چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بیٹا مجھے کچھ نہیں چاہیے، بس تم لوگ جلدی لوٹ آنا'' ماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس دوران نازیہ بھی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر آگئی، اور پھر دونوں گھر سے نکل گئے۔

ابھی انہیں گھر سے نکلے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ڈور بیل بجنے کی آواز سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ صغراں بیگم اٹھ کر دیکھتی، دروازہ کھلا اور اس کا دیور سجاد گھر میں داخل ہوا۔

بھابی آپ کب واپس آئیں۔'' سجاد نے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

''میں کل ہی آئی ہوں۔'' انہوں نے سلام کا جواب دے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں بھابی بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، دراصل میں ہاون دستہ لینے آیا تھا۔'' سجاد نے اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے بیٹھنے سے معذرت کی۔

''اچھا تو بھابی سے ملنے نہیں آئے ہو، بلکہ اپنے ہی کام سے آئے ہو۔ جاؤ بھئی اسٹور میں پڑا ہوا ہے جا کر لے آؤ۔''

بھابی کی بات سن کر سجاد مسکرا دیا، اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا ہوا لے کر نہیں آئے۔'' صغراں بیگم نے چند لمحوں بعد اسے خالی ہاتھ واپس آتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''بھابی اسٹور کو تو تالا لگا ہوا ہے۔''

''تالا لگا ہوا ہے!'' صغراں بیگم نے حیرت سے اس کی بات کو دہرایا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو، اسٹور کو تو کبھی کنڈی بھی نہیں لگائی اور تم تالا لگنے کی بات کر رہے ہو۔'' انہوں نے اٹھ کر اندر کی جانب جاتے ہوئے کہا، ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے انہیں اپنے دیور کی بات پر یقین نہ آرہا ہو۔

اسٹور کے دروازے پر لگا ہوا تالا دیکھ کر وہ چند لمحوں کیلئے ساکت سی ہو گئیں، سجاد بھی اپنی بھابی کے پیچھے ہی اندر آ گیا تھا۔

''شاید نازیہ نے میری غیر موجودگی میں لگا دیا ہو گا، ابھی وہ مبشر کے ساتھ شہر تک گئی ہے، جونہی واپس آئے گی میں مبشر کے ہاتھ ہاون دستہ بھجوا دوں گی۔'' انہوں نے واپس پلٹتے ہوئے کہا، تو سجاد سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ دونوں اسٹور سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے تو صغراں بیگم ٹھٹھک کر وہیں رک گئیں، اس کی نظریں صوفے اور دیوار کے درمیان تنگ سی جگہ میں پڑے ہوئے بیگ پر جم گئی تھیں۔

''کیا ہوا بھابی!'' سجاد نے اپنی بھابی کو رکتے ہوئے دیکھ کر پوچھا، مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیے بغیر آگے بڑھ کر صوفے کے پیچھے پڑے ہوئے بیگ کو اٹھا لیا اور پھر اسے صوفے پر رکھ کر اس کی زپ کھول کر اندر دیکھنے لگی۔

''یہ بیگ تو میرے فقراز کا ہے مگر یہاں کیسے آ گیا۔'' انہوں نے الجھے ہوئے انداز میں خود کلامی کی۔

''بھابی اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے، جب فقراز بیٹا گھر آیا ہے تو ظاہر ہے اپنا بیگ بھی ساتھ ہی لائے گا نا۔'' سجاد نے بھابی کے لہجے میں حیرت کو بھانپتے ہوئے وضاحت چاہی۔

''کیا مطلب، فقراز گھر آیا ہوا ہے، مگر کب آیا وہ میرے علم میں تو نہیں ہے صغراں بیگم نے بے یقینی سے پوچھا۔

''کل صبح والی گاڑی سے آیا ہے جب وہ سٹاپ پر بس سے اترا تو میں بھی اتفاقاً وہاں موجود تھا۔ پھر میں ہی اسے اپنی بائیک پر گھر کے سامنے اتار کر گیا تھا۔'' سجاد نے فقراز کے آنے کی تفصیل بتائی تو اس بار خود اس کے لہجے میں کسی انجانے خدشے کی بو رچی ہوئی تھی۔

''میں بھی کل دوپہر کو واپس لوٹی ہوں مجھے تو فقراز گھر میں نظر نہیں آیا۔ مبشر یا نازیہ نے بھی نہیں بتایا کہ وہ گھر آیا ہوا ہے۔

سجاد میرا دل ڈوبا جا رہا ہے خدا کے لیے پتہ کرو، اگر میرا بیٹا آیا تھا تو اب کہاں ہے، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا، اور یہ تالا بھی نجانے کیوں لگا ہوا ہے جلدی تو ڑوا سے دیکھو کیوں لگایا گیا ہے۔''

صغراں بیگم نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا اور گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''میں سلیم اور رفیق کو بلاتا ہوں۔'' سجاد نے اپنے بیٹوں کے نام لیتے ہوئے کہا، اور تیزی سے باہر کی طرف دوڑا۔

وہ چند منٹ میں ہی واپس لوٹ آیا اس کے ہمرا اس کے بیٹوں کے علاوہ گلی کے دو ہمسائے بھی تھے، ہتھوڑے کی چند جاندار ضربوں سے تالا ٹوٹ گیا۔ واش روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اندر کا منظر دیکھ کر سب ہی لرز گئے۔

صغراں بیگم بھی صوفے سے اٹھ کر سٹور میں چلی آئیں۔

''تائی اماں پلیز آپ باہر ہی بیٹھیں۔'' سلیم نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا، اور تائی اماں کو روکنا چاہا۔

''ایسا کیا ہے جو تم مجھے روک رہے ہو۔ انہوں نے سلیم کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا، اور آگے بڑھ آئیں۔ جب ان کی نظر اپنے لخت جگر کے کٹے ہوئے خون آلود سر اور ٹکڑوں کی صورت بکھرے ہوئے اعضاء پر پڑی تو وہ وہیں ساکت ہو گئیں، جیسے چلتے ہوئے کھلونے کی چابی اچانک ختم ہو گئی ہو۔

''بھابی آپ باہر چلیں۔'' سجاد نے انہیں بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ مگر صغراں بیگم کسی بے جان بت کی طرح فرش پر جا گریں ان کا چہرہ سیدھا فرش سے ٹکرایا تھا۔

''بھابی!'' سجاد نے بیقراری سے پکارتے ہوئے انہیں سیدھا کیا، مگر تب تک ان کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں موت کا بے رحم فرشتہ مٹی کی اس مورت سے روح نکال کر لے جا چکا تھا۔

سجاد اور اس کے بیٹے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تو ساتھ آئے ہوئے ایک ہمسائے مولوی عباس نے انہیں چپ کرواتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ خود کو قابو میں رکھیں، ہمیں مبشر اور نازیہ کے آنے سے پہلے

پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے تاکہ وہ اس مسئلے کو بہتر طریقے سے ہینڈل کرسکیں۔ گلی محلے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں کیا سانحہ پیش آیا ہے ورنہ مبشر اور نازیہ فرار ہو جائیں گے۔'' اس نے سجاد اور اس کے بیٹوں کو حالات کی سنگینی کا احساس دلاتے ہوئے بہترین مشورہ دیا۔

''ہاں بھائی عباس ٹھیک کہہ رہا ہے ویسے بھی آج پولیس ایک تفتیش کے سلسلے میں چوہدری اجمل کے ڈیرے پر آئی ہوئی ہے، ہمیں فوری طور پر تھانیدار کو خبر کرنی چاہیے۔'' دوسرے ہمسائے علم دین نے بھی مولوی عباس کی تائید کی۔

''ٹھیک ہے عباس بھائی آپ میرے ساتھ چلیں باقی لوگ یہیں رکیں تاکہ اس دوران اگر وہ دونوں خبیث واپس آئیں تو انہیں قابو کیا جا سکے۔'' سجاد نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ہدایات دیں اور مولوی عباس کے ہمراہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆

مبشر اور نازیہ ابھی واپس گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے سپاہیوں نے انہیں دھر لیا، اور چند لمحوں میں ہی ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

اسی وقت تھانیدار اور سجاد، دوسرے افراد کے ہمراہ اندر سے نکل کر باہر صحن میں آ گئے، تھانیدار کے ہاتھ میں کچھ اشٹام پیپر نظر آ رہے تھے، جو فقراز کے بیگ سے برآمد ہوئے تھے۔

''پی پی یہ سب ہم نے نہیں کیا آپ قسم لے لیں ہم نے کچھ نہیں کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم کس نے کیا ہے۔'' مبشر نے ہکلاتے ہوئے صفائی دی۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہاں کچھ ہوا ہے جب کہ ابھی تو ہم نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔'' تھانیدار نے غراتے ہوئے کہا، تو مبشر کا رنگ فق ہو گیا، وہ دونوں لمبی چوڑی پلاننگ کر کے آئے تھے مگر اچانک پکڑے جانے پر اس کے منہ سے نکلنے والے پہلے جملے نے ہی پھانسی کا پھندا ان کے گلے میں فٹ کروا دیا تھا۔

''میں تم دونوں کو تمہاری ہڈیاں ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ایک چانس دے رہا ہوں۔

جو ہوا جیسے ہوا سب سچ سچ بتا دو، اور اگر مجھے محسوس ہوا کہ تم لوگ غلط بیانی کر رہے ہو تو پھر یقین مانو انٹروگیشن سنٹر میں تم سے سوال بعد میں کروں گا، پہلے تمہاری کھال ادھیڑوں گا۔'' تھانیدار نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا تو اس کا لہجہ سن کر ہی نازیہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

اس نے ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھا کر انگلی مبشر کی طرف کر دی جبکہ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔

''وری گڈ، تم لوگوں نے میرا وقت اور اپنی کھال بچا کر سمجھداری کا ثبوت دیا ہے۔ ویسے کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ پیپر کس بارے میں ہیں۔'' تھانیدار نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن منہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکے۔

''چلو میں بتا دیتا ہوں۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جس فرشتہ صفت انسان کو تم دونوں نے خون میں نہلایا ہے، اس نے اپنی تمام جائیداد کا نصف حصہ تم دونوں کے نام کر دیا ہے اور شاید یہ کاغذات دینے کے لیے ہی وہ یہاں آیا تھا، لیکن اب تمہیں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ تمہاری باقی زندگی تو جیل میں ہی گزرنے والی ہے اور پھر ہو سکتا ہے پھانسی کے آرڈر بھی جلد ہی مل جائیں۔'' تھانیدار کی بات سن کر مبشر اور نازیہ کو زمین گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، اسی دوران سپاہی فقراز اور صغراں بیگم کی لاشیں سٹریچر پر ڈال کر صحن میں لے آئے۔

جیسے ہی مبشر کی نظر ماں کی میت پر پڑی تو وہ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا، اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے گھٹنوں کے بل زمین پر گرا۔ اس کی حالت اس ہارے ہوئے جواری جیسی ہو چکی تھی، جو اپنی زندگی کی آخری پونجی بھی ہار چکا ہو۔

☆☆☆

دوسرا شعلہ

انوکھا بندھن



ایڈیسن ادریس مسیح

ایڈیسن کے زہر بجھے قلم سے ایک شعلہ سامانی

''اچھا' پھر کیا ہوا؟''

''پھر...... پھر میری شادی ہوگئی۔''

''ہاں...... یعنی تمہاری بھی محبت امر ہوگئی؟''

''کہاں...... اس سے نہیں ہوئی۔''

''جب ہی تو امر ہوگئی۔ اس سے ہوجاتی تو مرجاتی۔ شادیاں محبتوں کا مدفن ہوتی ہیں۔''

''ضروری نہیں ایسا ہو۔ مجھے تو لگتا ہے' اگر اس سے شادی ہوجاتی تو میری محبت کو پناہ مل جاتی۔''

''خیر' تمہارا اپنا خیال ہے۔ اچھا یہ بتاؤ' تمہارا شوہر کیسا ہے؟ اسے تو چپ لگ گئی ہوگی تمہارا ہوشربا حسن دیکھ کر؟''

''ہاں' اسے تو جیسے آگ لگ گئی تھی' جلنے لگا تھا۔''

''کیسے نہ لگتی۔ تم بھی تو چنگاری ہو۔''

''میں جلنے کا لفظ جیلیس ہونے کے لیے استعمال کررہی ہوں۔''

''مطلب؟''

''اسے لگتا تھا' وہ زیادہ خوبصورت ہے۔''

''ہوتا ہے' کچھ لوگوں میں خودپسندی ذرا زیادہ ہوتی ہے۔''

''پتا ہے' اس نے سہاگ رات میں مجھے کیا کہا؟ اس نے کہا تھا' تمہارا میک اپ ٹھیک نہیں ہوا' چوڑیوں کی میچنگ بھی اسے پسند نہیں آئی۔''

''لیکن تم تو ہمیشہ ہی خوش لباس رہی ہو پھر......؟''

''اس کو لگتا تھا بلکہ اس کے بعد بھی ہمیشہ جب جب میں نے اپنا روپ سنوارا' اس نے تنقید ہی کی۔ وہ کہتا تھا' تمہارے ہاتھ کیسے ہیں' تمہارا فگر برا ہے اور بھی ایسی کئی باتیں' مطلب...... وہ زیادہ اچھا ہے۔''

''psycho تھا کیا؟''

''شاید تھا...... اور کون نہیں ہے psycho- ہم شہروں میں رہنے والے لوگ آدھے پاگل تو ہوتے ہی ہیں۔''

''کرتا کیا تھا تمہارا شوہر؟''

''پیروں میں گھنگھرو باندھ کر ناچا کرتا تھا۔ بھڑکیلے کپڑے پہن کر بھیک مانگتا تھا اور...... لیکن یہ سب وہ لاہور جاکر کرتا تھا۔ یہاں یہی پتا تھا' ٹیکسٹائل مل میں جاب ہے۔ دن رات کام کرتا ہے' خوب محنتی ہے۔''

''اوہ...... تمہیں کیسے پتا لگا؟''

''وہ گھر پہ بھی میک اپ کرتا تھا۔ تیار ہوکر میرے آگے کھڑا ہوجاتا تھا۔ مقابلہ کرتا تھا۔ کہتا تھا' دیکھو' میں زیادہ خوبصورت ہوں۔ تم میں ادا نہیں ہے؟''



''ہاہاہا' اور تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہاں' ادائیں تو تھیں اس میں مجھ سے بھی زیادہ۔ ادائیں ہی تو بکتی تھیں اس کی۔ بڑے عاشق تھے اس کے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں؟''

''ہاں' میں سمجھ گیا۔ تم نے کسی سے شکایت نہیں کی؟''

''کس سے کرتی اور کیوں کرتی؟ میں نے تو اُس وقت بھی شکایت نہیں کی جب اُس مرد نما عورت سے مجھے بیاہ دیا گیا تھا۔ عورت ہی تو تھا' پوری عورت......''

''یہ تو بڑا ظلم ہے یار...... تمہیں احتجاج کرنا چاہیے تھا؟''

''احتجاج......عورت کی کون سنتا ہے؟ مجھے تو الٹا بے اولادی کے طعنے ملتے تھے۔ کہاں سے لاتی بچہ؟ میں کنواری سہاگن تھی۔''

''کیا؟ پھر...... یہ...... سب یہ ابارشن......؟''

''اس کا ہوتا تو اتنا مارتا مجھے کہ ابارشن ہو جاتا۔''

''پھر......؟''

''شیراز کا تھا۔''

''کون شیراز؟''

''اس کا دوست تھا۔ گھر آنا جانا بہت تھا۔ میری دوستی ہوگئی تھی۔ بس چھوڑیں ساری باتیں' میں نے کہا ناں' مجھے......''

''لیکن ہمارا کام آپ کی جان بچانا ہے' مارنا نہیں......''

''تو آپ نے بھی میری کہانی سن کر صرف مزہ لیا؟ میرا ساتھ نہیں دیا؟ میں بے قصور ہوں۔''

''نہیں' ایسا نہیں ہے' آپ غلط سوچ رہی ہیں۔ میں نے آپ سے یہ سب صرف اس لیے پوچھا کہ آپ کا کتھارسس ہو سکے اور میں بھی ایک الجھن میں سے نکل سکوں۔''

''کیسی الجھن؟''

''یہی کہ آپ کے ہسبینڈ نے آخر آپ پر اتنا تشدد کیوں کیا؟''

''ظاہر ہے' کوئی بھی مرد کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی کسی اور کے ساتھ......''

''ہاہا...... ایسا نہیں ہے۔ اس نے مجھے اس وجہ سے مارا ہے کہ میں نے بقول اس کے' اس کے حق پہ ڈاکہ ڈالا تھا......''

☆☆☆

تیسرا شعلہ

ہائیپوگا نڈریا

سعدیہ سیٹھی

اُس ظالم شخص کی عبرت سرائی جو خود کو خدا کہلوانے لگا تھا

پیر وحید قلندر کے خاص کمرے سے حق حق کی صدائیں بلند ہورہی تھیں۔

اور یہ آوازیں صرف اسی وقت بلند ہوتی تھیں، جب وہ گناہ گار مریدوں کے برہنہ جسموں پر ڈنڈے برساتا تھا۔

اس وقت بھی پیر صاحب کی ہذیانی انداز میں گونجتی ہوئی آواز کمرے سے باہر تک آرہی تھی۔ جس سے لگ رہا تھا کہ ،سزا پانے والی مریدنی انتہائی گنہگار شمار کی گئی ہے، ورنہ عام طور پر چھوٹی ضربوں سے کام چل جاتا تھا۔

مگر جب بھی کسی بڑے گناہ والے مجرم کا معاملہ پیش آتا تو جلال کی وجہ سے پیر صاحب کی آواز میں شدت اور ڈنڈے کی ضرب دونوں بڑھ جاتی تھیں۔

کچھ دیر بعد کمرہ خاص کا دروازہ کھلا اور ایک خوبرو مریدنی سسکتی اور آہیں بھرتی ڈگمگاتے قدموں سے باہر نکلی ،اگر قریب ہی موجود عورت اسے تھام نہ لیتی تو وہ یقیناً نقاہت کی وجہ سے منہ کے بل جا گرتی۔

''نصیبوں والی ہو جو پیر صاحب نے تمہارے گناہ جھاڑ دیے ہیں، اب تمہارے من کی ہر مراد پوری ہوگی اور تمہاری گود بھی ہری ہوجائے گی۔''

اس ادھیڑ عمر عورت نے اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے کہا تو اردگرد موجود دوسرے لوگ بھی اسے کسی نومولود بچے کی طرح پاک ہونے پر مبارک باد دینے لگے۔

مزار کے بالمقابل میرا چھوٹا سا کریانہ سٹور ہونے کی وجہ سے میں یہاں آئے روز ہونے والے نت نئے تماشوں کا عینی شاہد تھا۔ یہ سب خرافات دیکھ کر میرا خون کھولتا رہتا تھا۔

آج بھی اس خوبصورت اور پڑھی لکھی نظر آنے والی حوا کی بیٹی کی تذلیل دیکھ کر میری کنپٹیوں میں پھڑکنے والی رگیں بتا رہی تھیں کہ میرا فشار خون کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

مگر بے حیثیت اور بے وقعت انسان سوائے کڑھنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

بہر حال میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے محکمہ اوقاف اور متعلقہ تھانے میں بغیر شناخت کے تفصیلی حالات لکھ بھیجے تھے تا کہ کسی سانحے کا قبل از وقت ادراک اور سد باب کیا جاسکے۔

میری طرف سے کئی بار کی گئی نشاندہی کے باوجود حکام بالا کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بے حس محکموں کی ازلی سستی اور نااہلی آڑے آگئی۔ اور پھر وہ ہوگیا، جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

ایک دن پیر وحید قلندر نے دعوی کر دیا کہ اللہ تعالی نے اسے مُردوں کو زندہ کرنے کی کرامت اور طاقت بخش دی ہے، اب وہ کچھ گناہ گاروں کو اپنے عصائے قلندری سے پہلے ہلاک کرے گا، اور پھر زندہ کرے گا، تا کہ ساری دنیا اس کے مہدی ہونے کا مشاہدہ کر سکے۔

سرگودھا کے اس بدنصیب چک نمبر 95 شمالی کا یہ سارا علاقہ پیر وحید قلندر کا معتقد تھا، اس دعوی سے اس کی اپنی جماعت میں ہی سراسیمگی پھیل گئی۔

مگر اس کی تقلید میں اندھے گونگے اور بہرے ہو چکے مریدوں نے اس ہرزہ رسائی پر بھی یقین کر لیا۔

اور خود کو معصوم بچوں کی طرح پاک صاف کروانے کے لیے قربانی کے لیے پیش کر دیا تو اس ولی کامل نے یکم اپریل کو لوگوں کے ساتھ وہ اپریل فول منایا جس کے بارے میں سن کر ہی انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

اپنی کرامت دکھانے کیلئے اس نے دن کی بجائے رات کے اندھیرے کا انتخاب کیا۔

وہ اپنے مریدوں کو بلاتا انہیں نشہ آور مشروب پلاتا اور پھر عصائے قلندری سے مار مار کر ہلاک کرتا رہا، یہاں تک کہ اس نے بیس مریدوں کی جان لے لی، ان میں چار خواتین بھی شامل تھیں۔

آخر میں کچھ کمزور دل مرید موت کو سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہو کر بھاگ اٹھے۔

اسی دوران میں خوف اور اذیت کے عالم میں رہا اور بار بار کالیں کر کے متعلقہ تھانے کو حالات کی سنگینی کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتا رہا، مگر ان لوگوں کو تو بس میری شناخت چاہیے تھی، انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا، کہ قیمتی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔

موت سے خوف زدہ ہو کو بھاگنے والے جب خود تھانے اور میڈیا تک پہنچے، تب کہیں جا کر اندھے، بہرے اور بے حس قانون کے مردار جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور اس،، مرد قلندر،، کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا۔



مگر تب تک درجنوں گھروں میں صف ماتم بچھ چکی تھی۔اس وحشی سانڈ نے فصلیں اجاڑنے کی حد کردی تھی۔

اب اس کا مکافات عمل شروع ہوا تو میں بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر عدالتی کارروائی دیکھنے پہنچ جایا کرتا۔

وہاں جو باتیں سامنے آئیں ان کے مطابق وحید الیکشن کمیشن میں لیگل اسسٹنٹ کے علاوہ، ایف، آئی، اے میں لا آفیسر جیسے اعلیٰ عہدے پر رہ چکا تھا مجرمانہ طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہاں بھی کرپشن اور اختیارات میں تجاوز کیا، اور پھر سزا سے بچنے کے لیے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

پھر اسی دوران وہ علی محمد قلندر گجر، نام کے ایک شخص سے ملا وہ مختلف بڑے شہروں میں تعویز گنڈے کا کام کرتا تھا۔

وحید اس کا مرید خاص بن گیا علی محمد قلندر نے انسانوں کو گناہوں سے پاک کرنے کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا ہوا تھا، وہ گناہ گار مرد و خواتین کو ننگا کر کے ڈنڈے مارا کرتا تھا، جس سے ان کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جاتا، اور وہ پاک صاف ہو جاتے تھے۔

مرید خاص وحید قلندر بھی جلد ہی گناہ جھاڑنے کا ایکسپرٹ بن گیا۔

علی محمد قلندر کا تین برس قبل انتقال ہوا تو اسے اس کے آبائی گاؤں چک 95 شمالی جو کہ ضلع سرگودھا کے نواح میں ہے، اس کی ذاتی زمین میں دفنا کر اس کی قبر پر مزار بنا دیا گیا۔

وحید قلندر اس مزار کا متولی اور مجاور بن کر سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا، وہ اس وقت تک خود ساختہ ترقی کرتا ہوا، اپنے نام کے ساتھ پیر اور قلندر کا لاحقہ جڑ چکا تھا۔

ظلی بروزی قطب بننے کے بعد تو اس نے انسانیت کے ساتھ وہ کھلواڑ کیا کہ، الامان الحفیظ۔

”تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔“ جج صاحب نے اپنی عینک کے اوپر سے وحید قلندر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا تھا۔

”جج صاحب آپ میرے ساتھ چلیں، میں ان سب مقتولوں کو دوبارہ زندہ کر دوں گا، بس ایک شرط ہے پولیس ہمارے ساتھ نہیں ہونی چاہیے۔“

وحید قلندر کی بات سن کر جج صاحب کے چہرے پر بیزاری کے تاثر پھیل گئے۔

”آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔“ اس بار جج صاحب نے میڈیکل ایگزامنر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔

”سر یہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک انتہائی افسوسناک واقعہ ہے، یہ کٹہرے میں کھڑا ہوا شخص عبدالوحید مکمل فراڈ اور جرائم پیشہ شخص ہے، میرے پاس اس کی تازہ ترین رپورٹس ہیں، ان کے مطابق یہ ایک نفسیاتی بیماری (ہائپو کانڈریا) کے آخری لیول کا مریض ہے، اس مرض میں انسان ایک اختراعی دنیا آباد کر لیتا ہے جس کا وہ خود کو چیف سمجھتا ہے اور اس خیالی دنیا کو سو فیصد حقیقت سمجھنے لگتا ہے دنیا کے تقریباً سبھی جھوٹے ولی قلندر قطب نبی یا پھر ظلی بروزی نبی اسی ہائپو کانڈریا، کے مریض تھے، علی محمد قلندر گجر، اور یہ کٹہرے میں کھڑا ہوا انسان نما درندہ بھی اسی مرض کا شکار ہے۔

سب سے خطرناک صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب لوگ اندھوں بہروں کی طرح ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

آپ ہمارے معاشرے کی گراوٹ کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہم، ہر اس شخص کو جو پتھر اٹھا اٹھا کر ہر گزرنے والی گاڑی پر پھینک رہا ہو، یا پھر وہ جو کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ بیچ بازار میں نکل آئے، ہم انہیں مشکل کشا اور کرنی والا سمجھ کر ان کے پاؤں چومتے ہیں، اور تو اور ان کی بہتی ہوئی رالوں کو بطور تبرک اپنے چہروں پر مل لیتے ہیں۔

میری حکومت سے درخواست ہے کہ وہ ایسے تمام ولیوں پیروں کو جو خود کو مشکل کشا اور مُردوں کو زندہ کرنے کے دعویدار ہیں انہیں اٹھا کر بیچ سمندر میں پھنکوا دیں، پھر جو واقعی اپنے دعوے میں سچا ہو گا، وہ بچ کر آ جائے گا۔“

ڈاکٹر صاحب جرم کی اس مذہبی قسم پر تفصیل سے بات کر رہے تھے، جبکہ میرے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال کسی بچھو کی طرح ڈنگ مار رہا تھا، کہ اصل مجرم کون ہے۔

ہائپو کانڈریا کے مریض، یا پھر ریاستی ادارے جن کی ناک کے نیچے یہ انسان نما درندے اندھی محبت اور تقلید کے مارے ہوئے معصوم لوگوں کی عزت اور زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔

یا پھر ہم خود عوام الناس... میں کنفیوز ہوں اگر آپ کو صحیح جواب ملے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔

☆☆☆

ہوش و خرد سے بیگانہ زمانے کے اُن دیوانوں کی داستانیں، جو آج آہنی سلاخوں کے پیچھے خود اپنی ذات کو کھوج رہے ہیں

زندگی جلتا دیا ہے

سیدہ تبسم زہرا رضوی

اُس ماں بیٹے کی کہانی، جنھیں زندگی بچانے کے لیے پاگل خانے میں قیام کرنا پڑا مگر......

جب میں اپنے گھر کے اکلوتے کمرے میں آیا تو امی کا سر سلائی مشین پر ٹکا ہوا تھا۔

''امی......امی......!'' اور امی سیدھی ہوگئیں۔ وہ شاید سوگئی تھیں۔

''جی......جی بیٹا لو اٹھ گئی۔'' سر تا پا شفقت و محبت کا مجسمہ میری ماں میرا میرا سائبان بھی تھیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ سلائی مشین پر جھکے پایا۔ کچھ گھر چھوڑ کے سلائی کا کارخانہ تھا۔ وہاں سے مال آجاتا اور امی سلائی مشین کی ہو جاتیں اسی سے گھر چلتا تھا۔

ایک دن میں نے پوچھا۔ ''ہمارا گھر سب کے گھر کی طرح کیوں نہیں ہے۔''

''کیوں بیٹا؟ ہم کسی سے کم ہیں؟''

''ہم غریب ہیں۔'' میرے معصوم لبوں پر سوال آیا۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال ہوگی۔

''نہیں بیٹا خدا نہ کرے ہم کسی سے کچھ مانگتے تو نہیں۔ غریب وہ ہوتا ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔'' انہوں نے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔

''میرے بیٹے کے تو بہت سارے دوست ہیں؟''

میری تسلی نہ ہوسکی۔ میرا ننھا سا ذہن مختلف سمتوں میں سوچتا! دوسرے بچوں کے پاپا تھے وہ نوکری پر جاتے تھے۔ تنخواہ آتی تھی گھر چلتا تھا ان کے کھلونے آتے تھے، اچھے اچھے کپڑے بھی بنتے۔ امی کے پاس جب پیسے ہوتے وہ بھی مجھے کھلونے دلاتیں، کپڑے دلاتیں، خود تو وہ نہیں بنا پاتیں۔ دوسرے بچوں کے عزیز اقارب آتے تھے ان کے لیے چیزیں لاتے میرا یہ خانہ بھی خالی تھا۔ میری نانی دو گلی چھوڑ کر رہتی تھیں لیکن شاید کبھی ہمارے گھر آئی ہوں۔ یہ ملیر سعود آباد کہلاتا تھا۔ یہاں کے لوگ آپس میں بڑے پیار و محبت سے رہتے۔ جب نانا کے گھر نیاز فاتحہ ہوتی کوئی ماموں کھڑے کھڑے کہہ جاتے شام کو میری امی بڑی سی چادر اوڑھ کر مجھے ساتھ لے کر نانا کے گھر آجاتیں۔ میری اور خالائیں بھی تھیں وہ افراد خانہ کے ساتھ مل کر گھر کے افراد کی طرح کام کر رہی ہوتیں۔ میری امی مجھے لے کر کسی مہمان کی طرح ایک کونے میں ٹک جاتیں۔ کوئی ان سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا تھا۔ نانا بھی سلام کا جواب اکھڑے انداز میں دے کر چلے جاتے۔ میری طرف تو دیکھتے تک نہیں تھے۔ دوسری خالاؤں کے بچوں کی انگلی پکڑتے انہیں گودوں میں اٹھاتے۔ لاڈ پیار کرتے پیسے

دیتے اور میں منہ دیکھتا رہتا۔

میری ماں مجھے بہلانے کی کوشش کرتیں ہم مہمانوں کی طرح جاتے اور کچھ ہی دیر میں واپس آجاتے۔ ایک ایسے ہی دن کی بات ہے کہ جب میری خودار ماں اپنی ماں کے گھر سے لوٹیں تو ان کا چہرہ بجھ کے رہ گیا تھا۔ انہوں نے بستر بچھا دیا اور مجھے لے کر سونے لیٹ گئیں۔ رات کا خدا جانے کون سا پہر ہوگا میری آنکھ کھل گئی۔ امی بے آواز رو رہی تھیں۔ یہ تو بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ امی کو یہ سزا میرے باپ سے شادی کے جرم میں ملی تھی جوان سے شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی پتا ہوگئے تھے۔ وہ کوئٹہ سے یہاں پڑھنے آئے تھے۔ انہوں نے پہلے نانی سے اجازت چاہی نہ ملنے پر دونوں نے مولانا سے کہہ کر عقد پڑھوالیا تھا۔ ان کے پاس نکاح نامہ تھا۔ امی نے نانی کو بتا دیا تھا کہ انہوں نے شادی کر لی ہے۔ نانی نہ تو انہیں قبول کر سکتی تھیں نہ گھر سے نکال سکتی تھیں۔

شمالی علاقہ جات کی سیر نے میری خوبصورت ماں کی آنکھوں میں ہیرے اور چہرے پر گلاب بکھیر دیے۔ بس وہ تصویریں ہی تو حاصل زندگی تھیں۔ واپسی پر نانی نانا دونوں بری طرح ناراض تھے۔ پاپا نے امی کو ان کے پاس چھوڑا اور خود کوئٹہ اپنے گھر ایسے گئے کہ پھر کبھی پلٹ کر نہیں آئے۔ ان کا نام اکبر حسین تھا۔ میں آٹھ ماہ کے بعد دنیا میں آیا تھا تو کوئی بھی نہیں تھا جو میرے پیدا ہونے پر خوش ہوتا۔ میں تو جن کی اولاد تھا ان کے ہاں تو بیٹا پیدا ہونے پر ایسی خوشی منائی جاتی ہے کہ شادی کا گمان ہوتا ہے۔ جب میں چار سال کا تھا امی کو ایک خط ملا بھابی سفید چادر اوڑھ لو چوڑیاں توڑ دو اکبر حسین کو قتل ہوئے چار سال ہوگئے۔ امی کو تو نانی پہلے ہی کہتی تھیں کہ مولوی صاحب سے پوچھ کر میں تمہاری شادی کردیتی ہوں۔''

''خدانہ کرے میں منظر کے پاپا کی امانت ہوں۔''

یہ تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا کہ جب مجھے اسپتال سے گھر لایا گیا تھا تو نانا نے صاف کہہ دیا تھا کہ ''صفیہ سے کہہ دو کہ اس پلے کو لے کر ہمارے گھر نہ آئے۔''



میری امی مجھے کچھ دیر کے لیے ایک رشتے دار کے گھر آئیں وہیں کرائے کا مکان مل گیا۔ دو گھنٹے کے اندر میری ماں نے تھوڑے سامان کا بندوبست کیا اور نئے مکان میں آگئیں۔ نانی کا گھر دو گلی پیچھے رہ گیا لیکن دل بہت دور ہو گئے۔

میرے پاپا نے بہت سے قیمتی زیور امی کو تحفہ میں دیے تھے۔ ان میں سے ایک فروخت ہوتا تو مکان کا کرایہ ادا ہوتا کھانے پینے کا انتظام ہوتا۔ جب ان کی موت کی اطلاع نانی کے گھر آئی پہلے تو امی کو یقین ہی نہیں آیا وہ سمجھیں کہ نانی ان کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ خط پر فون نمبر تھا۔ فون سے تصدیق ہوگئی۔ اس دن امی بہت روئیں۔ اپنا سر دیواروں سے ٹکراتی تھیں۔ ''اکبر مجھے اکیلا نہ کرو'' لیکن اب تو بس ہم ماں بیٹے اور حوادثِ زمانہ یہ منظر میری میموری میں خواب کی طرح محفوظ تھا۔

ایک روز دوپہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ امی نے اندر سے پوچھا۔

''کون؟''

''بھائی! میں دلنواز ہوں اکبر کا دوست۔'' امی نے دروازہ کھول دیا۔ ہمارے سامنے سادہ سا انسان تھا شلوار قمیض پہنا ہوا تھا۔ ایک گٹھڑی تھی جو اس نے کاندھے پر لٹکائی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں کبھی کوئی غیر اپنا بھی نہیں آیا تھا ایک کمرہ تھا ایک چارپائی بچھی تھی باقی میں دری تھی ایک کونے میں سلائی مشین تھی۔ یہ تھی کمرے کی کل کائنات۔ امی نے بڑی چادر اوڑھ کر چاچا کو اندر بلالیا۔ چارپائی پر بٹھایا خود فرش پر میرے ساتھ بیٹھ گئیں۔

''یہ......! ماشاء اللہ'' چاچا نے مجھے دیکھا پھر مجھے گلے لگالیا۔ باوجود ضبط کے ہم سب کے آنسو نکل آئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ باپ کی شفقت کیسی ہوتی ہے لیکن چاچا چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔

''اکبر حسین اکبر حسین میرا اکبر حسین۔'' وہ میرا چہرہ چھو رہے تھے اور ان کے آنسو ان کی ریش بھگو رہے تھے۔

''اچھا بہن! اب منہ سے نکلا ہے تو اب بھابی نہیں بہن کہا کروں گا۔ دیکھیں میں اور اکبر بچپن سے دوست تھے۔ اکبر سردار کا بیٹا تھا۔ آپ سے شادی ہوئی تو اکبر نے ڈر کے مارے کسی کو نہیں بتایا۔ آپ کے ساتھ مری سوات سے واپس حویلی گیا تو کہتا تھا کہ وقت دیکھ کر ماں کو بتاؤں گا۔ بابا سے بہت ڈر لگتا ہے لیکن پھر وقت ملا ہی نہیں۔ گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی۔ بابا بھی گئے میرا بھائی اور میرا دوست اکبر بھی۔''

امی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ''میں زخمی ہوا تھا۔ وہ لوگ ہمارے جانی دشمن تھے۔ زمینوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔ مجھے زخمی حالت میں وہ لوگ ساتھ لے گئے تھے۔ تھوڑا اعلاج بھی کروایا پھر جبری مشقت پر ڈال دیا۔ ایک دن میں ان کی دس سال کی قید کاٹ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میں ایک جگہ چھپ گیا تھا وہیں سے حویلی فون کیا۔ اماں جی کو بتایا اکبر کی شادی کی بات بھی یہ بھی کہا کہ اکبر نے کہا تھا تیری بھابی کو امیدواری ہے۔ اماں جی نے کہا کہ تم فوراً اس لڑکی کو ڈھونڈو۔ مجھے یہ پتہ زبانی یاد ہوگیا تھا۔ اس طرف ہمارے ایک عزیز بھی رہتے تھے میرے نانا کونسلر رہ چکے تھے۔ انہیں سب جانتے تھے گھر پہنچ گیا۔'' بابا کا ذکر سن کر میرا دل دھڑک رہا تھا۔

''وہاں سے اس گھر کا پتا مل گیا۔ اس طرح میں آیا ہوں یہ بی بی صاحب اماں جی نے آپ کو امانت بھیجی ہے۔ پتا تو آپ کے والد کا مجھے کل مل گیا تھا۔ میں نے فون پر بی بی صاحب کو بتایا منظر کا بتایا آپ کے صبر کی بات کی محلے میں عزت کی بات بتائی کس طرح اکبر حسین کی عزت اور اس کا بیٹا پال رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ابھی رک جاؤ میں امانت بھجوا رہی ہوں۔ میری بہو اور پوتے کو دینا۔''

اب میں دس گیارہ سال کا ہو رہا تھا۔ مجھے پرائمری اسکول سے فارغ ہو رہا تھا۔ ہائی میں داخلے کی رقم نہیں تھی امی نمازوں میں رو رو کر خدا سے میری تعلیم کی دعا مانگ رہی تھیں۔ میری خوددار ماں نے مجبور ہو کر نانی سے سوال کیا تھا۔ انہوں نے بھی منع کر دیا تھا حالانکہ غریب نہیں تھیں لیکن ان کی خطاوار تھیں پہلی شادی ان کی مرضی کے بغیر غیروں میں ہوئی تھی۔ دوسری پر راضی نہیں تھیں۔ پھر وہ امی کی ماں تھیں۔ ان کی بربادی پر ان کا دل دکھتا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



تھا۔ پھر وہ میرے مستقبل کی فکر کیوں کرتیں۔ کہتیں تھیں کسی دکان پر ڈال دو پیسے لائے گا۔ تمہارے گھر ہی میں آئیں گے۔ کپڑے سی سی کر تو نے آنکھیں پھوڑ لیں۔

وہ نفرت سے ان کی طرف دیکھتیں۔ چاچا دلنواز گٹھڑی کھول رہے تھے۔ ان کے کپڑوں کے درمیان سے بہت سارے نوٹ برآمد ہوئے۔ ''بہن یہ پورے پچپن لاکھ روپے ہیں۔''

میری ماں کی آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آخر ہچکی بندھ گئی میں پانی لے آیا۔

''بھائی جی سنبھال لو۔''

''بھیا کو میں چائے کھانے کا کرتی ہوں۔''

''نہیں میری بہن وقت کم ہے۔ میں نے مسقط کا ویزہ لگوایا ہے وہاں جا کر نوکری کروں گا۔ مسقط جا کر بھی آپ سے غافل نہیں رہوں گا۔'' یہ کہہ کر چاچا دلنواز چلے گئے۔ اپنے پیچھے خوشیاں اور آنسو چھوڑ گئے۔

اتنی بڑی رقم ہم غریب ماں بیٹے نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں روز ایک چابی والا کھلونا دکان پر دیکھتا تھا۔ میرا دوست کہتا عید پر لے لینا مجھے تو کوئی عیدی دینے والا بھی نہیں تھا۔ اب میں ماں سے کہہ رہا تھا امی وہ جہاز۔

''خاموش! سب کو پتہ چل جائے گا۔ ہمارے پاس پیسے ہیں۔'' بہت سنبھل کے انہوں نے مجھے گلے لگا کر بہت سارا پیار کیا۔

اگلے دن کچھ روپے رکھ کر سب بینک میں رکھوا دیے اور امی کے متفکر چہرے پر اطمینان اتر آیا۔

رات جب ہم ماں بیٹا اپنے کمرے میں بچھے فرش پر روئی کا گدا بچھا کر سوئے تو امی نے مجھے بہت دیر سمجھایا۔ ''بیٹا کسی سے پیسے کا ذکر نہ کرنا زمانہ بہت خراب ہے سب ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔ ہم اسی غربت میں رہیں گے۔ کسی کو شک نہیں ہوگا۔

''امی میں سردار کا بیٹا ہوں؟''

''ہاں تمہارے پاپا بہت اچھے انسان تھے۔ مرنے کے بعد بھی تمہارے لیے اتنا کچھ کر گئے وہ تو زندگی نے مہلت نہیں دی ورنہ تو میرا بیٹا کسی شہزادے کی طرح پرورش پاتا۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میں سردار کا بیٹا ہوں پر نانی تو مجھے کتے کی اولاد کہتی تھیں۔''

''کوئی بات نہیں بڑی ہیں چھوڑو۔''

پہلے جب امی کپڑے سیتے سیتے تھک جاتیں اور پکانے کو زیادہ ہوتا بھی نہیں تھا تو مجھے پیسے دے دیتیں میں ایک پاؤ دہی اور دو تندور کی روٹیاں لاتا اور دونوں ماں بیٹا سیر ہو کر کھانا کھاتے۔ ماں دیر تک خدا کا شکر ادا کرتیں۔ مجھے بھی یہ ہی ہدایت تھی۔ ہمارے مالک مکان انتہائی بدمزاج میاں بیوی تھے۔ ان کے تین چار گھر تھے اولاد نہیں تھی۔ وہ لوگ بوڑھے ہو چکے تھے۔ حج کا ارادہ کیا۔ سوچا ہمارا والا مکان بیچ دیں امی نے چپکے سے خرید لیا۔ ساری کاغذی کارروائی خاموشی سے ہو گئی۔ ہم لوگ پہلے کی طرح رہتے رہے۔ اب میں چودہ سال کا ہو رہا تھا۔

ایک دن ایک بڑی سی گاڑی دروازے پر رکی چاچا دلنواز ایک بہت گریس فل خاتون کے ساتھ اترے۔ خاتون گھر کے اندر آئیں اور مجھے گلے لگایا اکبر کہا ہچکی لی اور بے ہوش ہو گئیں۔ امی نے بھی اماں جان کہہ کر ان کے بے ہوش وجود کو سہارا دیا۔ تخت پر لٹایا۔ پانی چھڑکا وہ ہوش میں آئیں پھر امی سے لپٹ کر رو دیں۔

''میری بہو میرے اکبر کی بیوی......'' وہ مجھے لپٹائے ہوئے چھوڑ ہی نہیں رہی تھیں۔

''اکبر بالکل ایسا ہی تھا اتنا بڑا جب تھا۔'' کبھی ہنستیں کبھی روتیں۔

میری امی مجھے اشارہ کر رہی تھیں ناشتا لانے کو۔

''کیا لاؤں؟''

''جو بازار میں سب سے اچھا ہو سب لے آ۔ میری اماں جی آئی ہیں۔''

''تیری دادی ہوں۔'' انہوں نے پھر لپٹا لیا۔

وہ بہت روکنے پر شام تک رک سکیں۔ وہ محلوں کی رہنے والی تھیں۔ ہمارے چھوٹے سے سو گز کے مکان میں ان کا دم گھٹ رہا ہوگا۔ چلنے سے پہلے انہوں نے ماں کے کانوں میں سونے کے بندے ڈالے، ہاتھوں میں کڑے پہنائے، میری بلائیں لیں اور ایک عجیب جملہ کہا ماں سے ''میں تیرے صبر کا انعام دوں گی۔ میں

تیری مرضی سے تیرا نکاح کروں گی۔''
''اماں!'' امی کی آواز میں ناراضی تھی۔
''میرا بھائی ہے اکبر سے دو سال بڑا ابھی کنوارہ ہے۔''
''اماں آگے کچھ نہیں۔''
''کیوں؟''
''کیوں نہیں یہ نبی پاک کا حکم ہے۔ تم ذہنی طور پر تیار رہو میں پھر آؤں گی۔''

ان کے جانے کے بعد میں بہت ہنسا۔ میری ماں ہی تو میری دوست تھیں۔ ہو آج امی کی شادی رچی ہے وہ مجھے مارنے کے لیے دوڑیں۔ جھوم جھوم گاؤ، خوشیاں مناؤ آج امی کی شادی رچی ہے۔ اب دادی اکثر کوئٹہ کا سفر اپنی گاڑی سے طے کر کے آ جاتیں۔

''اماں خدا خدا کریں کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی ساس نے بہو کو رخصت کیا ہو۔''
''اب ہو جائے گا۔'' ان کا ذوق بہت اچھا تھا۔ انہوں نے بہترین ادب پڑھا ہوا تھا اگر اس غم نے انہیں توڑ نہ دیا ہوتا تو پتا نہیں کیسی ہوتیں بہت زندہ دل زیرک اور روشن خیال خاتون تھیں۔ کہتیں ابھی اس کی مونچھیں نکل رہی ہیں کل یہ داڑھی پر دلہن مانگے گا۔ مانگنے سے پہلے لے آئیں گے۔ امی بولیں۔
''لے تو آئیں گے پر میری بیٹی تو اکیلی ہو جائے گی۔''
''کیوں اماں۔''
''یہ مجھے بہت چاہتا ہے؟''
''یہ تجھے جب پتہ چلے گا جب اس کی دلہن آئے گی۔ یہ ہر وقت کمرے میں رہے گا۔''
گرمیوں کے دن تھے ہمارے گھر دو چار پائیاں تھیں۔

امی نے صحن میں پیڈسٹل فین لگا کر چار پائیوں پر بستر لگا دیے تھے۔ میں امی کے بستر میں گھس گیا۔
''چل ہٹ آدمی کا آدمی میں نہیں سلا رہی اپنے پاس۔ جا دادی کے پاس سو جا۔''
اب ان کے پاس جاتے مجھے خود شرم آئی۔ ہمارے گھر غریب آباد سے آئی ہوئی سیکنڈ ہینڈ سیٹی تھی

''بینچ نما'' میں اسے اٹھا لایا۔ دونوں چار پائیوں کے درمیان بچھالی آدھا میں امی کا آدھا دادی کا۔ سونے سے پہلے ہم لوگ کچھ دیر بات کرتے تھے۔
''ہاں دادی اماں! آپ میرے لیے جو نئے ابا ڈھونڈرہے تھے آپ ضرور انہیں لے آئیں پھر اللہ مجھے ایک بھائی دے گا۔ اس کا نام قلندر رکھ دینا۔ لڑکا کیا کرتا ہے۔'' میں نے پرانی بوڑھیوں کی طرح کہا۔
''منظر! اب ایک لفظ کہا تو خیریت نہیں۔''
''کیوں خیریت نہیں بھائی ہے میرا میری ماں سنیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔ اماں آپ کی اماں ہیں۔ لو اس کی تو ماں بھی بہت بوڑھی ہے مگر ہے بہت......!''
روکتے روکتے انہیں بری طرح ہنسی آ گئی۔ میں بھی ہنس رہا تھا۔ وہ جب بارہ سال کی تھی تو اس کی شادی ہو گئی۔ وہ جواب بہت بوڑھی ہیں۔ ہاں میری نانی جب چودہ سال کی تھی تو میری ماں پیدا ہوئی پھر میری ماں جب اٹھارہ سال کی تھی تو میں پیدا ہوئی اور جب میں بیس سال کی تھی تو اکبر پیدا ہوا تھا۔ جمع کا سوال ہے؟ ہم دونوں کی جب شادی ہوئی تھی تو اکبر اکیس اور میں بیس سال کے تھے۔ امی نے بھی عمر بتائی۔ یہ ہی تو کہہ رہی ہوں ابھی تو پینتیس کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ سامنے زندگی پڑی ہے۔ مرد کا سایہ نہ ہو تو زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہاں کے سارے فیصلے مرد ہی کرتے ہیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور چادر اٹھا کر سرداروں کے انداز میں اوڑھ کر کہا اب ہم پر یہ واجب ہے کہ اپنے لیے ایک دادا کا بندوبست کریں۔
''بے غیرت۔'' دونوں عورتوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ اس کے بعد جو ہم تین مل کر ہنسے تو اللہ کی پناہ۔
''یہ اپنے راستے کے کانٹے صاف کر رہا ہے تاکہ اس کے زندگی میں ہماری زندگی کا کانٹا نہ رہے۔'' دادی نے پتے کی بات کی۔
''ارے اماں جب اسے پال کر دکھا دیا تو اب کیا مشکل یہ کراچی ہے یہاں کی عورت با اختیار ہے۔ میں آپ کی خدمت کروں گی۔'' انہی باتوں کے دوران نیند آ گئی۔ دوسری صبح دادی جانے کے لیے تیار تھیں۔

''اماں میرا دل چاہتا ہے وہ جگہ دیکھوں جہاں اکبر رہتے تھے۔''

''چلو میرا تو خود بہت دل چاہتا ہے لیکن اونچے محل، حویلیاں، بنگلے نہیں قتل گاہیں ہیں تم لوگوں کے چھوٹے گھروں میں سکون ہے۔''

دادی پجیرو میں آتی تھیں مجھے لونگ روٹ پر سفر کا بہت شوق تھا جو اب پورا ہو رہا تھا ہم پاپا کے گھر جا رہے تھے۔ حویلی بہت خوب صورت تھی۔ ملازم باادب دادی کا آرڈر چلتا تھا۔ دو تین دن کے بعد میری چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ دادی نے ہمیں بھجوانے کے لیے وہی پجیرو کا انتخاب کیا۔ دادی ان کی ماں ان کی بھی ماں کو خدا حافظ کہہ کر واپسی کے لیے چل دیے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ''کون سے راستے سے چلو گے؟''

''حب والے سے چلتے ہیں چھوٹے سائیں۔''

''نہیں جیک آباد کی طرف سے چلو۔''

''جو حکم! پر دور پڑ جائے گا۔''

مجھے لاڑکانہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ امی پیچھے سو گئی تھیں۔ صبح کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ حیدر آباد آ رہا تھا لگا کہ زمین آسمان گھوم رہے ہیں تڑ تڑ تڑ گولیاں ڈرائیور کو چھلنی کر کے مجھے نشانہ بنا رہی تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر وہ لوگ بھاگ گئے۔ میں اندھیرے میں اترا امی خیریت سے تھیں لیکن بے ہوش تھیں۔ میں زخمی حالت میں انہیں کاندھے پر ڈال کر اندھیرے میں نکل آیا۔ خوف زخموں سے چور ایک عمارت کے قریب گر کر بے ہوش ہو گیا۔ وہاں پاگل خانہ تھا۔ گارڈ دروازہ کھلا چھوڑ کر نماز کو چلا گیا تھا۔ ہم ماں بیٹے کو دروازے کے آگے پڑا دیکھ کر یہ سمجھا کہ ہم نئے داخل مریض ہیں جنہیں یونیفارم نہیں ملا ہے اور اس کی غفلت سے عمارت سے نکل بھاگے ہیں۔ وہ وہیں اندر لے آیا پھر دروازہ لاک کر کے باہر بیٹھ گیا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب یہ سمجھے کہ کوئی ہمیں داخل کرنے آیا ہو پھر بھاگ گیا ہو۔ مجھے ہوش آیا تو اوسان خطا تھے۔ امی کی بھی بری حالت تھی۔ بار بار مجھے چھو چھو کے دیکھ رہی تھیں۔ میں زخمی ہوا، کان آدھا کٹ گیا تھا۔ بازو پسلیاں سب زخمی تھے لیکن مرہم پٹی علاج سے رو بہ صحت تھا۔

''اس سے اچھی پناہ گاہ اور نہیں ملے گی۔'' میں نے چپکے سے ماں سے کہا۔ ''پاگل بنی رہیں اور خود ایسی بری بری شکلیں بنا کر سب کو دکھائیں کہ انہیں ہماری دیوانگی کا یقین آ گیا۔''

شام اخبار سے دادی کو اطلاع مل گئی۔ ہمارے دشمن میرے وجود سے لاعلم تھے۔ وہ ہماری نسل ختم اور ہمارا چراغ بجھانا چاہتے تھے۔ ہمارے جانے سے انہیں میرے وجود کا پتا چل گیا تھا۔ انہیں حالات میں دادی ہمیں لینے آئیں۔ ہمیں وہاں سے نکالا پھر لے کر کراچی پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ گاڑی پر پھر فائرنگ ہو گئی۔ دشمن گھات میں لگے ہوئے تھے جوں ہی مجھ پر فائر ہوا میری ماں آہ کس زبان سے کہوں کہ میری صبر و ایثار کا پیاں ان درندوں کی گولیوں کا شکار ہو گئی وہ مجھ پر گر گئی تھیں۔ میرے اوپر پڑنے والے سب فائر خود پر سہہ کر ہمیشہ کے لیے مجھے اکیلا کر گئیں۔

ہم اپنے گھر آئے محلے میں کہرام مچ گیا تھا۔ میرے نانا نانی چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ آخری سفر شروع ہوا پٹیوں میں جکڑا ہوا میں غم کی شدت سے نڈھال میں نے ہر رشتہ اسی رشتے سے پایا تھا۔ یہ ہی میری ماں تھیں یہ ہی میرا باپ کہانی ختم ہو گئی۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا نہ میری دادی بڑی صاحب ذوق خاتون ہیں انہوں نے امی کی قبر پر اوڑھانے کے لیے جو چادر دی ہے اس پر خوب صورت دھاگوں سے معروف شاعر ڈاکٹر جاوید منظر کی خوب صورت نظم درج تھی۔ میں نے پھول چڑھائے چادر چڑھائی پھر پھول رکھے اور کتبے پر سر رکھ کر ایسا پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ کسی طرح مجھے صبر نہ آتا تھا۔ دادی نے امریکہ کا ویزہ لگوا دیا تھا۔ اب ہم دادی پوتا وہیں رہتے ہیں۔ جہاں اذان کی آواز بھی نہیں آتی لیکن گولیوں کی بھرمار بھی نہیں ہے۔ مجھے ماں کے بعد یاد آتا ہے کراچی وہاں کی چہل پہل عید تہوار پھر بابا کا دیس کوئٹہ اونچے اونچے پہاڑ یہاں تا وہاں ہماری زمین حویلی قلعے کیا فائدہ؟ جب انسان رہ نہ سکے۔ مجھے یقین ہے ایک دن ہوگا۔ ہم پلٹ آئیں گے اپنے وطن پیارے وطن کہ ہماری سرزمین تو یہی ہے۔

☆☆☆

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

تین مرد
تین کہانیاں

پروفیشنل



بلال فیاض

اُس ڈاکٹر کی داستان، جو بہت پروفیشنل تھا

بغیر دودھ اور چینی کی چائے کے ساتھ رات کی باسی روٹی کو میں نے بامشکل حلق سے اتارا اور اس بد مزا ناشتے کے دوران بیوی کی جھک جھک اور روتے منہ بسورتے بچوں کی ریں ریں مسلسل میرے غصے میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ غصے میں، میں آپے سے باہر ہوتا، چائے کا بدرنگ کپ فرش پر پٹخ کر میں گھر سے باہر نکل گیا کیونکہ جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا تھا تو سب سے پہلے میرا ہاتھ اپنی بیوی پر اٹھتا تھا اور پھر زبان بھی بہت دیر تک زہر اگلتی رہتی تھی۔

''جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو تو انسان کس قدر بدمزاج ہو جاتا ہے۔'' میں اکثر جھلا کر سوچتا۔

غصے میں کھسڑ پھسڑ چپل گھسیٹتے میں گلی کا موڑ مڑ کر میں سڑک پر آ گیا۔ کڑوی چائے کی تلخی میں ابھی تک اپنے منہ میں گھلی محسوس کر رہا تھا۔

سردیوں کا سورج ذرا دیر سے ہی طلوع ہوتا ہے۔ سوا آٹھ بج جانے کے باوجود ابھی تک سردی کی شدت برقرار تھی...... نیلے رنگ کا بوسیدہ مفلر میں نے کانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ مجھے یاد ہے یہ مفلر میں نے شادی سے چند سال پہلے خریدا تھا اور اب تین بچوں کا باپ تھا...... دن بدن بڑھتی مہنگائی کی وجہ سے نیا مفلر خریدنے کی خواہش آپ ہی آپ دل میں مر گئی تھی۔

رکشا اسٹینڈ پر پہنچ کر میں نے رکشا نکالا۔ تھوڑی دور جا کر سواریوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں گھماتے میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ ''یا اللہ! کوئی سواری مل جائے تاکہ زیادہ خوار نہ ہونا پڑے۔''

مگر آج کا دن ہی منحوس تھا۔ رکشے میں گیس اختتام کے قریب تھی۔ تیزی سے رکشا دوڑاتا بلکہ اڑاتا میں سی این جی اسٹیشن تک پہنچا تو پتا لگا آج سی این جی کی چھٹی ہے۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ اپنے حکمرانوں کو جہنم رسید کر دوں جنہوں نے غربت کا نہیں غریبوں کا خاتمہ کر دیا تھا اور جو دو چار بچ گئے تھے وہ ہر دم اپنی قسمت کو روتے تھے۔ جی بھر کے میں نے حکمرانوں کو کوسا اور تیزی سے رکشا آگے بڑھا دیا۔ اب میرا رخ واپس اسٹینڈ کی طرف تھا۔ گیس ختم ہونے سے پہلے میں ہر حال میں اسٹینڈ تک پہنچ جانا چاہتا تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ ابھی ایک اور مصیبت میری منتظر ہے۔

اچانک بیچ سڑک پر مجھے اتنی زوردار بریک لگانی پڑی کہ رکشا الٹتے الٹتے بچا۔ تیز رفتاری کے باعث ایک عورت رکشے کی زد میں آ کر سڑک پر اوندھی پڑی تھی۔ میں بوکھلا کر رہ گیا۔ کیونکہ اس وقت ٹریفک نہ

ہونے کے برابر تھی اور یہ نسبتاً ایک چھوٹی اور سنسان سڑک تھی۔ سردی کی شدت نے ماحول پر ایک سکوت طاری کر رکھا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ میں رفو چکر ہو جاؤں مگر ضمیر کی ملامت پر میں فوراً رکشے سے نکلا اور بے ہوش پڑی عورت کو بامشکل سنبھال کر



رکشے میں ڈالا۔ میری پریشانی میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب مجھے احساس ہوا کہ عورت امید سے ہے۔ شکل وصورت اور لباس سے وہ کسی اچھے گھرانے کی لگ رہی تھی۔

قریب ہی ایک رہائشی علاقے میں ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال کا بورڈ نظر آیا رکشا خود بخود رک گیا۔ گیس ختم ہو چکی تھی میں نے شکر ادا کیا کہ اسپتال تک پہنچ گیا ہوں۔

☆......☆

''ایک کپ چائے بھجوا دو۔'' کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور ایک مریض کی فائل اٹھالی۔ دروازہ زوردار آواز سے کھلا۔

''ڈاکٹر صاحب! سڑک پار کرتی ایک عورت میرے رکشے کی زد میں آکر بے ہوش ہوگئی ہے۔ ذرا آپ جلدی اسے دیکھ لیں...... اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔'' میں نے التجایہ انداز میں ڈاکٹر سے کہا۔ فائل سے نظریں ہٹا کر ڈاکٹر نے چشمے کی اوٹ سے مجھے بغور دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر تقریباً پچپن سال کے قریب تھی۔ کنپٹی کے سفید بال اور پیشانی پر ثبت لکیریں اس بات کی عکاس تھیں۔

''کہاں ہے مریضہ؟'' فائل بند کر کے انہوں نے ایک طرف رکھ دی۔

''باہر برآمدے میں...... اسٹریچر پر۔'' میں تیزی سے باہر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ میری بات سن کر انہوں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ملا کر بولے۔

''ڈاکٹر ثمرین! میرے کمرے میں آیئے۔'' تقریباً دو منٹ بعد ہی ایک جواں سال لیڈی ڈاکٹر چہرے پر پروفیشنل مسکراہٹ لیے نمودار ہوئی۔

''یس سر!'' ڈاکٹر نے ساری بات لیڈی ڈاکٹر کو بتائی اور میرے ساتھ بھیجا۔ پندرہ منٹ کے معائنے کے بعد ڈاکٹر ثمرین کمرے سے نکلی تو میں بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔

''وہ ٹھیک تو ہیں نا ڈاکٹر صاحبہ...... کوئی مسئلہ تو نہیں؟''

میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولی۔

''میرے ساتھ آئیں۔''

میں ڈاکٹر ثمرین کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا جو غالباً اس اسپتال کے مالک بھی تھے۔

ڈاکٹر ثمرین نے ساری کیس ہسٹری انگریزی میں بتائی تو میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ ساری بات سن کر ڈاکٹر صاحب بولے۔

''ٹھیک ہے...... آپ جائیں...... میں کچھ دیر بعد آپ کو بلاتا ہوں۔''

''اوکے سر!'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب میری سوالیہ نظریں ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر جمی تھیں۔

''مریضہ کی حالت اچھی نہیں ہے کیوں کہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ امید سے ہے۔ ہمیں فوراً آپریشن کرنا ہوگا ورنہ مریضہ کی جان کو خطرہ ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر پریشانی سے میری پیشانی کے بلوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''آپ جلد از جلد فیس باہر ریسپشن پر جمع کروادیں۔ تاکہ آپریشن کیا جاسکے۔ فیس کی تفصیلات آپ کو باہر ریسپشن پر مس عالیہ بتادیں گی۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔ دیر نہ کیجیے۔''

مجھے بات کرنے کا موقع دیے بغیر ڈاکٹر صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا اور میز کی دراز کھول کر کچھ تلاش کرنے لگے۔

''ابھی آپ پندرہ ہزار روپے جمع کروادیں...... باقی آپریشن کے بعد۔'' ریسپشن پر موجود جدید تراش خراش کا لباس پہنے مس عالیہ نے مسکرا کر کہا تو پندرہ ہزار روپے کے اس بم نے میرے حواس معطل کردیے۔

''پند...... رہ...... ہزار۔'' اب تو ایک عرصہ ہی گزر گیا ہے اتنی رقم اکٹھی دیکھے ہوئے۔ کچھ دیر بعد میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا التجا کر رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں ایک رکشہ ڈرائیور ہوں...... بامشکل دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ اتنی رقم میں کہاں سے لاؤں گا۔''

میری بات سن کر ڈاکٹر صاحب نے مجھے یوں

دیکھا جیسے انہیں میری بات بہت ناگوار گزری ہے۔ وہ رعونیت سے بولے۔

''یہ میرا دردسر نہیں ہے۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب! میں اتنی رقم کا انتظام نہیں کر سکتا......آپ......'' میری بات کاٹ کر وہ بولے۔

''دیکھیے یہ کوئی خیراتی اسپتال تو ہے نہیں جہاں آپ بیٹھے ہیں......نہ ہی سرکار ہمیں ایسے کوئی فنڈ فراہم کرتی ہے کہ ہم مفت علاج کریں۔ اس وقت آپ شہر کے سب سے اعلیٰ اور جدید پرائیویٹ اسپتال میں بیٹھے ہیں اگر آپ یہ خرچہ نہیں اٹھا سکتے تو مہربانی فرما کر مریضہ کو کسی سرکاری اسپتال لے جائیں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنی عینک درست کی اور ایک فائل کھول کر بیٹھ گئے۔

''میں ضرور ایسا کرتا ڈاکٹر صاحب مگر میرے رکشے میں گیس ختم ہو چکی ہے اور بدقسمتی سے آج سی این جی بند ہے۔''

''یہ میرا دردسر نہیں ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فائل سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب!'' میں نے گڑگڑا کر کہا۔

''وہ مر جائے گی۔''

''اس ملک میں روز ہزاروں مریض مرتے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب کے بے حسی سے کہے گئے اس فقرے پر میرا خون کھولنے لگا مگر میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔

''آپ آپریشن شروع کریں میں پیسوں کا انتظام کرتا ہوں۔''

''آپ پہلے فیس جمع کروائیے......ہمارے کچھ اصول ہوتے ہیں۔'' انہوں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''مگر......''

''دیکھیے......آپ یہاں بیٹھ کر صرف اور صرف میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے یوں چبا چبا کر کہا کہ ناچار مجھے کمرے سے باہر آنا پڑا۔

اسپتال کی راہداری میں ٹہلتے ہوئے ڈاکٹر کی بے حسی پر میرا دل لہولہو ہو رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں فوراً ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ میرا رکشا کسی انسانی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ آخر وہ عورت بھی تو کسی کی بہن، کسی کی بیٹی ہوگی۔

میری بات سن کر ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کی رضامندی ظاہر کی تو میں نے رکشے کی چابی ڈاکٹر صاحب کے سامنے شیشے کی میز پر رکھ دی۔

پاس پڑے فون کا ریسیور اٹھا کر انہوں نے ڈاکٹر ثمرین کو آپریشن کی تیاری کرنے کا کہا۔ میرے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی مگر یہ اطمینان وقتی تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ڈاکٹر ثمرین ڈھیلے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''سب ریڈی ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں ہے سر! وہ مر چکی ہے۔'' دھیمے لہجے میں ڈاکٹر ثمرین کے اس انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بند ہوتی محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب تیزی سے اٹھے اور ڈاکٹر ثمرین کے ساتھ کمرے سے باہر نکلے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے میں نے ان کی تقلید کی۔

آپریشن تھیٹر کے باہر اسٹریچر پر پڑی اس عورت کے بے جان وجود سے ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر چادر ہٹائی تو ان پر ایک قیامت گزر گئی۔ اسپتال کے پرسکون ماحول میں ایک بازگشت گونجی۔

''اس ملک میں روز ہزاروں مریض مرتے ہیں۔'' ڈاکٹر ثمرین پتھر کی عورت بنی کھڑی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر کوریڈور میں خاموشی تھی......موت کا سناٹا تھا۔ اس خاموشی کو ایک بوڑھے کی کرب ناک چیخ نے توڑ دیا اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا ڈاکٹر اسپتال کے ٹھنڈے فرش پر دوزانو بیٹھا اپنی بیٹی کی موت کا ماتم کر رہا تھا۔

☆☆☆

آخری وار

نینا خان

اُس معصوم بھائی کا قصہ، جو اپنے ہی بھائی بھاوج کے کرائے ہوئے کالے علم کی بھینٹ چڑھ گیا

یہ کہانی ایک اٹل حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کا حرف بہ حرف سچ اور حقیقت پر مبنی ہے بس ناموں کی تبدیلی اس لیے کر رہی ہوں کہ کچھ پردہ داری رہ جائے۔ کیونکہ خدا بھی یہی کہتا ہے کہ دوسروں کے عیب بیان نہ کرو۔ یہ کہانی میرے اپنے گھر کی ہے۔ اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد بس اتنا ہے کہ آپ سب یہ فیصلہ کریں کہ خدا کی قدرت کو ہاتھ میں لینا کیسا ہے؟ شاید کوئی یہ کہانی پڑھ کر راہ راست پر آجائے یا پھر خدا کے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لینا چھوڑ دے۔ میں جانتی ہوں ایسا ممکن تو نہیں کیونکہ گناہوں میں ہم سب بہت مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ ایک کوشش ہے۔

☆......☆

میرے ابو ذات کے اعتبار سے یوسف زئی پٹھان تھے۔ ابو چار بھائی اور دو بہنیں تھے۔ جس میں ابو کا نمبر دوسرا تھا۔ تایا ابو کا نام نایاب تھا اور ابو کا نام زریاب۔ ان سے چھوٹے چچا کا نام ارباب اور سب سے چھوٹے چچا کا نام علی تھا۔ ایک پھوپو کا نام اقبال جہاں تو دوسری کا نام راحت جہاں تھا۔ دادا جان سرکاری ملازم تھے اور وہ انتہائی سخت مزاج کے مالک تھے جب کہ دادی جان بہت خوب صورت اور معصوم طبیعت کی مالک تھیں۔ ایک وفا پرست بیوی جو کہ ہر دم اپنے شوہر کی ہر بات پر لبیک کہا کرتی رہتی تھیں۔ دادا جان اور دادی جان دونوں ہی کافی خوب صورت تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمام اولادوں کو بھی کافی خوب صورتی سے نوازا ہوا تھا۔ ابھی تمام بچے بہت چھوٹے تھے کہ سب سے آخری اولاد راحت جہاں ابھی صرف چھ مہینے کی تھیں۔ دادا جان کی سخت مزاجی اور معصوم طبیعت کی وجہ سے دادی جان دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔ جب کہ اقبال جہاں دو سال کی تھیں۔ اقبال جہاں بھی امی کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکیں اور وہ بھی دو سال کی عمر میں ہی اپنی والدہ کے پاس چلی گئیں۔

اب گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی۔ اس لیے ابو کی خالہ جان اپنے بچوں کو لے کر آئے دن ڈیرے ڈال دیتی تھیں۔ ابو کی خالہ جان انتہائی سفاک دل عورت تھیں۔ دادی جتنی سیدھی اور معصوم ان کی بہن اتنی ہی چالاک، ہوشیار تھیں۔ کیونکہ دادا جان سرکاری ملازم تھے کبھی پیسوں کی تنگی ہوئی نہیں تھی۔

بچپن ہی سے میرے ابو انتہائی سادہ طبیعت کے تھے اور تایا جان بہت چالاک اور شاطر انسان ثابت ہوئے۔ ابو کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ پر تایا جان کی چالاک عادتوں کی وجہ سے وہ بڑی مشکلوں سے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جب کہ تایا جان نے انٹر تک تعلیم حاصل کی۔

گھر میں کام کرنے اور کھانا پکانے کے لیے کوئی



عورت نہیں تھی۔ اس لیے ابو کو گھر کا سارا کام کرنا پڑتا اور راحت جہاں کو بھی سنبھالنا پڑتا۔ ان سے دو چھوٹے بھائی کو بھی وہ دیکھتے اور تایا جان اپنے کھیلنے اور پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ابو بھی کمسن ہی تھے۔ ان کا بھی دل چاہتا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جا کر کھیلیں مگر بڑے بھائی اور ابا کے ڈر سے خاموش رہتے۔ اکثر تایا جان، ابو کے ساتھ ایک ہوشیاری کرتے تھے کہتے ''زریاب جاؤ تم صبح سے گھر کا کام کر رہے ہو جا کر تھوڑا باہر دوستوں کے ساتھ کھیل آؤ۔''

تایا کی بات سن کر ایک کمسن لڑکا خوش ہو کر دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چلا جاتا۔

''ابا کے آتے ہی نایاب خان اپنے ابا سے کہتے۔ ''ابا میں صبح سے باورچی خانے میں کام کر رہا ہوں زریاب سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ میرا کام میں ہاتھ بھی نہیں بٹاتا سارے کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔''

اتنا ہی سن کر ابا تو آگ بگولہ ہو جایا کرتے تھے۔ غصے کے تو وہ تیز تھے ہی۔

''زریاب کو بلا کر لاؤ ذرا۔'' نایاب فوراً ابا کے فرمانبردار بن کر زریاب کو بلا کر جیسے ہی لاتے تو زریاب ابا کی آواز سن کر ہی کانپ اٹھتے اور ان کی چیخ سے سہم جاتے اور ابا کی مار سے بچانے والا بھی کوئی نہ ہوتا اور نایاب بھائی کو پٹتا دیکھ کر خوب خوش ہوتے۔ ابا کے الفاظ زریاب کو انتہائی تکلیف دیتے کہ سارا دن آوارہ بنا پھرتا ہے یہ۔ نہ کہ بھائی کا کام میں ہاتھ بٹائے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالے۔''

پانی کے لیے لمبی قطار لگا کرتی تھی۔ سب لوگ پانی بھرنے کے لیے لائن لگا کر کھڑے ہوتے تھے۔ یہ سارے کام بھی زریاب خان کے حصے میں ہی آتے تھے۔ زریاب کا مزاج انتہائی محترم تھا۔ ہر ایک سے شفیق انداز میں ملنا، بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ لڑکیوں کو بہن کہہ کر انتہائی ادب سے بات کرنا۔ زریاب گھر کے کاموں سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ نایاب کی ناانصافی پر اکثر وہ اپنی گلی میں

رہنے والے ایک بڑے صاحب کے پاس جا کر رو لیا کرتے تھے۔ ان کا نام افتخار تھا۔ وہ زریاب کی معصومیت اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر رو دیا کرتے تھے کہ ابا کی مار کے نشانات کمسن کمزور سے بچے کے جسم پر اکثر ہوتے تھے۔ افتخار صاحب زریاب کو اپنے ساتھ لے کر جانے لگے اور اپنا کام سکھانا شروع کر دیا۔ چند سالوں میں زریاب پلمبرنگ اور فٹنگ وغیرہ کے کام میں ماہر ہو گئے۔

خالہ جان کا گھر میں آنا جانا بہت تھا۔ نایاب ابھی سولہ سال کے ہی تھے تو خالہ جان نے اپنی ایک دور کے رشتے کی کزن سے نایاب کی شادی کی بات کی تو دادا جان بھی فوراً ہی مان گئے۔ کیونکہ گھر میں ایک عورت کا ہونا ضروری تھا پھر دادا جان کے سسرال کے ہی لڑکی تھی۔ اس لیے شادی بھی فوراً ہی ہوگئی کیونکہ نایاب بھی ایک خوب صورت نوجوان تھے۔ ان کی بیوی رخشندہ انتہائی مکار اور چالاک قسم کی لڑکی تھی۔ خالہ جان کیونکہ رشتے میں رخشندہ کی کزن تھیں ان کی آپس میں گہری دوستی بھی تھی۔

خالہ جان اور رخشندہ کے دادا ایک ہی آدمی تھے۔ ان کے دادا انتہائی دیندار آدمی تھے۔ روحانیت سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ لوگوں کے روحانی مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں حل کیا کرتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی روحانی کتابیں خالہ جان اور رخشندہ نے ان کے حجرے میں جا کر سب سے چھپ کر ان کی کتابیں چرالیں اور ان کا روحانی کتابوں کا استعمال ان دونوں عورتوں نے غلط کاموں کے لیے شروع کر دیا۔ اپنے ناجائز مقاصد کو وہ قرآن وسنت کی کتابوں کے غلط طریقے سے استعمال کر کے پورا کرنے لگیں۔

چند روز میں ہی ابا اور نایاب، رخشندہ کے غلام ہو گئے اور مزید ظلم وستم پر آمادہ ہو گئے۔ چھوٹی سی راحت جہاں بھی گھر کے بہت سے کام انجام دیتیں۔ علی اور ارباب بھی کافی کام کرتے۔ گھر کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے رخشندہ نے زریاب کی شادی پر زور دیا۔ خود کی شادی کو ابھی دو سال ہی ہوئے تھے کہ زریاب کی شادی کرنے پر زور اتنا دیا کہ زریاب ابا کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ سولہ سال کی عمر میں ان کی شادی رشتے داروں میں ہی کر دی گئی۔ زریاب ابھی شادی کے لیے دل سے راضی نہیں تھے۔ کمائی بھی اتنی نہیں تھی۔ ڈھائی سو روپے مہینے کی کمائی پر نہ چاہتے ہوئے بھی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ زریاب کے لیے لڑکی سوچ سمجھ کر رخشندہ نے ایسی دیکھی کہ جو کام میں انتہائی سلیقہ مند محنتی اور اکلوتی غریب خاندان کی ہو جو اپنے گھر میں سب سے بڑی اور چھوٹے بھائی تھے۔

سندس سے شادی کے بعد زریاب بہت خوش ہو گئے۔ سندس ایک بہت سلیقہ شعار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت بھی تھیں۔ دونوں کی جوڑی انتہائی خوب صورت تھی۔ دونوں خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھے۔

سندس نے اپنی سلیقہ شعاری اور نرم طبیعت کی وجہ سے گھر بار کی ذمہ داری پوری طرح سے اٹھالی تھی جب کہ رخشندہ کو گھر کے کام کاج آتے ہی نہ تھے۔ اس وجہ سے ابا کا رجحان سندس کی طرف بڑھنے لگا تو یہ بات رخشندہ سے برداشت کہاں ہوتی۔ اس نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر زریاب اور سندس کو ابا کی نظروں میں غلط طریقوں سے برا بنا دیا۔ ان دونوں کو گالیاں دینا بہت برا بھلا کہنا ابا کا روز کا معمول بن گیا تھا۔

خاندان بھر کے لوگ آتے تو وہ سندس کی تعریفوں کے پل باندھتے نہ تھکتے۔ یہ بات روز روز رخشندہ اور نایاب کے دل پر گراں گزرتی پھر تو رخشندہ اور نایاب نے اپنے غلط طریقوں کو پھر سے روز روز آزمانا شروع کر دیا۔ روز رات کے تیسرے پہر رخشندہ آتی اور پانی کے مٹکے میں کچھ ڈال کر چلی جاتی۔ اس کے بال بکھرے ہوتے سندس رات کو روز رخشندہ کی یہ حرکت دیکھتی اور زریاب کو جگاتی اور زریاب کو بولنے بھی نہ دیتیں۔ اب ان کا روز کا کام تھا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی مٹکے کا پانی تبدیل کرنا اور صحن کی دہلیز پر پھینکا پانی سے احتیاط سے بچتے ہوئے پورے صحن کو دھوتے۔

ایک دن اپنے پورشن میں بیٹھے نایاب اور رخشندہ باتیں کر رہے تھے جسے سندس نے سن کر فوراً زریاب کو لے کر آ گئیں اور پھر دونوں نے چھپ کر ان دونوں کی باتیں سنیں۔ رخشندہ، نایاب کو قرآن پاک کی سورتیں اور آیتوں کو الٹا پڑھنے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ یہ یہ آیت الٹی پڑھنے سے یہ کام ہوتا ہے۔ اکثر صحن میں رات کے تیسرے پہر بال کھول کر رخشندہ پتا نہیں کیا کیا پڑھتی رہتی تھی۔ زریاب اور سندس آئے دن نئی نئی مصیبتوں کے شکار ہوتے رہتے۔ کچھ نہ کچھ دکھائی دینے والی چیزیں اکثر تنگ کرتی رہتی تھیں۔ بچے بھی بڑی مشکل سے پیدا ہوتے۔ کبھی چھپکلی کمرے میں آجاتی تو کبھی سانپ اور سانپ بھی ایسے کہ جن کے دو منہ ہوتے۔ نہ دکھائی دینے والی چیزیں بہت تنگ کرنے لگی تھیں۔ بہت مشکل سے زندگی امتحان لیتے گزر رہی تھی

کہ ابا کو احساس ہونے لگا کہ وہ رخشندہ اور نایاب کی وجہ سے زریاب کے ساتھ غلط کر رہے ہیں اور کرتے آئے ہیں۔ کوڑھ جیسی موذی بیماری میں ابا کی خدمت واحد زریاب نے کی۔ نایاب ہاتھ تک نہ لگاتے۔ گھن کھاتے تھے۔ جب کہ زریاب ابا کو نہلاتا، واش روم لے جاتا، ان کی ہر حاجت کا خیال رکھتا، تمام کام زریاب نے بخوبی انجام دیئے۔ ابا نے رخشندہ اور نایاب کو الگ گھر لے کر دیا اور انہیں خود سے الگ کر دیا۔ یہ بات رخشندہ کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ رخشندہ کے کام ختم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اپنی غلط حرکتوں میں مسلسل لگی ہوئی تھی۔ بس اللہ زریاب اور سندس کا ساتھ اپنے نیک بندوں کو بھیج کر دیتا رہا۔ زریاب اور سندس کے پیر صاحب انہیں بچانے میں مسلسل کوشش کرتے رہتے۔ بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔

ان لوگوں کے خدائی دعوے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ لوگ خدا کے کاموں میں مسلسل مداخلت کر کے زریاب اور اس کی فیملی کو مسلسل نقصان پہنچا رہے تھے۔ اکثر نہ دکھائی دینے والی چیزیں تنگ کرتیں، نقصان پہنچاتیں اور بیماری کا بول بالا رکھتی تھیں گھر میں۔

زریاب دل کے دورے کی وجہ سے بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے علاج میں مسئلے نہیں ہوئے۔ آخر کار ایک آخری وار ایسا کیا گیا کہ نوبت بائی پاس کروانے کی آ گئی۔ سب بچے ابو کو منع کرتے رہے کہ آپ بائی پاس نہ کروائیں مگر وہ تو شاید اپنے آپ میں ہی نہیں تھے۔ گھر میں ایسے حالات ہو جاتے تھے۔ اکثر ہم سب ڈرتے تھے بہت سی نہ دکھائی دینے والی چیزوں کا احساس ان کا چلنا پاس سے گزر کر جانا ڈرا دیتا تھا۔ کافی روحانی علاج کروایا تمام عالموں کی ایک ہی بات ہوتی تھی کہ اس گھر میں بہت سے گندے عمل کیے گئے ہیں نہ تو آپ یہ گھر بیچ سکتے ہیں اور نہ ہی اس گھر سے نکل سکتے ہیں۔ زندگی گزر رہی تھی کہ ابو نے بائی پاس کروانے کے لیے سب کی مخالفت کر کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔ بائی پاس کے بعد انہیں ایسا لگتا کہ ایک بہت بڑا سا کتا ہے جو ان کے سینے پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ ڈر کر درد سے چیخ کر اٹھتے ہیں تو وہ کتا اسپتال کے بیڈ کے نیچے جا کر بیٹھ جاتا ہے اور دیوار پر بہت سے خوفناک چہرے نظر آتے جو ان کو ڈراتے، سونے نہیں دیتے۔ بھائی اور امی مسلسل ابو کے پاس بیٹھے رہتے مگر مسلسل ان تمام چیزوں کی وجہ سے ابو کے سینے پر لگے ٹانکے بار بار کھولتے۔ وہ بہت درد اور تکلیف میں تھے۔ تین عورتیں برقع پہنے ابو کے سرہانے بیٹھ کر زور زور سے باتیں کرتیں انہیں سونے نہیں دیتی تھیں۔ یہ تمام چیزیں بس ابو کو نظر آتیں ہم سب ان کو دیکھنے سے قاصر رہتے۔ ابو کے ٹانکے کھول دیئے گئے۔ دوبارہ ان کا آپریشن کیا گیا۔ پھر ابو کومے میں چلے گئے۔ اس کے بعد انہیں کبھی ہوش نہیں آیا۔ 31 دسمبر 2005ء کو ابو تمام تکالیف سے آزاد ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے اور ہم ان کے بغیر بہت اکیلے رہ گئے۔

جب ان کا جنازہ گھر لایا گیا تو تایا جان اور تائی جان بھی آئے تھے۔ تائی جان مسلسل ابو کے سرہانے بیٹھے کچھ پڑھ رہی تھیں کہ ابو جو کہ اب زندہ نہیں تھے مگر ان کے کراہنے کی ایک زوردار آواز آئی تو میری بڑی بہن نے غصے سے تائی جان کو ان کے سرہانے سے ہٹا دیا۔

جب ابو اسپتال میں تھے اور انہیں ایک کتا، تین عورتیں برقع والی اور دیوار پر خوفناک شکلیں نظر آ رہی تھیں تو کئی روحانی عالموں سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ زریاب صاحب پر میعادی عمل کیا گیا ہے اور بہت دیر ہو گئی میعاد پوری ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

کتنا مشکل عمل ہے ناں کہ قاتل بھی سامنے ہوں اور مقتول بھی مگر آپ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسے کیس کی نہ تو رپورٹ درج کروائی جا سکتی ہے اور نہ ہی پولیس کارروائی۔

کیوں لوگ خدا بننے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیوں لوگ خدائی دعوے کرتے ہیں؟ کیوں خدا کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں؟ کیوں؟ کیوں خدا کو بھول جاتے ہیں؟ کیوں یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک دن سب کو مرنا ہے؟

یہ شرک ہے، کھلا شرک اگر خدا کسی کو خوش اور ہنستا بستا رکھنا چاہتا ہے تو محض اپنی خوشی کے لیے ہم اس کو دکھ دیں۔ اس کی خوشی کو مٹی میں ملا دیں۔ خدا کے کاموں میں دخل اندازی کریں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

میری دعا ہے کہ اللہ ہمیں غلط اور برے کاموں سے بچائے اور کرنے والوں سے دور رکھے، (آمین)۔

☆☆☆

تیسری مرد کہانی

صوفی نانا



فردوس بانو

اُس سادہ لوح شخص کی داستان، جو اپنی سادگی کے ہاتھوں مال و متاع لٹا بیٹھا تھا

ہم سب بچے انہیں صوفی نانا کہتے تھے۔ یوں تو نام ان کا اقتدار احمد تھا۔ انتہائی سادہ اور شریف انسان تھے۔ نیک پرہیزگار اور سادہ آدمی تھے۔ ان کا تعلق ہندوستان کے ایک گاؤں کوٹ سے تھا۔ وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور ہمارے محلے میں ان کا گھر تھا۔ ان کی فیملی میں ان کی بیوی اور دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

ان کی بیوی حاجرہ بیگم نہایت تیز طرار خاتون تھیں۔ جو ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں۔ وہ ایک جھگڑالو خاتون تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا احتشام قریب ہی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا، چھوٹا بیٹا راحیل میٹرک میں اور بیٹی نازیہ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔

اقتدار احمد کے گھر کے قریب ان کی بہن کا گھر تھا۔ جہاں ان کا آنا جانا تھا۔ اقتدار احمد کی بہن رقیہ بیگم انتہائی خوش اخلاق اور نفیس خاتون تھیں۔ وہ اور ان کے بچے اقتدار احمد کا بہت خیال رکھتے تھے۔

اقتدار احمد بھی ایک چھوٹی سی فیکٹری میں کام کرتے تھے جس سے ان کا گزر بسر بہت اچھی طرح سے ہو رہا تھا۔ ان کی بیگم عمر میں ان سے بہت چھوٹی تھیں۔ بدمزاج ہونے کی وجہ سے وہ سارے گھر پر حاوی تھیں۔ اقتدار احمد کی مجال نہیں تھی کہ وہ گھر کی کسی بات پر اختلاف کریں اور حاجرہ بیگم اسے مان لیں۔ ان دونوں کے درمیان جھگڑا اسی بات پر ہوتا تھا۔

بڑا بیٹا احتشام جب جوان ہوا تو انہیں اس کی شادی کی فکر کھانے لگی کہ جلدی سے وہ احتشام کی شادی کریں اور اپنے پوتے پوتیوں کو اپنی گود میں کھلائیں۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو اپنے رشتے داروں میں رشتہ تلاش کرنا چاہا اور ایک دو جگہ رشتہ بھی کہلوایا لیکن ادھر سے حاجرہ بیگم کے مزاج کی وجہ سے انکار ہو گیا۔

اس کے بعد حاجرہ بیگم نے رشتہ کروانے والی تلاش کی اور اسے کہا کہ مجھے ایک شریف خاندان کی نیک اور سیدھی سادھی خوب صورت لڑکی چاہیے جو ہمارے گھر کو سنبھال سکے۔ رشتے والی نے انہیں ایک فیملی سے ملوایا جن کی لڑکی انتہائی خوب صورت اور تعلیم یافتہ تھی۔

حاجرہ بیگم ان لوگوں سے مل کر بہت خوش

ہوئیں اور فوراً ہی ہاں کر دی۔ رشتہ پکا ہونے کے بعد انتہائی سادگی سے منگنی کی رسم ادا کی گئی اور چھ ماہ بعد شادی طے پائی۔

بہو کے گھر میں آنے کے بعد بھی حاجرہ بیگم کی طبیعت اور مزاج میں بالکل بھی سدھار نہیں آیا۔ حاجرہ بیگم کی بہو عائشہ ان کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اپنے سسر اقتدار احمد کا بہت خیال رکھتی تھی اور اپنی پوری کوشش کرتی تھی کہ ساس اور سسر کے درمیان لڑائی جھگڑا نہ ہو۔

جب کبھی اقتدار احمد اور حاجرہ بیگم کے درمیان جھگڑا زیادہ بڑھ جاتا تو وہ اپنی ایک چھوٹی سی پیٹی میں چند کپڑے رکھتے اور اپنی بہن کے گھر چلے جاتے تھے۔

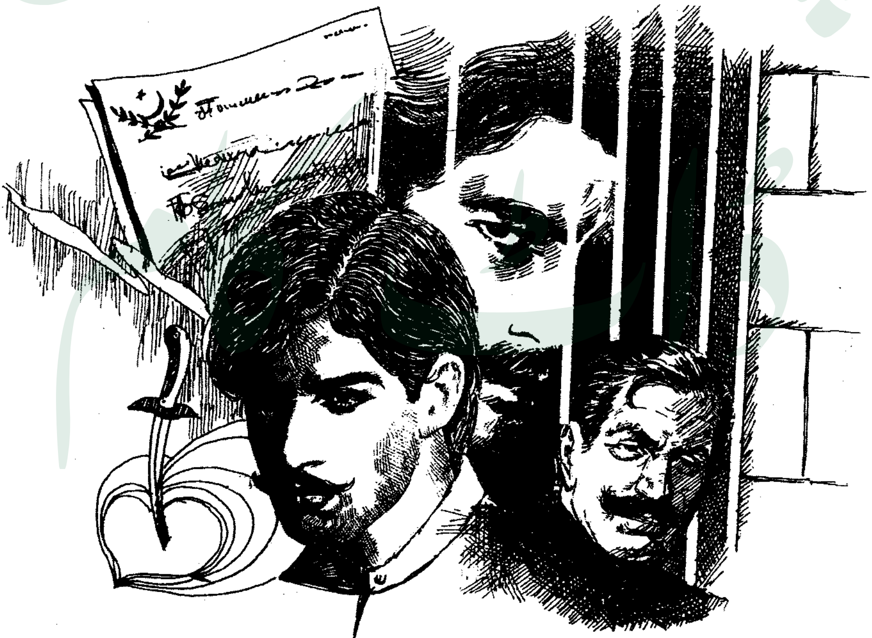
اسی طرح زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ اقتدار احمد کی ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آ گیا۔ انہوں نے اس کا ذکر اپنی بیگم حاجرہ سے کیا۔ بیگم نے انہیں مشورہ دیا کہ بیٹی جوان ہو رہی ہے جیسے ہی ریٹائرمنٹ کی رقم ملے گی ہم اسے جا کر بینک میں جمع کروا دیں گے تاکہ وہ رقم ہماری بیٹی کی شادی میں کام آ سکے۔

اقتدار احمد فیکٹری سے آنے کے بعد ٹھیلے پر سبزیاں بیچتے تھے۔ ان کے گھر کے قریب کرسچن کالونی تھی جہاں وہ سبزی بیچنے جاتے تھے۔ وہاں کے لوگوں سے ان کی اچھی خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔

ایک دن جب وہ وہاں سبزی بیچنے گئے تو ایک آدمی جو اقتدار احمد سے تقریباً روزانہ ہی سبزی لیتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ باتوں ہی باتوں میں اقتدار احمد نے اس کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ ابھی فی الحال سبزی بیچ رہے ہیں۔ انہیں فیکٹری سے ریٹائرمنٹ کی رقم ملی ہے۔ جسے وہ ایک دو دن میں بینک میں جمع کروا دیں گے۔

☆......☆

دو دن بعد انہیں رقم مل گئی، ایک دن رات



کے کھانے کے بعد جب سب سو گئے تو حاجرہ بیگم کو اپنے صحن میں کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ پہلے تو وہ سمجھیں کہ ان کا وہم ہے۔ پھر جب دوبارہ آواز آئی تو انہوں نے اپنے شوہر کو اٹھایا۔ ابھی وہ اٹھے بھی نہیں تھے کہ وہ دو آدمی ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جنہوں نے اپنے منہ پر نقاب لگائے ہوئے تھے انہیں دیکھ کر حاجرہ بیگم زور سے چلائیں۔

''کون ہو تم لوگ کیوں آئے ہو'' ایک آدمی نے ان کے منہ پر طمانچہ مارا اور بولا۔

''چپ کرو ورنہ ہم تم دونوں کو مار دیں گے۔'' شور کی آواز سن کر ان کے دونوں بیٹے بھی اٹھ کر کمرے سے نکلے۔ صحن میں بھی ان کا ایک ساتھی کھڑا تھا۔

جسے اقتدار احمد کے دونوں بیٹوں نے دبوچ لیا اور اسے کس کر پکڑ لیا لیکن اس آدمی کے ہاتھوں میں خنجر تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے احتشام کی ٹانگ میں خنجر گھونپ دیا اور راحیل کے ہاتھ میں مارا جس سے وہ ان دونوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

ادھر احتشام اور راحیل کی آوازیں سن کر کمرے میں موجود دونوں آدمی خورشید احمد ان کی بیگم باہر صحن کی طرف دوڑے۔ احتشام اپنی ٹانگ پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ راحیل کے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ کر گری ہوئی تھیں۔ دونوں کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حاجرہ بیگم حواس باختہ ہو گئیں اور زور زور سے رونے اور چلانے لگیں۔ بیٹوں کی حالت دیکھ کر اقتدار احمد ان تینوں آدمیوں کے پیچھے باہر گلی میں بھاگے اور ان میں سے ایک آدمی کو پکڑ لیا اور شور مچانے لگے۔ چور چور پکڑو یہ دیکھ کر اس آدمی کا ایک ساتھی واپس پلٹ کر اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے آیا اور اقتدار احمد کی کمر میں خنجر سے وار کیا۔

جس کی وجہ سے انہوں نے اس آدمی کو چھوڑ دیا اور وہ وہیں زمین پر گر گئے۔ پورے محلے میں کہرام مچ گیا۔ کچھ لوگوں نے ان آدمیوں کا پیچھا کیا لیکن وہ آدمی اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قریب کے جنگل میں جا کر چھپ گئے اور ان کا کچھ پتا نہ چلا۔

اقتدار احمد خون میں لت پت زمین میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے زخمی حالت میں درد سے کراہ رہے تھے اور حاجرہ بیگم پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

کسی نے ایمبولینس منگوائی تو کسی نے پولیس کو اطلاع دی۔ ایمبولینس میں ان سب کو اسپتال پہنچایا گیا لیکن اقتدار احمد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے راستے میں ہی چل بسے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق خنجر سے ان کے گردے دو انچ کٹ گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوئی تھی۔

احتشام اور راحیل اسپتال میں داخل تھے۔ جب حاجرہ بیگم کو ہوش آیا تو ان کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ پولیس آئی اور اس واقعے کی انکوائری کی۔ جلدی ہی اقتدار احمد کے قاتل پکڑے گئے۔ حاجرہ بیگم کو ان کی پہچان کے لیے تھانے بلوایا گیا۔ تھانے میں بہت سارے لوگ تھے۔ جنہیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور حاجرہ بیگم سے کہا گیا کہ وہ ان میں سے ان آدمیوں کو پہچانیں۔ حاجرہ بیگم نے انتہائی غور سے سب آدمیوں کو دیکھ کر ایک آدمی کو اس قطار میں سے گریبان پکڑ کر باہر نکالا کہ یہ ہی وہ آدمی ہے جس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ میرا گھر اجاڑ دیا۔ جیسے ہی ایک آدمی کی شناخت ہوئی اس کے باقی دونوں ساتھی بھی پکڑے گئے۔

کیس چلتا رہا اور بالآخر انہیں سزا ہو گئی۔

یوں اقتدار احمد کی سادگی کی وجہ سے انتہائی بھیانک اور سنگین واقعہ پیش آیا۔ جس نے ان کی جان لے لی۔

☆☆☆

لاری اڈا

سفر وسیلہ ظفر..... مگر اس سفر میں بھلا کون منزل تک پہنچا، کون راہزن ہوا اور کون رہبر حضرت انسان کے نئے نئے قصے

سعودی عرب کا ویزا



ممتاز احمد

لاری اڈّے کے نزدیک زیر تعمیر مسجد سے شروع ہونے والی نوسر بازی

جو آخر کار سعودی عرب کے ویزے پر ختم ہوئی

شروع شروع میں لاری اڈا شہر کے وسط میں تھا۔ جب آبادی بڑھ گئی اور گاڑیوں کی آمدورفت کی وجہ سے ٹریفک کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تو حکومت نے لاری اڈے کو شہر سے باہر نکال دیا۔ اس وقت نئے لاری اڈے



کے اِرد گرد آبادی نہیں تھی۔ بس تھوڑے سے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ انور گاؤں کا نمبردار تھا اور اس کی کچھ زمین تھی جس پر وہ مختلف فصلیں کاشت کرتا تھا۔ لاری اڈے کے ساتھ ہی مسجد کے لیے جگہ رکھی گئی تھی تو اپنی مدد آپ کے تحت مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا مگر اسپیڈ بہت سلو تھی۔ باہمی صلاح مشورے سے انور کو مسجد کمیٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا۔

ایک دن نئی کار پر ایک ویل سوٹڈ بوٹڈ صاحب آئے اور انہوں نے نئے لاری اڈے کی زیرِ تعمیر مسجد میں نماز ادا کی۔ نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے ایک نمازی سے پوچھا کہ مسجد کی تعمیر کا کام کون کروا رہا ہے؟ تو اس نے انور کی طرف اشارہ کیا۔ وہ صاحب انور سے ملے اور مسجد کی تعمیر کا پوچھا۔ انور نے جواب دیا۔ ''اپنی مدد آپ کے تحت مسجد کی تعمیر کام ہو رہا ہے۔ آج کل فنڈز نہیں ہیں تو اس وجہ سے کام رکا ہوا ہے۔''

اس پر ان صاحب نے اپنی پاکٹ سے پچاس ہزار روپے نکال کر انور کو دیئے کہ ''آپ کام شروع کرائیں۔'' اتنا کہہ کر وہ صاحب جلدی سے وہاں سے چلے گئے۔

اگلے ہی روز سے انور نے مسجد کی تعمیر کا کام شروع کروا دیا۔ کوئی پندرہ دن گزرے تو وہ صاحب دوبارہ مسجد آئے اور نماز ادا کی تو باقی نمازیوں نے انہیں بہت پروٹوکول دیا۔ انہوں نے مزید پچاس ہزار روپے انور کو دیئے کہ آپ جلد از جلد مسجد مکمل کروائیں۔ جب وہ صاحب جانے لگے تو انور سمیت تمام نمازیوں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے پوچھا کہ ''آپ کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟''

اس پر ان صاحب نے بتایا کہ ''ان کا سعودی عرب میں کافی لمبا چوڑا کاروبار ہے جو کہ بہت اچھا چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں بھی ان کا کاروبار چل رہا ہے جس کا ہیڈ آفس لاہور میں ہے اور وہ ساتھ والے شہر میں رہتے ہیں تو اپنے کاروباری دورے پر ہر پندرہ دن کے بعد اس شہر میں آتے ہیں۔''

سب نمازیوں نے انہیں کچھ دیر رکنے کے لیے کہا کہ ''جناب تشریف رکھیں آپ کو چائے پانی پلاتے ہیں۔''

ان صاحب نے انتہائی عاجزی اور شفقت سے معذرت کی اور بتایا کہ ''وہ جلدی میں ہیں، پھر کبھی بیٹھیں گے۔''

انور انہیں کار تک چھوڑنے آیا اور وہ وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سب نمازیوں نے ان کی بہت تعریف کی کہ آج کے دور میں بھی ایسے لوگ ہیں جن کے دل میں اللہ کا خوف ہے اور وہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اس طرح خرچ کرتے ہیں۔

یہ بات آج سے پچیس یا تیس سال پرانی ہے تو اس زمانے میں پچاس ہزار بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ وہ صاحب پندرہ دنوں میں ایک لاکھ روپے مسجد کی تعمیر کے لیے دے چکے تھے۔ پورے لاری اڈے میں نہ صرف یہ بات پھیل گئی بلکہ ان صاحب کی دھاک بھی بیٹھ گئی ان کی دریا دلی کا خوب چرچا شروع ہو گیا۔ مسجد کی تعمیر کا کام زور شور سے چل رہا تھا۔ انور بڑی ذمہ داری سے اور سوچ سمجھ کر پیسے خرچ کر رہا تھا اور ایک ایک پائی کا حساب کتاب رکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ لکھ رہا تھا۔

رات ہوئی تو انور سونے کے لیے چارپائی پر لیٹا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے دو لڑکے جو کہ جوان تھے اور میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکے تھے۔ سارا دن گاؤں کی آوارہ گردی کرتے اب تو گاؤں کے قریب لاری اڈہ بن گیا تھا تو ان دونوں کا لاری اڈے میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ انور اپنے ان دونوں لڑکوں کی وجہ سے پریشان تھا اور اسی پریشانی کی وجہ سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی کہ یکلخت اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ جن صاحب نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک لاکھ روپیہ دیا ہے اور ان کا کافی لمبا چوڑا کاروبار سعودی عرب میں ہے تو وہ ان سے کہے گا کہ اس کے دونوں بیٹوں یا ایک کو کہیں ایڈجسٹ کروا دیں اور اسے پوری امید تھی کہ وہ صاحب ضرور اس کی مدد کریں گے۔ اب مسجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ انور کو ان صاحب کی آمد کا بڑی بے قراری اور بے صبری سے انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے وقت گزرا تو آج وہ صاحب تیسری بار مسجد میں نماز ادا کرنے آئے۔ سب لوگوں نے ان کا پرتپاک طریقے سے استقبال کیا۔ ہر شخص اور خاص طور پر انور ان صاحب کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ لاری اڈے میں بھی ان صاحب کی آمد کی اطلاع ہو گئی تھی تو آج نماز کے لیے کافی لوگ

مسجد میں آ گئے تھے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد سب لوگ پرجوش طریقے سے ان صاحب سے ملے انہوں نے سرسری طور پر مسجد کی تعمیر کے کام کا جائزہ لیا چونکہ ابھی کام رہتا تھا تو انہوں نے پچاس ہزار روپے اور انور کو دیئے اور واپسی کی اجازت چاہی مگر آج انور بضد تھا کہ وہ اس کے گھر چلیں اور چائے پانی پی کر جائیں ان صاحب نے بڑی معذرت کی مگر انور کے شدید اصرار پر وہ اس کے گھر جانے کے لیے رضامند ہو گئے۔ چنانچہ انور ان کی کار میں بیٹھ گیا اور انہیں اپنے گھر لے آیا اور حسب توفیق ان صاحب کی خوب خاطر مدارت کی۔ باتوں باتوں کے دوران انور نے اپنے دونوں بیٹوں کو سعودی عرب میں ایڈجسٹ کرنے کا ذکر کیا۔ آج اتفاق سے اس کے دونوں بیٹے گھر پر تھے انور نے ان کی ملاقات ان صاحب سے کروائی تو انہوں نے مختصراً دونوں کا انٹرویو لیا اور سوچ میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگے کہ انور صاحب آپ کے بیٹوں کی تعلیم بھی میٹرک ہے اور کوئی ہنر بھی نہیں ہے وہ انہیں کہاں ایڈجسٹ کریں؟"

اس پر انور نے بڑے خوشامدانہ انداز سے کہا۔

"جناب اللہ نے آپ کو بہت دیا ہے آپ انہیں کسی کام پر لگا دیں تو بہت جلد یہ کام سیکھ جائیں گے۔ الغرض تھوڑے بہت اصرار کے بعد وہ صاحب مان گئے اور کہنے لگے۔

"ٹھیک ہے انور صاحب میں انہیں لیبر کلاس میں کام پر لگا دیتا ہوں۔ تو سال چھ ماہ بعد ان کی تنخواہ بھی بڑھا دوں گا اور اچھے کام پر لگا دوں گا۔ فی الوقت دونوں کی تنخواہ پچاس پچاس ہزار روپے ہوگی۔ ان کی رہائش، میڈیکل اور کھانا پینا سب کمپنی کے ذمے ہوگا۔"

اتنا سن کر انور اور اس کے دونوں بیٹوں کی باچھیں کھل گئیں۔ کہاں وہ دونوں پورے مہینے کا ٹکا نہیں کماتے تھے وہاں اب پورا ایک لاکھ روپے ماہوار کمائیں گے اور چھ ماہ یا سال کے بعد تنخواہ بڑھ جائے گی۔

انور نے ان سے پوچھا۔ "انہیں اب کیا کرنا ہوگا؟"

ان صاحب نے بتایا۔ "ان کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوائیں۔"

انور نے پوچھا۔ "ویزوں کا کتنا خرچ ہوگا؟"

تو وہ صاحب سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے۔

"ویسے تو دو لاکھ روپے ایک بندے پر خرچ آتا ہے تو اس حساب سے چار لاکھ روپے بنتا ہے مگر انور صاحب آپ اب اپنے بندے ہیں تو ایک لاکھ روپے آپ کو رعایت کرتا ہوں تو آپ دونوں کا صرف تین لاکھ دے دیں۔ وہ بھی ویزا اور گارنٹی کے اور ان کے ٹکٹ کے پیسے بھی اسی میں شامل ہیں۔ سال بعد ایک ماہ کی چھٹی بمعہ تنخواہ کے ملے گی۔ ان صاحب نے بتایا کہ وہ دو دن کے بعد سعودی عرب جا رہے ہیں اور پورے مہینے کے بعد آئیں گے اگر اپنے دونوں بیٹوں کو سعودی عرب بھیجنے کا پروگرام ہے تو ایک ماہ کے اندر اندر ان کے شناختی کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ اور تین لاکھ روپے تیار رکھیں۔" اتنا کہہ کر وہ صاحب وہاں سے رخصت ہو گئے۔

اب اگلے ہی دن پورے گاؤں اور لاری اڈے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ نمبردار انور کے دونوں بیٹے سعودی عرب جا رہے ہیں۔ اب ان دونوں لڑکوں نے اپنے اپنے شناختی کارڈ بننے کے لیے دے دیئے۔ جب شناختی کارڈ بن گئے تو اگلا مرحلہ پاسپورٹ بنوانے کا تھا۔ اس زمانے میں پاسپورٹ کمپیوٹرائزڈ نہیں بنتے تھے اور کافی ٹائم بھی لگتا تھا۔ بہرحال ان دونوں نے کچھ دے دلا کر ارجنٹ پاسپورٹ بنوا لیے۔ نمبردار انور پورا مہینا پیسوں کا انتظام کرنے لگا رہا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں سے قرض مانگا کہ تین مہینوں کی تو بات ہے دونوں لڑکوں کی تنخواہ ایک لاکھ روپے ہے تو تین مہینوں میں یہ قرضہ اتر جائے گا۔ بہرحال انور نے رقم کا بندوبست کر لیا۔ اس کے دونوں بیٹوں کے شناختی کارڈز اور پاسپورٹ بھی بن گئے تھے۔ تقریباً مہینا ہو گیا تھا ان صاحب کی آمد کا انتظار تھا۔ کوئی ایک ماہ دس دن گزرے تو وہ صاحب سیدھے نمبردار انور کے گھر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر انور کھل اٹھا۔ وہ صرف پانچ یا سات منٹ انور کے گھر رکے جہاں دونوں لڑکوں کے شناختی کارڈز، پاسپورٹ اور تین لاکھ روپے لیا اور کہا کہ "وہ اسلام آباد جا رہے ہیں کچھ اور بندے بھی ہیں تو سب کے ویزے لگوانے ہیں۔" انہوں نے انور سے رابطے کے لیے گاؤں میں لگے ایک گھر کا پی ٹی سی ایل فون نمبر لیا اور کہا اگلے دو ہفتے کے اندر اندر وہ رابطہ کریں گے اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔

اس دن چوبیس تاریخ تھی تو ان صاحب کا ٹیلی فون

آ گیا۔ وہ کراچی سے بول رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انور کے دونوں لڑکوں کے ویزے لگ گئے ہیں اور انتیس تاریخ کو ان کی سعودیہ روانگی ہے۔ جہاز کے ٹکٹ ان کے پاس ہیں ان دونوں لڑکوں کو پیغام دیں کہ وہ اٹھائیس تاریخ کو کراچی پہنچ جائیں وہ انہیں ریلوے اسٹیشن سے لے لیں گے۔ مزید وہ ستائیس تاریخ کو شام پانچ بجے ٹیلی فون کریں گے۔

جیسے ہی یہ ٹیلی فون آیا تو دونوں لڑکوں نے ستائیس تاریخ میں ٹرین میں سیٹیں بک کروالیں۔ ٹرین سہ پہر تین بجے چلتی تھی ان دونوں نے فوراً روانگی کی تیاری شروع کردی۔ اپنے ضروری کپڑے سلوائے اور رشتے داروں کے ہاں دعوتیں کھانی شروع کردیں۔ مستقبل کے سہانے خواب سجائے دونوں بھائیوں نے سب گاؤں والوں اور لاری اڈے میں اپنے اپنے ملنے والوں سے ملاقات کی اور اپنے اپنے بیگ لے کر وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ آدھے سے زیادہ گاؤں والے ان دونوں کو اسٹیشن چھوڑنے آئے تھے۔ تین بجے ٹرین چل پڑی۔ شام پانچ بجے ان صاحب کا ٹیلی فون آیا تو انہیں بتادیا گیا کہ وہ دونوں فلاں ٹرین کے ذریعے روانہ ہوچکے ہیں اور اگلے دن دو یا تین بجے کراچی پہنچ جائیں گے۔ اب اگلے دن وہ دونوں واقعی کراچی پہنچ گئے تو ان صاحب نے انہیں ریلوے اسٹیشن سے لے لیا تھا اور دونوں لڑکوں نے ٹیلی فون پر اپنے کراچی پہنچنے کی خبر سنادی تھی۔ دو دن کے بعد ان صاحب کا فون آیا کہ انور کے دونوں بیٹے سعودی عرب خیر خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔

آج جب انور رات کو سونے کے لیے لیٹا تو وہ بہت مطمئن تھا۔ اس کے دل میں جو وسوسے اندیشے تھے وہ سب دم توڑ چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی مستقبل کے سنہرے سپنے بننے میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے تو جو تین لاکھ روپے قرض لیا تھا وہ اتارنا تھا اس کے بعد سارا گھر گرا کر دوبارہ بنانا تھا۔ پھر دونوں بیٹوں کے رشتے تلاش کرنے تھے اور اگلے سال جب وہ دونوں چھٹی گزارنے آئیں تو ان کی شادی کردی جائے۔ اس طرح کے پروگرام بنتے رہے اور پورا مہینا گزر گیا۔

اگلے مہینے کی یکم تاریخ کو وہ صاحب نمبردار انور کے گھر آئے اور بہت پرتپاک طریقے سے ملے اور آتے ہی ایک لاکھ روپیہ انور کو ادا کیا کہ یہ اس کے دونوں بیٹوں کی تنخواہ ہے۔ ایک لاکھ روپے پا کر انور کے تو خوشی سے آنسو نکل آئے۔ آج انور کے گھر وہ صاحب کافی دیر رکے کھانا وغیرہ کھایا۔ انور نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا ان صاحب نے بتایا کہ انور کے دونوں لڑکے باہر فیلڈ میں کام کرتے ہیں اور ٹیلی فون کی سہولت نہیں ہے اس لیے انہوں نے پورا مہینا بات نہیں کی۔ پھر ان صاحب نے اپنے ایک نئے پروجیکٹ کا ذکر کیا جس کے لیے انہیں پچیس سے تیس بندوں کی فوری ضرورت تھی۔ انور نے فوراً یہ کام اپنے ذمہ لیا اور کہا کہ اسی مہینے کے اندر اندر انہیں مطلوبہ بندے مل جائیں گے۔ ان صاحب نے بتایا کہ ہر بندے کی تنخواہ پچاس ہزار روپے ماہوار ہوگی۔ رہائش، میڈیکل اور کھانا پینا سب کمپنی کے ذمہ ہوگا اور ہاں ہر بندے سے تین لاکھ روپے بھی وصول کرنے ہیں۔ اب وہ صاحب اس ماہ کے آخر میں آئیں گے تب تک انور ان کا یہ کام کرے۔ اس کے بعد وہ صاحب وہاں سے رخصت ہوگئے۔ ان صاحب کے جانے کے ایک گھنٹے بعد پورے گاؤں اور لاری اڈے میں یہ بات پھیل گئی کہ نمبردار انور کے دونوں بیٹے سعودیہ کام پر لگ گئے ہیں اور ان دونوں کی پہلی تنخواہ ایک لاکھ روپے انور کو مل گئی ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے انور کو مبارک باد دی۔ اب اگلی بات بھی پھیل گئی ان صاحب کو پچیس سے تیس بندوں کی ضرورت ہے۔ بس پھر کیا تھا کہ ہر بندہ باہر جانے کے لیے بے چین تھا۔

اب نمبردار انور کی چال ڈھال میں واضح تبدیلی آ گئی۔ اس کا حلقہ احباب بہت بڑھ گیا۔ لوگ جھک جھک کر اسے سلام کرتے اس نے سر کے بالوں اور مونچھوں کو خضاب لگانا شروع کردیا۔ اس کی گفتگو میں تکبر آنا شروع ہو گیا۔ وہ ماڑے موٹے بندے کو لفٹ نہیں کراتا تھا۔ اس کی گردن میں سریا آ گیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے دونوں بیٹے سعودیہ میں سیٹ ہوگئے تھے۔ اس کی ماہوار آمدنی ایک لاکھ روپے شروع ہوگئی تھی جس کے بڑھنے کے چانسز تھے اور دوسرا یہ کہ سعودیہ بھیجنے کے لیے بندوں کا انتخاب اس کی ذمہ داری تھی تو لوگ جوق در جوق اس سے ملنے آتے۔ ہوتے ہوتے پورے چالیس بندے باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ لوگ اس کے گاؤں کے تھے کچھ لاری اڈے کے

تھے اور کچھ اِدھر اُدھر کے تھے۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے ارجنٹ پاسپورٹ بنوا لیے اور رقم کا بندوبست بھی کر لیا تھا اب انتظار تھا تو ان صاحب کا کہ وہ کب آتے ہیں۔ مہینا ختم ہونے میں دو دن باقی تھے کہ ان صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ وہ شام کو نمبر دار انور کے گھر آرہے ہیں۔ ان کی آمد کی اطلاع انور نے سب لوگوں کو کر دی۔ شام پانچ بجے وہ صاحب انور کے گھر آ گئے تو انور کے گھر میلہ لگ گیا۔ ان صاحب نے بتایا کہ ان کو زیادہ سے زیادہ صرف تیس بندوں کی ضرورت ہے مگر یہاں چالیس بندے تیار تھے۔ ہر بندے کی خواہش تھی کہ اس کی سلیکشن ہو جائے مگر وہ صاحب کسی کا پاسپورٹ لینے کو تیار نہ تھے۔ اب ہر بندہ انور کی منت سماجت کر رہا تھا کہ اس کا پاسپورٹ وہ صاحب لے لیں بالآخر انور نے ان صاحب کی بہت چاپلوسی اور خوشامد کی کہ آپ سب کے پاسپورٹ رکھ لیں اور سب کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ آخر اس کی عزت بے عزتی کا مقام ہے مگر وہ صاحب نہیں مان رہے تھے جب انور نے ان صاحب کے گھٹنوں اور داڑھی کو ہاتھ لگا کر کہا تو وہ صاحب تھوڑی دیر سوچ میں پڑ گئے اور بالآخر مان گئے تو سب کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان صاحب نے سب کے پاسپورٹ لے کر ایک تھیلے میں ڈالی اور سب لوگوں سے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی رقم وصول کی اور دوسرے تھیلے میں ڈالے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بوقت رخصت ہر بندہ انہیں جھک کر مل رہا تھا۔ انہوں نے پاسپورٹوں والا تھیلا اور رقم والا تھیلا اپنی نئی کار میں رکھا اور سب لوگوں کو پندرہ دن کا ٹائم دیا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد لوگوں نے دن اپنی انگلیوں پر گننے شروع کر دیے۔ پندرہ بیس بائیس اور پچیس دن گزر گئے مگر نہ تو وہ صاحب خود آئے نہ ٹیلی فون آیا اور تو اور نمبر دار انور کے دونوں بیٹوں کی تنخواہ بھی نہ آئی مگر چھبیسویں دن انور کے دونوں بیٹے آ گئے۔

☆......☆

اٹھائیس تاریخ دن کے تین بجے ٹرین کراچی کے کینٹ اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ نمبر دار انور کے دونوں بیٹے جیسے ہی ریلوے اسٹیشن سے باہر آئے تو وہ صاحب انہیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دونوں لڑکوں کو ساتھ لیا اور ایک فلیٹ میں لے گئے جہاں ایک پی ٹی سی ایل ٹیلی فون پڑا تھا تو ان صاحب نے خود نمبر ملا کر دیا اور ان لڑکوں نے اپنے کراچی پہنچنے کی اطلاع کر دی تھی۔ دونوں لڑکے چوبیس گھنٹے کا سفر کر کے آئے تھے اور تھکن سے چور تھے تو ان صاحب نے کہا کہ آپ دونوں آرام کریں اب کل صبح ملاقات ہو گی۔ چنانچہ اگلے دن کی صبح تک وہ دونوں لڑکے سوتے رہے اگلے دن وہ صاحب آئے اور لڑکوں سے کہا کہ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اب تمہاری سعودیہ روانگی ہے۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کو ساتھ لیا اور دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ایک جنگل میں فارم ہاؤس تھا وہاں لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ جہاں ان دونوں لڑکوں کو چوبیس گھنٹے میں صرف ایک ایک روٹی اور ایک پلیٹ سالن دیا جاتا۔ اسی طرح پینے کا پانی بھی ایک بوتل روزانہ ملتی۔ وہ بے چارے دہائی دیتے بہت شور و غل مچاتے مگر ان کی کسی حرکت کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ان صاحب کے کارندے گونگے، بہرے اور اندھے بنے ہوئے تھے۔ تقریباً دو مہینے میں ان لڑکوں کا بیس بیس پاؤنڈ وزن کم ہو گیا۔ وہ بیمار اور لاغر نظر آنے لگے۔ ان دونوں کو کئی بیماریاں بھی لگ گئی تھیں۔ وہ ہر روز منت سماجت کرتے کہ انہوں نے سعودیہ نہیں جانا۔ خدارا انہیں ان کے گھر جانے دو اور بالآخر ایک دن کی سنی گئی اور ان دونوں کو گاڑی میں بٹھا کر ان کے سامان کے ساتھ انہیں ریلوے پہنچایا گیا جہاں سے وہ ٹرین میں بیٹھ کر اپنے شہر پہنچ گئے۔

ان دونوں لڑکوں کی داڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ وہ پہچانے ہی نہیں جا رہے تھے۔ وہ شدید کمزوری اور لاغری کا شکار تھے تو انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی پوری روداد سنا دی۔ ان کے سامان سے ان چالیس بندوں کے پاسپورٹ بھی برآمد ہو گئے۔ آناً فاناً یہ بات پورے گاؤں اور لاری اڈے کے سب لوگوں تک پہنچ گئی۔ نمبر دار انور کی بیوی نے یہ سارا ماجرا سنا تو اس کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ بے چاری اسپتال لے جانے سے پہلے ہی چل بسی۔ انور پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اسے کچھ ہوش نہ رہا وہ ہر آنے جانے والے کے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا اور آج بھی وہ لاری اڈے میں چپ چاپ گم صم بیٹھا رہتا ہے۔

☆☆☆

میری مینا

انیسہ تاج خان

سابقہ ایڈیٹر کی والدہ کے قلم سے، مسیحاؤں کی غفلت و ناتجربے کاری کی سچی حکایت

میری پیاری بیٹی مینا تاج جو کہ اب اس دنیا میں نہیں رہی...... ہائے یہ لکھتے ہوئے اب بھی کلیجہ کٹ رہا ہے۔ میری اکلوتی بیٹی تین بھائیوں کی لاڈلی بہن اپنے بابا کا مان، غرور اور فخر...... جس سے ملتی اس کو اپنا گرویدہ بنا لیتی۔ اس سے ملنے والے ہر انسان کو لگتا کہ وہی مینا کا سب سے اچھا دوست ہے۔ آہ! سمجھ نہیں آتا کیسے میری ہنستی کھیلتی بچی کی زندگی دکھوں کا گھر بن گئی۔ جب تک میرے پاس تھی بہت خوش رہتی تھی۔ ہم جب گلشن اقبال شفٹ ہوگئے تھے۔ تب اس کا ایک رشتہ آیا، ہم سیدھے سادھے لوگ تھے اور ہم نے ان میں بھی یہ ہی بات دیکھی کہ سیدھے اور اچھے لوگ ہیں تو ان کو اپنی بیٹی دے دی۔ اتنی دیکھ بھال کرنے کے بعد ہم نے شادی کر دی اور پھر میری بیٹی کی بدنصیبی کے دن شروع ہوئے۔ جن کو ہم نے اچھا سمجھا دراصل وہ چالاک اور تیز نکلے۔ ان کی سب زیادتیوں کو برداشت کرتے کرتے میری بیٹی نے صرف اپنے اکلوتے بیٹے علی گل کے لیے 12 سال اس عذاب میں کاٹے۔ بغیر کسی کو کچھ بتائے جب ملتی ہنستے ہوئے ملتی۔ لوگ کہتے کہ دیکھو ذرا مینا کو کتنی خوش ہے اس کا شوہر تو اس کو عیش کراتا ہے۔ اب

میری بیٹی لوگوں کو کیا بتاتی کہ اسے رو رو کر مظلوم بننے کی اور اپنے غم اور دکھوں کا اشتہار لگانے کی عادت نہ تھی۔

میری ایک رشتہ دار اس سے اکثر کہا کرتی تھی کہ ''میناتم اس ہنسی کا صرف ناٹک کرتی ہو۔''

اور وہ ''ارے چھوڑیں نا ایسا کچھ نہیں ہے'' کہہ کر ہنس کر ٹال دیا کرتی تھی۔

آخر کار ایک دن اس کی برداشت ختم ہوگئی اور اس نے روتے ہوئے سب کچھ اپنے بھائی کو بتا دیا۔

میرے بیٹے نے اس کو بہت ڈانٹا کہ اب تک کسی کو کچھ کیوں نہیں بتایا تھا؟''

خیر اس کے بعد ہم نے اس کو خلع دلوائی اور میں اپنی بیٹی اور نواسے کو خالی ہاتھ اس ظالم کے گھر سے لے کر آئے جس کے پاس میری بیٹی اور نواسے کو دینے کے لیے سکون اور تھوڑی سی خوشیاں بھی نہ تھیں لیکن ابھی قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اس ظالم کے پاس سے آنے کے بعد میری بیٹی کو کڈنی کا مسئلہ ہوگیا تو میں اسے لیاقت نیشنل لے گئی۔ وہاں اس کا ڈاکٹر ندیم اللہ بیگ اور ڈاکٹر آس محمد نے کامیاب آپریشن کیا۔ خدا ان دونوں ڈاکٹرز کا بھلا کرے۔ اس کے بعد میری بیٹی کو نو سال تک کبھی کوئی

تکلیف نہیں ہوئی۔ پھر اچانک اس کی طبیعت خراب رہنے لگی جب چیک اپ کروایا تو یوٹرس میں رسولی کا پتا چلا۔ یہ پتا چلنے کے بعد میں نے اپنی بیٹی کو منا کر آپریشن کے لیے راضی کرلیا۔

آہ! آج بھی سوچتی ہوں تو افسوس ہوتا ہے اور خود پر غصہ آتا ہے کہ کیوں میں نے اپنی بیٹی کو منایا؟ اور وہ کیوں میرے کہنے پر مان گئی؟ مجھے کیا پتا تھا کہ میں اپنی بیٹی کا آپریشن نہیں کروا رہی بلکہ ایک ظالم ڈاکٹر کو اپنی بیٹی پر تجربہ کرنے کا موقع دے رہی ہوں۔

میں اپنی بیٹی کو 23 مئی 2016ء کو یہ سوچ کر اسپتال لے کر گئی کہ اب میری بیٹی ٹھیک ہو کر واپس آئے گی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ اس کو آخری بار گھر سے اس کے اپنے بابا کے گھر سے اس کو رخصت کروا کر موت کی دہلیز پر لے کر جا رہی تھی۔

ہر اسپتال میں قانون ہوتا ہے کہ مریض کا آپریشن کرتے وقت اس کے ساتھ آئے ہوئے سے بھی اجازت لی جاتی ہے لیکن ڈاکٹر قرۃ العین امانی تب میں ان کی چالاکی کیوں نا بھی یا اپنی بیٹی اور اپنا برا وقت کیوں کہ انہوں نے مجھ سے اجازت لینے یا مجھ سے مشورہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ صرف میری بیٹی کے کہنے پر رسولی نکالی اور یوٹرس چھوڑ دیا اور پھر ہفتے کے دن سے اس کی حالت بگڑنے لگی جو جونیئر ڈاکٹر اس وقت ڈیوٹی پر تھی میں اس کو بار بار جا کر بولتی رہی کہ میری بیٹی کو بہت بلیڈنگ ہو رہی ہے ہر دس منٹ میں اس کے کپڑے بدلنے پڑ رہے ہیں آپ آ کر کچھ کرو تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ اماں اس کا پیٹ صاف ہو رہا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح سارا خون ضائع کر کے وہ کس طرح پیٹ کی صفائی کر رہے تھے۔ خیر ہفتے سے پیر کا دن میری بیٹی نے تڑپتے تڑپتے گزارا اور جب ڈاکٹر اتوار کی چھٹی گزار کر واپس آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ میری بیٹی کے پیٹ پر ورم آ گیا ہے اور اس نے دوبارہ آپریشن کرنے کا کہا۔ جس کے دوران میری بیٹی مر گئی۔ جب ہم نے ملنے کا کہا تو ہمیں بے وقوف بنایا۔ آپ وارڈ میں ملیے گا۔ حالانکہ آپریشن کے دوران وہ مر چکی تھی۔ ان لوگوں نے پوری رات ہمیں بے وقوف بنایا اس کو وینٹی لیٹر پر رکھا اور اس آپریشن سے پہلے میرے دستخط لیے، شاید ان کو پہلے سے ہی علم ہو چکا تھا کہ اب کیس ان کے ہاتھ میں نہیں رہا اس لیے ساری ذمے داری مریض کے گھر والوں پر ڈال دی۔ بہر حال میری بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا اگر ڈاکٹر کو تجربہ کرنا ہی تھا تو کسی بڑی عمر کی عورت کا کرتی جو شاید اپنی پوری زندگی گزار چکی ہوتی...... لیکن میری بچی...... اس نے ابھی کیا دیکھا تھا۔ جس بچے کی خاطر اس نے ظلم برداشت کیے اس کی اکیلے دیکھ بھال کی اس کو یتیم کر گئی۔ لوگ باپ کے مرنے پر بچے کو یتیم کہتے ہیں لیکن میرے نواسے کے لیے تو ماں اور باپ دونوں میری بیٹی تھی۔ اس کے بچے کا کیا قصور تھا؟ میرے گھر کی بنیاد تھی میری بیٹی۔ اس کے بابا میں اور اس کے بھائی ہم اس کو دیکھ کر جیتے تھے۔ میرے پورے گھر کو ویران کر گئی۔ میں اپنی ہنستی بولتی بیٹی کو 23 مئی بروز پیر کو گھر سے لے کر گئی تھی اور 1 جون بروز منگل کو سفید بے داغ لباس میں لپٹا کر تھوڑی دیر کے لیے گھر لے کر آ گئی۔ شاید ڈاکٹر کے لیے وہ صرف ایک مریضہ تھی لیکن میرے لیے وہ پوری دنیا تھی اور پڑھنے والوں کو شاید یہ صرف کہانی لگے یا کہیں کہیں بورنگ بھی لگے لیکن میرے لیے میری سب سے قیمتی اور عزیز متاع کی زندگی کی پوری کہانی تھی۔ اس کو لکھنے کا مقصد ڈاکٹروں سے بدلہ لینا نہیں ہے وہ معاملہ تو میں نے اپنے اللہ کے حوالے کیا۔ بس میں یہ چاہتی تھی ذرا سی غفلت اور بے دھیانی سے اب کوئی اور مینا ڈاکٹروں کے تجربے یا غفلت کا شکار نہ ہو۔ اب تو ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں یہ لکھتے ہوئے کہ جس رسالے میں میری بیٹی کہانیاں لکھ کر بھجواتی تھی اب وہ ایک کہانی بن کر اسی رسالے میں آ جائے گی۔ پڑھنے والوں سے بس اتنی گزارش ہے کہ دعا کریں کہ اللہ مجھ بوڑھی کو میرے علی کو مینا کی آخری نشانی کو اللہ صبر دے اور اس کو جو سکون دنیا میں نہیں ملا وہ آخرت میں ملے اور اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

شہر عروس البلاد سے دوسری حکایت

سائرہ کی باجی



ارم ناز

مڈل کلاس کے محلوں میں ہونے والا تماشا، ارم ناز کے قلم سے

آج سائرہ کی بہن کی شادی تھی۔ سیارا محلہ ہرے لال برقی قمقموں سے روشن تھا۔ گلی چوڑی تھی اس لیے بارات بٹھانے کا انتظام گلی میں ہی کیا جارہا تھا۔ تمام گلی کو جھاڑو دے کر صاف ستھرا کرلیا گیا تھا۔ اب پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ تمبو قنات والے آگئے تھے اور موٹی موٹی کیلیں زمین میں ٹھونک رہے تھے۔ نائیلون کی رسیاں کھینچی جارہی تھیں۔ سائرہ کے ابا تمام کام کی نگرانی کررہے تھے۔ سائرہ کے ابا فطرتاً بھی چوہدری ہی تھے حکم چلانا ان کا من پسند کام تھا جو آج وہ بخوبی انجام دے رہے تھے۔ سائرہ کی اماں ہر آدھے گھنٹے بعد گھر کے دروازے پر آکر کام کا جائزہ لیتی تھیں۔ سائرہ کے ابا کے ساتھ چالیس سال گزارے تھے کچھ اثرات تو ہونے تھے۔ آواز بلند کر کے ایک آدھ حکمیہ جملہ کہہ کر چھپاک سے گھر میں گھس جاتیں۔ خوف تھا کہ شوہر اتنے لوگوں کے سامنے جھڑک نہ دیں۔ رنگ برنگے تمبو تانے جاچکے تھے۔ بجلی کا انتظام ہورہا تھا۔ گھاگ الیکٹریشن تار میں کنڈا ڈالنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ بالآخر یون گھنٹے بعد وہ کامیاب ہوگیا۔ گھر کی چھت پر رکھے اسپیکر پوری قوت سے چنگھاڑ رہے تھے۔ رخصتی کے گانے لگائے جاتے تو پورے گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا۔ فوراً ہی کیسٹ بدل کر کوئی واہیات گانا لگا دیا جاتا جس کی شاعری دو ٹکے کی بھی نہ ہوتی۔ پہلے تو پڑوسی ملک صرف فلمیں ہی واہیات بناتا تھا مگر اب گانے بھی ایسے بننے لگے تھے کہ باپ بھائی کی موجودگی میں بجیں تو پسینے چھوٹ جائیں۔ چھوٹی موٹی جیسے لونڈوں نے نائی کی دکان پر رش ڈالا ہوا تھا۔ فیس پالش، فیشل بلیچ کاؤنٹر پر سجے ہوئے تھے۔ نائی نازک اندام لڑکوں کے چہروں پر طرح طرح کے حربے آزما رہا تھا۔ کسی کو دھوپ میں سن بلاک استعمال کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ تو کسی کو اپنی بنائی ہوئی رنگ گورا کرنے والی کریم بیچ رہا تھا۔ ان زنانہ ٹائپ لڑکوں نے عجیب طرح کے بال بنا رکھے تھے۔ یہ لڑکے کم اور کانٹوں والے چوہے زیادہ نظر آرہے تھے۔ کچھ نے گدی پر چھوٹی سی چوٹی باندھ رکھی تھی اور کچھ نے یہودیوں جیسی داڑھی بنا رکھی تھی۔ چند ایک نے تو کلائیوں میں ربڑ کی چوڑیاں بھی پہن رکھی تھیں۔ چست پاجامے جیسی پینٹ میں پتلی پتلی ٹانگیں نمایاں ہورہی تھیں۔ سفید سفید موی مجسموں کے گال سرخ ہورہے تھے۔ یہ سرخ گال اچھی صحت کی نشانی نہ تھے بلکہ میک اپ کا کمال تھا اور یہ تیاری تھی سائرہ کے گھر شادی میں جانے کی۔

محلے کی بوڑھیوں نے سر پر مہندی گھول کر لیپ کیا ہوا تھا۔ سائرہ کی اماں نے کون مہندی سے ہتھیلی کے بیچوں بیچ گول ٹپہ لگایا تھا اور یہ ٹپہ بغیر پرکار کے گول ہی بنا تھا۔ انگلیوں کی پوروں کو بھی مہندی سے رچالیا تھا۔ کل سویرے ہی پیروں کے تلووں کو بھی مہندی سے رنگا تھا اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سائرہ کی اماں کا پیر پان کی پیک پر پڑ گیا ہو۔ سائرہ نے منع بھی کیا تھا اماں اب پیروں میں مہندی لگانا پرانا فیشن ہو گیا ہے مگر اماں نے کہا بی بی خیر سے میں سہاگن ہوں۔ جب تک تمہارے ابا میاں زندہ ہیں میں تو یونہی مہندی رچاتی رہوں گی۔''

سائرہ کی چھوٹی بہنوں نے بھی پوری تیاری کرلی تھی۔ دلہن بھی گھنٹا بھر سے غسل خانے میں نہانے گھسی ہوئی تھی۔ پانچ دن مانجھے بیٹھنے والی دلہن ایک گھنٹہ تو نہائے گی ہی سائرہ ہر دس منٹ بعد آواز لگاتی۔

''باجی جلدی نہالیں، بیوٹی پارلر بھی جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔'' محلے بھر میں ہلا مچا ہوا تھا۔ باورچی بھی اپنے چیلوں کے ساتھ کھانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ تھال میں براؤن پیاز پھیلی ہوئی تھی۔ چاول صاف کیے جا رہے تھے۔ ٹماٹر کاٹتے ہوئے باورچی وقتاً فوقتاً سر بھی کھجا رہا تھا۔ سائرہ کا بڑا بھائی بلاوجہ ہی دوڑا دوڑا پھر رہا تھا۔ لڑکیاں بالیاں کپڑے استری کر رہی تھیں۔ گلی میں چوڑی والے کا ٹھیلا نمودار ہوا مگر تمبوؤں نے ٹھیلے کا راستہ روک لیا۔ ٹھیلے والے نے گلی کے نکڑ سے ہی آواز لگائی۔ ''چوڑی والا ہری لال نیلی پیلی جامنی اور پتا نہیں کون کون سی چوڑی لے لو۔'' ایک درجن خواتین آگے پیچھے اپنے گھروں سے نکل کر چوڑی والے کی طرف بڑھیں، مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں۔

''کیا درجن دیں بھیا۔'' یہ پہلا سوال تھا۔

جوڑوں کے ہم رنگ سیٹ بنوائے جانے لگے۔ چوڑی والا باری باری سب کو چوڑیاں پہنا رہا تھا۔ چوڑی والے کے پاس سے گزرتے ہوئے جمیل میاں کی حس مزاح پھڑکی ایک جملہ چوڑی والے کی طرف اچھال دیا۔



''کیوں یار ہاتھ پکڑے جا رہے ہیں۔'' جمیل میاں کی مارکیٹ میں سینڈل کی دکان تھی۔ چوڑی والے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''خدا کا کرم ہے۔ لوگ تو پاؤں پکڑتے ہیں۔'' جمیل میں دم دبا کر بھاگ نکلے۔ آج چوڑی والے کو خوب منافع ہوا۔

باراتیوں کے لیے گلی کے نکڑ پر کیلوں کے پتوں سے گیٹ تیار کر دیا گیا۔ گیٹ پر ہری لال برقی مرچوں کی لڑیاں جڑ دی گئیں، گھروں میں لڑکیوں نے سولہ کی جگہ اٹھارہ سنگھار شروع کر دیے۔ ثمینہ کی ماں نے آج ثمینہ کو تاکید کی تھی کہ اچھی طرح تیار ہو شاید کسی لونڈے کی ماں بہو کے طور پر پسند کر لے۔'' ثمینہ نے تیاری میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور تیار ہوتے ہوئے سوچتی رہی۔ رشتے تیاری سے طے ہوتے ہیں یا قسمت سے۔

میزبان کے طور پر محلے دار بارات آنے سے ذرا پہلے ہی پنڈال میں جمع ہونے لگے۔ لڑکیاں رنگین تتلیوں کی طرح اِدھر اُدھر تھرکتی پھرنے لگیں۔ لڑکے بھونروں کی طرح منڈلانے لگے۔ طرح طرح کے بے ہودہ گانے اسپیکر کے حلق سے ابلنے لگے۔ محلے کی خواتین ایک دوسرے کے ساتھ غیبت میں مشغول ہو گئیں۔

اچانک ایک جگہ مرد و خواتین کا جھمگٹا لگ گیا۔ قریب جانے پر پتا چلا سائرہ کے پھوپا چمار کی طرح اکڑ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ دھوبی نے استری کرتے وقت پاجامے کا پائنچا جلا دیا تھا۔ سائرہ کے ابا سمجھا رہے تھے۔

''یار تم بھی کمال کرتے ہو۔ غلطی سے جل گیا ہوگا۔ تم میرا کوئی سوٹ پہن لو۔''

''ارے واہ بھئی واہ! ہم کیوں تمہارے کپڑے پہنیں۔ کیا تمہارے محلے میں داماد کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے۔ جان بوجھ کر پاجامہ جلایا ہے کم بخت نے اور تو اور کل تمہاری بیوی نے سب کو بھنا بھنا سالن دیا مگر جب ہماری باری آئی تو لمبا پانی شوربہ آیا ہمارے سامنے۔ جس میں مرغی کے بازوؤں کی ہڈیاں تیرا کی کر رہی تھیں۔ چلو فیروز کی اماں واپس حیدر آباد چلیں۔ یہ عزت ہے تمہارے بھیا کے گھر ہماری۔ اب ہم نہیں رکنے کے یہاں۔'' فیروز کی اماں بھی دوڑ کر عنابی بیگ اٹھا لائیں اور لگیں درجن بھر بچوں کو جمع کرنے۔

''چلو بدبختوں اب تمہارے ماموں کے گھر تمہارے لیے جگہ نہیں۔'' ساتھ میں روتے اوڑھے ہوئے دوپٹے سے آنسو اور ناک صاف کرتی جاتیں۔ عین موقع پر سائرہ آ گئی۔

''کیا ہوا پھوپو! کیوں آنسو اور ناک کے ندی نالے بہائے جا رہے ہیں۔ ارے پھوپا جی آپ کہاں کی تیاری میں ہیں۔ بیٹی کو رخصت کیے بغیر تو ہم آپ کو جانے نہ دیں گے۔ باجی نے تاکید کی ہے کہ میری بارات جب آئے تو پھوپا جی سب سے آگے کھڑے ہوں استقبال کے لیے۔''

جیسے تیسے پھوپا کو منا کر روکا گیا۔

بارات آ گئی، شور شرابہ گانے بچوں بڑوں کی آواز میں نکاح ہوا۔ چھوہارے بٹے۔ بچوں نے سرخ تھیلا اٹھائے چھوہارے بانٹتی خاتون کو گھیر لیا۔ واویلا مچ گیا مجھے بھی۔ مجھے بھی کئی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ نکاح کے فوراً بعد دولہا اسٹیج پر دلہن کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ نکاح کے وقت رات کے پورے بارہ بجے تھے۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ وقت زوال پڑھایا گیا نکاح کتنا کامیاب ہوتا ہے۔ مسکراتے دلہا دلہن مووی اور تصویروں میں مصروف ہو گئے۔ ڈشوں کے ڈھکنے کھلے اور ہلڑ مچ گیا۔

ایک بڑی بی چیخیں۔ ''ارے بھیا کس کا جھگڑا ہوا گیا۔'' پاس کھڑے لڑکے نے تسلی دی۔

''اماں کچھ نہیں ہوا، کھانا کھل گیا ہے۔'' لوگوں کی دوڑیں کھانے کے ٹیبل کے پاس لگیں۔ پلیٹوں میں بریانی سے مقبرے بنائے جانے لگے۔ ڈش میں چمچوں سے بوٹیاں ڈھونڈنے کے لیے ہاکی کھیلی جانے لگی۔ زردے سے ہیرے موتی چھانٹے ہونے لگے۔ پیٹ کم بھرا اور رزق کی بربادی زیادہ ہوئی۔ لگتا تھا اس جگہ کچھ دیر پہلے گھمسان کا رن پڑا ہے۔ پنڈال خالی ہونے لگا۔ رخصتی کا گانا بجا اور سائرہ کی باجی کی شادی اختتام کو پہنچی۔ اچھا یہ ہوا کہ کئی جوان لونڈوں کی ماؤں نے اپنے لیے بہوئیں چن لیں جن میں ایک ثمینہ بھی تھی۔

☆☆☆

شورکوٹ سے تیسری حکایت

جرسی

راحیلہ منظر

اِک دکھیاری ماں کی حسرتوں بھری حکایت

''ایم سوری بابا! اب کتنی بار سوری بولوں میں بھول گئی کہ کل علی کی برتھ ڈے تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے یاد نہیں تھا مجھے یاد تھا۔ کچھ دن پہلے تک لیکن کل بالکل ہی ذہن سے نکل گیا۔ پلیز یار معاف کر دو اصل میں یہ سارا قصور حرا کا ہے وہ آئے دن بیمار ہو جاتی ہے۔ بہت کیئر کرتی ہوں یار لیکن پھر بھی اسے سردی لگ جاتی ہے۔ دو دنوں سے وہ بیمار ہے اور



میرا سارا دھیان اسی کی طرف تھا سو اسی لیے مجھ سے اتنا امپورٹنٹ دن مس ہوگیا۔ بٹ آئی پرومس یار جیسے ہی حرا کے پاپا آفس سے گھر آتے ہیں میں ان سے بات کرتی ہوں اور کل ہی تمہاری طرف آتی ہوں۔'' انیلہ اپنی دوست سے فون پر بات کررہی تھی اچانک اس کی نظر فرش پر پوچا لگاتی کلثوم پر پڑی کلثوم پوچا تو فرش پر لگا رہی تھی مگر اس کا سارا دھیان کہیں اور تھا۔ انیلہ کو تو جیسے موقع مل گیا۔ کلثوم کو ڈانٹنے کا۔

''ارے تمہارا دھیان کہاں ہے؟ ٹھیک سے صفائی کرو، دیکھو یہاں سے فرش بالکل بھی صاف نہیں ہوا۔ میں نے تم سے ہزار بار کہا ہے کام دھیان سے کیا کرو۔ ایک تو تم آتی اتنی لیٹ ہو اور اوپر سے کام میں سستی اور کاہلی دکھا رہی ہو۔''

''وہ میڈم آج میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے بخار ہے۔'' کلثوم اپنے دفاع میں اتنا ہی بول پائی تھی۔ انیلہ نے پھر سے ڈانٹ کر اسے چپ کرا دیا......

''تو میں کیا کروں تمہارے بچے کی طبیعت خراب ہے۔ تمہیں یہاں کام کرنے کے پیسے ملتے ہیں، اپنے دکھڑے سنانے کے نہیں۔ دوبارہ میرے سامنے اپنے یہ دکھڑے بیان نہیں کرنا سمجھیں۔''

کلثوم دوبارہ نم آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ فرش پر پوچا لگانے لگی۔ کلثوم کے کانپتے ہاتھوں کی وجہ تو یخ ٹھنڈا پانی تھا مگر اس کی نم آنکھوں کی وجہ صرف وہی جانتی تھی۔

کلثوم کو انیلہ کے گھر کام کرتے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس کے دو بچے تھے۔ سات سال کی بیٹی اور پانچ سال کا بیٹا جنہیں وہ اکیلے گھر پر چھوڑ کر کام کے لیے آتی تھی۔ کچھ ماہ پہلے تک تو اس نے گھر سے باہر قدم تک نہیں نکالا تھا۔ اس کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک موذی مرض میں مبتلا تھا۔ پر وہ کلثوم سے کہتا جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کام کرنے نہیں دوں گا۔ کلثوم بہت کہتی اسے کام کرنے دو مگر وہ اس کی ایک نہیں سنتا تھا۔ کلثوم کے نصیب میں کام کرنا لکھا تھا سو اسے کرنا تھا۔ ایک دن جب صبح سویرے کلثوم نے اپنے شوہر کو جگانا چاہا تو اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ کھولتا بھی کیسے وہ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سوچکا تھا۔ کلثوم اور اپنے دو بچوں کو بے یارومددگار چھوڑ کر اس دنیا سے جا چکا تھا۔ اس موذی مرض نے اس کی جان لے لی تھی۔ کلثوم کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ یتیم تو وہ پہلے ہی تھی۔ آج وہ بیوہ بھی ہوگئی تھی۔ دوست، احباب، سب رشتہ دار تین دن کے بعد ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب نا چاہتے ہوئے بھی اسے گھر سے باہر قدم نکالنا تھا۔ پیٹ کی بھوک کے لیے اپنے دو بچوں کے لیے اب وہی اس کا سہارا تھے۔ اس گلی کی ایک عورت نے اسے انیلہ کے گھر کام پر لگوا دیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے کام پر آتی تھی تاکہ پیٹ کی بھوک مٹ سکے۔

''او میرے خدایا! یہ عورت آج کل کتنی سست ہوگئی ہے۔ ابھی تک صفائی کا کام ختم نہیں ہوا اور کچن کا کام ابھی باقی ہے۔'' انیلہ کی آواز سنتے ہی کلثوم جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی ورنہ وہ اپنے ماضی میں ہی کھوگئی تھی۔

''اچھا سنو میں حرا کے روم میں جارہی ہوں۔ جلدی سے اس کے لیے دودھ گرم کرکے لاؤ۔ اس کی میڈیسن کا ٹائم ہوگیا ہے اور دیکھو پہلے ہاتھ اچھے سے دھونا جو چند دن سے پہلے میں نے ہینڈ واش لاکر دیا تھا وہ کچن میں ہے یا چرا کر اپنے گھر لے گئی ہو۔''

''نہیں میڈم جی میں چور نہیں ہوں۔ مجھے میرے بیٹے کی قسم میں نے کبھی آپ کے گھر سے کوئی چیز نہیں چرائی۔''

''اچھا او کے او کے! ہر بات پر زیادہ صفائیاں دینا شروع نہ کردیا کرو۔ جلدی سے دودھ گرم کرکے حرا کے روم میں لے کر آؤ۔'' تھوڑی دیر بعد کلثوم دودھ گرم کرکے حرا کے روم میں لے کر گئی۔ اس نے دیکھا انیلہ بہت سے کپڑے بیڈ پر پھیلائے ہوئے ہے اور وہ حرا کو ان سب میں سے ایک پہننے پر آمادہ کررہی تھی اور حرا ان میں سے کوئی بھی سوٹ پہننے پر تیار نہیں تھی کہہ رہی تھی۔

''یہ سب پرانے ہیں نیو چاہیے۔''

''اچھا میری جان ان میں سے ایک پہن لو آج شام کو ہی پاپا ڈھیر سارے نیو کپڑے لاکر دیں گے۔'' یہ سب دیکھ کر کلثوم کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا گال سے بہتا ہوا دوپٹے میں جذب ہوگیا۔ جو اس نے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ اس آنسو کی وجہ کلثوم کے سوا کوئی جانتا تھا تو وہ خدا جو سب کو عطا کرنے والا ہے۔

دودھ دینے کے بعد وہ کچن میں آکر کام کرنے لگی آج وہ کچھ زیادہ ہی کھوئی ہوئی تھی۔ وہ کام تو کررہی تھی لیکن اس کا سارا دھیان کہیں اور تھا۔ پتا نہیں منا سویا ہوگا یا بھوک سے رو رہا ہوگا۔ چھوٹی کو کتنا تنگ کررہا ہوگا۔ کہیں چھوٹی بھی بھوک سے

رونے نہ لگی ہو۔ آج اس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بھوکا چھوڑ آئی تھی اور اب اسے بھی زوروں کی بھوک ستا رہی تھی اور وہ کھانا پاس ہوتے ہوئے بھی ایک نوالہ تک منہ میں نہیں ڈال رہی تھی حالانکہ انیلہ نے اس کہا تھا فریج میں پرسوں کا کھانا پڑا ہے اسے گرم کر کے کھا لے لیکن وہ کیسے کھا سکتی تھی۔ گھر پر اس کے بچے بھوکے تھے۔

صبح سے شام ہوگئی شام کو انیلہ کا شوہر آفس سے گھر آیا انیلہ نے آتے ہی اسے شاپنگ پر جانے کا کہہ دیا۔ انیلہ کا کہنا تھا اسے دوست کے بیٹے کے لیے گرم کپڑے خریدنے ہیں اور کھلونے لینے ہیں اور تو اور حرا کے لیے بھی شاپنگ کرنی ہے کیونکہ حرا نے ہفتہ پہلے لائے کپڑے پہننے سے انکار کر دیا ہے۔ اب سب اس کی پسند سے خریدنے ہیں۔

''او کے بابا چلتے ہیں مگر پہلے مجھے سانس تو لینے دو ایک کپ چائے تو پینے دو۔'' انیلہ نے مسکراتے ہوئے کلثوم کو چائے لانے کو کہا۔ کلثوم نے چائے پہلے ہی تیار کر رکھی تھی وہ جانتی تھی صاحب کے آنے کا ٹائم ہوگیا ہے اس لیے وہ آواز سنتے ہی چائے لے کر آگئی۔ اس نے چائے دی پھر جانے لگی پھر پلٹی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیسے کہے۔

''تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ کیا ہماری باتیں سن رہی ہو۔''

''نہیں میڈم جی وہ میں وہ......''

''یہ کیا وہ وہ میں میں لگا رکھی ہے اور کیا آج تمہیں گھر نہیں جانا۔ چلو چھٹی کرو اور اپنے گھر جاؤ اور سنو تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا آج۔ فریج میں ویسے کا ویسا ہی پڑا ہے۔ چلو ایسا کرو جاتے وقت سارا کھانا لے جاؤ اگر ایک دن اور فریج میں پڑا رہا تو کھانے کے ساتھ فریج سے بھی بدبو آنے لگے گی۔'' کلثوم نے ہمت کی اور بولی۔

''وہ میڈم جی کچھ چاہیے تھا۔''

''کیا اب اور کیا چاہیے۔'' انیلہ نے اپنا سارا دھیان کلثوم کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ میڈم میرا چھوٹا سا بیٹا ہے اسے بہت سردی لگتی ہے۔ اس کے لیے ایک جرسی چاہیے۔ وہ حرا میڈم کی ہے نا۔ پھٹی ہوئی وہ دے دیں میں گھر جا کر سی لوں گی۔''

☆......☆

کلثوم بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی گھر کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ وہ آج گھر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اسے جانا تھا گھر اور سامنا کرنا تھا اپنے بیٹے کا۔ وہ سوچ رہی تھی گھر جا کر بیٹے سے کہوں گی میڈم جی نے کہا ہے وہ کل کو ضرور اسے جرسی دے دے گی۔ یہ جھوٹ وہ خود سے بول رہی تھی سچ وہ تھا جو کچھ دیر پہلے وہ سن آئی تھی۔

''ابھی ہفتہ پہلے ہی تمہیں حرا کے شوز دیے ہیں پھر ایک دن تمہاری بیٹی کے لیے فراک دی حرا کی اور اب تمہیں بیٹے کے لیے جرسی چاہیے تمہیں کیا لگتا ہے میں نے کوئی دکان کھول رکھی ہے جہاں سے چیزیں اٹھا کر تمہیں دیتی جاؤں گی۔ اب ہرگز کوئی چیز نہیں ملے گی۔ ایک چیز کیا دے دی سر پر چڑھ گئی ہو۔ کام دھیان سے کرتی نہیں ہو۔ کبھی تمہاری بیٹی بیمار ہوتی ہے۔ کبھی تمہارا بیٹا۔ روز کام پر بہت لیٹ آتی ہو۔ پیسے تمہیں پورے چاہیے ہوتے ہیں۔ تم نے سمجھ کیا رکھا ہے خود کو کہ روز روز مانگتی جاؤ گی اور میں دیتی جاؤں گی۔ خبردار اگر آج کے بعد کوئی چیز مانگی تو کام سے چھٹی کروا دوں گی۔ پہلے ہی میں بہت تنگ ہوں تمہارے ان روز روز کے ڈراموں سے۔''

''گھر کی دہلیز کے باہر وہ دو منٹ رکی اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور ہمت کر کے اندر داخل ہوگئی جہاں سامنے ہی اس کا بیٹا اور بیٹی اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کلثوم نے جاتے ہی اپنے بیٹے کو گلے لگایا جو ابھی بھی بخار میں تپ رہا تھا۔ اس نے کلثوم کی گود میں آتے ہی اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ صبح جاتے وقت کہہ گئی تھی۔ آج اس کے لیے جرسی ضرور لائے گی۔ کلثوم نے بیٹے سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔'' بیٹا خوش ہوا سمجھا ماں جرسی لائی ہے لیکن جب اس نے ماں کو پلو کے نیچے سے روٹی نکالتے دیکھا تو اس کی ساری خوشی غائب ہوگئی۔ آنکھوں میں پھر سے اداسی چھا گئی۔ دن بھر محنت کر کے، ڈانٹ سن کر، بے عزت ہو کر، وہ دو دن کا باسی سالن اور روٹی لائی تھی۔ دکھیاری ماں سمجھی تھی روٹی دیکھ کر بچہ خوش ہو جائے گا جو پیٹ کی بھوک مٹے گی تن کی بھوک بھول جائے گا لیکن دن بھر کے بھوکے بچے نے کہہ دیا۔

''ماں سردی لگتی ہے۔ روٹی نہیں جرسی چاہیے۔''

☆......☆

کوہاٹ سے چوتھی حکایت

خوامخواہ

سید ملازم حسین شیرازی

اِک ایسی حکایت جس میں نیکی خوامخواہ گلے پڑ گئی تھی

یہ قصہ ان دنوں کا ہے جب میں گورنمنٹ کے ادارے کراچی میں ملازم تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایس ایم لاء کالج میں زیر تعلیم تھا۔ میرے آفس اوقات صبح سات بجے سے دوپہر دو بجے تھے۔ میں پارٹ ٹائم ایک ٹریولنگ / ریکروٹنگ ایجنسی میں ان کا اکاؤنٹ مینٹین کرتا تھا جس کا دفتر بالمقابل میٹرو پول ہوٹل تھا۔ ساڑھے پانچ سے آٹھ بجے لاء کالج پاکستان چوک کلاسز اٹینڈ کرتا تھا۔

زندگی بہت مصروف تھی اور میں دن رات اس بھاگ دوڑ اور تگ ودو میں لگا رہتا تھا جس میں دل بھی لگا ہوا تھا۔

میری رہائش جناح کورٹس (ڈاکٹر ضیاء الدین روڈ) میں تھی۔

ایک دن ہاسٹل میں تین نوجوان ملنے آئے۔ ان کا تعلق سوات سے تھا۔ دراصل میری کزن سوات گرلز کالج میں لیکچرار تھیں اور ان میں ایک بنام نیاز ولی مذکورہ کالج میں کلرک تھا اور باقی اس کے دوست انٹر کر کے روزگار کی تلاش میں تھے۔

وہ میری کزن کا خط اپنے ساتھ لائے تھے جس میں میری کزن نے لکھا تھا کہ نیاز ولی اور اس کے دوست بغرض نوکری بیرون ملک جانا چاہتے ہیں ان کی مدد کریں اور ان کے باہر جانے میں تعاون کریں۔

میرے استفسار پر نیاز ولی نے بتایا کہ ”ہماری گھریلو پریشانیاں ہیں۔ لوگ آج کل باہر جارہے ہیں اگر آپ کی معرفت ہمارا کام ہو جائے تو احسان ہوگا۔“

میں نے انہیں بتایا۔ ”آج کل میں امتحانات کی وجہ سے چھٹی پر ہوں۔ ریکروٹنگ ایجنسی میں پارٹ ٹائم جاب کرتا ہوں اس کے مینجر ربانی صاحب سے بات کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔“

میں نے دوسرے دن ربانی صاحب کو صورت حال بتائی۔ بقول ان کے الدمام سعودی عرب میں کچھ آسامیاں ہیں۔ مذکورہ اشخاص بھیجے جاسکتے ہیں۔“

میں نے دوسرے دن تینوں کو ربانی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے ملاقات کر کے مجھے بتایا کہ ان کا کام ہو جائے گا اس سلسلے میں تیس ہزار روپے برائے ویزاجات وغیرہ ادا کر دیتے ہیں۔ (اس وقت

کے تیس ہزار آج کے تین لاکھ کے برابر تھے)۔
''ربانی صاحب نے دو ماہ کا وقت دیا ہے اس عرصے میں دستاویزات وغیرہ تیار ہوں گی۔''
اس کے بعد وہ تینوں واپس سوات چلے گئے۔
اب ان کا بالواسطہ تعلق ربانی صاحب سے تھا۔
تین ماہ بعد مجھے اپنے بھائی کی شادی کے لیے ڈیرہ جانا پڑا۔ میں نے دفتر سے پندرہ روز کی چھٹی لی تھی۔ ڈیرہ میں مہمان وغیرہ آتے تھے۔
شادی میں بہت مصروفیات تھیں۔ میں اس وقت بہت حیران ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ نیاز ولی وغیرہ ڈیرہ پہنچے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی دعا سلام کے بعد میں نے پوچھا۔
''نیاز ولی! آپ لوگ یہاں؟ آپ لوگوں کو تو سعودیہ ہونا چاہیے تھا؟ خیریت؟''
''سر آپ کی معرفت ربانی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے ویزوں کی بابت تیس ہزار روپے لیے تھے۔ دو ماہ کا وقت دیا تھا۔ تین ماہ گزرنے کے بعد سوات سے کراچی گئے۔ پتا چلا کہ وہ 20 آدمیوں سے پیسے لے کر فرار ہو گیا ہے۔'' نیاز ولی نے بتایا۔
''بہت افسوس ہوا لیکن یہاں میرے پاس آمد؟'' میں نے پوچھا۔
''ہمارا ان سے کوئی تعارف نہ تھا۔ آپ ہی نے ملایا تھا۔ آپ کی معرفت پیسے دیئے تھے۔ چونکہ آپ ضامن تھے وہ بھاگ گیا تو آپ سے رقم واپس لینے میں حق بجانب ہیں۔'' نیاز ولی بولا۔
''یہ تو نہایت غیر مناسب بات ہے۔ میرا تعلق تو صرف یہ تھا کہ میں نے ان سے ملایا۔ آپ لوگوں نے کب پیسے دیئے، کتنے دیئے، آپ لوگوں کے درمیان کیا شرائط طے ہوئیں، کیا معاہدہ طے پایا؟ اس میں میری گواہی یا کسی قسم کی ضمانت کا ذکر ہے؟'' میں نے نیاز ولی سے پوچھا۔
''میں تو آپ لوگوں کی Deal سے لاعلم



پیرو مرشد

جب سے یہ دنیا بنی ہے تب سے حضرت آدم کو اپنی ہدایت کے لیے ایک پیر کی ضرورت رہی ہے۔ اسی پیر و مرشد کے رشتے سے ہدایت کے سر چشمے بہے۔ اور اب تک لوگ اُن باتوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ازل سے ابد تک پھیلے اس سلسلے کو بہت جلد ہم آپ کے روبرو لا رہے ہیں۔ اک ایسے پیر و مرشد کی داستانِ حیرت' جو کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکے لیکن اُن کے درمیان رابطے کا پُل اِک آدھی ملاقات ہوتی تھی۔ مرشد نے اپنے پیر سے زندگی کے ہر مسئلے کے حل کے لیے خط و کتابت روا رکھی۔ اُن خطوط سے جڑا 'سچا سلسلہ' جو یقیناً ہماری راہنمائی کرے گا۔ پیر و مرشد کے سچے خطوط سے مزین یہ ایمان افروز سلسلہ بہت جلد...... آپ سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

ہوں۔ پھر مجھ سے مطالبہ کیوں؟''

نیاز ولی اور اس کے دونوں دوست کہنے لگے۔

''ہم لوگ غریب ہیں کوئی آسرا نہیں، گھر والے بہت پریشان ہیں آپ ہی کوئی حل نکالیں۔''

اس کی باتیں سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ ایک تو میرا شہر تھا، وہ میرے مہمان تھے۔ دوسرا میرے بھائی کی شادی کی تقریب تھی۔ میں تو کراچی اچھے مستقبل کی خاطر گیا تھا اور یہ کیسی افتاد آن پڑی۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوا تو بہت بدنامی ہو گی۔

میرے گھر والے یہ سن کر بہت فکر مند ہوئے۔ والدہ صاحبہ نے پوچھا تو میں نے انہیں تفصیل بتائی۔ وہ فرمانے لگیں۔

''تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ پیسا آنی جانی چیز ہے، عزت سب سے بڑی ہے، کسی طرح پیسوں کا انتظام کر کے ان لوگوں کو فارغ کرو، اللہ پاک خیر کرے گا۔''

میرے گھر کے آگے ایک کنال کا پلاٹ تھا اسے علاقے کے لوگ خریدنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کئی بار کہہ بھی چکے تھے لیکن ہمارا بیچنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اب یہ مصیبت آئی تو مجبوراً بیچنا پڑا۔

چالیس ہزار روپے میں سودا ہوا۔ تیس ہزار روپے ان کے حوالے کر دیئے۔ میں بہت خفا تھا۔ شادی کی ساری خوشیاں پھیکی پڑ گئی تھیں۔ وہ لوگ پیسے لے کر سوات روانہ ہو گئے۔

میں پندرہ دن بعد کراچی روانہ ہو گیا۔ وہی دفتر کالج کی مصروفیات۔ دو ماہ بعد میرے دفتر کے ایڈریس پر نیاز ولی کی طرف سے لکھا گیا ایک خط موصول ہوا۔ خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا لکھا تھا۔

''سر میں اس وقت سوات اسپتال سے نہایت شرمندگی سے خط لکھ رہا ہوں۔ ڈیرہ سے پشاور روانہ ہوئے۔ کوہاٹ کی پہاڑیوں کی بلندی سے ہماری کوچ موڑ کاٹتے ہوئے ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گئی۔ ٹائی راڈ ٹوٹ گیا تھا۔

دو ہزار فٹ کی بلندی سے کوچ پتھروں سے ٹکراتی ہوئی پاش پاش ہو گئی۔ نتیجتاً سات آدمی موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ میری دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ میں ٹانگوں سے معذور ہو گیا۔ میرے دونوں ساتھی شدید زخمی ہوئے۔ وہ بھی اسپتال میں داخل ہیں۔ لوگوں کا سارا سامان بکھر گیا۔ کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ خط لکھوں۔ اپنی زیادتی معافی مانگوں۔ ہم نے غلط کیا، آپ نے ایک ہی دن میں جائیداد اونے پونے بیچ کر ہمیں فارغ کیا لیکن قدرت کو ہماری زیادتی پسند نہ آئی۔ حادثہ ہوا اور اب ساری عمر کے معذور ہو گئے۔ ہو سکے تو معاف کر دیں۔''

خط پڑھ کر میں بہت رنجیدہ ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ ''میں نے کوئی بددعا نہ کی تھی۔ شاید آپ کے مقدر میں ایسا لکھا تھا۔ اللہ پاک آپ لوگوں کو صحت دے۔'' بعد میں پتا چلا کہ ربانی صاحب کا انقرہ ترکی میں بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ موقع پر ہلاک ہو گیا تھا۔ لوگوں سے ہتھیائے گئے پیسوں کا پتا نہ چلا۔ پاکستانی سفارت خانے نے اس کی لاش بعد از شناخت کراچی بھجوائی تھی اور یوں یہ واقعہ میری یادوں میں ثبت ہو گیا۔

☆☆☆

رب نے بنائی جوڑی

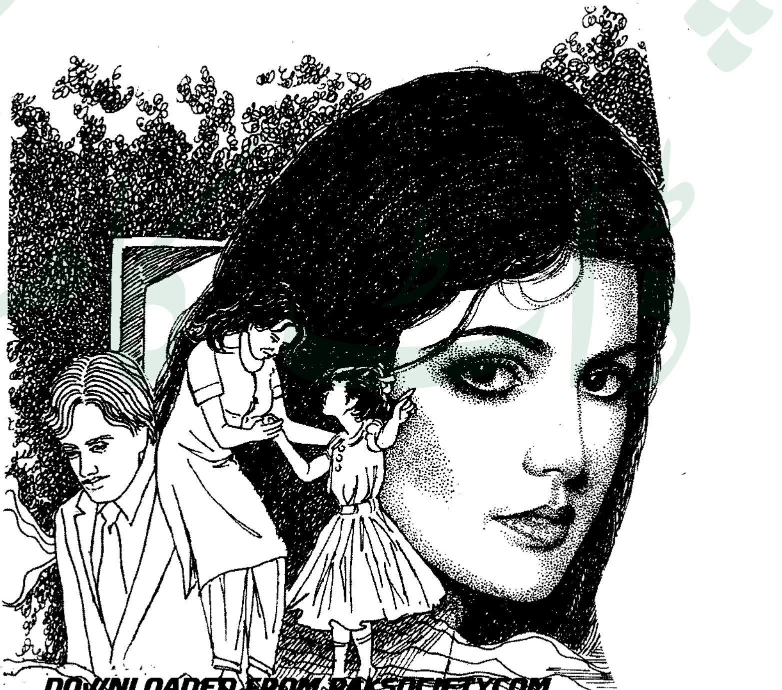


الماس فاطمہ ارمان

اُس کرموں جلی کی حکایت، جو تن کی کالی مگر من کی پارس تھی

جموں کا اصل نام جمیلہ تھا۔ آج وہ بڑی فرصت سے بیٹھی ریڈیو پر گانا سن رہی تھی۔
میں کالا جوڑا پایا تیری فرمائش تے۔

اتنے میں جموں کی ماں ہاجرہ کھیتوں سے تھکی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔
''اوئے کلموہی ایک تو آپ کالی ہے، دوجا کالا جوڑا



پہننے کی فرمائش تجھ سے کس نے کر دی۔''
''ماں تو کیوں اے باتیں کرتی ہے میں تو شوق سے گانا سن رہی ہوں۔''
''اچھا چل میرے واسطے ٹھنڈا پانی لا۔'' جموں نے ماں کو پانی پلایا۔
''تُو نے ڈنگروں کو پانی چارا ڈالا۔''
''اماں روز ہی ڈالتی ہوں۔ سب کو چارا پانی ڈال دیا ہے۔ اوپلے بھی تھاپ کر دیے۔'' ہاجرہ نے غور سے بیٹی کو دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر بولی۔
''ارے کلموہی تیرا رنگ کالا ہے تو کیا ہوا صاف ستھرے کپڑے پہن کر کریم کا جل لگا کر رہا کر دیکھ اور لڑکیاں خود کو کتنا بنا سنوار کر رکھتی ہیں۔''
''بس کر اماں کتنا بھی کریم پوڈر تھوپ لوں ہوں گی ویسی ہی جیسا رب نے بنایا ہے۔''
''تیرے سے تو بات کرنا بیکار ہے۔ تو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی۔''
''تو گلا گھونٹ دیتی۔'' ''کیوں پال پوس کر بڑا کیا۔'' جموں کو بھی غصہ آ گیا اس نے ماں کی طرف دیکھا جو کافی اداس نظر آ رہی تھی۔
''اماں میری سیپارے کی استانی جی کہتی ہیں انسان کی تربیت میں عاجزی کا عنصر ہو، اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت ہو، اچھے اعمال ہوں تو سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ سب کو ایک ہی رب نے بنایا ہے، کسی کو کمتر کم شکل نہیں سمجھنا چاہیے۔''
''تیری استانی بہت اچھی ہیں مگر پتر یہ دنیا بڑی جھلی ہے۔ دیکھ تیری دوسری بہنوں کی شادی ہو گئی ہے۔''
''اماں جو میرا نصیب ہے اللہ توکل ہے، جو اس کی مرضی ہے تو وہ میرے بھاگ ضرور کھولے گا۔ ورنہ تیرا کیا جا رہا ہے۔ تیری، بابا کی سب کی خدمت کرتی ہوں۔ ایک بیٹا بن کر گھر کا بوجھ کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ جانور کو ندی پار چرا کر لاتی ہوں۔ مشین پر چارا کاٹتی ہوں، بابا کے ساتھ بھٹی پر برتن بناتی ہوں تو میری شکل کو روتی رہتی ہے۔''
اسے کبھی ماں کے ناروا سلوک کا دکھ ہوتا جب وہ پیدا ہونے والی تھی تو ہاجرہ نے سچل سائیں کے مزار پر جا کر بیٹے کے لیے دعا مانگی تھی مگر یہ کیا جب وہ دنیا میں آئی تو اس کی ماں کو بے حد ناگوار گزرا۔ ہاجرہ کی ساس نے اس کا بہت مذاق بنایا۔
''ارے موئی کیا کوئلے کھائے تھے جو اتنی کالی کلوٹی پیدا کی ہے۔'' وہ سارا دن کپڑے کے جھولے میں پڑی روتی رہتی جب ہاجرہ کی ممتا کو احساس ہوتا تو وہ اسے دودھ پلا دیتی۔ وقت گزرتا گیا۔ ہوش سنبھلتے ہی وہ گائے بھینس بکریاں چرانے ندی چلی جاتی۔ گھر سے نکل کر اسے سکون ملتا وہ کھیت کھلیان ندی وغیرہ کی خوبصورتی میں کھو جاتی مگر اداس ہو جاتی۔
''اے ربا! میں نے کیا بگاڑا تھا مجھے بھی اس ندی ہریالے سے تھوڑی سی خوب صورتی دے دیتا۔''
کچھ دنوں سے جموں کو لگ رہا تھا کہ کھیتوں میں کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے مگر جب پلٹ کر دیکھتی ہے تو غائب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا وہم سمجھ کر آگے بڑھ جاتی مگر وہم نہیں تھا یہ سچ تھا۔ وہ کالو تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے نانی کے پاس رہتا تھا۔ وہ ایک آنکھ سے کانا تھا۔ کسی نے غلیل سے اس کی آنکھ پر پتھر مار دیا تھا۔ نام اس کا کالو تھا مگر وہ کالا نہیں تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا مگر وہ کانا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے کالو نے جموں سے کہا میں اپنی نانی کو تیرے گھر بھیجوں گا۔ اب میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا کالو نے سچ کر دکھایا نانی نے بہت کہا تو کانا ہی تو ہے پر دیکھ تجھے وہی چنگی مل سکتی ہے۔''
''نانی میں نے فیصلہ کر لیا میں جموں سے شادی کروں گا۔ وہ کالی ہے تو کیا ہوا وہ سیرت میں اچھی ہے میرا دل اس سے مل گیا ہے۔ تو نے کبھی دیکھا نہیں غور سے اس کا ناک نقش کتنا پیارا ہے تو صورت پر مت جا مجھ میں ایسا کیا ہے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کبھی مزدوری مل گئی تو کام کر لیا ورنہ فاقہ مستی۔ وہ میرے ساتھ ہر حال میں خوش رہ سکتی ہے۔''
نانی کو یہ بات دل کو لگی وہ دوسرے ہی دن جموں کے گھر پہنچ گئیں۔ ہاجرہ حیران تھی اور اللہ کے مہربان ہونے پر خوش۔ رشتہ قبول کر لیا تھا۔ ابا نے جموں کو جہیز میں ایک گائے ایک بھینس بکری اور بکرا دیا۔ اس کے علاوہ ایک گدھے کے ساتھ گدھا گاڑی بھی بنوا کر دی

تا کہ وہ اس سے اپنی روزی کما سکے۔

☆......☆

جموں کی زندگی کا خاص دن آگیا بہنوں نے ابٹن بکری کے دودھ میں ڈال کر گلاب چنبیلی کے تیل کا چھینٹا مار کر خوب گھس گھس کر لگایا گیا تھا۔ ہاتھ پیروں میں تھوپ تھوپ کر مہندی لگائی تھی۔ جموں نے خوب روپ نکالا دلہن کو ساٹن کے گوٹے لگے لال سوٹ میں رنگین پٹیوں کے سرخ پلنگ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہی بچے اور سکھیاں اس کو کلو کہہ کہہ کر پکارتی تھی۔ دلہن کو دیکھنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے سرخ کجاوے اور پھولوں سے کلو نے گدھا گاڑی کو سجا رکھا تھا۔ خود بھی بنا سجا دولہا تھا۔

جموں بابل کا گھر چھوڑ کر پیا کے گھر روانہ ہوگئی ہاجرہ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ آج وہ رو رہی تھی۔

''پتر مینوں معاف کر دینا۔ میں نے تیرا بہت دل دکھایا ہے۔''

نانی بھاگی خوش تھی۔ اس کو ایک نیک بہو چاہیے تھی جو اسے مل گئی۔ جموں نے ایک بار پھر سہاگ رات میں گھونگھٹ تلے کالو کو جیت لیا۔

دن بھر گھر کے کام کاج کرتی ڈھور ڈنگر کو سنبھالتی۔ شام نانی بھاگی کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ پیر بھی دباتی۔ شام ڈھلے کالو بھی آ جاتا۔ تینوں مل کر کھانا کھاتے پھر جموں اس کی خدمت میں لگ جاتی۔ اس کا سر دباتی جسم دباتی وہ لاکھ منع کرتا وہ نہیں مانتی اس طرح ہنسی خوشی وقت گزرتا گیا۔ نانی بھاگی بس پوتا یا پوتی چاہتی تھیں وہ اکثر کالو سے کہتی کہ سچل سائیں کے مزار پر جا کر دعا مانگ مگر پورا اڑھائی سال گزر گیا کالو نانی کو سمجھاتا نانی جب اللہ کو منظور ہوگا ہو جائے گی۔

جموں کے گھر اولاد تو نہ ہوئی اس کی مانگ اجڑ گئی۔ کالو شہر سے آرہا تھا راستے میں گدھا گاڑی ٹرک سے ٹکرا گئی وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ جموں کی دنیا اجڑ گئی نانی نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔

جموں نے اس بوڑھی جھکی ہوئی کمر والی نانی کو اپنے سینہ سے لپیٹ لیا۔ ''نانی چپ ہو جائیں میں تجھے کالو کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔''

اس نے بہت حوصلے سے کام لیا۔ نانی بھاگی کو سنبھالا۔ ماں نے بہت کہا۔ ''گھر واپس چل۔''

''نہیں اماں یہ ہی میرا گھر ہے۔''

وہ دن رات نانی بھاگی کی خدمت کرتی۔ گائے بھینس کا دودھ نکال کر آس پاس کے لوگوں میں بیچ دیتی۔ اس نے باپ سے مٹی کے برتن گملے مٹکے وغیرہ بنانے سیکھے تھے اس نے بھی بھٹی بنوائی اور کچھ بچوں کو اپنے ساتھ اجرت پر لگایا دن رات کی محنت سے اس نے بہت اچھا کاروبار جما لیا۔ برتنوں پر نقش و نگار کر کے لڑکوں کو دیتی لڑکے شہر جا کر فروخت کرتے جس سے اچھی کمائی ہو جاتی۔ کچے گھر کو اس نے اونچا کر کے پکا بنا لیا خالی جگہ پر سبزیاں اگائیں، گائے بھینسوں کا چارا بھی لگایا نانی سارا دن کھیتی باڑی میں لگی رہتی جس سے ان کا دل بھی لگ گیا۔

نانی کی منہ بولی بیٹی کے گھر جڑواں بچے ہوئے تو اس کی موت واقع ہوگئی۔ دونوں بیٹے تھے ایک بچہ چار دن بعد مر گیا دوسرا بچہ زندہ تھا مگر بہت کمزور اور لاغر۔ نانی نے اس بچے کو جموں کی گود میں ڈال دیا۔ اس منہ بولی بیٹی کے میاں نے بھی خوشی سے بچہ دے دیا۔

جموں نے نانی کو منع کیا۔ ''نانی یہ بڑا ہو جائے گا تو واپس مانگ لے گا۔ اس کا مجھے دکھ ہوگا میں ابھی کالو کا دکھ نہیں بھول پائی۔''

''نہیں پتر اس کا کوئی بھی نہیں جو اس بچے کو پالے گا۔ یہ کاغذ پر لکھ کر دے رہا ہے۔''

جموں نے گاؤں کے بڑوں کو بلا کر لکھا پڑھائی کر کے بچے کو گود لے لیا۔ نانی کے ساتھ ساتھ جموں بھی قدرت کی اس مہربانی پر خوش تھی۔ بچے کا نام اس نے اللہ رکھا، رکھا وہ اکثر جب اداس ہوتی، اسے کلو یاد آتا وہ اللہ رکھے کو گود میں لے کر چادر کا بکل بنا کر پھولوں کی سوغات لے کر شہر خموشاں کی جانب چل پڑتی اور پھر اس کی قبر پر جا کر ڈھیروں آنسو بہاتی اپنے دل کی بھڑاس نکال کر سورۃ یسین پڑھتی پھر اپنی منزل کی جانب چل پڑتی۔ زندگی کا مقصد اب یہی بچہ تھا۔

☆☆☆

شرارت

فرح انیس

اُس شخص کی حکایتِ عجب، جو جانوروں کو تنگ کرتا تھا

''جاؤ یہاں سے چلے جاؤ میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ آدمی سامنے کھڑے کتے کو دیکھ کر بدحواس ہوئے چیخ رہا تھا۔

میں ٹرین کے انتظار میں بیٹھا وقت گزاری کے لیے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے کسی کام کے سلسلے میں لاہور جانا تھا کہ اچانک میرے برابر بینچ پر بیٹھا شخص پاس کھڑے کتے کو دیکھ کر زور زور سے چیخنے لگا اس کے اس طرح سے چیخنے پر بہت سے لوگ اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے نیچے پڑا پتھر اس کتے کو مارا جس سے وہ کتا بھاگ گیا۔

''بہت شکریہ تمہارا۔'' وہ آدمی مجھے دیکھ کر ممنون لہجے میں بولا۔ ''آپ کو کیا بہت ڈر لگتا ہے کتوں سے؟''

میرے سوال پر وہ چپ سا ہو گیا۔

''مجھے کتے، بلی کو دیکھ کر وحشت کا احساس ہوتا ہے حالانکہ پہلے ایسا نہ تھا وہ کہتا ہوا ماضی کی وادیوں میں کھوتا چلا گیا۔

☆......☆

''میرا نام نادر ہے۔ میں بچپن سے ہی بہت چلبلے مزاج کا تھا۔ پر میری ایک ایسی عادت تھی جس سے میرے گھر والے بھی عاجز تھے اور وہ تھی کتے بلیوں کو ستانے کی۔ میں اپنی حرکتوں سے کتے، بلیوں کو پریشان کر دیا کرتا تھا۔ اب اسے میری عجیب و غریب عادت کہہ لیں کبھی انہیں پتھر مارنا کبھی بری طرح سے بلی کی دم مروڑ کے اس کی تکلیف پر مزہ لینا۔ مجھے میری اس حرکت پر گھر والوں اور دوستوں کی ڈانٹ بھی پڑا کرتی۔ پر میں اپنی ڈھٹائی سے باز نہ آیا میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ حرکت میرے لیے کتنی پریشانی لائے گی۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں پندرہ برس کا تھا۔ گھر کے قریب ہی ایک اسٹیشن تھا۔ ہم سب دوست رات میں اپنے گھر کے پاس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ عموماً پلیٹ فارم رات میں سنسان ہوا کرتا تھا۔ اس رات بھی ہم باتیں کرتے ہوئے پلیٹ فارم سے واپس گھر کی طرف آ رہے تھے کہ راستے میں کھڑی بلی دیکھ کر مجھے شرارت سوجھی اور میں نے جھک کر اس بلی کی زور سے دم مروڑ دی کہ وہ تکلیف سے چیخنے لگی۔ ''یار نادر کیا کر رہا ہے۔ انسان بن، جاندار ہے اس کو بھی درد ہو رہا ہوگا۔'' میرا دوست مبین بولا۔ باقی دوست بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ میں نے ہنستے ہوئے اس کی دم چھوڑ دی۔ میرے دم چھوڑتے ہی وہ تیزی سے بھاگ گئی۔

یہ کوئی دو سے تین دن بعد کی بات ہے کہ رات کے وقت میں گھر کی طرف واپس آ رہا تھا جونہی میں نے اپنی گلی میں قدم رکھا اچانک مجھے پیچھے سے کسی نے کندھوں سے جکڑ لیا۔ مجھے اپنے کندھوں پر محسوس ہوا جیسے پنجے ہو پھر مجھے کچھ یاد نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ جب میری آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اس راستے پر پایا جہاں میں نے اس بلی کی دم کو مروڑا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر وہ بلی کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ میں اٹھ کر سرپٹ دوڑا۔ گھر کی جانب۔ گھر میں داخل ہوا تو سب مجھے دیکھ کر

اکٹھے ہو گئے۔ امی نے روتے ہوئے بتایا کہ پوری رات گھر والے میری تلاش میں نکلے رہے۔ یعنی میں جب گلی میں داخل ہوا تھا تو ایک بج رہا تھا اور اب صبح کے چھ بج رہے تھے۔

☆......☆

اس واقعے کے بعد میں بہت زیادہ بلیوں سے محتاط ہو گیا۔ ہم دوستوں کے انٹر کے پیپرز ہوئے اور ہماری چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ ہم فارغ تھے ہم سب دوست ہفتے کی رات پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور خوب ہنسی مذاق میں لگے ہوئے تھے۔ کسی ٹرین کے آنے کا وقت بھی نہ تھا تو خاموشی ہی تھی۔ ہنسی مذاق میں ہم چھ دوستوں کو پتا بھی نہیں چلا اور دو بج گئے کہ ہمارے پاس ایک کتا آ کھڑا ہوا۔ اس کتے کو دیکھ کر میرے منہ سے نکلا۔

''ابے ننگا کیوں کھڑا ہے جا کپڑے پہن کر آ۔''

میری اس بات پر میرے دوستوں کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔ میرے برابر بیٹھا امجد بولا۔ ''اچھے کپڑے پہن کر آنا۔''

پھر ہم دوست اپنی باتوں میں لگ گئے۔ وہ کتا بھی جا چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا دوست مبین بولا۔ ''نادر یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟'' اس کے کہنے پر میں اور میرے دوست اس اجنبی شخص کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''کون ہو بھائی؟'' اس کو اپنے برابر بیٹھا دیکھ کر میں پوچھنے لگا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ کپڑے پہن کر آؤ، دیکھو میں آ گیا اور اچھے پہن کر آیا ہوں ناں۔'' وہ اب امجد کو دیکھ کر بولا۔

اس کی بات پر تو ہماری حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کہ مبین چیخ کر بولا۔ ''بھاگو یار۔''

ہم لوگوں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے ہم دوستوں نے پیچھے مڑ کے دیکھا کہ کہیں وہ آدمی ہماری طرف تو نہیں آ رہا مگر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس بینچ پر اس آدمی کی جگہ وہ کتا بیٹھا تھا۔ یہ واقعہ برسوں ہمارے ذہنوں میں بسا رہا۔ اس واقعے نے ہمارے ذہنوں پر بہت اثر کیا تھا۔ پھر وقت گزرا اور میری شادی ہو گئی۔ میں دو بچوں کا باپ بن گیا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ میں جس عمارت میں رہائش پذیر تھا اس کے نیچے دودھ کی دکان تھی میری اس دودھ والے سے اچھی سلام دعا تھی۔ اکثر میں بیٹھ بھی جاتا تھا۔ میرا فلیٹ تیسرے فلور پر تھا۔ ایک شام آفس سے آتے ہوئے میں دودھ والے سے باتیں کرتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے زبردستی پیالے میں دودھ ڈال کر مجھے پکڑا دیا۔ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے وہ پیالہ لبوں سے لگا لیا کہ اچانک ایک کتا جس کے منہ پر گہرا زخم تھا مجھے دودھ پیتا دیکھ کر بھونکتے ہوئے مجھ پر جھپٹنے لگا۔ اس کتے کو دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ بیتا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔ میں اسے ہٹانے لگا۔ پر وہ بھوکا تھا اور دودھ پینا چاہ رہا تھا۔ دودھ والے نے پتھر اٹھا کے اسے مار دیا جس پر وہ ہٹ گیا۔ میں پیالہ اس دودھ والے کو دے کر اوپر چلا آیا۔ اس رات میں سویا تو مجھے لگا کوئی مجھے گھسیٹ رہا ہے۔ صبح آنکھ کھلی تو بہت سے لوگوں کو خود پر جھکا پایا۔ میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی تو میں پلیٹ فارم پر تھا میں کس طرح سے یہاں آیا مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے محلے کے لوگوں نے بتایا کہ میں یہاں بے ہوش پڑا تھا۔

میرے بیوی بچوں کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ میرے ساتھ تین رات چلا میں سوتا اور صبح پلیٹ فارم پر لوگوں کو ملتا۔ میری بیوی نے بتایا کہ ان تین راتوں میں اس نے میری جگہ پر کتے کو دیکھا۔ ہم حیران تھے کہ تیسرے فلور پر کتے کا کیا کام۔ بیوی کی بات پر میں چونکا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ''کیا اس کتے کے منہ پر گہرا زخم تھا؟''

اس نے بتایا۔ ''ہاں زخم تھا۔'' میں نے گھر سے برتن اٹھایا اس میں دودھ بھرا اور نیچے چلا آیا۔ وہ کتا میری عمارت کے نیچے ہی کھڑا تھا۔ میرے برتن رکھتے ہی وہ پینے لگا پھر چوتھی رات میرے ساتھ ایسا کچھ نہ ہوا۔ مجھے لگتا ہے جو میں نے بچپن میں کتے بلیوں کو ستایا ہے اس کی سزا ملی ہے مجھے۔ اتنا وقت گزر گیا اب بھی میں کتا بلی دیکھتا ہوں ڈر جاتا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ ٹرین آ گئی تھی اور ہم دونوں اس کی جانب بڑھ گئے۔ آج بھی نادر کے ساتھ بیتے واقعات یاد کر کے میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی ہے۔ سچ ہے خدا کی مخلوق کسی بھی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ کبھی ہمیں ناحق کسی جانور کو بھی ستانا نہیں چاہیے۔



بہاول پور سے ساتویں حکایت

تم بن آنگن سُونا

سلمیٰ سید

ماں کی یادوں سے جڑی ایک بیٹی کی دکھی حکایت

دنیا میں بہت سے رشتے ہوتے ہیں۔ جن سے ہمارا اپنائیت اور محبت کا تعلق ہوتا ہے لیکن ان سب رشتوں میں سب سے افضل رشتہ ماں کا ہوتا ہے جو بے لوث اور بے غرض ہوتا ہے۔ جو ہمیں ہماری غلطیوں اور خامیوں کے باوجود پیار کرتی ہے۔ ہمارے لیے دعا گو رہتی ہے۔ باقی رشتے غرض کے ہوتے ہیں اگر آپ سے ان کو نبھانے میں زرا سی غلطی ہو جائے یا آپ ان کی توقعات پر پورا نہ اتریں تو تعلق ٹوٹنے میں لمحہ نہیں لگتا۔ کسی نے سچ کہا ہے ماواں ٹھنڈیاں چھاواں آج جب امی کو بچھڑے پورے نو ماہ ہو گئے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ختم ہو گئی ہو۔ ہر چیز ان کی یاد دلاتی ہے۔

میری امی کا تعلق برما (رنگون) سے تھا۔ سرو قد، گلابی چہرہ، گھنے بال اور اس پر سادگی اور بھولپن۔ جو کوئی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ وہ اپنے رویے سے لوگوں کے دل جیت لیتی تھیں۔ وہ بہت صاف گو تھیں۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتی تھیں لیکن اندر سے وہ بہت نرم دل اور مہربان تھیں۔ میری امی کو لپٹنے جھپٹنے سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ جب کبھی بھی میں نے ان سے گلہ کیا کہ اوروں کی مائیں تو سارا وقت ان کو چومتی ہیں تو ان کا کہنا تھا کہ بیٹا محبت تو دل کے اندر ہوتی ہے۔ یہ تو ایسا پودا ہوتا ہے۔ جس کی شاخیں دل کے اندر تہ در تہ ہوتی ہیں۔ آپ ابھی چھوٹی ہو یہ بات نہیں سمجھو گی۔"

وہ بچوں سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ اس کا ادراک مجھے تب ہوا جب میں گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہوئی۔ مجھے یاد ہے چھ سال پہلے جب مجھے گٹھیا کا مرض ہوا تو تکلیف سے راتوں کو روتی تھی۔ تو میری پیاری ماں میرے ساتھ روتی تھیں کہ میری بیٹی کو اتنی تکلیف ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے لیے وہ بہت بے چین و بے قرار رہتی تھیں۔ نماز پڑھ کر مجھ پر دم کرتی تھیں۔ میرے لیے دعائیں کرتی تھیں۔ امی کو شروع سے ہی بیٹیوں سے بڑا پیار تھا۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ جب میرے پہلے پہل کے پانچ بیٹے ہوئے تو میں رنج کرتی تھی۔ روتی تھی اور اللہ سے شکوہ کرتی تھی کہ اللہ میاں تو نے مجھے بیٹی کیوں نہیں دی۔ وہ تو ماں کی دکھ درد کی ساتھی ہے۔ بیٹی سہارا ہوتی ہے ماں کا۔ تو لوگ امی کا خوب مذاق اڑایا کرتے تھے کہ لوگ ترستے ہیں بیٹوں کے لیے اور یہ بیٹی کی دعا مانگ رہی ہے۔ پھر جب امی کی دعاؤں کے نتیجے میں باجی پیدا ہوئیں تو وہ اتنی خوب صورت تھیں کہ پورا خاندان اور محلّہ ان کو دیکھنے اُمڈ آیا اور باجی کو ایسی نظر لگی کہ وہ ایک ماہ شدید بیمار رہیں۔ طلعت باجی چھوٹے بہن بھائیوں کا بہت خیال رکھا کرتی تھیں اور یہ امی کی دی ہوئی تربیت ہی تھی جس کی وجہ سے لوگ ہمارے خاندان کی مثالیں دیا کرتے تھے کہ دیکھو بڑی بہن نے کس طرح چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھال رکھا ہے۔

یہ ہی نہیں امی کا رویہ ملازمین سے بھی اتنا اچھا تھا کے مجھے بخوبی یاد ہے جب ہم کراچی میں رہتے تھے تو دو خواتین پنجاب

سے ان سے ملنے کے لیے آئیں تو امی نے ان کا بہت اعزاز و اکرام کیا۔ ان کو اپنے پاس رکھا۔ جوڑے بنوا کر دیے۔ ہم سب بچوں کو بہت تجسس ہوا تھا کہ آخر یہ ہماری کون سی رشتے دار ہیں جنہیں ہم نے پہلے نہیں دیکھا۔ ان خواتین کے جانے کے بعد پتا چلا کہ یہ خواتین ہمارے بچپن میں گھر کی نوکرانیاں تھیں لیکن امی نے انہیں بہنوں کی طرح سمجھا اور آخر تک رشتہ نبھایا۔

امی نرم دل کی مالک تھیں۔ ہر کسی کے دکھ درد کو اپنا درد سمجھتی تھیں اور لوگ ان کی اسی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔

امی کو خدا نے پیش بینی کی روحانی صلاحیت سے بھی نوازا تھا۔ وہ اکثر باتیں قبل از وقت بتا دیا کرتی تھیں۔ جیسے انہیں میرے بڑے بھائی کے ایکسیڈنٹ سے قبل خواب میں اس بات کا اشارہ مل گیا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اپنی وفات سے قبل جب وہ نہانے گئیں اور واش روم کے باہر گر پڑیں تو ان کے کولہے کی ہڈی میں چوٹ لگ گئی۔ وہ چل نہیں سکتی تھیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ بڑھاپے میں ہڈی دیر سے جڑتی ہے۔ آرام کریں گی تو ٹھیک ہو جائیں گی لیکن امی کہتی تھیں۔

”بیٹا! میں نے ٹھیک نہیں ہونا۔ میرا بلاوا آ گیا ہے۔“ تو میں امی کو کہتی کہ آپ پریشان نہ ہوں امی اتنی سی چوٹ سے کون مرتا ہے۔ آپ ٹھیک ہا جائیں گی لیکن وہ کہتی تھیں کہ بیٹا اب مجھے اللہ کا بلاوا آ گیا ہے۔ تم سب پیار محبت سے رہنا۔ آپس میں لڑنا نہیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا اپنی تکلیف بھلا کر امی نے ہم سب کو ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی نصیحتیں کیں۔

گرنے کے چوتھے روز صبح 6.30 بجے ان کو بلیڈنگ شروع ہوگئی۔ فوراً 1122 کو کال کی اور انہیں ہاسپٹل لے گئے۔ ڈاکٹروں نے مختلف ٹیسٹ کروانے کے بعد خون کی بوتلیں لانے کا کہا۔ ان کو خون لگتا رہا لیکن بلیڈنگ نہ رکی۔ ڈاکٹروں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بلیڈنگ کیوں ہو رہی ہے اور پھر جب منہ سے بھی بلیڈنگ اسٹارٹ ہوئی تو ہماری امیدیں دم توڑ گئیں لیکن امی کا صبر اور حوصلہ برقرار تھا۔ کلمہ طیبہ ان کی زبان سے رواں تھا۔ ایک بات پر تو مجھے اب تک حیرانی ہے کہ اس وقت ان کے بیڈ کے پچھلی طرف ان کی اکلوتی نواسی بے آواز روئی تو انہوں نے یکدم سر پیچھے موڑ کر اسے دیکھا اور کہا کہ اسے کہو نہ روئے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ گویا امی کو اس حالت میں بھی اس کا خیال تھا۔ ابو کی وفات کے بعد تو امی نے بہت حوصلے اور ہمت سے کام لیا تھا۔ گھر اور بچوں کو سنبھالا تھا مگر اب تو کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔



پیاری امی! اب آپ کے بعد ہمیں کون رونے سے منع کرے گا۔ کون تسلی دے گا۔ کون پیار سے سنبھالے گا۔ دل درد سے بوجھل ہے۔ آنکھ سے آنسو گرتے ہیں۔

پچھلے دنوں میری آنکھ کا آپریشن ہوا۔ جب میں آپریشن کے لیے گھر سے روانہ ہوئی تو میرا دل بہت اداس تھا کہ اب میرے لیے دعا کرنے والے لب خاموش ہیں۔ اب کون میری جلد صحت یابی کی دعائیں کرے گا۔ کون میری فکر کرے گا کہ وہ فکر کرنے والی ہستی تو اب اتنی دور جا چکی ہے کہ جہاں تک میری پکار میری صدائیں اور آہیں نہیں پہنچتیں۔

آہ! پیاری ماں تجھ بن دل آنگن سونا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ ہر ذی نفس نے اللہ کے حضور جانا ہے۔

اللہ کی رضا پر شاکر ہیں کہ آپ کا اور ہمارا ساتھ اتنا ہی تھا۔ اللہ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

وفا کیسی، کہاں کا عشق؟

ثنا کنول اللہ دِتا

محبت کی یکطرفہ حکایت، جو دل سے پڑھی جائے گی

آج پھر اسے دورہ پڑا تھا۔ آج پھر اسے اپنی بے عزتی یاد آئی تھی۔ ہر طرف کانچ بکھرا پڑا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی ٹوٹ کر بکھری تھی۔ کسی نے ایسے ہی تو اسے عرش سے فرش پر پھینکا تھا مگر نہیں اس میں بھی تو اس کی اپنی غلطی تھی۔ جس نے اُسے اپنی ہی نظروں سے گرا دیا تھا۔

عزت جسے بنانے میں انسان اپنی ساری عمر گنوا دیتا ہے اور جسے ختم ہونے میں ایک منٹ لگتا ہے اور اکثر ایسا ہماری خواہشوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خوابوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خواب جو ہر کوئی دیکھتا ہے مگر اپنی حد میں رہ کر اور اس نے اپنی حد توڑ دی تھی۔ اس کے ساتھ پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس نے بھی تو اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے خود کو اپنی ہی نظروں سے گرا لیا تھا۔

جیسے جیسے وہ سوچ رہی تھی اس کی اذیت بڑھتی جا رہی تھی۔ تبھی مسز خضر گھر میں داخل ہوئیں تو وفا کو حال سے بے حال دیکھ کر پریشان سی ان کی طرف بڑھیں۔

''کیا ہوا وفا بیٹی! تم ٹھیک تو ہو؟'' اس سے پہلے کہ وفا کوئی جواب دیتی وہ مسز خضر کے بازوؤں میں جھول گئی۔ جب اسے ہوش آیا وہ ہاسپٹل میں تھی۔ جیسے ہی اس نے مسز خضر کو دیکھا۔ مارے شرمندگی کے اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔ مسز خضر روتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ تبھی کمرے میں ندیم داخل ہوا اور اس کے پاس بیٹھ کر نرمی سے بولا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔''

''زندہ ہوں۔'' وفا تلخی سے بولی تو ندیم اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر نرمی سے بولا۔ ''وفا ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''پلیز مسٹر ندیم مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھے کیسی باتیں کرنی چاہیے۔'' وفا ایک بار پھر طنز سے بولی تو ندیم تحمل سے بولا۔ ''وفا تم ایسی تو نہیں تھی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ تم بہت بدل گئی ہو۔ تمہیں یاد ہے پہلے ہم کیسے باتیں کرتے تھے۔ ہنسی مذاق پلیز وفا مجھے میری پہلے والی وفا واپس کر دو جو مجھ سے لڑتی تھی۔ نارمل ہوتی تھی اور مان جاتی تھی۔ میری وفا مجھے واپس کر دو۔ تمہارے دل میں جو بھی ہے مجھ سے شیئر کر لو۔ شوہر سمجھ کر نہ سہی دوست سمجھ کر اس سے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔'' باتیں کرتے ہوئے ندیم وفا کے ہاتھ تھام کر بولا تو وفا جو کب سے خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی دھیرے دھیرے ندیم پر اپنا آپ کھولنے لگی۔ ''اسلام علیکم! ہاؤ آر یو۔'' وہ جیسے ہی کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی مقدس اس کے پاس آ کر بولی تو وہ اسے جواب دے کر جھجکتے ہوئے بولی۔

''وہ مقدس سکندر حیات......'' اس سے پہلے کے وفا اپنی بات مکمل کرتی سکندر حیات اس کے پاس آ کر چہکتے ہوئے بولا۔

''ہائے وفا کیسی ہیں آپ اور آپ کے گھر والے کیسے ہیں؟'' وہ وفا سے ایسے پوچھ رہا تھا جیسے صدیوں سے جانتا ہو جب کہ وفا اس کی اتنی سی بات پر ہی خوش ہوگئی تھی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''جی فائن گھر والے بھی ٹھیک ہیں۔''

''تم جانتے ہو سکندر حیات ابھی وفا تمہارا ہی پوچھ رہی تھی۔''

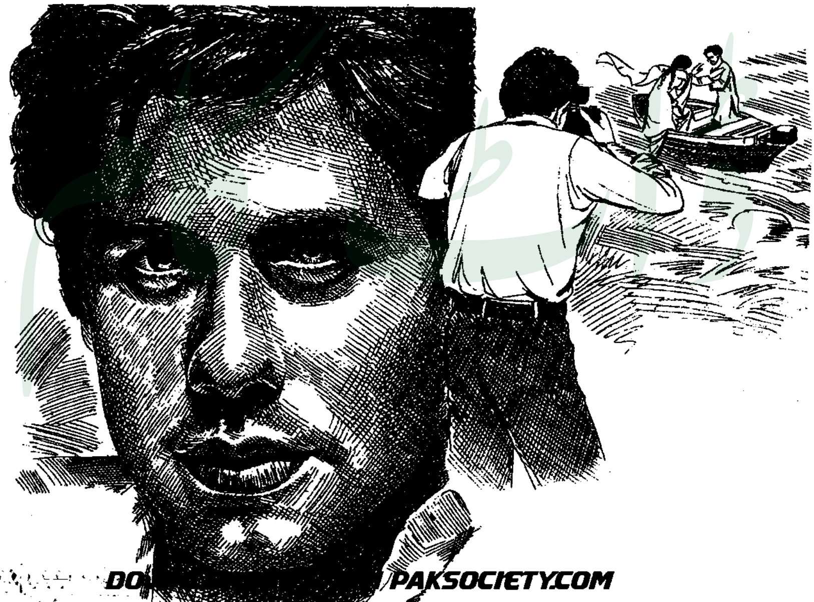
''ارے واؤ! میں تو واقعی مقدر کا سکندر ہوں۔ جس کا نام وفا پوچھ رہی تھی۔ ویسے سب ٹھیک تو ہے۔'' مقدس کے کہنے پر وفا نے مقدس کو گھور کر دیکھا تھا مگر وہاں بھی مقدس تھی۔ ایک نمبر کی ڈھیٹ اس کی بات پر سکندر حیات شرارت سے بولا تو وفا جھینپ گئی تھی۔

وفا کو لگتا تھا کہ سکندر حیات اس سے محبت کرتا ہے اکثر وفا نے نوٹ کیا تھا کہ وہ جہاں جاتی سکندر حیات کی نظروں کے حصار میں رہتی سکندر حیات نے کبھی اپنے منہ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اکثر وفا سوچتی جب بھی وہ مجھے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ اس کی نظریں کچھ تو کہتی ہیں اور جب میں کالج نا جاؤں کیسے بے قرار ہوتا ہے وہ۔ یہ ہی تو محبت ہے۔

ایک بار سکندر حیات اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتا تو وہ کئی دنوں تک خوش رہتی۔ مقدس اور سکندر حیات کزن تھے۔ مقدس کی ہی وجہ سے وفا کی سکندر حیات سے دوستی ہوئی تھی۔ مقدس اکثر اسے کہتی تھی کہ سکندر حیات اسے پسند کرتا ہے۔ سارا سارا دن اس کی باتیں کرتا ہے۔ اس کی تعریف کرتا ہے کہ وفا بہت خوب صورت ہے اور وہ ہنستی اچھی لگتی ہے۔ وفا ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ جب کہ ندیم اس کا کزن تھا جو اپنے ماں کی وفات کے بعد ان کے گھر رہتا ہے۔

وفا کی عمرابھی خواب دیکھنے کی تھی کہ اس کی زندگی میں سکندر حیات چلا آیا اور وفا کو لگا کہ جیسے اسے اس کے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہو مگر وفا بھول گئی تھی کہ خوابوں کے شہزادے کبھی بھی اصل زندگی میں نہیں آتے۔ ہمیں جسے محبت ہوتی ہے ہم وہ نہیں دیکھتے جو لوگ دیکھتے ہیں۔ ہم وہ دیکھتے ہیں جو لوگ نہیں دیکھتے۔

وفا کو بھی کبھی سکندر حیات میں کبھی کوئی خامی یا برائی نظر ہی نہ آئی تھی۔ کچھ دنوں سے گھر میں کچھ افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وفا سب سے بے گانی سکندر حیات کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ امی اور ابو اس کی شادی ندیم سے کر رہے ہیں تو پہلے تو وہ صدمے سے مسز خضر کا چہرہ دیکھتی رہی ہوش تب آیا جب مسز خضر جانے کے لیے مڑیں تو وفا یکدم بولی تھی۔



''سوری امی! میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔'' مسز خضر حیرت سے مڑیں پھر نرمی سے بولیں۔ ''کون ہے وہ۔'' مسز خضر کے کہنے پر وفا نے چونک کر انہیں دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔

''میرے کالج میں پڑھتا ہے۔ مجھے پسند بھی کرتا ہے دو، بہن بھائی ہیں۔''

''ہوں۔'' مسز خضر نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا پھر نرمی سے بولیں۔ ''اس سے کہو مجھ سے آ کر ملے۔''

''جی امی!'' مسز خضر کی بات پر وفا خوشی سے ان کے گلے میں باز وڈال کر بولی تو مسز خضر مسکرا دیں۔

دوسرے ہی دن وفا نے جب شرماتے ہوئے سکندر حیات سے کہا۔ ''سکندر حیات امی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''مگر کیوں؟'' سکندر حیات حیرت سے بولا تو وفا ہمت کر کے بولی۔ ''ہمارے رشتے کے لیے انہوں نے کہا ہے کہ پہلے آپ سے......''

''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟'' سکندر حیات اس کی بات کاٹ کر غصے سے بولا تو وفا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر نرم آواز میں بولی۔

''آپ بھی تو یہی چاہتے تھے نا۔''

''میں کیوں یہ چاہنے لگا۔'' اب کی بار سکندر حیات غصے سے دھاڑا تھا جس پر وفا بولی۔

''کیونکہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور۔''

''محبت...... میں تم سے محبت کرتا ہوں کس نے کہا تمہیں۔'' ''آپ کے ہر ہر انداز نے، آپ کا میری طرف بڑھنا، مجھے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں چمک کا آنا، آپ کا خوش ہونا اور میرے کالج نہ آنے پر بے قرار ہونا یہ ساری ہی تو محبت کی علامات ہیں۔'' وفا جب بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اس کے چپ ہونے پر سکندر حیات تمسخرانہ اڑاتے ہوئے بولا۔

''محبت اور تم سے...... سوچنا بھی مت۔ یونو تم لڑکیوں کی یہی پرابلم ہے۔ کسی لڑکے نے ہنس کر بات کیا کری تم سمجھتی ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ کسی لڑکے نے ہمدردی کیا کر لی تم اسے بھی محبت کا نام دیتی ہو۔ نکل آؤ افسانوں کی دنیا سے، اصل زندگی میں یہ سب نہیں ہوتا۔ تم جانتی ہو انسان کبھی کسی کو دکھ نہیں دیتا بلکہ انسان سے وابستہ توقع خواب خواہش انسان کو دکھ دیتی ہے اور جہاں تک بات ہے کہ میں تمہارا خیال کرتا تھا، تمہارے لیے بے قرار ہوتا تھا۔ تمہیں دیکھ کر مسکراتا تھا تو مس وفا کس نے کہا کہ یہ محبت ہے؟ یہ سب کچھ ہمدردی بھی ہو سکتی ہے صرف محبت نہیں۔ کوئی تمہاری تعریف کرے، تمہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کرے تمہارا خیال کرے اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہوتا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' سکندر حیات اپنی بات مکمل کر کے چلا گیا تھا مگر وفا ابھی تک ششدر سی کھڑی تھی۔ وہ کب کا جا چکا تھا مگر اس کے الفاظ ابھی تک وفا کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وفا ایسی ٹوٹ کر روئی کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا۔

''صحیح تو کہہ رہا تھا۔ سکندر حیات ہم لڑکیاں بہت اموشنل ہوتی ہیں۔ بات ہوئی نہیں کہ خواب دیکھنے لگتی ہیں اور یہ ہی خواب ہمیں رلاتے ہیں۔ واقعی کوئی لڑکا اگر کسی لڑکی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے مسکراتا ہے اس کا یہ مطلب تو بالکل نہیں ہوتا کہ وہ اسے محبت کرتا ہے۔''

پھر آہستہ آہستہ وفا سنبھل گئی۔ ویسے بھی کسی کے چلے جانے سے کوئی مرتو نہیں جاتا۔ دن بھی نکلتا ہے رات بھی ہوتی ہے۔ صبح بھی ہوتی ہے شام بھی ہوتی ہے۔ بس بھی بھی کسی کے چلے جانے سے کسی کے جینے کا انداز ضرور بدل جاتا ہے۔ کوئی ہنسنا بھول جاتا ہے وہ بھی ہنسنا بھول گئی تھی۔ پھر وفا کا نکاح ندیم سے ہو گیا جو اسے اس کی خواہش سے بڑھ کر چاہتا تھا مگر کبھی بھی وفا نے اسے وہ مقام نہیں دیا تھا جو ایک لڑکی کی زندگی میں اپنے شوہر کا ہوتا ہے۔ ندیم جب بھی ہاتھ بڑھاتا تو وہ جھٹک دیتی۔ وفا جیسے ہی چپ ہوئی اس سے پہلے ندیم کچھ کہتا مسز خضر مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور نرمی سے بولی۔

''ڈاکٹر نے وفا کو ڈسچارج کر دیا ہے۔'' پھر وہ لوگ گھر آنے کے بعد وفا ندیم سے کترائی کترائی پھرتی جسے ندیم نے نوٹ کیا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگا کہ کب وہ وفا سے بات کرتا ہے۔ اور آج وفا سے بات کر کے ندیم کے دل کا بوجھ مکمل طور پر ہٹ گیا تھا۔ اب وہ خوش تھا کہ وفا نے اس سے کچھ نہ چھپایا تھا اور سچ سچ سب کچھ اس کے روبرو کر دیا تھا۔ ندیم نے دل بڑا کر کے اسے اس کی ہر بھول سمیت قبول کر لیا تھا۔ زندگی کتنی حسین ہو گئی تھی۔ اب وفا اور ندیم کو لگتا تھا جیسے نام نہاد عشق کی سیل نے اُن دونوں کی زندگی سے ہٹ کر خلا پورا کر دیا تھا۔ آج وہ دونوں ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔

......☆......

پپّی باجی



شیما عبدالقیوم

اُس دوشیزہ کی حکایت، جو ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے خود قربان ہوگئی

گلی کے مڑتے ہی پہلا مکان ماموں بھائی کا تھا۔ نام تو ان کا مجھے نہیں پتا مگر سب انہیں اسی نام سے پکارتے تھے۔ ان کی بیوی نفسیاتی مریضہ تھیں جو ہر وقت بیٹھی خلاؤں میں دیکھا کرتیں۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں جن میں سب سے بڑی پپی باجی تھیں۔ گھسے ہوئے قد کی گہری رنگت چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور کندھے تک جھولتے چھدرے بال۔ ایک چیز جو ہمہ



وقت ان کے چہرے پر رہا کرتی وہ تھی پیاری سی مسکراہٹ۔ ماں کی دماغی حالت کے باعث گھر کی تمام تر ذمہ داری ان کے کمزور کندھوں پر تھی جسے وہ بخوبی نبھارہی تھیں۔ میں انہیں بچپن سے ایسا ہی دیکھ رہی تھی۔ ہم بڑے ہوتے گئے مگر وہ ویسی ہی تھیں۔

بچپن میں ہر جمعرات کو ان کے گھر کے سامنے بچوں کا ہجوم ہوا کرتا جنہیں کبھی ٹافیاں ملتیں، کبھی جلیبیاں اور کبھی کوئی اور مٹھائی یا کبھی گھر پر بچوں کو کھانا کھلاتیں اور ساتھ ساتھ کہتی جاتیں۔ ''میری امی کے لیے دعا کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔''

☆......☆

وقت گزرتا گیا باجی کی عمر کی تمام لڑکیاں بیاہی گئیں مگر وہ اپنی جگہ رہیں۔ اب میں میٹرک میں آگئی تھی۔ آتے جاتے ان پر نظر پڑ جایا کرتی جو کبھی مشین لگائے کپڑے دھور ہی ہوتیں تو کبھی بچوں کو سیپارہ اور ٹیوشن پڑھا رہی ہوتیں یا پھر گھر کو جھاڑنے چمکانے میں مصروف نظر آتیں، یا پھر محلے میں کبھی میلاد تو کبھی قرآن خوانی کی دعوت دیتی نظر آتیں۔

ان دنوں گھر میں بہن کی شادی کا ہنگامہ زوروں پر تھا جب وہ آئیں بہن کو پیار کیا اور خوب دعائیں دیں۔ ان کے بھی ایک بھائی اور ایک بہن کی شادی ہو چکی تھی اور اب چوتھے نمبر والی کی تیاری ہو رہی تھی۔ امی کو ان پر بہت ترس بھی آیا کرتا اور پیار بھی لہٰذا اس دن بھی ان سے کہا۔

''بس پپی! اب تم کو بھی اپنے گھر کا ہو جانا چاہیے۔ بہن بھائی چھوٹے تھے ٹھیک ہے مگر اب سب بڑے ہو گئے ہیں۔ انہیں ذمہ داریاں دو اور اپنی تیاری پکڑو۔''

لمحہ بھر کو ان کا چہرہ جیسے مرجھایا پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''ارے آنٹی! میری منگنی تو ہو چکی ہے۔ ہمارے رشتے دار ہیں ناں امریکہ میں وہیں ہوئی ہے بس تھوڑے عرصے کی بات ہے میں بھی نمٹ جاؤں گی۔''

''اچھا!'' امی حیران ہوئیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو یقیناً پتا چلتا مگر ان کی دل آزاری نہ ہو یہ سوچ کر امی خاموش ہو گئیں۔

☆......☆

امی کو فیشل کے لیے پارلر جانا تھا سو مجھے ساتھ لیے علاقے کے پارلر میں آگئیں۔ انیلا باجی بڑی اچھی بیوٹیشن اور خوش اخلاق تھیں۔ امی کا نمبر آنے میں ابھی ٹائم تھا سو باتوں میں ٹائم پاس ہونے لگا۔ امی کے فیشل کے ساتھ برابر والی کرسی پر پپی باجی تھیں جو فیشل کروا رہی تھیں۔ امی نے انہیں کافی شاباش دی کہ بالآخر انہیں اپنا خیال آ ہی گیا۔ وہ شرما کر بولیں۔ ''آنٹی! انہوں نے خاص تاکید کی ہے کہ اپنا خاص خیال رکھوں پارلر ٹریٹمنٹ باقاعدگی سے لوں۔''

امی نے دعائیں دیں۔ تھوڑی دیر میں ان کا فیشل مکمل ہو گیا تو وہ امی سے بولیں۔ ''آنٹی! آپ فارغ ہو لیں، ساتھ چلتے ہیں۔'' ہم فارغ ہو کر پارلر باہر نکلے تو انہوں نے ریڈ کلر کی پی کیپ لگالی اور بولیں۔ ''کلر خراب ہو جائے گا۔''

سارے رستے وہ امی کو اپنے منگیتر کے قصے سناتی رہیں کہ ''اتنا خیال رکھتے ہیں فون کرتے رہتے ہیں۔''

ان کی کالی رنگت کچھ پہلی نظر آرہی تھی۔ امی نے پوچھا تو رازداری سے بولیں۔

''آنٹی! وائٹنگ کریم استعمال کر رہی ہوں اس کا رزلٹ ہے۔''

☆......☆

ماموں بھائی کے گھر سے شادی کا کارڈ آیا جس میں پپی باجی سے چوتھے نمبر کی بہن کا دعوت نامہ تھا۔ امی بجھ کر رہ گئیں اور کہنے لگیں۔ ''ماموں بھائی اور دوسرے بچوں نے اس لڑکی پر ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ بہت برا کر رہے ہیں اس کے ساتھ۔'' وہ ان کے لیے بے حد اداس تھیں۔

خیر شادی کا دن آ پہنچا اور ہم شادی ہال پہنچ گئے جہاں حسب معمول پپی باجی سب کا پرتپاک استقبال کر رہی تھیں۔ زمانہ قدیم کی گھسی ہوئی ہرے رنگ کی فراک جسے میں ہزار دفعہ ان کے جسم پر سجے دیکھ چکی تھی۔ ''پپی باجی آخر آپ نئے کپڑے کیوں نہیں بناتیں؟''

مجھے واقعی غصہ آگیا وہ مسکرائیں۔ ''بیٹا! اتنے خرچوں میں یہ ایک اور اضافی خرچہ ہوتا۔''

''اچھا'' میں نے ان کے دوسرے بہن بھائیوں کو دیکھا جو مہنگے کپڑوں میں سجے سنورے گھوم رہے تھے۔ ''اور ان پر خرچہ نہیں ہوتا؟'' ''ارے یہ لوگ تو کماتے ہیں ناں'' وہ معصومیت سے بولیں پھر میں کچھ نہ بول سکی۔

☆......☆

کالج سے آتے وقت میری نظر ماموں بھائی کے گھر پر پڑی گھر کے باہر عورتیں جمع تھیں۔ یا اللہ خیر میں تیز تیز قدم اٹھاتی گھر میں آگئی۔

''السلام علیکم امی!''

''وعلیکم السلام بیٹا!'' امی نے جواب دیا۔

''امی ماموں بھائی کے گھر کیا ہوا ہے۔'' بیگ وہیں صوفے پر رکھ کر میں امی سے مخاطب ہوئی۔

''ارے ہونا کیا تھا بیٹا! پپی کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اسے اسپتال لے گئے ہیں۔''

''کیوں کیا ہوا انہیں؟''

''تباہ کر دیا لڑکی کو۔'' امی یاسیت سے بولیں۔

''مشین بنا کر رکھ دیا۔ بے چاری کو صبح چار بجے سے رات ایک بجے تک صرف کام ہی کرتی رہتی ہے اور صرف دو گھنٹے کی نیند لے کر تہجد کے لیے اٹھ جاتی ہے، عمر نکال دی ذرا ترس نہ آیا نہ باپ کو نہ بہن بھائیوں کو۔'' امی اداسی سے آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔ پپی باجی عبادت گزار تھیں یہ بات سب جانتے تھے۔ میں مارے تاسف کے کچھ نہ بول پائی۔

''بیٹا کل چلو گی اسپتال اسے دیکھنے؟''

''جی امی ضرور یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

☆......☆

''میں انہیں دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔ پیلا زرد وجود یوں لگا جیسے ڈھانچے پر صرف کھال ہو۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائیں، کمرے میں ان کی دوسرے نمبر کی بہن تھیں۔ جو بار بار گیلی آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔

''کیسی ہو پپی؟'' امی نے محبت سے ان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''ٹھیک ہوں آنٹی مگر ڈاکٹر چھٹی نہیں دیتے کہتے ہیں کہ آپ نے یہاں رہنا ہے، آرام کرنا ہے۔ نہ کچھ سوچنا ہے نہ کوئی کام کرنا ہے۔'' آواز میں نقاہت واضح محسوس ہو رہی تھی۔ ''تو اچھا ہے ناں کرو آرام۔'' امی پاس پڑی بینچ پر بیٹھ گئیں۔ میں نے فروٹ شاپر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور امی کے برابر میں بیٹھ گئی۔ ''بار بار آ کر کہتے ہیں سو جاؤ بھلا کیسے سو جاؤں نیند آئے تو سوؤں گی ناں، اب تو ایک عرصہ ہوا نیند ہی نہیں آتی۔'' انہوں نے اپنے سوکھے کانپتے ہاتھوں سے آنکھیں مسلیں۔

''چلو کوئی بات نہیں کبھی کبھار صحت کے لیے اسپتال آنا اچھی بات ہے پپی۔'' امی نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ تبھی ڈیوٹی پر موجود نرس نے آ کر ملاقات کا ٹائم ختم ہونے کی اطلاع دی۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا امی نے دعائیں دیں۔ ہم نکلنے لگے تو بولیں۔

''آنٹی اب کی بار آپ آئیں گی تو آپ کو ان کا نمبر دوں گی بہت پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ آپ انہیں تسلی کروا دیجیے گا کہ شاید جلد ٹھیک ہو کر گھر آ جائے گی۔''

''ضرور بیٹا!'' امی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ہمارے ساتھ ساتھ ان کی بہن بھی باہر آ گئیں۔

''ہوا کیا اسے؟'' امی اور میں کوریڈور میں رک گئے۔

''آنٹی ڈاکٹر کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر سے دگنی زندگی جی لی ہے۔ دن رات کی محنت نے ان کے جسمانی اعضاء ختم کر دیے ہیں۔ کیا بتاؤں آپ کو۔'' وہ رو پڑی۔

''اب اپنی زیادتیوں کا احساس کھائے جا رہا ہے، ہم سب نے انہیں ایک مشین سمجھا، بس جو صبح تین بجے سے اسٹارٹ ہوتی اور رات ایک بجے تک چلا کرتی ہم سب ہی خود غرض ہو گئے تھے۔'' ''تم لوگوں نے اس کی زندگی اپنی آسودگیوں پر قربان کر دی۔'' امی تلخ ہو گئیں۔ ''ایسا تو سوتیلی اولادوں کے ساتھ بھی کوئی نہیں کرتا۔ اللہ تم سب پر رحم کرے اور اس کا منگیتر کب آنے کا کہتا ہے۔''

''ان کا کوئی منگیتر نہیں آنٹی، سب ان کی تصوراتی باتیں تھیں۔'' امی اور میں بھونچکا ہو کر ان کا منہ تکنے لگے اور لوگ اتنے ظالم نکلے کہ اس کے خوابوں کا احساس تک نہ کیا۔

''ارے عقلمندوں دیکھ لیتے نا کوئی رشتہ تم بہن بھائیوں کو اپنی شادیوں کی تو بڑی جلدی رہی تم سمیت سب شادی شدہ بہن بھائی اپنی اولادیں لینے اس کے سامنے آتے ہوں گے تو کیا کیا نہ بیتی ہو گی اس کے نازک کمزور دل پر۔'' امی تلخی سے بولے جا رہی تھیں۔ ''ہمیں بہت دیر سے احساس ہوا مگر جیسے ہی یہ ٹھیک ہوں گی ہم سب سے پہلا کام یہ ہی کریں گے۔'' وہ شرمندہ شرمندہ بول رہی تھیں۔

''اللہ کرے۔'' امی یہ کہہ کر میرا ہاتھ تھامے تیز تیز باہر نکل آئیں۔

☆......☆

''کچھ دن ہاسپٹل میں رہنے کے بعد ایک رات انہوں نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ سب کہتے ہیں کہ اسپتال کا عملہ تک ان کے لیے افسردہ تھا اور جس ڈاکٹر نے ان کی موت کی تصدیق کی اس نے نہایت غصے سے ان کے والد سمیت سب کو کہا تھا۔ ''اب یہ پہلی بار گہری اور پرسکون نیند میں ہیں۔ امید ہے اب آپ لوگ انہیں ڈسٹرب نہیں کریں گے۔''

انہیں گزرے کافی سال گزر گئے ہیں مگر آج بھی ان کے گھر والوں کی زندگی رواں دواں ہے۔ ہاں اب نہ ہر جمعرات کو ان کے گھر سے کچھ پکنے کی خوشبو آتی ہے۔ نہ بچوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ نہ ہی کوئی دعوت دینے آتا ہے۔ ایک بے مہری خاموشی رہتی ہے۔

☆☆☆

ناول

حمیرا خان

نواب



قسط نمبر: 02

اُس نوجوان کی سرگزشت، جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

اسی روز گاؤں کے قبرستان میں مشتاق کو مٹی کے حوالے کر دیا گیا تھا اگرچہ اس گاؤں سے اس کا تعلق بہت پرانا تھا لیکن وہ اس کا گاؤں نہیں تھا اس گاؤں میں اس کے آباؤ اجداد کی قبریں نہیں تھیں ایک طرح سے وہ مرنے کے بعد بھی بے گھر بے زمین رہا تھا اور ایک بنجارے کی طرح اس کی زندگی کا آخر ہوا تھا۔ سبھی کو اس کی موت کا بہت صدمہ تھا نواب تو بالکل گم صم ہو ہی رہا تھا لیکن اسلم بھی بہت غصے میں تھا۔ سب لوگ اسے صبر کرنے کا کہہ رہے تھے لیکن بات یہ ہے کہ انسان کو اگر طبعی موت آجائے تو اس کے پیاروں کو جلد یا بدیر صبر آجاتا ہے، لیکن اگر کوئی اسے قتل کر دے تو اس کے گھر والوں کو لگتا ہے کہ جیسے ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا اگر اسے مارا نہ جاتا تو وہ زندہ ہوتا زندہ رہتا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ موت کا وقت لکھا جا چکا ہے جب کوئی انسان اس دنیا میں آتا ہے تبھی اس کی واپسی کا وقت طے ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود قتل کو قبول نہیں کیا جا سکتا قاتل کو معاف نہیں کیا جا سکتا اس کو بے گناہ نہیں مانا جا سکتا۔ اس سب کو خدا کی مرضی کہہ کر صبر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ مشتاق کے قاتل ان کے سامنے آجائیں اور وہ انہیں جہنم واصل کر دیں پتا نہیں یہ انتقام کی آگ کب اور کیسے بجھنے والی تھی۔

شاکر اس وقت شدید غصے میں تھا دونوں موٹر سائیکل سوار جنہوں نے مشتاق کو فائرنگ کر کے قتل کیا تھا کمرے میں ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑے تھے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ شاکر کے غصے سے بہت سہمے ہوئے ہیں اور اس کے بولنے کے منتظر ہیں۔ شاکر غصے میں پھنکارتا ہوا کمرے میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چکر کاٹ رہا تھا چکر لگاتے لگاتے وہ رکا اور خونخوار نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا ”بڑے بدمعاش بنے پھرتے ہو ایک چھوٹا سا کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے تم لوگ“ شاکر غصے سے دھاڑا تو وہ دونوں کچھ اور سہم گئے ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی معصوم قسم کے لوگ تھے وہ دونوں بہت خطرناک مجرم تھے قتل اغوا ڈاکے ہر طرح کے جرائم کرتے تھے لیکن ہر کسی کے دو باپ ہوتے ہیں ایک وہ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں تشریف لایا ہوتا ہے اور دوسرا وہ جس کے سامنے وہ کچھ بھی بول نہیں پاتا جس کی گالیاں تک سر جھکا کر سننا پڑتی ہیں تو شاکر ان دونوں کا ایسا ہی باپ تھا۔ دیکھنے میں شاکر جسمانی لحاظ سے ان کے مقابلے کا ہی تھا لیکن پیسہ اور طاقت نے اختیار کے ساتھ مل کر اسے بہت زیادہ مضبوط اور طاقتور بنا دیا تھا جس سے ٹکرانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ جنگل کا وہ شیر تھا جس کے سامنے چھوٹے موٹے شیر کتے بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ سلوک

بھی وہی کرتا تھا جو کوئی شیر کسی کتے کے ساتھ کر سکتا ہے ''سانپ تو مارا گیا ہے جناب'' ان میں سے ایک نے ہمت کرتے ہوئے کہا ''ہاں لیکن سنپولیا زندہ رہ گیا ہے اور کبھی کبھی سنپولیا سانپ سے زیادہ زہریلا اور خطرناک ہوا کرتا ہے اس لیے وقت پر اس کا سر کچلنا ضروری ہوتا ہے'' شاکر انہیں جھڑکتے ہوئے بولا ''ہم بہت جلد اس سنپولیے کو مار کر کام پورا کر دیں گے جناب، ویسے بھی وہ ایک چھوٹا بچہ ہی تو ہے کب تک ہم سے بچ سکتا ہے'' دوسرے والے نے بھی بڑک مارنے کی کوشش کی جس پر شاکر نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ سر جھکا گیا ''جاؤ یہاں سے'' شاکر نے ان دونوں کو وہاں سے دفع ہونے کا حکم دے دیا لیکن اس سے پہلے وہ نواب کو تلاش کر کے مار دینے کا حکم دینا نہیں بھولا تھا۔

نواب بے حد خاموش ہو گیا تھا حتیٰ کہ وہ اکرم کے ساتھ بھی نہ کھیلتا۔ مشتاق کے گولیاں لگنے کا منظر اس کے ذہن کی دیوار سے چپک کر رہ گیا تھا جب یہ منظر اسے یاد آتا غصے اور نفرت سے اس کا خون کھولنے لگتا وہیں بے بسی کی تھکن بھی اسے توڑ پھوڑ دیتی اسے بہت اچھی طرح احساس تھا کہ دشمن کے مقابلے میں وہ بہت چھوٹا اور کمزور ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ دونوں باتیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہیں وہ دن دور نہیں تھا جب وہ بڑا اور طاقتور ہو جاتا اور اپنے دشمن سے اپنے باپ کی موت کا انتقام لے سکتا لیکن وہ وقت آنے تک اسے انتظار کرنا تھا انتظار چاہے محبوب کے آنے کا ہو یا دشمن کی موت کا دونوں ہی میں لمحے صدیاں بن کر گزرتے ہیں اور دونوں ہی صورتوں میں انتظار بہت تکلیف دہ اور تھکا دینے والا ہوتا ہے نواب کی زندگی میں بھی بہت چھوٹی عمر میں یہ انتظار آ گیا تھا یہ انتظار کسی محبوب کا نہیں تھا کہ کیف آفریں ہوتا یہ انتظار ایک دشمن کی موت کا تھا بلکہ نہیں موت کا نہیں موت تو قدرتی ہوا کرتی ہے اور اگر وہ انسان جس سے ہم نے انتقام لینا ہو قدرتی موت مر جائے تو ایسا لگتا ہے جیسے مرنے والا جاتے جاتے ہمیں شکست دے گیا ہو اور نواب



شکست نہیں کھانا چاہتا تھا اس لیے وہ اپنے دشمن کو اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتا تھا۔

مشتاق اور شاکر کی دشمنی بہت پرانی تھی کسی نسلوں پرانی دشمنی کا آغاز شاید پاکستان بننے سے بھی پہلے ہو گیا تھا اس وقت شاکر کا دادا اور مشتاق کا دادا دونوں اچھے پہلوان تھے دونوں جوان مرد تھے جوش و جذبے سے بھرے ہوئے اپنے اپنے گاؤں کی شان۔ ہر سال ہونے والے مقابلوں میں جیت اکثر مشتاق کے دادا کے حصے میں آتی اور کسی سے نہ ہارنے والا شاکر کا دادا مشتاق کے دادا سے شکست کھا جاتا پھر یوں ہوا کہ یہ دشمنی اور حسد رقابت میں تبدیل ہو کر سنگین صورت اختیار کر گئی دونوں کو ایک ہی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ جس لڑکی کے ساتھ مشتاق کے دادا کا چکر چل رہا تھا اسی پر شاکر کے دادا کی نظر کرم ٹھہری اور جب اسے یہ پتا چلا کہ ان دونوں کا چکر چل رہا ہے تو اس لڑکی کو حاصل کرنا شاکر کے دادا کی ضد بن گئی۔ دونوں کشتی کے میدان کے علاوہ میدان عشق میں بھی ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑے ہوئے اور اس میدان میں ہارنے یا پیچھے ہٹ جانے کا حوصلہ دونوں میں ہی نہیں تھا اور یہ دشمنی اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب شاکر کا دادا عشق کی بازی ہار گیا اور وہ لڑکی مشتاق کی دادی بن گئی شاکر کے دادا کی بھی کہیں اور شادی ہو گئی اور اسی طرح دو تین سال گزر گئے مشتاق کا دادا سمجھ رہا تھا کہ بات اب ختم ہو گئی کیونکہ ان کی شادی ہو گئی تھی لیکن شاکر کے دادا کے لیے معاملہ کبھی بھی ختم نہیں ہوا تھا اور ایک رات وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشتاق کے دادا کے گھر گھس آیا اس رات لڑکی گھر پر اکیلی تھی اور اس کا شوہر کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا انہوں نے نہ صرف اس سے بدسلوکی کی بلکہ اسے اس کی غلطی بھی بتائی جس کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ سب ہوا تھا لڑکی نے گندم میں رکھنے والا زہر کھا کر اپنی جان دے دی اور اپنے شوہر کے گھر آنے سے پہلے یہ دنیا چھوڑ دی اس وقت ایسی سہولتیں نہیں تھیں کہ اس بات کا خلاصہ ہو پاتا اور گاؤں بھی اس وقت چھوٹی بستی تھا اور پھر معاملہ نام نہاد عزت کا بھی تھا اس لیے پولیس کو اس معاملے سے دور رکھا گیا اور جلد از جلد اس کی تدفین کر دی گئی لیکن اس کا شوہر ذہنی طور پر یہ سب قبول نہ کر پایا وہ مسلسل اس کھوج میں تھا کہ اپنی بیوی کی موت کی وجہ معلوم کر پائے اور پھر ایسی باتیں کہاں چھپی رہتی ہیں جب کہ بات بھی ایسے شو باز اور طاقت کے غرور میں اندھے ہوئے لوگوں کی ہو جو اپنے کارنامے خود دنیا کو سنانے کو بے تاب ہوں اس معاملے میں بھی یہی ہوا بہت جلد مشتاق کے دادا کو پتا چل گیا کہ اس رات اس کی بیوی کے ساتھ کیا ہوا تھا وہ اتنا کم ظرف نہیں تھا نہ اتنا گرا ہوا کہ بدلے میں دشمن کی بیوی پر ہاتھ ڈالتا لیکن ایک رات جبکہ وہ دشمن کو مارنے کے لیے اس کے گھر دیوار پھلانگ کر گیا تو وہاں چادر اوڑھ کر لیٹے جس آدمی کو اس نے اپنا دشمن سمجھ کر گنڈاسے سے وار کیا وہ دراصل دشمن کا بھائی تھا اس وقت تو وہ اسے قتل کر کے فرار ہو گیا لیکن اس کا دشمن بچ گیا۔ قتل کرنے کے بعد مشتاق کا دادا سیدھا تھانے پہنچا اور اقبال جرم کرتے ہوئے گنڈاسا بھی پولیس کے حوالے کر دیا اس وقت تک اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے غلط آدمی کو مار دیا ہے ورنہ شاید وہ ابھی خود کو پولیس کے حوالے نہ کرتا دوسری جانب شاکر کا دادا اپنے کرتوتوں پر نظر کیے بنا اپنے بھائی کا انتقام لینے کو بے تاب تھا۔ مقدمہ چلا اور مشتاق کے دادا کو عمر قید کی سزا سنائی گئی کچھ سال بعد اچھے رویے کی بنا پر اسے رہا کر دیا گیا اور اس نے دوبارہ شادی کی جس سے اس کا بیٹا پیدا ہوا دوسری طرف دشمن کا بھی ایک بیٹا تھا جس کے دل میں بچپن سے ہی اپنے چاچا کے قتل کی آگ کو بھڑکایا گیا تھا اس طرح ان دونوں کا بچپن بڑوں کی دشمنی کی نذر ہو گیا اور انہی لڑائی جھگڑوں سے اپنے بیوی بچوں کو بچانے کے لیے مشتاق کا دادا شہر شفٹ ہو گیا لیکن گاؤں سے ان کا ناتا نہیں ٹوٹا اور نہ ہی شاکر کے خاندان سے ان کی دشمنی میں فرق پڑا ان کی وفات کے بعد مشتاق کا باپ گاؤں لوٹ آیا اس وقت دشمن کی بھی نئی نسل میدان میں آ چکی تھی اُن کے خاندان کا چشم و چراغ شاکر تھا اور ان کا مشتاق۔ ان چھوٹے بڑے جھگڑوں سے ہوتے ہوئے جب یہ دشمنی ایک بار پھر قتل تک پہنچی اور مشتاق کے باپ کو شاکر کے باپ نے قتل کر ڈالا تو اس دشمنی نے ایک نیا موڑ لیا۔ مشتاق شہر چلا گیا اور پھر وہاں سے دور دراز علاقوں میں نکل گیا اور اس طرح وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا حصہ بن گیا وہیں اس کی ملاقات اسلم سے ہوئی اور اسلم کی بہن ساجدہ سے مشتاق کی شادی ہو گئی اور نواب کی پیدائش ہوئی کچھ عرصے بعد مشتاق نے شاکر کے باپ کو قتل کر کے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا لیکن اس نے اپنے داد

اسی طرح خود کو پولیس کے حوالے نہیں کیا پھر بھی وہ ایک روز گرفتار ہو گیا نامکمل ثبوتوں اور آلہ قتل کی غیر موجودگی کی وجہ سے مشتاق کو صرف چند سال کی سزا سنائی گئی لیکن سزا کے پورا ہوتے ہی اس کے دشمنوں نے جو کہ گھات لگائے بیٹھے تھے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اب نواب کی باری تھی جس کے بعد ان کی نسل کا نام و نشان تک مٹ جانا تھا۔

اسلم جھونپڑے میں داخل ہوا تو نواب کو سر جھکائے بیٹھے دیکھا وہ اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے اسلم کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی ''نواب پتر سب ٹھیک تو ہے؟'' اسلم نے نواب کے پاس بیٹھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو نواب نے چونک کر اسے دیکھا ''اماں ابا کی بہت یاد آتی ہے ماما'' نواب کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے اسلم نے کچھ بھی کہے بغیر نواب کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کی کمر کو دھیرے دھیرے تھپکنے لگا ''جب تک میں اسے جان سے نہ ماردوں مجھے سکون نہیں آئے گا'' وہ طیش سے کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے قہر جھلک رہا تھا اسلم اسے پرسوچ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

شاکر نے اپنے آدمیوں کو ہر طرف پھیلا دیا تھا وہ نواب کی بو سونگھتے پھر رہے تھے، اتنے سال تک بھی نواب اس لیے گاؤں میں محفوظ رہ گیا تھا کیونکہ نواب کی ماں ساجدہ شادی کے بعد بھی اپنے گاؤں میں اپنے بھائی کے گھر اپنی بھابھی نجمہ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ شاکر کو مشتاق کی شادی کے بارے میں پتا نہیں چل سکا تھا لیکن اب وہ نواب کو کسی صورت زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا شاکر نے اپنے آدمیوں کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ جلد از جلد نواب کا پتا معلوم کریں اور انہوں نے یہ کام اچھے سے کر دیا تھا، بہت جلد شاکر کو پتا چل گیا کہ نواب اپنے ماما کے ساتھ جنگل میں ہے اب بس جنگل تک پہنچ کر اسے ختم کرنے کا کام رہ گیا تھا جو ان کی نظر میں اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔

ایک رات شاکر کے آدمیوں نے جنگل پر ہلہ بول دیا آدھی رات کا وقت تھا اور فطری طور پر ساری رات کا جاگا انسان اس وقت تھوڑا سست ہو جایا کرتا ہے دوسری بات یہ بھی تھی کہ علاقے کی پولیس کے ساتھ ان کا معاہدہ ہو چکا تھا اور ان کا نذرانہ ہر ماہ ٹھیک تاریخ پر پہنچ جایا کرتا تھا اس لیے ان کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس رات سردار اور اس کے ساتھیوں نے ایک کامیاب ڈاکے کی خوشی میں اچھی خاصی پی رکھی تھی لیکن پھر بھی وہ اتنے غافل نہیں تھے کہ کوئی بھی ان کے اندر تک گھستا چلا جاتا بس اتنا ہوا تھا کہ نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ تھوڑا دیر سے



چونکے دشمن جنگل میں داخل ہو چکا تھا لیکن جیسے ہی انہیں دشمن کی آمد کا احساس ہوا انہوں نے فائر کھول دیے دونوں طرف سے خوب گولیاں چلائی گئیں کچھ لوگ مرے بھی لیکن آخر سردار کے ساتھی دشمن کو پلٹنے پر مجبور کر گئے ویسے بھی وہ ان کا علاقہ تھا انہیں بہت ساری باتوں میں دشمن پر برتری حاصل تھی ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ سردار کے کئی ساتھی درختوں میں چھپے ہوئے تھے اور اس طرح انہیں نیچے پھرتے دشمنوں پر برتری حاصل تھی۔ دوسری بات وہ اس جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے رات کا اندھیرا ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا جبکہ دشمن کے لیے وہ علاقہ اجنبی تھا اور رات کا اندھیرا بھی مشکل کھڑی کر رہا تھا۔ نواب کو مارنا تو دور کی بات وہ لوگ اڈے کے قریب پھٹک بھی نہیں سکے تھے۔ اور نواب ایک بار پھر ان کے ہاتھوں سے مرنے سے بچ گیا تھا۔

اسلم بالکل نہیں چاہتا تھا کہ نواب بدلے وغیرہ کے چکر میں پڑے ایسا نہیں تھا کہ اس نے قاتل کو معاف کر دیا تھا یا چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا بلکہ وہ قاتل سے خود نبٹنا چاہتا تھا لیکن نواب نے اس کی ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر ڈٹا رہا دوسری طرف سردار کی دلچسپی بھی نواب میں دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی اور وہ روزانہ نواب کو اپنے پاس بلا کر گر کی باتیں سکھاتا اور اسلم سے بھی روزانہ کی رپورٹ مانگتا، آخر اسلم نے سب کچھ حالات پر چھوڑ دیا اور اس طرح نواب اور اکرم کی باقاعدہ ٹریننگ کا آغاز ہو گیا یوں تو دونوں ہی پھرتیلے اور جانباز تھے لیکن نواب اکثر اکرم سے بازی لے جاتا اور اس کا نشانہ حیرت انگیز حد تک اچھا ہو گیا تھا ''یہ اپنے باپ سے بھی زیادہ قابل ہے'' سردار اکثر اس کی تعریفیں کرتا دکھائی دیتا لیکن اس حملے نے اسلم کو پریشان کر دیا تھا اس کے لیے نواب اور اکرم ہی اس کی دنیا تھے اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو اس کے لیے جینے کا مقصد ختم ہو جاتا اور پھر نواب تو ویسے بھی اس کی مرحوم بہن اور دوست کی امانت تھا اور وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ نواب کے ماں باپ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ نواب کوئی ڈاکو بنے یا کسی بھی طرح سے کوئی جرائم پیشہ انسان بنے۔ مشتاق نے بہت بار اسلم کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ چاہتا تھا نواب پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے، انسان کوئی بھی کسی بھی پیشے سے تعلق رکھتا ہو دنیا کی نظروں میں شرافت کی مثال ہو یا غنڈا گردی کا بادشاہ لیکن ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد پڑھے لکھے اور اونچے مقام تک پہنچے عام طور پر جرائم پیشہ لوگ اپنے بچوں کو اپنی زندگی سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مشتاق بھی انہی گنے چنے لوگوں میں سے ایک تھا جو ہمیشہ نواب کے شاندار مستقبل کے خواب دیکھا کرتا تھا دوسری طرف اس کی بہن ساجدہ تھی جو مشتاق سے بھی زیادہ شدت سے اس بات کی خواہش رکھتی تھی کہ اس کا بیٹا باپ اور ماما کے نقش قدم پر نہ چلے کیونکہ خوف کی زندگی کا جو عذاب وہ اپنے بھائی اور شوہر کے لیے جھیل رہی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنے بیٹے کے لیے بھی وہ یہی سب کچھ برداشت کرے۔ ویسے بھی وہ ایک عام عورت تھی ایک سیدھی سادی ماں جس کی پہلی اور آخری خواہش اپنے بیٹے کو بابو بنے دیکھنے کی ہوتی ہے تاکہ وہ سکھ سے اپنی زندگی گزارے۔ اب وہ دونوں اس دنیا میں نہیں رہے تھے نواب کی ہر طرح کی ذمہ داری اب اسلم پر تھی تو اب سارے فیصلے بھی اسلم کو ہی کرنا تھے لیکن حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مشتاق اور ساجدہ کی خواہش پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی دوسرے اتنے دن گزر جانے کے باوجود بھی اسلم نواب کے دل میں سے انتقام کے خیال کو نہیں نکال پایا تھا۔ بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا انتقام لینے کا جذبہ اور خواہش بڑھ رہی تھی لیکن اسلم لاشعوری طور پر شدت سے چاہتا تھا کہ کسی طرح نواب کو اس جگہ سے دور کر دے اور اب اس ہونے والے حملے نے اسے بہانہ بھی دے دیا تھا جس کا فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی ہوتی اور اسلم بے وقوف نہیں تھا۔

شاکر بری طرح تلملایا ہوا تھا اس حملے میں ان کا بہت زیادہ جانی نقصان ہو گیا تھا اور مقصد پھر بھی حاصل نہیں ہوا تھا نواب اب تک زندہ سلامت تھا اور اب اسے قتل کرنا شاکر کے انتقام کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ضد بن گئی تھی۔ وہ ہر قیمت پر نواب کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا لیکن وہی بات کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے نواب کی زندگی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے تو شاکر کیا پوری دنیا مل کر بھی نواب سے اس کی زندگی نہیں لے سکتی تھی۔

''تو تمہیں لگتا ہے کہ ہم اس چھوٹے سے بچے کی حفاظت کرنے لائق بھی نہیں ہیں'' اسلم اسی روز سردار کے پاس

پہنچا تھا اور اس نے نواب اور اکرم کو وہاں سے لے جانے کی بات کی تھی جس پر سردار کو لگا تھا کہ اس کی طاقت پر بھروسہ نہیں کیا جا رہا ''ایسی بات نہیں ہے سردار لیکن میں مرنے والوں کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی اجازت چاہیے'' اسلم نے مختصر الفاظ میں ساجدہ اور مشتاق کی خواہش کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا اب بات ایسی آگئی تھی کہ سردار چاہتے ہوئے بھی اسلم کو انکار نہ کر سکے اگرچہ وہ نواب کو بہت پسند کرنے لگا تھا بلکہ وہ نواب کی شکل میں اپنا جانشین دیکھ رہا تھا لیکن اسلم بہرحال نواب کا ماما تھا اور اس کے بارے میں سارے فیصلے کرنے کا حق رکھتا تھا یہی سب سوچ کر سردار نے اسلم کو نواب اور اکرم کو وہاں سے لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور اتنی آسانی سے اجازت مل جانے پر اسلم دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کیونکہ اسے لگتا تھا کہ اب وہ اپنے بہن بہنوئی کے خوابوں کو سچ کر سکتا ہے لیکن خواب دیکھنا جتنا آسان ہوتا ہے ان کی تعبیریں حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہوا کرتا ہے زندگی کب کونسی کروٹ بدل لے کون جان سکتا ہے۔

اسلم نے سردار کے اجازت دیتے ہی اپنے ایک پرانے دوست اکبر کے گھر بچوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس کا گاؤں شاکر کے گاؤں سے کافی فاصلے پر تھا اس لیے اسلم کو یہ تسلی بھی تھی کہ شاکر نواب تک نہیں پہنچ سکے گا اور نواب وہاں محفوظ رہتے ہوئے اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر سکے گا۔ وہ اگلے دن ہی اکبر کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا اکبر سے وہ کافی سالوں بعد مل رہا تھا اتنے سال بعد اسلم کو اپنے دروازے پر دیکھ کر اکبر حیران بھی ہوا تھا اور خوش بھی، بچوں کو اپنی بیوی حاجرہ کے حوالے کر کے اکبر اسلم کے پاس بیٹھک میں آبیٹھا تنہائی میسر آئی تو اسلم نے اکبر کو ساری بات بتائی اور اپنے آنے کا مقصد بھی بیان کیا۔ نواب کی جان خطرے میں ہے یہ سن کر اکبر کچھ پریشان دکھائی دینے لگا لیکن وہ دوستی نبھانے میں پیچھے نہیں ہٹا تھا ''تم بے فکر ہو کر انہیں یہاں چھوڑ جاؤ اللہ کے حکم سے ان کا بال بھی بانکا نہیں ہو گا'' اکبر نے اسلم کی تسلی کراتے ہوئے کہا جس پر اسلم کے دل پر سے ایک بڑا بھاری بوجھ اتر گیا سالوں بعد کے بچھڑے دوستوں کے پاس کرنے کو اتنی باتیں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں کھانے کے دوران بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

اکبر ایک چھوٹا سا کاشتکار تھا اس کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا تھا جس پر کاشتکاری کر کے وہ اتنا کما لیتا تھا کہ اپنے گھر کا خرچہ اٹھا سکتا ویسے بھی اس کے گھر میں تھا ہی کون ایک وہ دوسری اس کی بیوی حاجرہ، خدا نے انہیں اولاد کی دولت سے محروم رکھا تھا لیکن محبت کی دولت بہت تھی ان کے پاس۔ حاجرہ گوری چٹی چھریرے بدن کی خوبصورت عورت تھی جبکہ اکبر ہر لحاظ سے ایک عام مرد تھا لیکن دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر جان دیتے تھے حتیٰ کہ اولاد کی کمی بھی ان کے درمیان فاصلے پیدا نہیں کر پائی تھی ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اولاد نہ ہونے کی ذمہ داری ہر صورت عورت پر ڈالتے ہیں اور اکثر تو سال دو سال بعد ہی دوسری شادی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں جبکہ اکبر اور حاجرہ کی شادی کو دس بارہ سال ہونے کو آئے تھے لیکن ان کے درمیان آج بھی پہلے دن والا پیار اور ایک دوسرے کا احترام موجود تھا اس لحاظ سے وہ دونوں کافی خوش قسمت تھے ''یہ میرے دوست کے بچے ہیں انہیں ذرا کھانا وغیرہ کھلا دو'' اکبر نے اتنا کہہ کر دونوں بچے حاجرہ کے حوالے کر دیے حاجرہ نے مزید کوئی سوال پوچھے بنا نہ صرف بچوں کو کھانا کھلایا بلکہ انہیں سلا بھی دیا وہ بھی اتنے لمبے سفر کے تھکے ہوئے تھے فوراً ہی سو گئے تو حاجرہ اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

اسلم نے وہ رات وہیں گزاری تھی اس نے یہاں آنے سے پہلے بچوں کو کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ وہ پہلے اکبر سے بات کرنا چاہتا تھا اب جبکہ اکبر نے بچوں کو اپنے پاس رکھنے کے لیے ہاں کر دی تھی تو اب بچوں کو سب کچھ بتانا ضروری ہو گیا تھا لیکن اسلم نے انہیں اس بات کی بھنک بھی نہیں لگنے دی تھی کہ جنگل میں نواب کی جان کو خطرہ تھا وہ انہیں ڈرانا نہیں چاہتا تھا۔ چاہے کتنے بھی بہادر سہی بچے تو پھر بچے ہی ہوتے ہیں ''تمہارے اماں ابا کی خواہش تھی کہ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو جنگل میں رہتے ہوئے یہ کام نہیں ہو سکتا اس لیے تمہیں اور اکرم کو یہیں رہنا ہو گا جب تک تمہاری سکول کی پڑھائی ختم نہیں ہو جاتی'' اسلم نے نواب کو اپنے پاس بٹھا کر پیار سے سمجھایا اور اس نے فرمانبرداری سے سر جھکا دیا سکول جانے کا شوق تو خود اسے بھی بہت تھا اور وہ اپنی کلاس کا سب سے لائق بچہ تھا وہ پانچویں کلاس میں تھا جب اس کی

ماں کا انتقال ہوا اور اسے گاؤں چھوڑ کر جنگل میں رہنا پڑا اس وقت تو یہی لگ رہا تھا کہ اب اس کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا لیکن قسمت شاید اسے ایک موقع اور دے رہی تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اپنے ماں باپ کی خواہش اس کے لیے دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ اکرم نے واپس اس کے ساتھ جانے کی تھوڑی ضد کی لیکن اسے بھی اسلم نے پیار سے سمجھا دیا ”تم یہاں اکیلے نہیں ہو اکرم، تمہارا بھائی بھی تمہارے ساتھ ہے اور میں بھی آتا جاتا رہوں گا ویسے بھی تمہارے اکبر چاچا بہت اچھے بندے ہیں تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی“ اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دونوں وہاں رکنے کے لیے تیار ہو گئے۔

”یہ نواب اور اکرم کیسے لگے تمہیں؟“ رات کو اکبر سونے کے لیے اپنے کمرے میں آیا تو روز کی طرح سونے کے لیے لیٹنے کی بجائے حاجرہ سے پوچھنے لگا ”کیسی بات پوچھتے ہو بچے بھلا کس کو برے لگ سکتے ہیں، خوش نصیب ہیں وہ ماں باپ جن کی یہ اولاد ہیں“ حاجرہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا اس کے لہجے کی حسرت نے اکبر کے دل کو بھی اداس کر دیا ”لیکن یہ بچے بہت بدقسمت ثابت ہوئے“ اکبر نے اداسی اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا ”اللہ نہ کرے یہ بدنصیب ہوں ایسا کیوں کہتے ہو“ حاجرہ کے لہجے میں ناگواری تھی اسے اکبر کا اس طرح بچوں کو بدقسمت کہنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا اسی لیے ٹوک دیا تھا اور ساتھ ہی دل میں پیدا ہونے والے تجسس کی وجہ سے ایسا کہنے کی وجہ بھی پوچھی ”بیچارے سے اتنی سی عمر میں گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں ماں کی محبت سے محروم ہو گئے ہیں اور یہ جو نواب ہے کچھ عرصہ پہلے اس کا باپ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا اب اسلم ہی اس کا سب کچھ ہے“ رات کو جب اکبر نے نواب کے بارے میں ساری بات حاجرہ کو بتائی تو شاید زندگی میں پہلی بار اس نے اکبر کی بات سے اختلاف کیا وہ نواب کو اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں تھی ”یہ سمجھ اللہ کی بندی کہ خدا نے ہماری سن لی ہے اور پلی پلائی اولاد ہماری جھولی میں ڈال دی ہے وہ بھی دو دو بیٹے“ اکبر نے بات کو ہلکے پھلکے انداز میں لے جانا چاہا لیکن حاجرہ بے حد سنجیدہ تھی اور اکبر کے ہنسنے پر بھی حاجرہ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا ”دیکھو اگر یہ سب باتیں نہ ہوتیں تو بات اور تھی لیکن جس بچے کے پیچھے اتنے خطرناک لوگ پڑے ہوں اس کی ذمہ داری لینا کوئی آسان بات نہیں“ حاجرہ کے دل میں جانے کون کون سے وہم ستا رہے تھے وہ کسی طور اس فیصلے کو ماننے کو تیار نہ ہو رہی تھی ”ارے نیک بخت یہی تو وقت ہوتا ہے جب دوست کی پہچان ہوتی ہے وہ دوست ہی کیا جو مشکل وقت میں کام نہ آئے“ اکبر نے اسے سمجھانا چاہا لیکن وہ پھر بھی نہ مانی ”اصل بات بتاؤ تمہارے دل میں کیا ہے؟“ اکبر نے آخر پوچھ ہی لیا کیونکہ حاجرہ بلاوجہ ضد کرنے والی عورت نہیں تھی ضرور اس کے دل میں کوئی ایسی بات تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی ”جو لوگ اتنے خطرناک ہیں اور اس طرح ہاتھ دھو کر اس بچے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ان کا کوئی پتا نہیں کہ بچے کو ڈھونڈتے ڈھانڈتے یہاں تک پہنچ جائیں بچے کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہو گی اللہ کرے کہ ایسا کچھ نہ ہو لیکن اگر وہ آ گئے اور انہوں نے تمہیں کچھ کر دیا تو میں کیا کروں گی؟“ حاجرہ نے اپنے دل کی بات اور اپنی پریشانی بتائی اس کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی شاکر کو ہر صورت نواب کو مارنا تھا ایسے میں کوئی بھی بیچ میں آتا تو شاکر نے اسے بھی معاف نہیں کرنا تھا اور اسے اس کے دشمن تک پہنچنے میں جو رکاوٹ بنتا اسے وہ سب سے پہلے ختم کرتا اور ایسے میں حاجرہ کی جگہ کوئی بھی ہوتا اسی طرح سوچتا لیکن اکبر بھی مجبور تھا نہ تو وہ بزدل تھا نہ مفاد پرست دوست جو صرف اپنا بھلا سوچے اور نہ ہی وہ ایسا تھا کہ دوستی کا مان توڑ سکے وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر طرح سے مجبور ہو کر اسلم اس کے پاس آیا تھا دوست کو خالی ہاتھ واپس کرنا اس کے لیے بہت بڑی گالی تھی یہ بات اس کی غیرت کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ وہ بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جان کے خطرے کی وجہ سے دوست کو پیٹھ دکھائے اس لیے اس کے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ کسی بھی طرح حاجرہ کو سمجھائے اور اس نے یہ کام بخوبی کر لیا تھا اس نے حاجرہ کو سمجھا لیا تھا۔

اسلم اگلے دن واپس چلا گیا دونوں بچے اداس اور افسردہ رہ گئے ”چلو میں تمہیں گاؤں کی سیر کراتا ہوں“ بچوں کو اداس دیکھ کر اکبر نے کہا تو وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑے چھوٹا سا مگر خوب سرسبز گاؤں تھا ایک دو کو چھوڑ کر زیادہ

تر یہاں کاشتکار چھوٹے ہی تھے کیونکہ سب کے پاس تھوڑی تھوڑی زمینیں تھیں نسل در نسل بٹوارے ہونے کی وجہ سے بڑے کاشتکاروں کی نسلیں بھی چھوٹے کاشتکاروں میں شامل ہو گئی تھیں اکبر نے انہیں پورا گاؤں گھمایا اور کئی چیزیں بھی لے کر دیں گھر لوٹنے تک نواب اور اکرم دونوں اکبر سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔

اکبر اور بچے شام کو گھر لوٹے تو حاجرہ رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف تھی سالن بن چکا تھا اور اب وہ تندور میں روٹیاں لگا رہی تھی بچوں کو دیکھ کر وہ محبت سے مسکرائی گویا خاموش استقبال کیا اور اس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر بچے اس کے اردگرد آبیٹھے حاجرہ نے کٹوریوں میں سالن نکال کر دونوں کے سامنے رکھا اور گرم گرم روٹیوں کا چنگیر بھی ان کے پاس رکھ دیا اکبر بھی ہاتھ منہ دھو کر وہیں آ گیا اور بچوں اور حاجرہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کھانا کھانے لگا۔اس وقت وہاں ایک مکمل گھر کا خوبصورت احساس سب پر چھایا ہوا تھا کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ دو بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں بچے تھوڑا سا کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو حاجرہ انہیں پیار بھری جھڑکیاں دے رہی تھی اور وہ نخرے دکھا رہے تھے اکبر نے بہت دھیان سے منظر دیکھا اور حاجرہ کے چہرے پر چھائے ہوئے مامتا کے نور کو شدت سے محسوس کیا اور اس کا دل خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہونے لگا۔

''اللہ انہیں حیاتی دے،بہت ہی سمجھدار اور لائق بچے ہیں ان کے آنے سے گھر میں کتنی رونق آ گئی ہے''اس رات بچوں کے سونے کے بعد حاجرہ نے خود سے اکبر سے ان کی بات چھیڑی تھی اکبر نے خوش ہوتے ہوئے حاجرہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور دل میں سکون محسوس کیا کہ آخر کار حاجرہ نے دل سے انہیں قبول کر لیا ورنہ اپنی بات منوانے کے باوجود اسے دل ہی دل میں کہیں پشیمانی نے گھیرا ہوا تھا کہ اس نے دوستی نبھاتے ہوئے اپنی شریک حیات پر زبردستی ایک بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے اب حاجرہ کی اس بات نے اکبر کے دل سے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا تھا اس رات وہ کتنی ہی دیر بچوں کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن ہی اکبر بچوں کو اپنے ساتھ سکول لے گیا سکول کیا تھا چار دیواری پر مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس میں تین چار کچے کمرے بنے ہوئے تھے البتہ صحن کافی بڑا تھا صحن کے ایک طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جہاں اس سکول کے واحد ماسٹر صاحب رہتے تھے واحد اس لیے کہ باقی کے استاد شہروں سے تعلق رکھتے تھے ان کا اس چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے سے سکول میں کبھی کبھار ہی چکر لگتا تھا وہ بھی صرف رجسٹر حاضری میں اپنی حاضریاں لگانے کے لیے باقی سکول میں کتنے بچے ہیں کس کلاس میں کتنے بچے پڑھتے ہیں اور روزانہ سکول آتے ہیں یا نہیں ان باتوں سے انہیں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی ان کا کوئی لینا دینا تھا۔واحد استاد جو روز اپنی ڈیوٹی انجام دیتے تھے سب کچھ انہی کے ذمہ تھا ان کے بچے شہر جا بسے تھے بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی سو اب فراغت ہی فراغت تھی''ماسٹر صاحب اب یہ دونوں بچے آپ کے حوالے ہیں آپ انہیں خوب پڑھا لکھا دیں''اکبر نے اپنی عقل اور علم کے مطابق بات کی اور ماسٹر صاحب نے خوشدلی سے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔وہ دونوں بچوں کو ماسٹر کے حوالے کر کے چلا آیا۔

''بچے کے بارے میں پتا چل گیا ہے چوہدری صاحب بہت جلد اس کی موت کی خبر آپ تک پہنچ جائے گی''شاکر کے آدمی نے آ کر اسے یہ خبر سنائی تو وہ تھوڑا سوچ میں پڑ گیا''نہیں اسے مارنا نہیں ہے''شاکر کی بات پر رشید نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا کہاں تو شاکر دن رات اسی خبر کا منتظر تھا اور اب وہ نواب کو مارنے سے منع کر رہا تھا''تو پھر اس کا کیا کرنا ہے چوہدری صاحب''رشید کو کافی مایوسی ہوئی تھی کیونکہ اس نے بڑی محنت کر کے نواب کا پتا لگایا تھا اور سوچ رہا تھا اتنی اہم اور بڑی خبر دے کر وہ شاکر کا اور بھی منظور نظر بن جائے گا اور کسی نہ کسی طرح نوازا جائے گا لیکن یہاں سارا معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا''اسے مارنا نہیں ہے بلکہ زندہ اٹھا کے لانا ہے''شاکر نے مونچھیں مروڑتے ہوئے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا رشید ابھی بھی ناسمجھی سے شاکر کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اس بات کا منتظر تھا کہ شاکر آگے بھی کچھ کہے لیکن وہ جانے کس سوچ میں گم تھا کہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی جب اس نے کافی دیر کچھ نہ کہا تو رشید مایوس ہو کر وہاں سے چلا گیا۔شاکر کے دماغ میں نیا منصوبہ جنم لے چکا تھا نواب کو مارنا تو تھا ہی اس

سے پہلے اس نے نواب کے ذریعے پیسہ کمانے کا سوچا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نواب جتنا اہم اس کے لیے تھا اس سے زیادہ اہم اسلم کے لیے تھا۔ اسلم اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوسکتا تھا اور شاکر کی لالچی طبعیت جیب میں آتے پیسے کو اس طرح چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو پارہی تھی اس لیے اس نے نواب کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا۔

اکبر نے بچوں کو سکول لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے رکھی تھی صبح سویرے حاجرہ بچوں کو جگاتی اور پھر ناشتہ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تیاری میں بھی ان کی مدد کرتی۔ اکبر اس دوران صحن میں چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا اور حاجرہ کو گھر میں ادھر ادھر آتے جاتے دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہتا جب بچے ناشتہ کر کے تیار ہو جاتے تب وہ انہیں سائیکل پر اپنے آگے اور پیچھے بٹھاتا اور ان کا یہ چھوٹا سا قافلہ سکول کی طرف چل پڑتا راستے میں اکبر بچوں سے خوب باتیں کرتا اور انہیں فصلوں اور زمین کے بارے میں بتاتا کون سی فصل کس موسم میں ہوتی ہے ان کے علاقے کی فصلیں کون کون سی ہیں اور کیسے اچھی سے اچھی فصل حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہ ایک کسان تھا اس کا جینا مرنا سب کچھ زمین سے جڑا ہوا تھا وہ سکول کالج نہیں گیا تھا اس کے پاس سائنس کا علم نہیں تھا سیدھی سادی زندگی میں سیاست سے اس کا بس اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ ووٹ دیا کرتا تھا اس کے علاوہ اسے نہ سیاست سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ کوئی سیاسی شعور رکھتا تھا اپنی باتیں بتاتا اور نواب اور اکرم کے چھوٹے چھوٹے سوالات کے جواب دیے جاتا ان کا روز کا راستہ اسی طرح کٹ جایا کرتا تھا۔ سکول سے واپسی پر بھی یہ سب اسی طرح ہوتا بس فرق یہ ہوتا کہ ان کی گفتگو کا موضوع بدل جایا کرتا واپسی پر یہ باتیں ہوتیں کہ انہوں نے اس روز کیا پڑھا تھا کیا سیکھا تھا۔ بچے بڑے جوش اور خوشی کے ساتھ اکبر کو اس روز ہونے والی ایک ایک بات بتایا کرتے جس پر وہ اپنی رائے دیتا جاتا کبھی کسی بات پر انہیں شاباش دیتا تو کبھی ان کو ہلکی سی سرزنش کردیا کرتا۔ گھر جا کر یہ ساری باتیں پھر دہرائی جاتیں اس بار سننے والی حاجرہ ہوتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکبر بھی ان باتوں کو اتنی ہی توجہ سے سنتا جیسے پہلی بار سن رہا ہو ان سب کی زندگی ایک ڈگر پر آگئی تھی بدل گئی تھی اور یہ بدلاؤ ان سب کے لیے بہت اچھا ثابت ہو رہا تھا۔

وہ تین آدمی تھے جو اس وقت کھیتوں میں چھپے ہوئے اکبر کی سائیکل کا وہاں سے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے انہیں گاؤں میں آئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے اور اس دوران انہوں نے اکبر اور بچوں کی روٹین کا اندازہ لگایا تھا۔ لیکن اس سارے وقت میں کوئی ایک وقت بھی ایسا نہیں تھا جب انہوں نے بچوں کو اکیلے پایا ہو اکبر ان کا سایہ بنا ہوا تھا حتیٰ کہ کھیل کے میدان میں بھی وہ ان کے ساتھ جایا کرتا اور کچھ فاصلے پر بیٹھ کر انہیں دیکھتا رہتا کبھی کبھار بچے کم ہو جانے پر ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاتا اور ان تینوں نے ہر طرح سے ہر وقت کو جانچا تھا اور انہیں اغوا کے لیے سب سے بہترین وقت یہی لگا تھا جب اکبر بچوں کا سکول چھوڑنے کے لیے جا رہا ہوتا تھا۔ اس وقت سڑک پر لوگ نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے تینوں کے پاس اسلحہ موجود تھا ایسے میں اکیلے اکبر سے بچوں کا چھین لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا، اب اس میں صرف ایک الجھن باقی تھی کہ وہ اکبر کے ساتھ ایک کی بجائے دو لڑکوں کو آتے جاتے دیکھا کرتے تھے جبکہ ان کو جو اطلاع دی گئی تھی اس کے مطابق ایک بچہ تھا جسے اغوا کرنا تھا۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ دونوں بچوں کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا انہیں امید تھی کہ دوسرے بچے کے بدلے بھی انہیں شاکر سے اچھی رقم مل جائے گی اور بالفرض شاکر دوسرا بچہ نہ بھی لیتا تب بھی وہ اسے کہیں اور فروخت کر کے اچھی رقم حاصل کر سکتے تھے۔ سچ ہے جب انسان کا ضمیر مر جاتا ہے تو پھر کوئی بھی کام اس کے لیے اچھا برا نہیں رہ جاتا۔ وہ تینوں بھی بچے کو بیچنے کی بات جس بے دردی سے کر رہے تھے کوئی درد دل رکھنے والا انسان ان کی باتیں سن لیتا تو دل تھام کے رہ جاتا۔ انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ بچوں کے ساتھ آگے کیا ہونے والا تھا انہیں صرف اس رقم سے مطلب تھا جو ان بچوں کے بدلے انہیں ملنے والی تھی سچ ہے جب انسان میں سے انسانیت ختم ہو جائے تو پھر اس سے کسی بھی گری ہوئی حرکت کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ہر روز کی طرح اس روز بھی اکبر بچوں کو سائیکل پر بٹھائے باتیں کرتا سکول کی طرف بڑھے چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی نے اس کے سامنے پہنچ کر بریک لگا دی اکبر نے بھی غیر ارادی طور پر بریک لگا دی ورنہ اس کی سائیکل گاڑی سے جا ٹکراتی اور وہ تینوں نیچے گر پڑتے۔ گاڑی کو اس طرح سامنے رکتے دیکھ کر اکبر کی چھٹی حس نے کچھ غلط ہونے کا اشارہ کر دیا تھا وہ چوکس ہو گیا اور اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا اس وقت تک گاڑی میں سے دو لوگ باہر نکل چکے تھے ”کھیتوں میں بھاگو“ اکبر نے چلا کر دونوں بچوں سے کہا اور خود پستول ہاتھ میں لے کر گولی چلانے کو تیار ہو گیا گاڑی سے اترنے والے لوگوں کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اکبر کے پاس پستول ہو گی اس لیے وہ اس بات کے لیے تیار بھی نہیں تھے اور خالی ہاتھ نیچے اترے تھے لیکن اکبر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر انہوں نے بھی پھرتی سے اپنے کپڑوں میں چھپی گنز باہر نکال لیں اور گاڑی کے پیچھے چھپتے ہوئے اکبر پر فائر کیا۔ اکبر بھاگ کر ایک بڑے درخت کی اوٹ میں ہو گیا لیکن گولی اس کے بائیں بازو کو چھو کر گزر گئی جس سے خون بہنے لگا تھا اکبر کے کہنے پر بچوں نے کھیتوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا تھا وہ دونوں چیخ چیخ کر بچوں کو رکنے کے لیے کہہ رہے تھے لیکن وہ کہاں رکنے والے تھے وہ بچوں کے پیچھے بھاگنے کے لیے گاڑی کی اوٹ سے نہیں نکل سکتے تھے کیونکہ ایسی صورت میں اکبر انہیں گولی مار سکتا تھا یہ ان کے لیے بالکل غیر متوقع صورت حال تھی بھاگتے بھاگتے نواب ٹھوکر لگنے سے زمین پر گر پڑا تو اکرم بھی اسے اٹھنے میں مدد دینے کے لیے وہاں رک گیا گاڑی کے پیچھے چھپے لوگوں میں سے ایک نے انتہائی بے وقوفانہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچے کی طرف دوڑ لگا اکبر یہ سب دیکھ رہا تھا اس نے بچوں کی طرف بھاگنے والے آدمی پر گولی چلائی لیکن ذرا سے فرق سے نشانہ چوک گیا یہ گولی چلانے کے لیے اکبر کو درخت کی اوٹ سے نکلنا پڑا اس کا فائدہ گاڑی کے پیچھے چھپے دوسرے آدمی نے اٹھایا اور اس نے اکبر پر گولیاں برسا دیں اور اکبر زمین پر گر پڑا۔ نواب اور اکرم بھاگ کر کھیتوں میں دور اندر تک جا چکے تھے اور پیچھے آنے والے آدمی کی پہنچ سے بہت دور تھے فائرنگ کی آوازیں سن کر کھیتوں میں کام کرتے لوگ بھاگ کر سڑک کی طرف آنے لگے تھے ”جلدی واپس آؤ“ گاڑی کے پیچھے چھپے آدمی نے چلا کر بچوں کے پیچھے جانے والے کو پکارا تو وہ کشمکش میں پڑ گیا کہ بچوں کے پیچھے جا کر انہیں پکڑ لائے یا پھر پلٹ کر گاڑی میں جا بیٹھے جب دوسری بار اس کو واپس آنے کے لیے کہا گیا تب وہ گاڑی کی طرف بھاگنے لگا کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ سڑک تک پہنچ گئے تھے دونوں آدمی گاڑی میں سوار ہوئے اور تیسرا ساتھی جو ڈرائیونگ سیٹ پر تیار بیٹھا تھا اس نے گاڑی موڑی اور تیز رفتاری سے گاڑی بھگا لے گیا پیچھے دھول اڑتی رہ گئی تھی۔

جب تک گاؤں والے اکبر کے پاس پہنچے تب تک اس کی روح جسم سے پرواز کر چکی تھی سب حیران پریشان تھے کبھی اکبر کی لاش کو تو کبھی خالی رہ جانے والی سڑک کو دیکھ رہے تھے گاڑی کے جانے کی آواز سن کر نواب اور اکرم بھی بھاگتے بھاگتے رک گئے تھے اور مڑ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگے تھے جہاں پر کافی لوگ جمع ہو چکے تھے جب وہ دونوں سڑک پر پہنچے تو انہوں نے اکبر کو زمین پر بے حس و حرکت پڑے دیکھا وہ دوڑ کر اکبر کے پاس پہنچے اور اسے پکارنے لگے لیکن اکبر اس وقت تک ان کی پکار سے بہت دور دوسری دنیا میں جا چکا تھا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ان کی پکار کا جواب دیتا نواب اور اکرم نے رونا شروع کر دیا تھا ان کے لیے خون میں لت پت انسان کو دیکھنے کا منظر نیا نہیں تھا وہ ایک بار پہلے بھی یہ سب دیکھ چکے تھے اس وقت مرنے والے سے ان کا خون کا رشتہ تھا لیکن اب جو مرا تھا وہ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بہت اپنا تھا جو ہماری زندگی کے لیے اپنی جان دینے سے بھی گریز نہ کرے اس سے زیادہ اپنا کون ہو سکتا ہے بھلا۔ نواب اور اکرم زار و قطار رو رہے تھے کسی نے تھانے اطلاع کر دی تھی اور کوئی اکبر کے گھر بھی بتا آیا تھا۔ حاجرہ دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی تھی اس کا دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک کر کاندھوں پر سے لٹکتا ہوا زمین کو چھو رہا تھا لیکن اسے اس بے پردگی کا احساس تک نہیں تھا جتنی تیزی سے وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی اکبر کو خون میں لت پت دیکھ کر اتنی ہی ساکت رہ گئی تھی۔ دونوں بچے دوڑ کر حاجرہ سے جا لپٹے اور چیخ چیخ کر رونے لگے ان کے اس طرح رونے سے حاجرہ کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی اس نے آہستگی سے بچوں کو خود سے الگ کیا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اکبر کے پاس آئی۔ اکبر

کے پاس آ کر وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اکبر کے لہولہان جسم کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا جیسے کہہ رہی ہو ''میں نے کہا تھا نا'' پھر اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس کے ہونٹوں سے بار بار ایک ہی بات نکلے جا رہی تھی ''اب میں کیا کروں گی'' گاؤں والے حیرت اور افسوس سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اتنے میں پولیس وہاں آ گئی اور سوال جواب کرنے لگی لیکن گاؤں والوں میں کوئی بھی اس بارے میں کچھ بتانے سے قاصر تھا ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ گولیوں کی آواز سن کر سڑک پر پہنچے تو انہوں نے جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھا اور اکبر کو زمین پر پڑا پایا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی قابل ذکر بات کسی کو معلوم نہیں تھی دشمنی کا اینگل دیکھا جا رہا تھا اور دیکھنے میں یہی لگ رہا تھا کہ یہ ذاتی دشمنی کا نتیجہ ہے دشمن آئے اور گولیاں برسا کر بھاگ گئے۔ اصل میں وہاں کیا ہوا تھا وہ صرف نواب اور اکرم بتا سکتے تھے لیکن وہ دونوں اس وقت صدمے کی کیفیت میں تھے اور بہت زیادہ سہمے ہوئے تھے پولیس کے سوالوں کے جواب میں وہ خاموش نگاہوں سے انہیں تکتے رہے تھے انہوں نے پولیس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بچوں کے علاوہ حاجرہ ہی سارے معاملے پر روشنی ڈال سکتی تھی لیکن اس کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ پولیس کے سوالوں کا جواب دے پاتی۔ تصاویر لینے اور جائے واردات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ گاؤں کی عورتیں حاجرہ اور بچوں کو ان کے گھر لے آئی تھیں حاجرہ کی حالت بہت زیادہ خراب تھی وہ مسلسل رو رہی تھی اور بار بار بے ہوش ہو جاتی تھی۔ عورتیں ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ حاجرہ کا دکھ بہت بڑا تھا اس کو روتے دیکھ کر سب عورتوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے بلکہ پورے گاؤں پر سوگ کی کیفیت طاری تھی۔

شام تک حاجرہ کی حالت اس حد تک سنبھل گئی تھی کہ وہ بار بار بے ہوش نہیں ہو رہی تھی اس نے پولیس کے سوالوں کے جواب بھی دیے تھے اور نواب کے حوالے سے کچھ بھی کہنے کی بجائے خاموشی اختیار کی تھی اور دشمن کے بارے میں انجان رہتے ہوئے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی چاہتا کہ مجرموں کو سزا ملے لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور تھی ایک بار اکبر نے اسے کہا تھا ''اگر کبھی تیرے خدشے سچ بھی ہو جائیں اور نواب کے دشمن ہمارے گاؤں تک پہنچ جائیں اور میں مارا جاؤں'' اس کی اس بات پر غور سے اس کی بات سنتی حاجرہ تڑپ اٹھی تھی ''اچھی بات منہ سے نکالیں جی کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے'' وہ ناراض نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگی تو اکبر مسکرا دیا۔ ''بس آج میری بات سن لے آگے سے ایسی بات نہیں کروں گا'' اکبر کے کہنے پر حاجرہ کو مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑی ''ایسی صورت میں پولیس ضرور تجھ سے پوچھ گوچھ کرے گی'' اس بار بات کرتے ہوئے اکبر نے حاجرہ کی پریشانی کا خیال کرتے ہوئے اپنے مرنے کی بات نہیں کی تھی بلکہ الفاظ بدل دیے تھے لیکن الفاظ کتنے بھی بدل جائیں ان کا مطلب خوفزدہ کر دینے والا ہو تو الفاظ بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی لیے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے حاجرہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اکبر کو بات کرنے سے منع کیا بلکہ خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی ''جب پولیس تجھ سے سوال کرے تو تو نے بس ایک ہی بات کہنی ہے کہ تو اس بارے میں کچھ نہیں جانتی'' اس بات پر حاجرہ چپ نہیں رہ سکی تھی ''کیسی بات کرتے ہو جی میں ایسا کیوں کروں گی میں تو پولیس کو سچ بتاؤں گی کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں'' حاجرہ کو اکبر کی منطق سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ اسے ایسی بات میں جھوٹ بولنے کا کہہ رہا تھا جہاں ان کا نقصان ہی نقصان تھا ''تم اس لیے یہ جھوٹ بولو گی کیونکہ اگر تم نے سچ بولا تو پولیس نواب سے سوال جواب کرے گی اور میں نہیں چاہتا کہ یہ بچہ اس عمر میں پولیس کے چکر میں پڑے تم ان معاملات کو نہیں جانتیں اس لیے جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کرنا'' اکبر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہی تھی یا سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی ''اگر پولیس دو چار سوال کر لے گی تو کیا ہو جائے گا بلکہ اچھا ہی ہے نا اس طرح پولیس نواب کے دشمنوں کو پکڑ لے گی اور اس کی جان ہمیشہ کے لیے دشمنوں سے چھوٹ جائے گی'' حاجرہ کی سادگی اور معصومیت پر اکبر کو ہنسی آ گئی اس کا اس طرح سے ہنسنا حاجرہ کو احساس دلا رہا تھا کہ جیسے اس نے کوئی بے وقوفی کی بات کر دی ہو، خود کو بے وقوف سمجھے جانے پر حاجرہ کے چہرے پر خفگی کا تاثر پھیل گیا تو اس کی ناراضگی کو سمجھتے ہوئے اکبر نے ہنسنا بند کر دیا اور دوبارہ سنجیدہ ہو

گیا''نواب کے دشمن کوئی ایرے غیرے لوگ نہیں ہیں وہ بہت طاقتور ہیں وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں پولیس بھی سات سلامیاں دیتی ہے اگر تم ان کے بارے میں بتا بھی دو گی تب بھی کچھ نہیں ہوگا، پولیس انہیں نہیں پکڑے گی ہاں تم سے سوال کر کر کے اور تھانے بلا بلا کر تمہاری زندگی عذاب کر دے گی اور نواب کی بھی اور یہی بات میں نہیں چاہتا'' اکبر نے تفصیل سے اسے بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئی، حاجرہ کی پریشانی کا اندازہ اس کے چہرے سے لگایا جاسکتا تھا اسے ایک ہی بات پریشان کر رہی تھی کہ آخر اکبر یہ سب باتیں کیوں کر رہا تھا کیا کچھ ہونے والا تھا کیا اکبر جانتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور وہ اس سے یہ بات چھپا رہا تھا یا پھر یہ اس کی چھٹی حس تھی جو اسے آنے والے وقت کے بارے میں خبردار کر رہی تھی جو بھی تھا حاجرہ نے اکبر کی بات مان لینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور جب وہ تاریک دن آپہنچا اور اکبر کو اس سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا گیا تو اس نے اپنے مرحوم شوہر کی باتوں کی لاج رکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دی تھی۔

اسلم نے اکبر کو عابد کا موبائل نمبر دیا تھا تا کہ کسی انتہائی ضرورت کے وقت وہ اسے عابد کے ذریعے پیغام پہنچا سکے وہ فون نمبر اکبر کی زندگی میں تو کبھی استعمال نہیں ہو سکا تھا البتہ اس کے جانے کی خبر اسی فون کے ذریعے اسلم تک پہنچی۔ حاجرہ نے کسی کے ذریعے عابد کے نمبر پر فون کروا دیا تھا حاجرہ کا دکھ بہت بڑا تھا لیکن اپنے اتنے دکھ کے وقت میں بھی وہ اپنی ذمہ داری نہیں بھولی تھی اتنی پریشانی میں بھی اسے نواب اور اکرم کی فکر تھی، اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی ان دونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہی تھی۔ اس کے دل میں خوف تھا کہ کہیں دشمن دوبارہ وار نہ کر بیٹھے اس کا یہ خوف بے جا بھی نہ تھا جو ایک بار اتنی جرات کر سکتے تھے ان سے دوبارہ کسی بھی حرکت کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔ جس وقت اسلم کو اکبر کے قتل کی خبر ملی وہ شام کا وقت تھا اسلم حسب معمول اڈے پر موجود تھا اور اپنے جھونپڑے سے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ دو تین دن سے اس کا دل بہت بے چین ہو رہا تھا اور وہ خود کو یہ کہہ کر تسلی دے رہا تھا کہ اسے بچوں کی یاد آرہی ہے اس لیے وہ بے چین اور مضطرب ہے۔ اس وقت بھی وہ بظاہر اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا لیکن اس کا ذہن نواب اور اکرم کی طرف ہی لگا ہوا تھا جب اس نے عابد کو اپنے جھونپڑے کی طرف آتے دیکھا تو کسی انجانے احساس سے اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا ''تو کیا واقعی کچھ ہو گیا ہے'' اس کے ذہن میں اٹھنے والے اس خیال نے اسے بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہونے کے لیے مجبور کر دیا۔ عابد کا اس طرح اڈے پر آنا معمول کی بات نہیں تھی، بھی کوئی بہت ہی ضروری پیغام ہوتا تھا تو وہ جنگل میں اڈے کی طرف آتا تھا ورنہ اس کا کام صرف گھوڑوں کی دیکھ بھال تک کا ہی ہوتا تھا۔ جو بات اسلم کو سب سے زیادہ کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ عابد سردار کے پاس جانے کی بجائے سیدھا اس کے جھونپڑے کی طرف آرہا تھا۔ عابد اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھا اس کے باوجود اسلم سے یہ چند منٹوں کا انتظار کرنا بھی محال ہو رہا تھا اس لیے وہ وہیں کھڑے ہو کر عابد کے آنے کا انتظار کرنے کی بجائے تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھا'' سب ٹھیک تو ہے نا اکبر کا فون تو نہیں آیا؟'' عابد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسلم نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی ''اکبر کا قتل ہو گیا ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا'' عابد نے اس کی بات کے جواب میں وہ بات بتا دی جو اسے فون پر پتا چلی تھی عابد کی بات سن کر اسلم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اس کا ذہن خدشات اور خوف سے اتنا بھر گیا کہ وہ چاہنے کے باوجود فوراً کچھ نہ بول سکا، نہ پوچھ سکا۔ عابد اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے خاموش رہا تھا یا شاید وہ بھی اس کے کسی سوال کا منتظر تھا ''فون کس نے کیا اور اس نے کیا کہا'' ذہن میں آتے خوفناک خیالوں کو دور دھکیلتے ہوئے اسلم نے عابد سے پوچھا ''فون پر کوئی آدمی تھا شاید اکبر کے گاؤں کا ہی کوئی تھا اس نے بتایا کہ کچھ لوگوں نے اکبر پر حملہ کیا اور اس پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، اس نے اس بارے میں بس اتنا ہی بتایا اور تمہارے لیے اکبر کی بیوہ کا یہ پیغام دیا کہ جتنا جلدی ہو سکے گاؤں پہنچ جاؤ'' اکبر پر ہونے والے حملے کے بارے میں سن کر اسلم سمجھ گیا تھا کہ وہ حملہ دراصل نواب پر کیا گیا تھا لیکن اکبر دوستی نبھاتے ہوئے اپنی جان قربان کر بیٹھا۔ دوستی میں جان دینے کی باتیں کرنے والے بہت لوگ مل جاتے ہیں لیکن سچ میں جان قربان کر دینے والے دوست بہت مشکل سے اور بہت قسمت والوں کو ملتے ہیں اور ایسے دوستوں کا کھو جانا بہت بڑا نقصان ہوا کرتا ہے نا قابل تلافی نقصان۔ اسلم بھی اس

وقت اپنے اس نقصان کو شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اس کی آنکھیں اپنے دوست کو یاد کر کے نم ہو گئی تھیں۔ اس جذباتی کیفیت سے نکلتے ہی اسے نواب اور اکرم کی فکر ستانے لگی اگر حاجرہ نے اسے جلد گاؤں پہنچنے کے لیے کہا تھا تو اس کا مطلب سیدھا اور صاف تھا کہ اسلم کا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ حملہ دراصل نواب پر ہوا تھا اور حاجرہ تمام حالات سے واقف تھی اس لیے فکرمند اور پریشان تھی اور اب سارے حالات کا اندازہ کر کے اسلم بھی فکرمند ہو گیا تھا اور جلد از جلد بچوں کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

رسم قل کے بعد سب رشتے دار اپنے گھروں کو لوٹ گئے تو گھر میں حاجرہ اور بچے ہی رہ گئے یا پھر حاجرہ کے رشتے کی ایک خالہ تھی جو اس کے اکیلے پن کے خیال سے کچھ دن کے لیے حاجرہ کے پاس رک گئی تھی، خالہ کا دنیا میں صرف ایک بیٹا تھا جو شادی کے بعد بیوی کو پیارا ہو چکا تھا اور ماں اب اس کے لیے صرف ایک بوجھ اور اضافی خرچہ بن کر رہ گئی تھی۔ گاؤں میں آج بھی دکھ سکھ سانجھے سمجھے جاتے ہیں شہر کی نسبت اب بھی وہاں لوگ ایک دوسرے کے حال سے واقف ہوتے ہیں۔ حاجرہ بھی اپنی خالہ کے حال اور حالات سے بخوبی واقف تھی اور اس نے پہلے بھی کئی بار خالہ کو اپنے ساتھ آ کر رہنے کا کہا تھا ''ان بچوں کی صورت دیکھے بنا مجھے چین کہاں آئے گا بھلا'' ہر بار حاجرہ کے اصرار پر خالہ اپنے پوتا پوتی کی طرف اشارہ کر کے بہت پیار سے کہتی اور اس بات پر آ کر حاجرہ کو خاموش ہونا پڑتا وہی کیا گاؤں میں سبھی اس بات سے واقف تھے کہ ہر ماں کی طرح خالہ کو اپنے بیٹے کی نافرمانیوں کے باوجود اس سے بہت زیادہ محبت تھی اور پوتا پوتی میں تو جیسے اس کی جان اٹکی رہتی تھی اب وہی خالہ حاجرہ پر وقت پڑنے پر سب کچھ بھول بھال کر تین دن سے اس کے گھر آئی بیٹھی تھی اور ایک بار بھی اپنے گھر نہیں گئی تھی ''تو بالکل فکر نہ کر میں اب تیرے ساتھ ہی رہوں گی'' حاجرہ کو سوچوں میں ڈوبے دیکھ کر جانے کیسے ان پڑھ خالہ نے اس کے دل کا حال اس کے چہرے سے پڑھ لیا جو بنا کچھ کہے ہی اسے تسلی دے رہی تھی، حاجرہ نے بہت حیرت سے خالہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ وہ سچ مچ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہی تھی کہ بچوں کے اور خالہ کے جانے کے بعد وہ اکیلی کیسے رہے گی اور خالہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کا مسئلہ حل کر دیا تھا جو کہ یقیناً ایک بہت بڑا ایثار تھا جو وہ حاجرہ کے لیے کر رہی تھی خالہ کی محبت اور خلوص کے اس مظاہرے نے حاجرہ کو اس کا قرض دار کر دیا تھا۔

اگلی صبح بہت سویرے ہی اسلم جنگل سے نکل کھڑا ہوا ہمیشہ کی طرح جنگل سے گاؤں تک کا فاصلہ اس نے گھوڑے پر ہی طے کیا تھا اور اس سے آگے تیار کھڑی گاڑی میں جا بیٹھا تھا جو کہ عابد نے پہلے ہی اس کے لیے تیار کر رکھی تھی۔ جس وقت وہ نواب لوگوں کی طرف روانہ ہوا اس کا دماغ خدشات سے بھرا ہوا تھا اس کا بس چلتا تو وہ گھنٹوں کا یہ سفر لمحوں میں طے کر کے ان کے پاس جا پہنچتا۔ اس کا ذہن اس بات کو بھی سوچ رہا تھا کہ دشمن اتنی جلدی نواب تک کیسے پہنچ گیا جبکہ اسلم کا خیال تھا کہ اس نے نواب کو بہت محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ سالوں تک سکون سے نارمل زندگی گزار سکتا ہے، لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا نواب وہاں بالکل بھی محفوظ نہیں تھا اور اسلم کے خیال میں اس بار نواب کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا وہ ابھی اس بات سے ناواقف تھا کہ شاکر نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا اب وہ نواب کو قتل نہیں بلکہ اغوا کرنا چاہتا تھا، انہی سوچوں میں گم وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اسلم کو سامنے پا کر نواب اور اکرم اس سے لپٹ گئے اتنے دن گزرنے کے باوجود وہ دونوں بری طرح سہمے ہوئے تھے اتنی سی عمر میں انہوں نے بہت خوفناک مناظر دیکھ لیے تھے اور بہت کچھ بھگت لیا تھا اسلم نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا وہ سسک سسک کر رو رہے تھے اسلم کافی دیر انہیں اپنے گلے سے لگائے رہا حاجرہ عدت میں تھی اس لیے وہ اسلم کے سامنے نہیں آئی خالہ نے ہی اس کی میزبانی کی تھی لیکن جب اسلم نے بچوں کو ساتھ لے کر واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو حاجرہ نے پردے کی اوٹ سے اس سے بات کی تھی ''میری بہن میں تم سے شرمندہ ہوں اور خود کو تمہارا مجرم محسوس کر رہا ہوں''، اسلم نے حاجرہ کے سلام کے جواب میں کہا ''بھائی بہنوں سے شرمندہ ہوتے اچھے نہیں لگتے اسلم بھائی، ویسے بھی جو نصیب میں لکھا ہو وہ ہو کے رہتا ہے تم دل پہ کسی قسم کا بوجھ نہ رکھو مجھے اپنے شوہر اور

آپ کے دوست پر فخر ہے اس نے اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنی ذمہ داری نبھائی اور سرخرو رہا'' یہ کہتے ہوئے حاجرہ کی آواز آنسوؤں کی وجہ سے بھرانے لگی تو وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی ''تمہاری بات ٹھیک ہے بہن جس کی جب آئی ہو اسے جب جانا ہی پڑتا ہے لیکن پھر بھی میرے دل میں یہ ملال تو رہے گا کہ اگر میں اسے یہ خطرناک ذمہ داری نہ سونپتا تو شاید وہ آج ہمارے درمیان موجود ہوتا'' اسلم کا لہجہ افسوس اور ملال کے احساسات سے بھرا ہوا تھا جواب میں حاجرہ خاموش رہی شاید وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے بول نہیں پا رہی تھی ''تمہارا بہت بہت شکریہ تم نے ایک ماں کی طرح دونوں بچوں کا خیال رکھا جب تک میں زندہ ہوں خود کو کبھی اکیلا نہ سمجھنا تمہارا یہ بھائی جب تک اس دنیا میں ہے اپنی حیثیت کے مطابق اپنی بہن کو خرچہ بھیجتا رہے گا اور اس کے علاوہ بھی اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو کہتے ہوئے ہچکچانا نہیں یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا'' اسلم کہہ رہا تھا اور دونوں بچے اور خالہ خاموشی سے ان کے بیچ ہونے والی بات چیت سن رہے تھے۔ ''تمہاری مہربانی تمہاری اس بات نے مجھ دکھیا کے دل کو بڑا سہارا دیا ہے لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں میری ہر ضرورت کو پوری کرنے کا انتظام وہ نیک روح اپنی زندگی میں ہی کر گیا تھا ویسے بھی اکیلے جی کا کیا خرچہ کونسا ہمارے بال بچے ہیں جو۔۔۔'' حاجرہ جذباتی انداز میں بولتے بولتے درمیان میں ہی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئی تھی اور آنکھوں میں آتے آنسوؤں نے اسے مزید بات کرنے سے روک دیا تھا وہ مروت اور خودداری کے سبب یہ سب کہہ رہی تھی ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے گھر میں جو تھوڑا بہت سامان موجود تھا اس کے بعد وہ بس اللہ کے بھروسے تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ آنے والے دنوں میں اسے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن اپنے مرحوم شوہر کے دوست کا احسان لینا اسے گوارا نہ ہو رہا تھا'' میں پھر بھی کہوں گا کہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا مجھے میرا فرض ادا کرنے سے نہ روکو تمہاری ذمہ داری اٹھا کر میں قیامت کے دن اپنے دوست کے سامنے سرخرو ہوسکوں گا'' اسلم بہت لجاجت سے کہہ رہا تھا اس کے اس طرح بات کرنے سے حاجرہ اسے اور زیادہ انکار نہ کرسکی۔ ''ٹھیک ہے میرے بھائی اگر اس سے تمہارے دل کو تسلی ملتی ہے تو میں تمہیں نہیں روکوں گی'' حاجرہ نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا تو جواب میں اسلم نے اس کا شکریہ ادا کیا کچھ دیر اکبر کے اوپر ہونے والے حملے کے بارے میں بات ہوتی رہی اور پھر اسلم حاجرہ کو ڈھیروں تسلیاں دے کر واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا وہ لوگ کھانا کھا چکے تھے اور جو بچوں کا تھوڑا بہت سامان تھا وہ بھی حاجرہ نے باندھ کر تیار کر لیا تھا۔ بچوں کو رخصت کرتے ہوئے جہاں حاجرہ کی آنکھ بھر آئی تھی وہیں نواب اور اکرم بھی اس مہربان خاتون سے بچھڑنے پر بے حد اداس تھے۔

اسلم بچوں کو ساتھ لے کر جنگل میں پہنچا تو اسے سردار کا پیغام ملا سرداران سے ملنا چاہتا تھا اسلم دونوں بچوں کو ہمراہ لیے سردار کے خیمے کی طرف بڑھ گیا سلام دعا کے بعد اسلم نے سردار کو اکبر کے قتل کے بارے میں بتایا اور بچوں کو ساتھ لانے کی وجہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں اپنی پریشانی کا اظہار بھی کیا تو سردار ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا ''تم ان دونوں بچوں کو میرے گھر پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے'' سردار کی بات پر اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اسے خیال بھی نہیں تھا کہ سردار اسے یہ پیشکش کر دے گا اس لیے اسے فوری طور پر سمجھ نہ آیا کہ کیا جواب دے ''میری بیوی دونوں لڑکوں کا اچھے سے خیال رکھے گی تم کسی قسم کی فکر نہ کرو'' اسلم کو تذبذب میں دیکھ کر سردار نے مزید کہا ''ہمارے گاؤں میں بہت امن امان ہے وہاں یہ لوگ ہر طرح سے محفوظ اور پرسکون رہیں گے'' اسلم کی فکرمندی کا احساس کرتے ہوئے سردار نے اس کی مزید تسلی کرائی تو اسلم نے بھی کچھ سوچ کر ہاں کر دی دونوں لڑکے اس دوران خاموش رہے تھے لیکن نواب اس دوران مضطرب دکھائی دے رہا تھا جس پر کسی کا دھیان نہیں گیا کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد سردار نے انہیں وہاں سے جانے کی اجازت دے دی تو وہ تینوں اٹھ کر سردار کو سلام کرتے ہوئے اپنے جھونپڑے کی طرف چلے آئے سب کے سب سفر کی تھکن سے نڈھال تھے کھانا کھاتے ہی بستر پر گر گئے اسلم اور اکرم تو بستر پر لیٹتے ہی سو گئے لیکن نواب کو نیند نہیں آرہی تھی اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اس کے اندر طوفان کروٹیں لے رہا تھا وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہوا آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگلی صبح اسلم کی آنکھ کھلی تو اس نے نواب کو اپنے بستر سے غائب پایا اس نے یہی سوچا کہ وہ حاجت کی وجہ سے جنگل

میں گیا ہوگا لیکن جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی نواب واپس نہیں آیا تو اسلم کو تشویش ہونے لگی۔ وہ بستر سے اٹھا اور کپڑے ٹھیک کرتا ہوا جھونپڑے سے باہر آ گیا نواب جھونپڑے کے باہر بھی نہیں تھا ورنہ عام طور پر وہ برگد کے پرانے پیڑ کے نیچے تنہا بیٹھا دکھائی دیا کرتا تھا لیکن آج برگد کے پیڑ کے نیچے کی جگہ خالی تھی وہ نواب کو ڈھونڈتا جنگل میں ایک طرف کو جانے لگا سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک حیرت انگیز منظر اس کا منتظر تھا نواب ہاتھ میں گن تھامے کھڑا تھا اسلم کے دو تین ساتھی نواب کے اردگرد کھڑے ہوئے اسے گن چلانے اور نشانہ اچھا باندھنے کے بارے میں ہدایات دے رہے تھے جنہیں وہ بہت دھیان اور دلچسپی سے سن رہا تھا نواب کے ہاتھ میں گن دیکھ کر اسلم کا دماغ ہی تو گھوم گیا وہ اس کے لیے کیا کیا سوچ رہا تھا اور نواب گن چلانا نشانے باندھنا سیکھ رہا تھا ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ آگے بڑھے اور نواب کے ہاتھ سے گن چھین کر اسے دو تھپڑ لگائے لیکن پھر اس نے خود کو تحمل اور حوصلے سے کام لینے کے لیے تیار کر لیا ''تم یہاں کیا کر رہے ہو میں تمہیں جھونپڑے کے پاس تلاش کر رہا تھا'' اسلم نے ہر ممکن حد تک اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے کہا ''ہم اسے گن چلانا سکھا رہے ہیں یار یہ لڑکا تو کمال ہے سچ مچ مشتاق کا پتر ہے اتنی جلدی جلدی سب کچھ سیکھ رہا ہے کہ پوچھو مت ہم تو حیران رہ گئے'' اس سے پہلے کہ نواب کوئی جواب دیتا اسے گھیرے کھڑے ڈاکوؤں میں سے ایک تعریفی لہجے میں بتانے لگا، اپنی تعریف پر نواب نے لاشعوری طور پر اسلم کے چہرے کی طرف دیکھا شاید اس کے چہرے پر اپنے لیے کوئی فخر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اسلم کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے خالی تھا نواب کے چہرے کی خوشی لمحے میں غائب ہوگئی ''گن واپس کرو اور میرے ساتھ آؤ'' اسلم نے اپنے ساتھی کی بات کے جواب میں کچھ بھی کہے بنا نواب سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا ''ہم آج ہی یہاں سے چلے جائیں گے تم اکرم کے ساتھ مل کر اپنی تیاری کر رکھنا'' اسلم نے بات کرنے کی غرض سے کہا ورنہ جانتا تو وہ بھی تھا کہ نواب کی بھلا کیا تیاری ہونا تھی کپڑوں کے دو جوڑے تھے جنہیں ابھی تک بیگ سے نہیں نکالا گیا تھا س کے علاوہ اس کا ایسا کوئی سامان نہیں تھا جس کے لیے تیاری کا لفظ استعمال کیا جاتا ''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا یہیں رہوں گا اور ٹریننگ پوری کروں گا اور دشمنوں سے انتقام لوں گا'' اسلم کی بات کے جواب میں نواب نے اسی خاص اکھڑ لہجے میں کہا تھا جو اس عمر کا خاصا ہوا کرتا ہے۔ اس کی بات سن کر اسلم اپنی جگہ پر رک گیا اسلم کے رکنے سے نواب بھی وہیں ٹھہر گیا دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اسلم نواب کی آنکھوں کی بے خوفی اور سرکشی بھی دیکھ رہا تھا اور اس کے لہجے میں اتری ضد کو بھی محسوس کر رہا تھا چڑھتے دریا کی اس سرکشی کو غصے سے نہیں روکا جا سکتا تھا'' میں تمہیں تمہارے ماں باپ کے خوابوں کے بارے میں بتا چکا ہوں جو انہوں نے تمہارے لیے دیکھ رکھے تھے'' اسلم نے اپنا لہجہ نرم رکھا تھا لیکن اس کے الفاظ میں تنبیہ چھپی ہوئی تھی ''جب انہوں نے وہ خواب دیکھے تھے اس وقت حالات کچھ اور تھے اب حالات کچھ اور ہیں اس وقت میں آرام سکون سے اپنی ماں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا اور اب میری جان کے دشمن میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں میری وجہ سے ایک اچھا انسان اس دنیا سے چلا گیا اور میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا'' اسلم نے حیرت سے بولتے ہوئے نواب کو دیکھا وقت اور حالات نے اسے ایکدم کتنا بڑا بنا دیا تھا اس کے سامنے کھڑا نواب کچھ عرصہ پہلے کے اس نواب سے کتنا مختلف تھا جو شرماتے ہوئے اسے سلام کر رہا تھا اور اپنے باپ سے مل رہا تھا۔ نواب کے پاس دلائل تھے لیکن پھر بھی اسلم کے لیے اس کی بات ماننا ممکن نہیں تھا وہ اپنے اکلوتے بھانجے کو انتقام کی آگ میں نہیں جھونک سکتا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آگ اندھی ہوا کرتی ہے یہ کسی کو نہیں چھوڑتی اس کو بھی جلا کر خاک کر دیتی ہے جو اسے سلگاتا ہے اور اس کو بھی جو اس میں تیل ڈال کر اسے بڑھاتا ہے۔ اسلم نے فکرمندی سے نواب کے چہرے کی طرف دیکھا دل ہی دل میں وہ ایسے الفاظ سوچ رہا تھا جن سے نواب کو سمجھایا جا سکتا اور اس ضد سے دور رکھا جا سکتا کافی دیر بحث مباحثے کے بعد آخر اسلم نواب کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اسے فی الحال ان سب معاملات سے دور رہ کر اپنی زندگی بنانی چاہیے وہ دل سے راضی ہوا تھا یا نہیں لیکن اپنے پیارے ماما کی بات کو رد نہیں کر پایا تھا کہ اب دنیا میں ماما اور اکرم کا سوا اس کا اب رہ ہی کون گیا تھا اس لیے جنگل میں رکنے اور ٹریننگ لینے کی

شدید خواہش کو اسلم کی بات پر قربان کرتے ہوئے وہ سردار کے گاؤں اس کے گھر جا کر رہنے کو تیار ہو گیا۔

اسلم نے موقع غنیمت جانا اس سے پہلے کہ نواب پھر کسی باغیانہ سوچ کے زیر اثر آتا اسلم نے سردار کے گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ گاؤں اچھے خاصے فاصلے پر تھا وہاں پہنچنے کے لیے انہیں دو دن سفر کرنا تھا جو یقیناً بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لیے بھی خاصا دشوار سفر تھا اگر وہ لوگ ٹرین سے سفر کرتے تو ان کا یہ سفر تھوڑا آسان ہو سکتا تھا یہی سوچ کر اسلم نے قریبی شہر پہنچ کر ٹرین کی ٹکٹیں کرا لیں گاڑی شہر میں موجود ایک دوست کے حوالے کر کے وہ بچوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گیا دونوں بچوں کو پہلے سے بک کرائی برتھوں پر لیٹنے کے لیے بھیج کر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا ''بابا مجھے بھوک لگی ہے'' سوچوں میں کھوئے ہوئے جانے کتنا وقت بیت گیا تھا کہ اسلم کو اندازہ بھی نہ ہو پایا اور وہ اکرم کی آواز پر چونکا جو سر لٹکائے جھانک کر اسے اپنی بھوک کے بارے میں بتا رہا تھا اسلم نے کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا انہیں روانہ ہوئے چار گھنٹے ہونے کو تھے ''کیا قریب کوئی سٹیشن آنے والا ہے؟'' اسلم نے پاس بیٹھے مسافر سے پوچھا تو جواب میں اس مسافر نے آنے والے سٹیشنز کی ساری تفصیل اسلم کے گوش گزار کر دی یقیناً وہ کافی دیر سے بور ہو رہا تھا اور کسی سامع کی تلاش میں تھا لیکن اسلم اس کا سامع بننے کا ہرگز تیار نہیں تھا اس کے پاس سوچنے کو بہت باتیں تھیں اور اس لحاظ سے وقت کم تھا بچوں کو آنے والے سٹیشن کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے افسوس ہونے لگا کہ اسے سفر شروع کرتے ہوئے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ بچوں کے کھانے پینے کے لیے کچھ سامان ساتھ لے لوں اس کے بعد اس نے دوبارہ اپنی سوچوں میں گم ہونا چاہا لیکن ساتھ والے مسافر نے بار بار سوال کر کے اس کی اس کوشش کو بالکل ناکام بنا دیا تو آخر تنگ آ کر وہ اس کی باتوں کی جواب دینے لگا جو موسم کی شدت کی شکایت ایسے کر رہا تھا جیسے موسم کی شدت کا ذمہ دار اسلم ہی ہو کچھ ہی دیر بعد مطلوبہ سٹیشن آ گیا تو اسلم کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے گاڑی سے اتر گیا جب اسلم واپس گاڑی میں آیا تو اس نے دیکھا کہ وہی باتونی مسافر نواب اور اکرم کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا ''کمال کرتے ہو یار بھلا ان چیزوں سے بچوں کا پیٹ بھر و گے'' مسافر نے اسلم کے ہاتھوں میں تھامے شاپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا جس میں چپس، چاکلیٹ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے علاوہ جوس کے ڈبے تھے اس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اسلم کی کم عقلی پر بہت افسوس ہو رہا ہو'' یہ سب رکھو اور آؤ تم بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاؤ، میں جب بھی سفر پر نکلتا ہوں میری بیوی میرے علاوہ تین چار لوگوں کا کھانا ساتھ کر دیتی ہے کہتی ہے سفر میں اکیلے کھانا کھانا برا لگتا ہے اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے سے برکت بھی ہوتی ہے اور انسانوں میں محبت بھی بڑھتی ہے، اب بھلا اس پگلی کو کون سمجھائے کہ وہ زمانے لد گئے جب مل بیٹھ کر کھانے کا رواج ہوا کرتا تھا اب زمانہ اور ہے اب تو سفر میں کوئی تھوڑی سی بھی مہربانی دکھائے یا خلوص سے پیش آئے تو انسان کے دل میں ہول اٹھنے لگتے ہیں کہ جانے سامنے والے کا منصوبہ کیا ہے مسافر نوالہ توڑتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا تو ایک لمحے کے لیے اسلم بھی شرمندہ سا ہو گیا کیونکہ واقعی اس کے دل میں بھی اس آدمی کے لیے شکوک و شبہات ابھرے تھے کہ آخر وہ بچوں پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا لیکن قصور اسلم کا بھی نہیں تھا آج کل ماحول ہی ایسا ہو گیا ہے کہ کسی اجنبی پر بھروسہ کرنا مانو مصیبت مول لینا ہے اسلم نے شاپر چپ چاپ ایک سائیڈ پر رکھا اور ان کے ساتھ کھانے میں شامل ہو گیا کھانا سادہ مگر مزیدار تھا اسلم نے جب کھانا شروع کیا تھا یہی ارادہ تھا کہ ایک دو نوالے پر اکتفا کرے گا لیکن کھانے کی لذت نے اس کے ہاتھوں کو رکنے سے روک دیا اور وہ سیر ہو کر کھانا کھا رہا تھا ''ماشاءاللہ بھابھی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے'' کھانے کے دوران اور بعد میں بھی اسلم نے کھانے کو سراہتے ہوئے کئی بار تعریف کی تھی جواب میں ہمسفر مسافر ایسے خوش دکھائی دینے لگتا جیسے اس کی بیوی کی نہیں بلکہ اس کی تعریف کر دی گئی ہو۔ اسلم کو بے اختیار اپنی بیوی کی یاد آ گئی تو آنکھوں کے سامنے کتنے ہی منظر آ کر گزر گئے اس کے منہ سے بے اختیار گہری ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

اس سنسنی خیز ناول کے باقی واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو محض ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ اور عید کی ڈھیروں خوشیاں نصیب ہوں اور ایسی ہزاروں عیدیں اپنے پیاروں کے ساتھ دیکھو۔ اور میں ان تمام بچوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری درخواست پر لبیک کہا اور کارِ خیر میں اپنا اپنا حصہ ڈال کر مجھے خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سرخرو کیا ورنہ میں کمزور بوڑھا اپنی نظروں میں بھی گرجاتا...... ذمہ داری بہت بڑی تھی اور تنہا میں کچھ بھی نہیں...... اب میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی اولاد تو کھوئی مگر تم سب نے ثابت کیا کہ میں تنہا نہیں ہوں...... اللہ تم سب پر اپنا خاص کرم رکھے۔ آمین۔

بینا۔ شیخوپورہ

○ پیارے بابا جان! السلام علیکم! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ کچھ عرصے پہلے میں نے آپ کو اپنا مسئلہ لکھا تھا کہ لوگوں کے پاس ہمارے پیسے پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ نے فجر کی نماز میں سورۃ رحمٰن پڑھنے کے لیے کہی تھی اور 21 دن بعد بتانے کے کہا تھا۔ وظیفہ کیا' بیچ میں مجبوری کے دن آ گئے۔ وہ اور دو تین نماز بھی قضا ہو گئی تھیں۔ انہیں بھی شمار کر کے پورے 21 دن میں وظیفہ پورا کر لیا مگر ابھی تک ہمارے پیسے ملنے کی امید نہیں جبکہ ہمیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ بابا جان! اب بتائیں میں کیا کروں؟ میرے شوہر نے سپر اسٹور کھولا ہے' کچھ پیسے لگائے ہیں اور مزید پیسوں کی ضرورت ہے۔ زیور وغیرہ بیچ کر بھی پیسے پورے نہیں ہو رہے۔ کوئی ایسا تعویذ دے دیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پیسے' ہمیں واپس دلا دے۔

☆ بیٹی بینا! ہمت اور استقامت کے ساتھ وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔ وظیفہ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وظیفہ مکمل آداب کے ساتھ کیا جائے۔ نماز کی پابندی اولین شرط ہے۔ مشکل وقت اللہ کی طرف سے آزمائش ہے' جو لوگ صبر سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔

□ یاسمین' کاکول

○ محترم بابا جی! سچی کہانیاں میں آپ کا سلسلہ 'مسئلہ یہ ہے' پڑھا اور پڑھ کر بے اختیار دل سے دُعا نکلی۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ جس طرح آپ خلقِ خدا کی خدمت کر رہے ہیں' اللہ آپ کو اس کا اَجر دے۔ (آمین!) بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ماشاء اللہ' پانچ بچے ہیں۔ میرے شوہر آرمی کمانڈوز میں تھے جو شہید ہو چکے ہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرا شوہر رُوحانی طور پر مجھ سے بات کرے یا میری رہنمائی کرے۔ میں ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی یاسمین! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور شوہر کو بخش دو۔ یہ عمل اپنی عادت میں شامل کر لو۔ اللہ تمہارا مددگار رہو۔

□ فوزیہ' پشاور۔

☆ بیٹی فوزیہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ چننے والوں کو اللہ بہت پسند فرماتا ہے۔ بے شک راستہ سہل نہیں مگر اس

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88- فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121 - 021

پر چلنے والوں کے لیے بہت اَجر ہے۔ تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ کوشش کرو کہ ترجمے کے ساتھ پڑھو۔ نمازِ عشاء کے بعد 7 تسبیح یَاصَمَدُ کی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ مہرین' اوستا محمد۔

☆ بیٹی مہرین! تمہارا یہ پہلا خط ہے جو مجھے ملا لہٰذا جواب تحریر کررہا ہوں۔ تم نماز کی پابندی کرو اور نمازِ عشاء کے بعد 3 تسبیح یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ کی پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ یہی عمل نمازِ فجر کے بعد بھی کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ دورانِ وظیفہ بدزبانی' غیبت' حسد اور دروغ گوئی سے مکمل پرہیز لازمی ہے۔

□ نسیم' سیالکوٹ۔

o محترم بابا جی! میں نے اس سے پہلے بھی ایک خط لکھا تھا جو کہ آپ کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ یہ خط میں اس لیے لکھ رہی ہوں تاکہ آپ نزدیکی شمارے میں میرے مسائل کا حل بتا دیں۔ پہلے حالات کچھ اور تھے اور اب اور بھی زیادہ بگڑ گئے ہیں' میرے دو مسئلے ہیں۔ پہلا تو یہی کہ میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہوں' وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو وہ ہمارے خاندان کا نہیں ہے' دوسرے میرے والدین میری شادی میری پھوپھو کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں جبکہ وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ پہلے کسی کو بھی اس بارے میں علم نہیں تھا لیکن اب لڑکے کے گھر والوں کو علم ہوگیا ہے۔ لڑکے کی بہن نے فون کرکے میری والدہ کو بھی یہ معاملہ بتا دیا ہے۔ امی نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا تو میں نے اُن سے جھوٹ بول دیا کہ میری ایک لڑکی سے لڑائی ہوگئی تھی' اس نے بدلہ لینے کے لیے ایسا کہا ہے لیکن اب اس کی امی محلے میں کہتی پھرتی ہیں کہ میں نے اُن کے بیٹے کو پھنسالیا ہے اور اسے تنگ کرتی ہوں حالانکہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ اَب اس سے رابطے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہمارا شہر کوئی اتنا بڑا نہیں ہے کہ لوگوں کو دوسروں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ ہو بلکہ یہاں بات چند لمحوں میں ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اگر یہ بات زیادہ پھیلی تو میرے گھر والوں کو پتا چل جائے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور اگر زندہ چھوڑ بھی دیا تو میری گھر میں کیا عزت رہ جائے گی؟ میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میری پھوپوا اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور کردیں اور اس لڑکے کی امی کا دل میری طرف سے صاف ہوجائے۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ پہلے تو میرے والدین بھی راضی تھے لیکن جب سے اُس لڑکے کی بہن نے فون کیا ہے' میرے والدین کچھ ڈھیلے ہوگئے ہیں۔ اب شاید وہ مجھے کالج میں داخلہ نہ لینے دیں جبکہ میں اپنی پڑھائی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے والدین مجھے میرے پسند کے کالج میں داخلہ لینے دیں کیونکہ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔

☆ بیٹی نسیم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنی توجہ اپنی تعلیم کی طرف دو۔ سب سے قیمتی شئے عزت ہے' اگر ایک بار کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے تو پھر انسان ساری زندگی صرف پچھتاتا رہتا ہے۔ نماز کی پابندی کرو کہ اس عمل سے شیطان دور رہتا ہے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ حج پڑھ کر پانی پر دَم کرلو اور یہ پانی پی لو۔ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ معذوری کے دن شمار کرکے بعد میں پورے کرلینا۔ اللہ حامی وناصر ہو۔

□ رحیم احمد' حیدرآباد۔

o بابا جی! میرا بھانجا جس کا نام لئیق ہے' اس کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتے ہوئے دو سال ہوگئے ہیں' اسے کانٹریکٹ پر رکھا ہوا ہے' مستقل نہیں کرتے۔ اس نے ایسوسی ایٹ انجینئرنگ کا کورس کیا ہے اور وہ آفیسر پوسٹ پر ہے مگر اسے مستقل نہیں کیا جارہا جس کی وجہ سے بڑی پریشانی ہے۔ آپ اس کے لیے کوئی تعویذ دیجیے کہ اس کی سروس کمپنی میں مستقل ہوجائے اور اس کے افسران اسے تنگ نہ کریں۔

☆ بیٹے رحیم! اللہ تمہارے بھانجے کو کامیابی عطا فرمائے۔ نمازِ فجر کے بعد 41 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ حسبِ استطاعت صدقہ' خیرات

شادی کے لیے مجرب وظیفہ

جس جس، نے جب جب اللہ کو دل سے پکارا۔ میرے رب نے بندے کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ فی زمانہ والدین بچیوں کی شادی کو لے کر بہت پریشان رہتے ہیں۔ کہیں اچھے رشتے ناپید ہیں تو کہیں خرچے آڑے آجاتے ہیں۔ اسی لیے نہایت سہل اور مجرب عمل بتارہا ہوں۔ شرط نماز کی پابندی ہے۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد سات سات بار درود شریف اول و آخر اور درمیان میں سات تسبیحات یامجیب کی پڑھیں۔ 14 دن مکمل ہونے پر کسی میٹھی چیز پر حضورؐ کے نام کی فاتحہ دے کر وہ مٹھائی بچوں میں تقسیم کردو۔ انشاء اللہ حاجت فوری طور پر قبول ہوگی۔

ضرور کرو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ ازلان شاہ۔ بلتستان۔

o قابلِ احترام بابا جی! میں کافی عرصہ سے سچی کہانیاں پڑھ رہا ہوں۔ آپ کا کالم مسئلہ یہ ہے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ کے جذبۂ خدمتِ خلق کو دیکھتے ہوئے اتنی دور سے یعنی پاکستان کے شمالی علاقہ جات اسکردو بلتستان مقام سرمک سے خط لکھ رہا ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو تقریباً 12 سال ہوچکے ہیں لیکن ابھی تک اولاد سے محروم ہوں۔ بیوی کا علاج چل رہا ہے۔ میرا اپنا بھی چیک اپ ہوا ہے' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دو تین دفعہ سوچا' بیوی کو طلاق دے دوں اور دوسری شادی کرلوں مگر کسی کا دل دکھانا بھی گناہ ہے۔ بیوی کا دل دکھانا نہیں چاہتا اور میں اللہ تعالیٰ سے ناامید بھی نہیں ہوں۔ میرا دوسرا مسئلہ بے روزگاری کا ہے۔ میں پانچ وقت باجماعت نماز کا پابند ہوں۔ ایف اے پاس ہوں۔ ہر جگہ درخواست دیتا ہوں مگر مایوسی ہوتی ہے۔ پلیز آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے خدا میرے مسائل حل کرادے۔

☆ بیٹے ازلان! اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس مت ہونا۔ ہر لمحے اللہ کو یاد کرتے رہو' آپس میں میاں بیوی محبت سے رہو۔ اللہ بہت اسباب پیدا کرے گا۔ بیٹے! تم نمازِ فجر اور عشاء کے بعد گھر میں باآوازِ بلند اذان دو اور پھر اولاد کے لیے دُعا کرو۔ بیوی سے کہو کہ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دودھ اور دو کھجور کھالیا کرے۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ کرو' مدت ایک ماہ ہے۔ تعویذ کے لیے فوری طور پر سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ گل افشاں۔ حیدرآباد

o بابا جی! السلامُ علیکم! میرا پہلا مسئلہ میرے سر میں بے شمار دانے اور پھوڑے نکلنے کا ہے' یہ دانے اور پھوڑے تقریباً موسمِ گرما سے نکلنا شروع ہوئے تھے اور موسمِ سرما میں اور بھی شدت کے ساتھ تکلیف دیتے ہیں۔ ان میں درد' خارش بے حد ہوتی ہے۔ ان کے لیے دیسی حل کے ساتھ ساتھ اللہ کے اسمِ مبارک کا وِرد بھی بتایئے گا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے پچھلے حصے میں درد کا ہے جس کے بارے میں آپ کو پہلے لکھا تھا۔ ابھی زیادہ فرق نہیں پڑا ہے۔ سر کے پچھلے حصے کا درد اب سر کے اردگرد کے اوپر کی جانب بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی دیسی حل بھی بتایئے گا۔

☆ بیٹی گل! سب سے پہلے تو اپنا تولیہ الگ کرلو۔ نیم کے پتے توڑ کر اچھی طرح دھولو پھر انہیں خوب ابالو' اتنا ابالو کہ پانی آدھا رہ جائے پھر اس پانی سے جب بھی سر دھو' آخر میں بال نتھار لیا کرو۔ یہ بہت آسان سا علاج ہے۔ سر میں جب درد ہو تو کسی کپڑے میں برف چل کر رکھ لو اور اس سے سر کی ٹکور کرو' بس 10 منٹ۔ انشاء اللہ' ضرور آرام ملے گا۔ یَارَحِیمُ کا وِرد بہت کیا کرو۔

□ نسرین۔ لاہور

o بابا جی! السلامُ علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی! ہمارا آپ کے پاس گزشتہ دو تین مہینوں کے دوران میں یہ تیسرا خط ہے۔ بابا جی! ہم نے آپ سے استخارہ کروایا تھا اور وہ حق میں تھا۔ بابا جی! اب جو میں مسئلہ لکھ رہی ہوں' اس کا بھی آپ مہربانی کر کے جلدی جواب دیجیے گا۔ بابا جی! بچی کی بات جب سے ماموں کے

بیٹے سے طے ہوئی ہے' تب سے آج تک وہ بیمار رہتی ہے' سانس بند ہونے لگتا ہے اور رات کو ہاتھ' پیر ٹھنڈے اور پھر گرم ہو جاتے ہیں۔ بابا جی! ہمیں کسی نے بتایا ہے کہ بچی پر بندش کروائی گئی ہے کہ اس کا رشتہ ختم ہو جائے۔ اب ہمارے گھر میں اکثر جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ بابا جی! آپ ہمیں بتائیں کہ ایسا کیوں ہے؟ اور ہمیں کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے بچی کی شادی خیریت سے ہو جائے اور وہ اپنے سسرال میں بھی خیریت سے زندگی گزارے۔

☆ بیٹی نسرین! یاد رکھو' جو لوگ صرف اللہ سے پناہ مانگتے ہیں' وہ دنیا میں بھی ناکام نہیں ہوتے۔ کوئی کچھ بھی چاہے' کچھ نہیں ہوتا۔ صرف وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے لہٰذا لوگوں کی باتوں میں مت آؤ۔ صبح و شام 11-11 بار سورۃ کوثر پڑھو اور دُعا کرو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات لے لو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ شمع۔ خوشاب۔

○ محترم بزرگوار! اللہ آپ کو صحت' تندرستی سے نوازے۔ (آمین!) محترم! میں نے تین ماہ قبل آپ سے کاروبار میں برکت کے لیے تعویذ منگوایا۔ محترم! اللہ کے فضل و کرم سے میرے شوہر اور جیٹھ نے مل کر دکان ڈالی ہے مگر محترم جی! وہاں دکان پر اتنا کام نہیں آتا۔ صبح جاتے ہیں' شام ہاتھ جھاڑ کر آ جاتے ہیں۔ محترم! آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دے دیں کہ ہماری دکان خوب چلے۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا۔

☆ بیٹی شمع! نماز کی پابندی سے کرو' مستقل مزاجی کے ساتھ۔ انشاءاللہ' ضرور کرم ہوگا۔ شوہر سے کہو' جب دکان کھولیں' تب ایک بار سورۃ مزمل ضرور پڑھ لیا کریں۔ کرم ہوگا۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات لے لو۔

□ فرحین۔ لیہ۔

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میرا نام فرحین ہے۔ میری شادی ہوئے تقریباً چھے سال ہو گئے ہیں اور جب سے ہی معاشی پریشانی ہے۔ میرے شوہر کو کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ملتا ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو تنخواہ اتنی کم ہوتی ہے کہ اس سے گزارہ ناممکن ہوتا ہے جبکہ میرا ذہن بھی اتنا کمزور ہے کہ کچھ یاد نہیں رہتا ہے۔ کوئی آ کر مجھ سے کچھ کہتا ہے تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسے کیا جواب دوں؟ دماغ کام نہیں کرتا ہے۔ ان مسائل کی وجہ سے مجھے اپنے سسرال میں کافی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ میری ساس کا بھی مجھ سے ہروقت منہ بنا رہتا ہے۔ میں انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں لیکن اس کے باوجود بھی ان کا رویہ مجھ سے صحیح نہیں رہتا' وہ ہروقت مجھے ذہنی ٹینشن دیئے رکھتی ہیں۔ ان مسائل کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ بابا جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی' آپ مجھے ان تینوں مسائل کے لیے کوئی ایک ہی حل بتا دیں۔ آپ کی یہ دکھی بیٹی آپ کو بہت دُعائیں دے گی۔

☆ بیٹی فرحین! اللہ تمہیں زندگی کی ہر سہولت عطا فرمائے۔ ایک تو نماز کی پابندی کی عادت ڈالو۔ دوسرے جس قدر ممکن ہو یَا مُقِیتُ کا وِرد بہت کیا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ صدف۔ بدین

○ محترم و بزرگوار بابا جی! السلامُ علیکم! بابا جی! عرصۂ دراز سے "سچی کہانیاں" پڑھ رہے ہیں لیکن آج پہلی مرتبہ شرکت کر رہے ہیں۔ امید ہے' مجھ ناچیز کو اپنی بزم میں جگہ دیں گے۔ بابا جی! بندہ جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اپنے رب کو ہی یاد کرتا ہے لیکن بابا جی! میں نے تو کبھی بھی اپنے رب کو بھلایا نہیں۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ معاشی طور پر بہت کمزور ہیں۔ میں' شوہر اور دو بچے ہیں۔ میرے میاں بہت اچھے ہیں' بہت ایماندار' دو دو جاب کرتے ہیں لیکن اس مہنگائی کے دور میں پورا نہیں پڑتا۔ ہم لوگ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں' آمدنی کا زیادہ حصہ کرائے اور بلز وغیرہ میں چلا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ بہت زیادہ پریشان رہتے ہیں۔ میں نے گھر میں ٹیوشن سینٹر کھولا لیکن پتا نہیں' کیوں ایک بھی بچہ ٹیوشن پڑھنے نہیں آیا۔ بابا جی! شدید پریشان ہو کر آپ کے پاس مسئلہ لے کر آئی ہوں' شاید آپ کی ہی دُعائیں سوہنے رب تک پہنچ جائیں۔ بابا جی! کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے ہمارے آگے آنے والی

شوگر کے مریضوں کے لیے اکثیر عمل

وہ خواتین وحضرات جو ذیابیطس یا شوگر جیسے مرض کا شکار ہیں وہ نہار منہ ایک چوتھائی چمچہ کریلے کا پاؤڈر پانچ بار اللہ اکبر پڑھ کر پھانک لیا کریں۔ یہی عمل مغرب کی نماز کے بعد کریں۔ انشاء اللہ ہر قسم کی ذیابیطس میں فائدہ ہوگا اور انسولین کے انجکشن لگانے سے آہستہ آہستہ جان چھوٹ جائے گی۔

تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ میرا اسینٹر چل جائے اور میاں کو یا تو بہت اچھی جاب مل جائے یا پھر وہ ملک سے باہر چلے جائیں۔ میرے میاں بہت ہنر مند ہیں اور رزقِ حلال کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ بابا جی! میرے خط کا جواب آپ ''سچی کہانیاں'' میں ضرور دیجیے گا۔ کوئی ایسا وظیفہ ہو۔ ہماری ڈوبتی کشتی پار لگ جائے۔ آپ کے لیے ڈھیروں دُعائیں! اللہ آپ کو صحت دے اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆ بیٹی صدف! اللہ رزق میں برکت بھی دے گا۔ ایک تو بعد نمازِ عشاء سورۃ واقعہ کو عادت میں شامل کرلو۔ یہ وظیفہ ہر شخص کرسکتا ہے۔ تم خود چند دنوں میں تبدیلی دیکھو گی' خوش رہو۔

□ ایک بیٹی۔ نوشہرہ

☆ بیٹی......! تمہارا خط طوالت کے باعث شائع نہیں کیا جارہا۔ ویسے تمہارا خط پڑھ کر بے انتہا تکلیف ہوئی۔ تم نے جس صبر اور ہمت کے ساتھ وقت گزارا ہے' اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا صلہ تمہاری اولاد سے دے گا۔ بیٹی! شک اصل میں ذہنی بیماری ہے اور ایسے لوگ بیمار ہوتے ہیں' ان پر ترس کھانا چاہیے۔ بے شک ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ تمہاری اولاد' تمہارے ملنے والے سب جانتے ہیں کہ تم ایک پاکباز عورت ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ وہ تمہیں مزید صبر عطا فرمائے۔ (آمین!) نمازِ فجر کے بعد ایک مرتبہ سورۃ یٰسین پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ یہ وظیفہ نہایت اعتقاد کے ساتھ 21 روز تک کرو۔ کرم ہوگا۔

□ ارم' میانوالی۔

o بابا جی! السلامُ علیکم! ہماری شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ شادی کے بعد تیسرے دن جھگڑا ہوگیا پھر یہ جھگڑے معمول بن گئے جواب تک جاری ہیں۔ دراصل میرے شوہر کے شب و روز آوارہ عورتوں کے ساتھ گزرتے ہیں۔ پچھلے سال سے وہ کہہ رہے ہیں کہ دوسری شادی کروں گا۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ دوسرا مسئلہ میری کزن کا ہے۔ اس کی شادی کو تیسرا سال ہے۔ پہلا ایک سال تو خوشی سے گزرا مگر پھر اس کے شوہر نے اس پر شک کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ تم مجھ کو کھانے میں نشہ ملاکر دیتی ہو مگر اس کی بیوی اس سے بہت پیار کرتی ہے جبکہ وہ اس سے عمر میں بھی بہت بڑے ہیں۔ آپ اس کے لیے بھی کوئی آسان سا وظیفہ بتائیں کہ اس کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔

☆ بیٹی ارم......! تمہیں اپنی زبان پر قابو پانا ہوگا کیونکہ تم پہلے بھی بہت نقصان اٹھا چکی ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور معاملات میں خاموشی اختیار کرو۔ اپنے فرائض پوری تندہی سے پورے کرتی رہو اور زبان سے صرف اچھی بات نکالو' رویہ نرم رکھو۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ طارق پڑھو۔ یہ وظیفہ تمہاری بہن بھی کرسکتی ہے۔ مجھے 41 روز کے بعد مطلع کرو۔ دوران وظیفہ تمہاری جانب سے لڑائی جھگڑے میں پہل نہیں ہونی چاہیے۔

□ سیمین' رائے ونڈ۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! آپ کا کالم ''مسئلہ یہ ہے'' ''سچی کہانیاں'' میں عرصۂ دراز سے پڑھ رہی ہوں لیکن آج آپ سے کچھ کہنے کی ہمت کررہی ہوں۔ امید ہے' ضرور میری درخواست پر غور کریں گے۔ میں بہت پریشان ہوں' میری پریشانی یہ ہے کہ میری بیٹی کی عمر اب بڑھتی جارہی ہے یعنی 30 سال سے اوپر ہے اور کوئی رشتہ نہیں آتا۔ اگر کبھی آتا ہے تو

وہ معیاری نہیں ہوتے یا پھر لوٹ کر نہیں آتے۔ ہم ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے شوہر ایک مشہور فوٹو گرافر ہیں۔ میری لڑکی کی شکل و صورت قابل قبول ہے۔ انٹر پاس ہے اور گھریلو امور میں طاق ہے۔ دن بدن اس کا جسم فربہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ بے حد کام کاج کرتی ہے۔ امید ہے' آپ میری مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی تعویذ عنایت فرمائیں گے۔

☆ بیٹی سبین! اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ تم پر اپنا کرم فرمائے۔ بیٹی سے کہو کہ سورۃ طٰحٰ آیات 6,2724,25,2 نمازِ عصر اور نمازِ مغرب کے بعد 11-11 مرتبہ پڑھے اور اپنے اوپر دم کرلے۔ یہ وظیفہ ایک ماہ تک کرے۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات لے لو۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔

☐ ربیعہ۔ شور کوٹ۔

o محترم بابا جان! السلام علیکم! پہلی مرتبہ آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ بابا جان! آپ بہت اچھے انسان ہیں' آپ لوگوں کی بہت مدد کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کا اَجر دے گا۔ (آمین!) بابا جان! میرا مسئلہ میرا شوہر ہے۔ میری شادی کو پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ شادی سے پہلے ہی میرے شوہر ایک لڑکی کو پسند کرتے تھے۔ میرے ساتھ شادی ان کی رضامندی سے ہوئی تھی لیکن اس وقت سے اس لڑکی کو نہیں چھوڑا جبکہ اس کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ اس کے دو بچے ہیں لیکن اس کے خاوند نے بھی اسے بدچلن کہہ کر طلاق دے دی ہے۔ بابا جان! وہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے رہتی ہے۔ میرے خاوند کے ساتھ اب اس کے تعلقات اب اور بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ میرے خاوند بہت اچھے انسان ہیں۔ سب رشتے دار بھی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ بابا جی! گھر میں بھی وہ سب کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے پیش آتے۔ گھر کے ہر فرد کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ نماز' روزے کے بھی پابند ہیں لیکن اس عورت کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ میں انہیں پیار سے بھی سمجھاتی ہوں تو کہتے ہیں۔ ''اس موضوع پر بات نہ کرو۔'' بابا جی! خدا جانتا ہے' میں نے اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مجھے اپنے شوہر سے بہت محبت ہے اور میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔ عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے لیکن دوسری عورت کو برداشت نہیں کرتی۔ بابا جی! میں نے بہت وظائف بھی کیے لیکن میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ کے واسطے' آپ میری مدد کریں اور کوئی تعویذ مجھے عنایت کردیں۔ جو ہدیہ ہو میں دوں گی۔ ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔ بابا جی! ذرا جلدی جواب دینا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ برائے کرم میرا گھر خراب ہونے سے بچائیں۔ میرے ذہن میں پتا نہیں کیا کیا خیال آتے ہیں؟ بابا جی! میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔

☆ بیٹی ربیعہ! تمہارا خط پڑھنے کے بعد میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوا لو اور اس کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

☐ زاہدہ۔ خان پور۔

☆ بیٹی زاہدہ! مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔ میں تعویذ تیار کروں گا۔ تمہارے گھر کے حالات یقیناً بہت خراب ہیں۔ جب تک تعویذ تیار ہوگا' تم بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔

☐ ریاض علی' منڈی بہاؤالدین۔

☆ بیٹے ریاض! بچے بلاوجہ نہیں بگڑتے ہیں' گھر کا ماحول انہیں الٹی سیدھی حرکتوں پر مجبور کرتا ہے۔ اگر وہ کام کرنا چاہتا ہے تو کرنے دو مگر اس سے کہو کہ ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرے۔ والدہ سے کہو کہ اس پر الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دَم کر دیا کریں۔ بیٹے! تم نمازِ فجر کے بعد سورۃ محمدؐ آیت 7' 99 بار پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرو اور زندگی میں فیصلے سوچ سمجھ کر کیا کرو۔ آگے بڑھنے کی لگن بہت اچھی بات ہے مگر حالات پر بھی نظر رکھا کرو۔ مجھے 2 ماہ بعد مطلع کرو۔

☐ شاہین۔ کراچی۔

☆ بیٹی شاہین! خوش رہو۔ وِرد کی اجازت ہے۔ وظیفہ گھر کا کوئی فرد بھی کرسکتا ہے۔ وظیفہ بھی دُعا ہی ہے جو قرآن شریف میں موجود ہے۔ جس طرح اللہ کا نام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

لے کر ہر کام شروع کیا جاتا ہے تاکہ برکت ہو اسی طرح کلامِ الٰہی پڑھنے سے مشکلات حل ہوتی ہیں۔ والدہ سے کہو کہ وہ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ روم آیات 10-9-8، 33-33 بار پڑھیں اور دُعا کریں۔ انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔ مدت 90 دن ہے۔

☐ شمع۔ لاہور۔

☆ بیٹی شمع! اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتی رہو۔ لوگوں کے رویئے سے دکھ ضرور ہوتا ہے مگر دکھ دینے والی باتوں کو اپنے اوپر طاری نہیں کرنا چاہیے۔ نمازِ عشاء کے بعد سورۃ فتح آیت 27 ایک ہزار بار پڑھ کر دُعا کرو۔ بہن سے کہو کہ وہ بھی یہی وظیفہ کرے۔ کرم ہوگا۔

☐ بینش۔ ساہیوال۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں، اس کی منگنی اس کی تایا کی بیٹی سے ہوگئی ہے جبکہ لڑکا اس شادی پر راضی نہیں۔ وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ اور اس کے گھر والے یہ منگنی نہیں توڑ سکتے کیونکہ اس لڑکے کی دو بہنیں اس لڑکی کے گھر شادی شدہ ہیں۔ بابا جی! خط کا جواب جلدی دیں۔ میں شدت سے انتظار کروں گی۔

☆ بیٹی بینش! ضروری نہیں ہے کہ انسان جو کچھ چاہے، وہ اس کو حاصل ہو جائے یا اس کے حق میں بہتر ثابت ہو۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 7 بار سورۃ الکوثر پڑھ کر دُعا کرو کہ رَبّ العزت بہتر فیصلہ فرما۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات لے لو۔

☐ چاندنی۔ کبیر والا۔

○ بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت منداور خوش رکھے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر پلمبر والا کام کرتے ہیں، وہ غصے کے بہت تیز ہیں جبکہ ہمارے مالی حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ کرائے کا گھر ہے۔ پلمبری تو ہوائی روزی ہے۔ میں سلائی کرتی ہوں۔ بابا جی! غصہ تو ہر آدمی کرتا ہے لیکن میرے شوہر کے ساتھ الگ ہی مسئلہ ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ ہر مہینے ہم پر قرضہ چڑھ جاتا ہے۔ ان کی ہوائی روزی ہے، کبھی ملتی ہے، کبھی نہیں لیکن پھر بھی میری سلائی کو برا کہتے ہیں۔ بابا جی! کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے تو بہتر ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے خود محنت کر لے۔ سلائی کی صورت ایک ہنر میرے ہاتھ میں ہے، میں نے تین سال پہلے بھی سلائی چھوڑ دی تھی لیکن قرضہ بہت چڑھ گیا تھا۔ میرا گھر چلانے کے لیے میری بہن میری مدد کرتی تھی مگر مجھے بہت شرم آتی تھی۔ آپ یقین کریں، پچھلے سال عید پر بچوں کی کوئی چیز نہ خرید سکے۔ میرے شوہر نے گھر کے حالات دیکھتے ہوئے مجھے دوبارہ سلائی کی اجازت اپنی مرضی سے دے دی لیکن اب بھی جب وہ غصے میں آتے ہیں تو میری سلائی مشین اٹھا کے پھینک دیتے ہیں حالانکہ میں سلائی والا کام کرنے کے باوجود گھر صاف رکھتی ہوں، کھانا بھی وقت پر تیار رکھتی ہوں، شکایت کا کوئی موقع نہیں دیتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ اُن کو یہ دیکھ کر شرمندگی ہوتی ہے کہ میری بیوی گھر چلانے کے لیے سلائی کرتی ہے۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا تعویذ دے دیں کہ میرے شوہر کا غصہ کم ہو جائے اور وہ یہ بات سمجھ لیں، میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ اس مہنگائی کے دور میں دونوں کو مل کر گھر چلانا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ایسی کوئی دُعا بتایئے جس کے پڑھنے سے میرے شوہر کی آمدنی میں برکت اور اضافہ ہو جائے تاکہ میں سلائی چھوڑ دوں۔ میں اپنی خوشی سے تو انہیں ناراض نہیں کرتی۔ بابا جی! آپ اپنی بیٹی کو دُعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھا کریں۔ میں یہ باتیں ماں باپ، بہن بھائی سے نہیں کر سکتی ہوں، آپ سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ مجھے جواب رسالے ہی میں دیجیے گا۔

☆ بیٹی چاندنی! خوش رہو۔ نماز کی پابندی کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔ اللہ سب قرضہ دور فرمائے گا۔

☐ ثانیہ، حیدرآباد۔

☆ بیٹی ثانیہ...... ! جو لوگ اپنے آپ کو بدنصیب کہتے ہیں، اصل میں انہیں نہ تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہوتا ہے اور نہ ہی اپنے آپ پر۔ کوشش، مسلسل جدوجہد اور سب سے بڑھ کر دُعا تقدیریں بدل دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو۔ وہ ضرور تمہاری حاجت قبول فرمائے گا۔ فی

نافرمان اولاد

وہ والدین جو بچوں کی نافرمانی سے نالاں ہیں ہر نماز کے بعد 33 بار پڑھیں حسبنا اللہ ونعم الوکیل اول و آخر درود شریف تین، تین بار پڑھیں۔ وظیفہ کی مدت ایک ماہ ہے۔

الحال کوئی وظیفہ مت کرو۔ صرف کثرت سے توبہ استغفار پڑھو۔ دن میں کم از کم ہزار بار پڑھو۔ 14 دن کے بعد مجھے حالات سے مطلع کرو۔ تم انشاء اللہ ضرور اپنے شوہر کے پاس جاؤ گی۔

☐ عشرت، فیصل آباد۔

☆ بیٹی عشرت......! نماز کی پابندی رکھو اور اس یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگا کرو کہ وہ تمہیں ضرور عطا فرمائے گا۔ کامیابی انہی لوگوں کو ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا رکھتے ہیں۔ وظیفے کی مدت دو ماہ ہے۔

☐ محمد عاقل، دریا خان۔

☆ بیٹے عاقل......! سب سے پہلے نماز کی پابندی کرو اور جس قدر ممکن ہو، سورۃ فاتحہ کا وِرد کیا کرو۔ دکان کھول کر سب سے پہلے سورۃ رحمٰن کی تلاوت کیا کرو۔ دکان بند کرنے سے قبل روز کی آمدنی میں سے کچھ خیرات کر دیا کرو۔ نمازِ عشاء کے بعد سورۃ یوسف آیت نمبر 11، 212 بار پڑھ کر ہاتھوں پر دم کرو اور ہاتھ چہرے پر پھیر لو۔ اس کے بعد 7 تسبیح یَاسَلامُ کی پڑھ کر حاجات بیان کرو۔ بیٹے......! میرے لیے بس دُعا کیا کرو۔ یہی بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔

☐ شمیم فاطمہ، ریاض۔

☆ بیٹی شمیم! وظائف کی اجازت ہے۔ وظیفہ ایک وقت میں صرف ایک ہی کرنا اور تم خود کرو۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ حسد، غیبت اور دروغ گوئی سے مکمل پرہیز لازمی ہے۔ دُرود شریف کا کثرت سے وِرد جاری رکھو۔ وظیفہ مکمل ہونے کے بعد کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

فرمان الٰہی

''اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا کر دے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال سکے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (سورۃ یونس۔ آیت ۱۰۷)

سادہ طرزِ زندگی

حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ ۲۲ لاکھ مربع میل سے زائد مملکت کے حکمران تھے۔ اس سے قبل کسی بادشاہ کو اتنی بڑی حکومت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے سادگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور تادم حیات اسی اصول پر کاربند رہے۔ جب ملک قحط کی زد میں آیا تو جو کی روٹی اور سادہ غذا پر اکتفا کیا اور کچھ عرصے میں جلیل القدر فرماں روا کی رنگت سیاہی مائل ہوگئی۔

حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ کا فرمان تھا ''جب تک حکومت میں ایک شخص بھی فاقہ زدہ رہا، میرے لیے اچھی خوراک غیر مناسب ہے۔''

مرسلہ: شزاء سلیم، کراچی۔

امید

بڑا ہونے کے لیے بڑا حوصلہ بھی چاہیے۔ سکندر اعظم نے ایران کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے مقدونیہ میں اپنے محل کا قیمتی ساز و سامان اپنے سپاہیوں کو بخش دیا تھا۔ اس کے دوست کلیٹرس نے پوچھا۔

''سکندر! تم نے اپنے لیے کیا رکھا؟''

تو اس اولوالعزم انسان نے جو عظیم جرنیل ہونے کے علاوہ عظیم انسان بھی تھا، بڑے اعتماد سے کہا۔

''امید۔''

مرسلہ: کوثر اسلم، راولپنڈی۔

اچھی باتیں

☆ سادگی ایمان کی علامت ہے۔

☆ جن لوگوں کے خیالات اچھے ہوں، وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

☆ دوسروں کے عیب بیان نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا تمہارے عیب دنیا پر عیاں کر دے۔

☆ زندگی کو ہمیشہ خوشی سے گزارو کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ ابھی کتنی باقی ہے؟

☆ کبھی کبھی قلم سے لکھا گیا ایک لفظ کئی ہتھیاروں سے زیادہ طاقت رکھتا ہے۔

مرسلہ: فاخرہ بیگم، سکھر۔

کالا دیو

بہت عرصے پہلے کی بات ہے، ایک قافلہ جنگل میں سفر کر رہا تھا، اس قافلے میں کئی عورتیں اور چھوٹے بچے بھی شامل تھے۔ راستے میں ایک بچہ اپنی ماں سے چمٹ

کر مارے خوف سے کہنے لگا۔ ''امی...... !اندھیرے میں مجھے ایک کالا دیو نظر آتا ہے تو مارے ڈر کے میری گھگی بندھ جاتی ہے۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹا...... !تو مرد بچہ ہے' خوف کو اپنے دل سے نکال دے۔ اب کی دفعہ جیسے ہی وہ دکھائی دے' آگے بڑھ کر حملہ کر دینا' وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم؟''

بچے نے پوچھا۔ ''لیکن امی...... !اگر اس کالے دیو کی ماں نے بھی یہی نصیحت کر رکھی ہو تو......؟''

مرسلہ: مدیحہ گیلانی' کراچی۔

اطمینان

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب بولے۔ ''میں جب بھی کسی ٹیکسی میں بیٹھتا ہوں' مجھے سب سے زیادہ فکر بریکوں کی ہوتی ہے۔''

''اس ٹیکسی میں بیٹھ کر آپ کو بریکوں کے بارے میں فکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ اس میں بریکیں ہیں ہی نہیں۔'' ڈرائیور نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ: گل زمان' نوشہرہ۔

نکتہ چینی

محبت کو تباہ کرنے کے لیے شیطان نے جتنی قسم کی آگ پیدا کی ہے' اس میں سب سے خطرناک اور زود اثر آگ 'نکتہ چینی' کی ہے۔ اس کا شعلہ محبت کو کبھی نہیں بخشتا۔ اس کا زہر ناگ کے زہر کی طرح مہلک ہوتا ہے۔ (ڈیل کارنیگی)

مرسلہ: عادل گلزار' فیصل آباد۔

کوئی فرق نہیں پڑتا

میاں بیوی کار میں جا رہے تھے کہ بارش نے آلیا۔ ونڈ اسکرین بالکل دھندلی ہو گئی' کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ کئی بار حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تو خوف سے لرزتی بیگم نے غصے سے کہا۔ ''کار روک کر آپ ونڈ اسکرین صاف کیوں نہیں کر لیتے؟''

شوہر نے کہا۔ ''بیگم اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' میں عینک تو گھر ہی بھول آیا ہوں۔''

مرسلہ: عائشہ سرور' کراچی۔

ہیٹ ٹرک (hat trick)

جب کوئی باہر کرکٹ میچ میں یکے بعد دیگرے تین کھلاڑی آؤٹ کرے تو یہ عمل 'ہیٹ ٹرک' کہلاتا ہے جو اس بالر کے لیے یقیناً ایک اعزاز کی بات ہے' ساتھ ساتھ اس کی ٹیم اور ملک کو بھی اس پر فخر ہوتا ہے لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ 'ہیٹ ٹرک' کی اصطلاح کا مطلب کیا ہے اور اس نے کہاں سے رواج پایا؟

کرکٹ کے اوائل میں جب کوئی کھلاڑی یکے بعد دیگرے تین کھلاڑی آؤٹ کرتا تو اس خوشی میں ناظرین کو بھی شامل کرنے کے لیے اپنا ہیٹ اتار کر باری باری سب کے آگے کرتا اور کھیل دیکھنے والے لوگ انعام کے طور پر اس میں کچھ نہ کچھ ڈالتے جاتے۔ اس عمل کو کسی نے 'ہیٹ ٹرک' یعنی 'ٹوپی کا کرشمہ' کہہ دیا۔ رفتہ رفتہ انعام مانگنے کی رقم تو ختم ہو گئی لیکن تین کھلاڑیوں کو آؤٹ کرنے پر 'ہیٹ ٹرک' کی اصطلاح وجود میں آ گئی۔

مرسلہ: سمیہ رمضان' بہاول پور۔

نمکین قطعہ

ایک دن بیوی نے شوہر سے کہا' کیا بات ہے؟
اس قدر گم سم تمہیں پہلے کبھی دیکھا نہیں
عقد نامہ اس کے آگے کر کے شوہر نے کہا
کب یہ ہوگا ایکسپائر' یہ کہیں لکھا نہیں

شاعر: ندیم آذر

انتخاب: رافعہ علی' گھوٹکی۔

انداز مسیحائی

ایئر پورٹ کے لاؤنج میں ایک خاتون کو زار و قطار روتے دیکھ کر ایک نوجوان قریب پہنچا اور ہمدردانہ لہجے میں وجہ دریافت کرنے لگا۔

''کچھ عورتیں میرے قریب بیٹھی تھیں' انہوں نے میری دل آزاری کی۔ وہ میرے بیٹے کو بدصورت کہہ رہی تھیں۔'' خاتون نے کہا۔

''آپ ہرگز دل چھوٹا نہ کریں' آیئے' میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔''نوجوان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
''جب تک ہم چائے پی کر آئیں' تب تک اپنے بندر کو یہیں بیٹھا رہنے دیں' میں اسے کیلا لا کر دے دیتا ہوں۔''

مرسلہ: ثنا' حیدر آباد۔

مشکل کہانی

ایک لڑکے نے کسی دکان سے ڈکشنری کو کہانی کی کتاب سمجھ کر خرید لیا۔ اس کے مطالعے کے بعد اپنے دوست کو بتا رہا تھا۔
''یار' کہانی تو سمجھ نہیں آ رہی لیکن اس میں ایک ایک لفظ کو خوب اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔''

مرسلہ: مہک مجید' ٹنڈو آدم۔

بچے ہمارے عہد کے

ایک بچے کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ پڑوس کی دو خواتین تعزیت کے لیے آئیں۔ ان میں سے ایک بولی۔''ستر کے ہوں گے۔''
دوسری بولی۔''نہیں' بہن' ساٹھ کے ہوں گے۔''
پاس ہی بچہ بیٹھا تھا' جھٹ بولا۔''آنٹی' چلیں' آپ چالیس ہی دے دیں۔''

مرسلہ: تہمینہ آصف' کوٹ ادو۔

ایک قطعہ

سوچ لو چلنے سے پہلے راستہ دشوار ہے
عشق دروازہ نہیں ہے' ہجر کی دیوار ہے
پھر فریب روز و شب کی دوستی ممکن نہیں
کر دیا انکار' سو انکار ہے' انکار ہے

شاعرہ: نوشی گیلانی

انتخاب: سہیلہ خان' وزیر آباد۔

MENU

ایک خاتون نے ایک ہٹے کٹے بھکاری سے کہا۔
''اگر تم میرے گھر میں کام کرو اور سبزی وغیرہ لا دیا کرو تو میں تم کو کھانا کھلا دیا کروں گی۔''
بھکاری نے ایک لمحے پیشکش پر غور کیا پھر بولا۔
''پہلے مینو تو دکھا دیجیے......''

مرسلہ: شازمین فضل' میاں چنوں۔

محبت تو محبت ہے

محبت لفظ نہیں ہے جاناں
یہ تو لوح محفوظ پہ لکھی حکایت ہے
تم سب سے کہہ دو
مجھے تم سے محبت ہے
یہ جملہ تو نہیں جاناں
یہ تیری میری زیست کی ضمانت ہے
محبت ماں کے مادھو کی روح جیسی ہے
محبت سمندر کی تہہ میں زندہ خدا کے جیسی ہے
محبت اڑتے پرندے کی پرواز سے اونچی
محبت پہاڑوں کی گپھا سے گہری ہے
محبت تو محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے
یہی میری حقیقت ہے
یہی تیری حقیقت ہے
محبت ہے خدا جیسی

مدار ہے حصار ہے

میں اڑ کر اب کہاں جاؤں
تیری نظروں کا حصار
مری ذات کا مدار ہے
مجھے آزاد نہیں چھوڑتا
اپنے بس میں رکھتا ہے
میں اس قید میں خوش ہوں

شاعرہ: صائمہ عروج۔ دبئی

برف سا وجود

بکھر ہی تو گئے جیسے کوئی کانچ کی گڑیا گر کر کرچی کرچی ہو جائے۔ جیسے ریت کے ذرات اڑ اڑ کر جا بجا بکھر جائیں۔ جیسے توڑ دیا ہو وقت نے۔ جیسے بکھر

کررہ گئے ہوں وہ خواب سارے جو کبھی پلکوں کی چلمنوں میں سجے تھے اور بن موت ہی تو مر گئے ہم۔ نہ کوئی فاتحہ نہ کوئی نوحہ خواں بس جیتے جی مر گئے۔ ہاں یہی حقیقت ہے زندگی کی۔

گزرتا وقت زندگی میں خزاں سی ویرانی لکھتا گیا اور ہم تقدیر کے لکھے پر صبر ہی کرتے آئے۔ خود ہی نوچ ڈالے وہ خواب جو کبھی جینے کی امنگ پیدا کرتے تھے۔ اب کچھ بھی تو نہیں ان ہاتھوں میں وقت نے منجمد کر دیا سوچ کو...... خوشیوں کو...... برف سا وجود ہے اپنے ہی ہاتھوں کاندھوں پر اپنی لاش اٹھائے چلے جا رہے ہیں...... جانے ابھی کتنا سفر باقی ہے...... جانے ابھی کتنے سانس باقی ہیں...... دنیا میں کتنا قیام باقی ہے......!!

حسنِ خیال: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

امن

امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرط اول ہے' مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی نام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایان شان ہو لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے' یعنی امن اور آزادی کی تمنا' وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سب ہی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سب ہی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت' دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ' شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے' جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت' انصاف اور صداقت' وفا اور شجاعت' نیکی اور رواداری اس لیے بظاہر امن کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

(فیض احمد فیض کی ''دست تہ سنگ'' سے اقتباس)

کچھ برا نہیں

میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے یا (محض عادت ہی ڈال لے) تو بری سے بری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقے کو ہی لے لیجیے' معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے تفکرات ہی پر کیا موقف ہے' کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورد نوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ دب جاتا ہے۔ خیمہ گاؤزبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے' شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارہ ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے' بلکہ نفس امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے لیکن جدید طبی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اہل ذوق کے نزدیک یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

(مشتاق یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس)

وقت کی پابندی

آزادیٔ ہند کو بطریقِ احسن حل کرنے کے لیے ۱۹۴۵ء میں شملہ کے مقام پر کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ یہ مجوزہ کانفرنس لارڈ ویول' وائسرائے ہند کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں قائداعظم محمد علی جناح' صدر آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے منتخب کیا گیا۔

ابھی کانفرنس کی کارروائی کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ قائداعظم کے علاوہ مسٹر لارڈ ویول اور دیگر تمام لیڈر کانفرنس ہال پہنچ گئے۔ کارروائی ٹھیک نو بجے شروع ہونا تھی' ابھی کچھ وقت باقی تھا جس سے مخالفان جناح نے خوب فائدہ اٹھایا اور لارڈ ویول کی خوشامد میں کہنے لگے۔

''صاحب بہادر' قائداعظم کے پلے کیا ہے اور وہ کانفرنس میں آنے کی ہمت کہاں سے لائے؟ ہندوستان کے تمام

باشندے بلالحاظ مذہب وقومیت کانگرس کے ساتھ ہیں۔ وہ تو خودساختہ قائداعظم ہیں۔ اگر ان میں جرأت اور معقولیت ہوتی تو کب کے ہال میں پہنچ چکے ہوتے۔''

ابھی ۹ بجنے میں ایک منٹ باقی تھا کہ قائداعظم نے کانفرنس ہال میں قدم رکھا۔ یہ دیکھ کر لارڈ ویول اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی نشست سے اٹھ کر قائداعظم کو سلیوٹ کیا اور مخالفین قائداعظم کو مخاطب کر کے کہا۔ ''یہ ہے اصول۔'' گویا محمد علی جناح کا دوسرا نام ہے'اٹل اصول'۔

یہ دیکھ کر تمام مخالفان قائد شرم کے مارے خاموش سر جھکائے کھڑے ہو گئے۔

انتخاب: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

چھوٹے میاں

ریاضی کے استاد نے طلبہ کی ذہنی آزمائش کے لیے ایک سوال کیا۔ ''ایک ریلوے پلیٹ فارم جس کی لمبائی دو سو میٹر ہے' پٹری کی چوڑائی تین میٹر اور شمال سے جنوب کی طرف چلنے والی ہوا کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ ہے' بتاؤ میری عمر کیا ہے؟''

تمام طالب علم ہکا بکا ایک دوسرے کو تکنے لگے' ایک طالب علم نے ہاتھ بلند کیا' استاد نے کہا۔ ''جواب سے پہلے سوال دہراؤ۔'' طالب علم نے سوال دہرایا اور جواب دیا کہ آپ کی عمر بیالیس سال ہے۔

اب استاد کو حیرت ہوئی' پوچھا۔ ''تم نے کیسے اندازہ لگایا؟ میری عمر واقعی بیالیس سال ہے؟''

طالب علم نے کہا۔ ''میرے محلے میں ایک لڑکا ہے' اس کی عمر اکیس سال ہے اور وہ آدھا پاگل ہے۔''

مرسلہ: حبیب الرحمٰن۔ گوجرہ

نیند کہاں......؟

نیند پورے بستر میں نہیں ہوتی
وہ پلنگ کے ایک کونے میں
دائیں
یا بائیں
کسی مخصوص تکیے کی
توڑ موڑ میں چھپی ہوئی ہے
جب تکیے اور گردن میں
سمجھوتہ ہو جاتا ہے
تو آدمی چین سے
سو جاتا ہے

شاعر: ندا فاضلی

مردم شماری

مردم شماری کی ابتداء چین سے ہوئی۔ کہتے ہیں 156ء میں وہاں سب سے پہلی مردم شماری ہوئی تھی۔ بر ہان خاندان کا دور حکومت تھا۔ اس زمانے میں افراد کی نہیں بلکہ خاندانوں کی گنتی ہوئی تھی اور ہر خاندان میں اوسطاً پانچ شخص فرض کیے جاتے تھے۔ اس حساب سے 156ء میں چین کی آبادی کا تخمینہ پانچ کروڑ لگایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ صحیح طریقہ نہیں تھا لیکن چین میں جو مردم شماری 18 سو برس پہلے ایجاد ہوئی تھی۔ مغرب میں تقریباً دو سو سال پہلے رائج ہوئی۔ سب سے پہلے امریکہ میں مردم شماری ہوئی۔

مرسلہ: خضر حیات۔ روڑہ تھل

سنہری کرنیں

☆: خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ (سورۃ البقرہ)

☆: جس نے علم کا راستہ اختیار کیا اس نے جنت کا راستہ اختیار کیا۔ (رسول پاک ﷺ)

☆: جو غور کرتا ہے وہ حقیقت کو پا لیتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆: ثواب حاصل کرنے کی نسبت گناہ سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆: خاموشی غصے کا بہترین حل ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

☆: حکمت عملی قوتِ بازو سے زیادہ کام کرتی ہے۔ (سلیموس)

☆: زندگی نام ہے اپنے کمالات کے اظہار کا۔ اگر تمہارے اندر یہ قوت موجود نہیں تو تم زندہ نہیں۔ (علامہ اقبال)

☆: رات دن کے ردوبدل میں سمجھ والوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ (ارشادِ الٰہی)

☆: مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔ (ارشادِ نبوی ﷺ)

مرسلہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمائیے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

فرح عالم.........اسلام آباد
بیٹیاں باپ کی آنکھوں میں چھپے درد کو پہچانتی ہیں
گر کوئی دوسرا پڑھ لے تو برا مانتی ہیں

عبدالغفار عابد.........چیچہ وطنی
زمیں پہ ہم تو زمیں کا نصیب لائے تھے
ہمیں ستارے تمہارے قریب لائے تھے
'لگاؤ' لوک کہانی کا استعارہ تھا
اسے وجود میں ہم کم نصیب لائے تھے

خضر حیات.........روڈہ تھل
دوستوں کے کام آ اور کام آ کر بھول جا
ہر مشقت ایک اجرت ہے' کوئی خواہش نہ کر
حسرتوں کا دکھ بجھا دے گا چراغِ خدوخال
تو بہت ہی خوبصورت ہے' کوئی خواہش نہ کر

عادل حسین.........کراچی
ہم نے بس ایک بار پَر کھولے
آسماں آج تک اڑان میں ہے

شاذلی سعید.........کراچی
ہم دور نکل جائیں گے ہر خواب وخبر سے
تم دیکھتے رہ جاؤ گے پرواز ہماری

نگہت منیر.........اوکاڑہ
محبت روح میں اترا ہوا موسم ہے جانِ جاں
تعلق ختم کرنے سے محبت کم نہیں ہوتی

ماسٹر سرفراز.........پسرور
جہاں کوئی بچھڑ جائے' وہیں پر اس کی منزل ہے
کسی کے ساتھ چلنے سے مسافت کم نہیں ہوتی

تحسین جونیجو.........بورڑی شریف
دشت کی دھوپ میں پیاسے کو سہارا دینے
کوئی دریا نہیں آتا ہے' سراب آتا ہے

زرینہ جونیجو.........بورڑی شریف
ترا وصال بھی آیا تھا ایک وقت میں کام
مگر یہ ہجر تو اک عمر کام آئے گا

ندیم عباس میواتی.........چوکی
یادِ ماضی میں جو آنکھوں کو سزا دی جائے
اس سے بہتر ہے کہ ہر بات بھلا دی جائے
میں نے اپنوں کے رویوں سے یہ محسوس کیا
دل کے آنگن میں بھی دیوار اٹھا دی جائے

ابوہریرہ بلوچ.........بورے والا
میں بکھر رہا ہوں کرشمہ گر' کوئی معجزہ' کوئی دم کرو
کسی نام پر کسی نام سے' مجھے ریزہ ریزہ باہم کرو

ابوذر بلوچ.........کراچی
عکس چہرے پہ آفتاب کا ہے
کس علاقے میں گھر جناب کا ہے؟

فہد نسیم.........کویت سٹی
دیکھتے ہیں اور چھو سکتے نہیں
تم وہاں اور ہم یہاں آباد ہیں
سوچیے تو سب کے سب ہیں قید میں
دیکھیے تو سب کے سب آزاد ہیں

نزہت جبین ضیاء.........کراچی
آخر کہاں چلا گیا دل سے نشاطِ غم؟
اے زندگی' تجھے بھی منانا پڑے گا کیا؟

مسز نگہت غفار.........کراچی

بغیر خواب کی تعبیر اور وہ بھی سچ
کبھی کبھی تو محبت کمال کرتی ہے

انتہا سے نہ ڈر، چراغ جلا
روشنی کی ہے ابتدا سب کچھ

سلطانہ نسیم.........کراچی

ذرا سی دیر خوش رہنے کی خاطر
مجھے سب کچھ بھلانا پڑ رہا ہے
ہوا میں اڑ گئی تصویر میری
نیا خاکہ بنانا پڑ رہا ہے

ماہم علی.........حویلیاں

تمام ٹوٹ گئے خواب افراتفری میں
میں رستہ بھول گیا جب تو اُس کا گھر آیا

نسیم شفیق.........اسلام آباد

چُپ غلط فیصلے کرا دے گی
بولیے ورنہ مسئلہ ہوگا

محمد وقاص حسین.........رحیم یار خان

آ کر پتھر بن جاتی ہو
میرے گھر تم کیوں آتی ہو؟
دنیا والوں کی نظروں میں
تم کس کی کہلاتی ہو؟

حیات خان بونیری.........پشاور

نور چہرے سے ہٹ نہیں سکتا
عشق کا رنگ کٹ نہیں سکتا
مجھ کو معلوم ہے کہ تیرے بغیر
عشق کایا پلٹ نہیں سکتا

سدرہ انور علی.........**جھنگ**

میں نے ایک بار بھی جھپکی نہیں پلک
حیراں ہوں کس طرح مرا سپنا بدل گیا؟

شہروز شریف.........کراچی

چھپائے رکھتا ہے اک شخص میری آنکھوں کو
فقط میں خواب ہی دیکھوں گا عمر بھر جیسے

شعبان کھوسہ.........کوئٹہ

ہر اک سو حشر برپا ہو رہا ہے
مری دنیا، تجھے کیا ہو رہا ہے؟
مضافاتی ہوں پھر بھی سوچتا ہوں
نہ جانے شہر میں کیا ہو رہا ہے؟

نادیہ طارق.........کراچی

محبت اک سزائے موت ہے جو سب کو ملتی ہے
اور اس میں آخری خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی

رضوانہ کوثر.........لاہور

غمِ آئندگی کا ایک لمحہ
بہت ہوتا ہے کم ہوتے ہوئے بھی

عاصم خان نیازی.........میانوالی

کھلتے ہی آنکھ ذہن میں اتنے سوال آئے
پتھر پہ خواب لکھ کے سمندر میں ڈال آئے
لمحے تمام ہجر کے کر دیں گے ہم الگ
اب کے ہمارے ہاتھ اگر ماہ و سال آیا

مور شاہد حسین.........**قمبر شہداد کوٹ**

بجھ گئی آگ، جل گیا سب کچھ
پھر لگا آگ پھر بنا سب کچھ

نسیم شفیق.........اسلام آباد

میں بھی چپ ہوگیا پھر اس کی طرح
گفت گو خامشی سے ہار گئی

کوپن برائے
تیرِ نیم کش
جولائی 2017ء

میرا یہ پسندیدہ شعر ''**سچی کہانیاں**'' کی نذر ہے

نام:

پتا: